DUE DATE

Cl. No Acc. No.

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. **Text Book Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.

جملہ حقوق محفوظ

مخزن

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر



اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

... ملک اردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

ہندوستانی زبان ہے ● ان شہروں ... ● ان شہروں ... اردو سمجھی جاتی ہے

... پریس لاہور میں ... منشی فضل الٰہی ...

[illegible] اعلیٰ افسر صاحبان ”مخزن حکمت“ کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں:-

[illegible] ایک اعلیٰ افسر

[illegible]

[illegible]

مخزن حکمت

[illegible]

ہندوستان کے [illegible] ایک اعلیٰ افسر

جناب کرنل ذوالفقار احمد ایم ڈی - آئی ایم ایس

[illegible] رائے رکھتے ہیں کہ:-

”مخزن حکمت“

(یا)

گھر کا ڈاکٹر و حکیم

(مصنفہ [illegible])

نہایت قابل [illegible] [illegible] کی معرفت [illegible] [illegible] ہر ایک [illegible] اس کتاب کی ایک ایک جلد [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] ڈاکٹری و [illegible] کی [illegible] ذیل کے [illegible]:-

(۱) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۲) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۳) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۴) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۵) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۶) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۷) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۸) جناب [illegible]

(۹) جناب ڈاکٹر [illegible]

(۱۰) جناب ڈاکٹر [illegible]

[illegible]

مخزن

آنکھ کھلنا

سنہ ۱۹۱۰ء کا آخری دن تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء کی آمد آمد تھی۔ میں شام کے قریب الٰہ آباد کی نمائش کے اُس حصہ میں جہاں نمائش کا وسیع میدان دریائے جمن کے کنارے سے آملا ہے ٹہل رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں دریا کے پانی کو چمکیلے سُرخ رنگ میں رنگتی تھیں تماشائیوں کا ہجوم ہوائی جہاز یا زمانۂ جدید کے اُڑن کھٹولے کا حیرت انگیز منظر دیکھنے کے بعد منتشر ہو رہا تھا۔ اور بہت سے تماشائی زن و مرد شفق کے نظارہ کے شوق میں دریا کی طرف کھنچے آتے تھے۔ اور دو دو چار چار مل کر کنارِ دریا پر کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ میں بھی ایک گروپ میں جا ملا۔ وہاں دو صاحبوں میں ایک عجیب بحث چھڑ گئی۔ ان میں سے ایک اپنی وضع سے انگریزی پڑھے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور دوسرے کوئی پرانی وضع کے بزرگوار تھے یہ گفتگو ایسی دلچسپ تھی کہ میں دیر تک اسے سنتا رہا۔ اور اس میں مجھے بہت سے مضامین غور طلب نظر آئے۔ اِس گفتگو کا خلاصہ حافظہ کی مدد سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ابنائے وطن اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کریں۔

الٰہ آباد کی عالیشان نمائش جو دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئی اور فروری سنہ ۱۹۱۱ء تک جاری رہیگی دیکھنے کے قابل ہے۔ اُسکا حال بہت سے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا ہے اور نمائش کی کمیٹی کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوگئی ہے جسکی قیمت صرف ایک آنہ ہے اس میں سب ضروری حالات نمائش درج ہیں۔

بحث کرنے والے دونوں صاحبوں کے نام چونکہ معلوم نہیں ہو سکے۔ اس لئے انہیں بااعتبار اس تمدن کے جس کے وہ اپنی اپنی جگہ قائم مقام تھے۔ اس مضمون میں جدید و قدیم کے نام سے تعبیر کیا جائیگا:۔

مسٹر جدید (میاں قدیم سے) فرمائیے۔ آپ اس نمائش کو کیسا پاتے ہیں؟ مفید چیز ہے نا؟

میاں قدیم (کسی قدر تامل کے ساتھ) آپ کس اعتبار سے پوچھتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ تماشا تو بہت اچھا ہے۔ ایک اُجلا مہذب میلا ہے۔ اور یہ میلا تفریح کے بہت سے اُور سامانوں سے جو ہمارے ہاں مروّج ہیں بہتر ہے۔ لیکن جو محنت اور صرف اس پر ہُوا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے تو ایسی زیادہ کارآمد چیز معلوم نہیں ہوتی۔

جدید۔ مجھے یہ سُنکر حیرت ہوئی ہے کہ آپ جس نمائش کو کارآمد نہیں سمجھتے۔ یورپ میں ایسی نمائشیں صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کا ایک مجرب نسخہ ہیں اور ہماری گورنمنٹ نے اس نمائش میں نہ صرف ظاہری حیثیت میں یورپ کی نمائشوں کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیا ہے۔ بلکہ ہماری ترقی کے لئے وُہی مجرب نسخہ جو یورپ میں مفید ثابت ہو چکا ہے۔ مہیا کیا ہے۔

قدیم۔ وہاں کی باتیں تو آپ جانیں جو وہاں ہو آئے ہیں۔ شاید وہاں نمائشیں مفید ثابت ہوتی ہوں یا مناسبِ حال ہوں۔ مگر یہاں کیا باعتبار ملک کے عام افلاس کے اور کیا باعتبار ہماری موجودہ کاروباری حالت کے کچھ غیر موزون سی نظر آتی ہیں۔ آخر بتائیے تو سہی۔ انکا مقصد کیا ہے اور فائدہ کیا؟

جدید۔ نمائش کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھولدے۔ ہندوستان کے آدھے امراض کا باعث یہی ہے کہ اہلِ ملک کی آنکھیں

بند ہیں۔ یعنی یا تو وُہ ایسے خواب غفلت میں ہیں کہ "جاگنا حشر تک قسم ہی"۔ اور یا اگر کسی قدر بیدا بھی ہو چکے ہیں تو بہت سی چیزوں سے جو اُن کے لئے مفید ہیں بے خبر ہیں اور اس معنی میں کہا جا سکتا ہی کہ اُنکی آنکھ ابتک نہیں کھلی۔

قدیم۔ ہمارے ملک کی غفلت کی نیند کی اگر پوچھئے تو اس کے کئی سبب ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نمایش یا ایسی اور بہت سی نمائشیں ہماری اس غفلت کا کیونکر علاج ہو سکتی ہیں۔ رہا دُوسرے معنی میں آنکھ کھلنا۔ سو اسکے فوائد کا میں چنداں معترف نہیں۔ میں تو دس پندرہ دن سے ہر روز شام کو یہاں کا ہجوم دیکھ جاتا ہوں۔ میری آنکھ اگر اب تک بند تھی تو اب بھی بند ہے۔ مجھے تو کوئی ترقی محسوس نہیں ہُوئی۔

جدید۔ مجھے یہ سُنکر بہت تعجب ہُوا۔ کہ آپ نے اتنے دِنوں میں اس مجموعۂ عجایبات میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی۔ جو آپ کے لئے نئی ہو۔ یا جسے دیکھکر آپ کے خیالات میں پہلے سے زیادہ وسعت یا معلومات میں ترقی ہُوئی ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو معاف کیجیئگا۔ آپ چشم بینا سے محروم ہیں۔ یہاں تو قدم قدم "پُر کرشمہ دامن دل میکشد" کا مضمون ہے۔ ہندوستان کے مشہور ادیب بدل شاعر مرزا غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

نخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

قدیم۔ میں یہ دیکھکر تو خوش ہُوا کہ آپ کو ہماری شاعری سے کچھ تعلق باقی ہی۔ مگر میں اشعار کی سند نہیں مانتا۔ شعر وسخن کے شوق میں تو میں کسی سے کم نہیں ہی لیکن اس قسم کے مباحثے اس سے نہیں طے ہوتے۔ یا کم از کم اس طرح طے

نہیں ہونے چاہئیں۔ کہ ایک شعر پڑھ دینا گویا ایک برہانِ قاطع پیش کر دینا ہے
میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ نمایش بھر میں کوئی ایک چیز بھی ایسی بتایئے جسکو
ہم اپنے مُلک کی بیداری یا آنکھ کھُلنے کا ذریعہ قرار دے سکیں۔

جدید۔ ایک چیز ہو تو کہوں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہاں ایک ایک چیز عجیب اور مفید ہونے میں لاجواب ہے۔ مثال کے طور پر آپ سب سے پہلے اس ہوائی جہاز کو ہی لیجئے۔ جسکی حیرت انگیز اُڑان ہم آپ ابھی دیکھکر آئے ہیں۔ اِنسان ہزاروں برس سے اس فکر میں تھا کہ ہوا میں اُڑنے کی کوئی ترکیب پیدا ہو۔ صدیوں کی محنت کا آج ثمر ملا ہے۔ کہ اُڑان ممکن ہو گئی ہے۔ آپنے دیکھا۔ اس جہاز ہوائی کا وُہ فرانسیسی جہاز ران کس طرح بیدھڑک زمین سے ابھرتا ہے۔ کس وُثوق کے ساتھ آسمان کی طرف بڑھتا ہے اور کتنی بلندی پر پہنچکر چکر پر چکر لگاتا ہے۔ سائنس کے عجائبات میں اس سے بڑھکر اچنبھا ہنوز نہیں ہے۔ اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس نمائش کی بدولت ہزارہا ہندوستانیوں نے اس ایجاد کو بچشم خود دیکھ لیا۔

قدیم۔ ہوائی جہاز کے عجیب ہونے میں کلام نہیں۔ بیشک اچنبھا ہے۔ اور میں پھر اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اور تماشوں سے بہتر تماشا ہے۔ کیونکہ بجائے فریب نظر کے سائنس کا کرشمہ اور ترقی علم کا نتیجہ ہے۔ مگر میرا اعتراض ابتک قائم ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ اس کے دیکھنے سے نہیں ہو سکتا۔

جدید۔ کیا جانیں آپ فائدہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان چیزوں کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات وسیع ہوں۔ اسے معلوم ہو کہ انسان (محنت اور ہمت) سے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ سائنس کے پڑھنے اور سیکھنے کا شوق پیدا ہو۔ اور اہل ہند اہل یورپ کی ترقی دیکھکر خود بھی ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اور یہ سب اس ہوائی جہاز کے مشاہدہ سے اور دیگر مشاہدات سے ممکن ہے۔

قدیم۔ ممکن تو بہت سی چیزیں ہیں جو بسا اوقات واقعی طور پر ظہور میں نہیں آتیں اہلِ عمل کے نزدیک محض امکانات کی بحث بالکل غیر معتبر اور ناکافی ہے۔ واقعات پر بحث ہونی چاہیئے۔ کیا آپ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو لوگ اس اُڑان کی سیر دیکھتے ہیں۔ اُن کے یہ خیال ہوتے ہیں جن کے امکان آپ بتا رہے ہیں؟ میرا تو مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ مَیں تو روز دیکھتا ہوں کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد تو اس حیرت سے اس نظارہ کو دیکھتی ہے۔ جیسے وُہ کسی اَور مٹی کے بنے ہُوئے ہیں اور اس ایجاد کے موجد اور اس ہنر کے جاننے والے کسی اَور مٹی کے۔ اُن کی آنکھیں صرف کُھلی ہی نہیں۔ بلکہ حیرانی سے کُھلی رہ جاتی ہیں۔ اسکا اثر بجائے ترقی کا حوصلہ دلانے کے اور سائنس سیکھنے کا شوق بڑھانے کے جہانتک میرا اندازہ ہے ہم ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے والا ہے۔ ہم ابھی سائنس میں مُبتدی بھی نہیں اور اہلِ یورپ منتہی کے درجہ کو پہنچتے جاتے ہیں اور انکی رفتارِ ترقی اس قدر تیز ہے۔ کہ ہم اگر پر لگا کر بھی اُڑیں تو انکے برابر نہیں چل سکتے۔ اَور تو اَور اس فرق کو تو ملاحظہ کیجئے۔ مَیں نے اِن کانوں سے ایک دفعہ نہیں بیس دفعہ پچھلے چند دنوں میں ہی اچھے اچھے ثقہ اور معقول لوگوں کو یہ کہتے سُنا ہے۔ بھئی انہی لوگوں کا حوصلہ ہے۔ مجھے تو اگر کوئی ہزار روپیہ ساتھ دے اور کہے کہ جاؤ اس کے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ تو مَیں تو کبھی نہ جاؤں موت کے مُنہ میں کُودنا ہے۔ ہم تو ابھی اتنے سستے ہُوئے نہیں۔ کہ یُوں مُفت میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں!۔

جدید۔ مَیں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے مُلک میں ابھی کمی تعلیم کے باعث بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی ایجادات سے مرعوب ہوتے ہیں اور

اہل یورپ کو ایک مافوق الفطرت قوت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن سب تو ایک سے نہیں بہت
ایسے بھی تو ہیں کہ یورپ کی ترقی سے مستفید ہو کر اپنے ملک کی ترقی کی فکر میں ہیں۔
اُن کے لئے تو یہ تجربے جو یہاں دکھائے جا رہے ہیں۔ فائدہ سے خالی نہیں
آپ نے دیکھا ہے بجلی کو علوم جدیدہ نے کس طرح دست بستہ باندی بنایا ہے۔ اور
اِس نمائش میں کیا کیا کام اس سے لیا جا رہا ہے۔ شام ہوتے ہی نمائش کے
وسط کے قریب جو گھنٹہ گھر بنا ہے کس طرح خودبخود منوّر ہو جاتا ہے سیکڑوں
برقی لمپ جو اس پر لگے ہیں۔ یکبارگی روشن ہو کر اسے بقعۂ نور بنا دیتے
ہیں۔ فوّارے اسی بجلی کی بدولت طرح طرح کے رنگ بدلتے ہیں۔ اور رات
روشنی میں رشکِ نیمروز بن جاتی ہے۔

قدیم۔ جی ہاں میں نے یہ سب دیکھا ہے۔ اور بارہا اس کی خوبصورتی سے میرا
دِل خوش ہوا ہے۔ لیکن مُلکی پہلو سے میرے دِل پر تو ہمیشہ مایوسی چھا گئی
ہے۔ اور میں نے آہ سرد بھر کر کہا ہے۔ کہ یہ چراغان ہمارے لئے باعثِ
مسرّت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم بڑی محنت
سے مٹی کے چراغوں میں سرسوں کا تیل اور رُوئی کے فتیلے ڈال ڈال کر
چراغاں کیا کرتے تھے اور جتنی دیر روشنی درکار ہوتی اتنی دیر دعائیں
مانگتے رہتے تھے۔ کہ کوئی جھونکا تیز ہوا کا آکر ہمارے دیئے نہ بجھا دے
اور اب برقی چراغوں کی قطاریں ہیں۔ جو شیشے کے چھوٹے چھوٹے فانوسوں
کے نیچے نہایت محفوظ حالت میں روشن ہیں۔ نہ انہیں ہوا کا ڈر نہ آندھی
کا خطر۔ مگر فرق کیا تھا۔ وُہ روشنی ہماری اپنی ہوتی تھی اور یہ روشنی دوسروں
سے مانگی ہوئی۔ نمائش کے میدان میں یہ منوّر مینار کھڑا ہے۔ مگر اس
روشنی میں ہمارا کیا ہے۔ برقی روشنی ایجاد اہل یورپ کی۔ لیمپ ساخت

یورپ کے۔ اُن کی ترتیب لیاقت کسی یورپین صناع کی۔ کونسی بات ہے جس پر ہم فخر کر سکیں۔ کہ یہ ہماری کرامات ہے۔ ہاں ایک چیز ہم بھی اس مجموعہ میں پیشکش کرتے ہیں اور وُہ چشم حیراں ہے۔ اُستاد کا شعر بے اختیار زبان پر آتا ہے۔ کس بیساختہ پن سے کہا ہے ؎

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
چشم نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

جدید۔ مَیں آپ کی اس منطق کا قائل نہیں کہ ہم ان چیزوں کو دیکھکر ہمیشہ محو حیرت ہی رہینگے۔ اس میں شک نہیں کہ فوری اثر حیرانی کا ہوتا ہے اور اپنی ناقابلیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس ہی قابلیت کا آغاز ہے اور اس سے ہر ترقی کی ابتدا ہے۔ اور اس کا نام مَیں نے "آنکھ کھلنا" رکھا ہے۔ آپ مجھ پر اعتراض کرتے ہُوئے درحقیقت میری تائید کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ بہت سے سوچنے والے دِل اور دماغ ان ایجادات اور ترقیوں کو دیکھکر حیران ہوتے ہیں اور اپنی کمی کو محسُوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کاموں کے سیکھنے کی تدبیر اس احساس سے فقط ایک قدم آگے ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو۔ اسی نمائش کے اندر اس کے ثبوت موجُود ہیں۔ بہت سی چیزیں جو پہلے ہمارے ہاں نہیں بنتی تھیں۔ اور باہر سے بن کر آتی تھیں۔ اب ہمارے ہاں بننے لگی ہیں اور ہمارے ہی ہم وطن کاریگروں نے بنائی ہیں۔ اسی طرح اَور بہت سی چیزیں جو ابھی ہماری صنعت سے بالاتر نظر آتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد بننے لگیں گی۔ مَیں کل ہی اتفاق سے فرنیچر کے کمرے میں گیا۔ تو یہ دیکھکر نہایت

ہی مسرور ہوا کہ ایک سے زیادہ کارخانوں نے فرنیچر میں یورپ کے اعلیٰ کارخانوں کا معقول کامیابی سے مقابلہ کیا ہے۔ ایک دوکان بریلی کی اور ایک دوکان پنجاب سے آئی ہوئی گجرات کی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

قدیم۔ یہ امر تو اس وقت تو زیرِ بحث نہیں کہ ہندوستان میں کوئی صنعت ترقی نہیں کرسکتی یا کر نہیں رہی۔ میں نے بھی اُن کارخانوں کا کام دیکھا ہے جن کا آپ ذکر کرتے ہیں۔ بیشک اُن کی کوشش قابلِ داد ہے مگر اُن کے وجود سے آپ کے لئے کوئی چنداں مفید دلیل پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کام اُن کاموں میں ہے۔ جو مدت سے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ فن نجاری میں بڑے بڑے اعلیٰ صناع ہندوستان میں ہو گذرے ہیں۔ جو اپنے کام رنگ میں کسی یورپین کاریگر سے کم نہیں۔ علاوہ بریں دستکاری میں ہندوستان اچھا نام پیدا کرچکا ہے اور اب تک دستکاری میں اسے شکست دینا آسان نہیں۔ اِن نئے کارخانوں نے پُرانی کاریگری سے طرزِ جدید پر کام لیا ہے۔ مگر جن چیزوں کا میں ذکر کررہا تھا وُہ دستکاری سے متعلق نہ تھیں۔ بلکہ کلوں اور انجنوں کے متعلق اور علمی ایجادات کا نتیجہ تھیں اور میری بحث یہ تھی کہ تاحال علمی ایجادات کے تعجب سے ہمارے دماغ مغلوب ہیں اور کلوں کے کام ہماری دستکاری پر غالب ہیں۔ پس اس کاریگری کو دیکھ دیکھ کر ہم کیا فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

(باقی دارد)

عبدالقادر

جوتش

اول ہم ذیل میں برجوں کے نام درج کرتے ہیں جو عربی یورپین اور ہندی علم ہیت میں معروف ہیں اس سے نتیجہ بعدہٗ اخذ کرینگے :-

عربی	ہندی	لاطینی
حمل	میکھ	ایریز
ثور	برکھ	ٹورس
جوزا	متھن	جیمینائی
سرطان	کرک	کینسر
اسد	سنگھ	لیو
سنبلہ	کنیا	ورگو
میزان	تلا	لیبرا
عقرب	برچک	سکورپو
قوس	دھن	ساگی ٹیرئیس
جدی	مکر	کیپریکارن
دلو	کنبھ	اکیوریس
حوت	مین	پیسیز

نقشہ مندرجہ بالا سے ظاہر ہوگا کہ جس لفظ سے ہر ایک برج نامزد کیا گیا ہے اس کے تینوں زبانوں میں ایک ہی معنی ہیں۔

ستاروں کا مجموعہ فلک پر بیشمار ہے۔ زمانہ حال میں اور نیز زمانہ قدیم میں انکا

شمار کی کوشش ہوئی۔ لیکن مکمل فہرست ہنوز تیار نہیں ہوئی۔ بقول اجہ بیزل کے جتنے بکری کے کھال پر بال ہیں۔ اتنے ہی ستارے اور سیارے ہیں۔ ہندوؤں کے راہو اور کیتو کا پتہ نہیں چلا۔ یا تو یہ سیارے فرضی تھے یا ہنوز دوربین کافی طاقت کی ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ یا ممکن ہے کہ نئے دریافت ہوئے ہوئے سیارے یورینس (Uranus.) اور نپچوں (Neptune.) راہو اور کیتو ہوں۔

یورپین اور عربی علم ہیئت میں صرف سات ستارے مانے جاتے ہیں۔ یعنی:-

زحل	سنیچر	سیٹرن
عطارد	بدھ	مرکیوری
زہرہ	شکر	وینس
مشتری	برہسپت	جوپیٹر
مریخ	منگل	مارس
شمس	سورج	سن
قمر	چندرمان	مون

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو صفتیں ان سیاروں کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ وہی ہیں جو ہندیوں میں مشہور ہیں۔ ہم سوال کرتے ہیں:-

اول۔ کیا یہ ممکن ہے کہ چند اشخاص مختلف ملکوں میں ستاروں اور سیاروں کے مجموعوں کو دیکھنے اور شناخت کے لئے بجنسہ وہی اشکال اپنے ذہنوں میں تجویز کریں جو اُنکے خیال میں مشابہ بعض متخیلہ اشکال فرضی کے ہوں۔

دوم۔ کیا یہ غالب ہے کہ اگر جوتش محض تجربہ پر بنیاد رکھتا ہے تو ہر ایک ستارے کے متعلق وہی تاثیریں مختلف ملکوں کے مشاہدہ کرنے والے بیان کریں۔

ہمارے خیال میں اس درجہ کا توارد ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے

کہ علمِ ہندسہ دُنیا کے مختلف حصّوں میں ابتدأً ہند سے گیا ہے - چنانچہ یہ نام بھی اس امر پر دال ہے - لیکن اس امر میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آیا مصریوں اور یونانیوں نے ہند سے جوتش کا علم حاصل کیا - بہت سے علمائے اسلام جوتش کو لغو اور فرضی سمجھتے رہے لیکن ان میں سے بعض بعض اس کی تحصیل اور مشق میں مصروف رہے - نصاریٰ کے ممالک میں بھی اس کی مخالفت ہوتی رہی - تاہم بعض اُن میں سے بھی اس کے مشتاق رہے -

یہ امر مانا جاتا ہے کہ چینی - ہندو - مصری - کلدانی زمانہ قدیم میں جوتش کے قائل تھے - رفتہ رفتہ خواہ کچھ ہی وجوہات ہوں لوگوں کے عقیدے میں فرق آ گیا باوجود اس زوال کے خلیفہ منصور کے عہد میں منجم دربار میں رہتے تھے اور آیندہ کا حال بیان کیا کرتے تھے - علیٰ ہذا کیتھلک عیسائیوں میں اسکا شغل رہا چنانچہ ایک شخص کارڈینل ڈالی نے حضرت مسیح کا زائچہ بنایا تھا - فرانس کے بادشاہ لوئی یازدھم نے ایک نجومی گیلی اوٹی ملازم رکھا ہوا تھا - انگلستان میں بعضے پروٹسٹنٹ عیسائی اسکے قائل رہے - ولیم للی ایک بڑا مشہور نجومی انگلینڈ میں ہو چکا ہے اس کی پیشینگوئی دربارہ وَبا کے صحیح نکلی - وبا کے بعد کی آتشزدگی کے بارہ میں بھی اس کی پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی - علیٰ ہذا چارلس اوّل کے متعلق بھی اس کی پیشینگوئی صحیح نکلی - حتیٰ کہ اسکو پارلیمنٹ سے کچھ عرصہ ایسی خدمات کے صلہ میں پنشن بھی عطا ہوتی رہی - شاعروں میں سے ڈرایڈن نے اپنے بچوں کے زائچے بنوائے - علم ہیئت کی تحقیقات نے اس فن کو بہت ضعف پہنچایا اور رفتہ رفتہ یہ فن ابلہ فریبوں کے ہاتھ منتقل ہو گیا -

اب ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ ہندی جوتش کی مشابہت مصری جوتش سے حیرت انگیز ہے - ان دنوں پھر کچھ کچھ یورپ میں اس طرف توجہ ہوئی ہے - یوروپین جوتشیوں کی سالانہ جنتریوں کو شوقیہ مطالعہ کیا جاتا ہے - خواہ یہ علم ظنی - لغو -

باطل یا صحیح ہو۔ یورپ کے منجم مصری جوتش پر عمل کرتے ہیں۔ جو اتفاق سے ترجمہ ہو کر باقی رہ گیا ہے۔

اوکلٹ ریویو میں ہمارے شہنشاہ معظم کا زائچہ درج ہوا ہے۔ ہارمسورتھ انسائیکلوپیڈیا میں جرمن کے مشہور شاعر گیٹے کا زائچہ درج ہے جو صحیح ثابت ہوا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک کتاب جس کا نام (انفلوئنس آف دی سٹارز) ہے روزا باگن نے شائع کی۔ اس میں مذکور ہے کہ ابتداً یہ علم سینہ بسینہ مصر میں جاری رہا اور حضرت مسیح کے ایک ہزار سال قبل سے ستاروں کا مشاہدہ مصری کرتے رہے۔ سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں کلاڈیس بطلیموس نے ۴ جلدوں میں اس علم کے قواعد قلمبند کئے۔ اس کے ترجمے انگریزی زبان اور ہسپانیہ کی زبان میں ہو گئے۔ سنہ ۱۸۲۲ء میں جان ولی نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مفصل ذکر تو اس فن کا اس محدود تحریر کے احاطہ مجوزہ سے باہر ہے تاہم شائقین جوتش کی دلچسپی کے لئے زائچہ کے بارہ خانوں کا ذکر کافی ہوگا۔ جو ہر ایک زائچہ میں ہوتے ہیں۔

خانہ اوّل - یہ گھر مذکر ہے۔ اس کا تعلق سر، زبان اور حافظہ سے ہے۔ یہ جسم کا گھر ہے اور سب سے ضروری خانہ ہے۔ اگر اس میں منگل واقع ہو تو مولود کے چہرہ پر تل یا داغ ہونا ضروری ہے۔ مختلف ستاروں کے اس گھر میں واقع ہونے سے مختلف اثر بیان کئے جاتے ہیں۔ اس گھر کا رنگ سفید ہے۔

خانہ ۲ - مؤنث ہے۔ دولت دنیوی سے اور مولود کی گردن سے متعلق ہے رنگ سفید ہے۔

خانہ ۳ - رنگ سرخ زردی لئے ہوئے۔ مذکر ہے۔ ہاتھ بازو شانہ مولود سے تعلق رکھتا ہے۔ سفر۔ ہمسائگان۔ تصنیفات۔ برادر ہمشیرہ کے

تعلقات بھی اسی گھر سے ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۴۔ مونث رنگ سُرخ۔ معدہ۔ سینہ پُشت سے متعلق ہے۔ اس گھر سے میراثِ پدر۔ زندگی کے آخری حصّہ کی بابت احوال ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۵۔ رنگ سیاہ وسفید۔ مذکر۔ دل پُشت جگر سے تعلق ہے۔ اولاد۔ ثروتِ دُنیوی لذاتِ دنیوی۔ کامیابی کاروبار سے متعلق ہے۔

خانہ ۶۔ سیاہ رنگ۔ مونث۔ مولود کے ملازم۔ مویشی۔ جدیان کے متعلق معدہ امعا پر اثر ہوتا ہے۔

خانہ ۷۔ سیاہ۔ مذکر۔ ازدواج وعشق کے متعلق ہے۔

خانہ ۸۔ سبز وسیاہ۔ مونث۔ جسم کے نچلے حصّہ سے تعلق ہے۔ موت کس طرح سے ہوگی۔ کیا کیا مال بذریعہ وصیت ملیگا۔

خانہ ۹۔ سبز وسفید۔ ران اور سُرین سے تعلق رکھتا ہے۔ دریائی سفر اور سفر دُور ودراز سے تعلق ہے۔ بیوی اور اس کے عزیزوں سے تعلقات اس گھر سے ظاہر ہوتا ہے۔

خانہ ۱۰۔ مونث۔ سُرخ سفید۔ زانو کے متعلق۔ کاروبار منصبی پیشہ۔ مادر کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۱۔ مذکر۔ لات کے متعلق۔ دوست اور آشناوں کے حالات ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۲۔ مونث سبز رنگ۔ رنج والم کا گھر ہے۔ دشمن۔ خرابی دُنیوی سے تعلق ہے۔ پاؤں اور انگوٹھے سے تعلق ہے۔

نقشۂ بالا سے ظاہر ہے کہ گرہ باراں گھر میں کیونکر واقع ہوسکتے ہیں۔ بوقتِ ولادت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون ستارہ کس بُرج میں ہے۔ ستاروں کی گردش کے حساب سے اگر بُرج اوّل میں جو پیدایش کا خانہ ہے کوئی ستارہ موجود ہے تو اُس کے

پھل دریافت کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات دو دو تین تین ستیارے ایک ہی بُرج میں جمع ہوتے ہیں اور دیگر گھر خالی رہتے ہیں۔ خالی گھر کے اثر مقابلہ کے گھر کے گرہ سے دریافت ہو جاتے ہیں۔ طریق دریافت کی ماہیت نہ معلوم کس بُنیاد پر رکھی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ علم کس طرح سے حاصل ہوا۔ غالباً تجربات کا مجموعہ ایسا تیار ہوتا گیا ہوگا کہ اُس سے کوئی کلیہ قاعدے موضوع کئے گئے ہیں۔ چنانچہ

(۱)۔ زحل (یعنی سنیچر) ہے۔ اگر وُہ خانۂ پیدایش میں بوقتِ ولادت موجود ہے تو مولود ثقہ۔ متین۔ صابر۔ مطالعہ پسند ہوگا۔ مستورات سے تعشق نہ رکھیگا لیکن جس کے ساتھ اُس کا عشق ہوگا ثابت قدم ہوگا۔ رُوحانی معاملات کا شُغل رکھیگا۔ قد دراز دست و پا لمبے ہونگے۔ بال سیاہ ابرو آپس میں ملے ہُوئے ہونگے۔ لیکن اگر یہ ستیارہ نچلی منزلت کا واقعہ ہوا ہے (جو ایک اصطلاحی لفظ ہے) تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولود حاسد۔ حریص۔ کینہ ور۔ دروغ گو۔ اور بے صبر شخص ہوگا۔ جملہ سیاروں کا اثر موجودات حیوانات اور نباتات پر بھی ہوتا ہے جو جوتش میں نامزد کئے گئے ہیں جنکا ذکر طوالت کی وجہ سے متروک کیا جاتا ہے۔

(۲)۔ مشتری (برہسپت) اگر خانۂ ولادت میں واقعہ ہے تو وُہ اُونچا واقعہ ہوا ہے تو قد دراز۔ بیضوی شکل۔ موٹی آنکھیں۔ بال گُنجان۔ دانت اچھے ہونگے۔ مولود فیاض۔ مہمان نواز۔ لذاتِ دُنیوی کا شائق ہوگا۔ بیوی سے محبت رکھیگا۔ کمینہ باتوں سے اجتناب کرے گا۔ آواز بلند اور صاف ہوگی۔ اگر یہ ستیارہ نیچ واقعہ ہوگا تو مولُود بوالہوس۔ مغرور۔ عیاش۔ فضول خرچ اور ظالم و جابر ہوگا۔ گویا اثر بوجہ نیچ ہونے کے برعکس ہوگا۔

(۳)۔ مریخ (منگل) کے اثر یُوں بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر اُونچا واقعہ ہُوا ہے تو

مولود بہادر۔ شائقِ جنگ۔ تیز طبیعت۔ رنگ سُرخ۔ دراز سینہ۔ متوسط قد۔ جسم کی ہڈیاں بڑی ہونگی۔ بال گھنگھر و دار۔ آنکھیں باز کی آنکھوں کے مشابہ۔ اگر یہ سیارہ نیچے واقعہ ہوا ہے تو مولود۔ شریر۔ فتنہ پرداز۔ نہ خوفِ خدا نہ خوفِ انسان۔ عادات میں بے تمیز اور بے اصول ہوگا۔

(۴)۔ شمس (سورج) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود حکمرانی کا شائق۔ نمود کا شائق لیکن مزاج محبت آمیز ہوگا۔ عادات حسن اور گفتگو میں متین ہوگا۔ اگر نچلے درجہ پر واقع ہے تو مولود مدمغ۔ شیخی باز۔ فضول خرچ۔ زبان دراز۔ دوسروں کی فیاضی پر زندگی بسر کرنے والا ہوگا۔

(۵)۔ زہرہ (شکر) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود عاشق مزاج۔ محنت سے جی چرانیوالا۔ خوبصورت۔ ہر قسم کے تعیش کا شائق۔ موسیقی اور فنونِ لطیفہ و نفیسہ کا مشتاق ہوگا۔ رنگین مزاج ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوا تو جسم فربہ۔ موٹے لب۔ چہرہ پر فربہی۔ عادات میں شورہ پشت۔ بداخلاق۔ بد وضع۔ بدمعاش ہوگا۔

(۶)۔ عطارد (بدھ) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود کا دماغ باریک بین۔ ذہن تیز اور طبیعت فصیح و بلیغ۔ صاحبِ حافظہ۔ روحانی معاملات میں مشتاق۔ پیشگو ہوگا۔ اگر تجارت کی جانب توجہ کرے گا تو اس سے بڑھکر ہونا مشکل ہے۔ نئے نئے رستے دولت پیدا کرنے کے اختراع کریگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود دروغ گو۔ لاف زن زبان دراز۔ متلون مزاج۔ ابن الوقت ہوگا۔

(۷)۔ قمر (چندرماں) اگر اونچا واقعہ ہوا تو مولود۔ نرم مزاج۔ بزدل۔ خیالی پلاؤ پکانے والا۔ شاعر۔ سفر کا شائق۔ متلون مزاج ہوگا۔ میانہ قد۔ گول چہرہ ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود سست۔ کاہل الوجود۔ شرابی۔ آوارہ گرد۔ دروغگو ہوگا۔

اس نقشہ میں راہو اور کیتو دونوں کا ذکر نہیں ہے جو ہندی جوتش میں نحس گرہ

سمجھے جاتے ہیں۔

اب رہا یہ امر کہ یہ گرہ اگر خانۂ ولادت میں واقعہ ہوں تو پھر بُرجوں پر جہاں جہاں وُہ ستارے واقعہ ہوں۔ اپنے اپنے اثروں کے عکس ڈالتے ہیں۔ اِن میں سے بعض گرہ بعض خانوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ وُہ جہاں واقعہ ہوں اپنے اپنے خانہ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی گرہ ایسے خانہ میں واقع ہے جو اُسکا گھر نہیں تو مالکِ خانہ اس کے ساتھ ملکر اثر پیدا کرتا ہے۔ یعنی بعض ستیارے بعض دیگر ستیاروں کے دوست اور بعض دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ اگر دوست واقعہ ہے تو فبہا ورنہ دشمن گرہ سے اسکا مقابلہ ہوتا ہے۔ جس گرہ کا زور زیادہ ہوتا ہے وُہ اپنا اثر زیادہ دکھاتا ہے اور اکثر اوقات اوسط نکل آتی ہے اس قاعدہ پر جس کے قواعد بشرح و بسط بیان کیے گئے ہیں۔ ہر ایک گرہ کے ایک بُرج میں واقعہ ہونے یا اس بُرج کے خالی رہنے سے جو اثر ہوتے ہیں جُداگانہ بیان کیے گئے ہیں۔ جنکا ذکر مفصل باعثِ طوالت ہے۔ ہم نے صرف اُسی قدر تذکرہ کیا ہے جس سے مشابہت دکھلانی مقصود ہے۔

جو لوگ ہندی جوتش سے واقف ہیں وہ مندرجہ بالا تحریر سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ کہانتک ہندی جوتش مصری جوتش سے مشابہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ:۔

یا تو یونانی ہندیوں سے جوتش لے گئے اور انہوں نے مصر میں رائج کیا یا کلدانیوں اور چینیوں نے ہندیوں سے حاصل کیا۔

یا ہندی ان ملکوں میں جاتے رہے اور وہاں سے سیکھ کر ہندوستان میں لے آئے۔ یا مصریوں نے ہند سے سیدھا حاصل کیا۔

خواہ ان میں سے کوئی صورت صحیح ہو۔ جہانتک راقم سطور کو ہندی جوتش سے

واقفیت ہے وہ اتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو نہیں ایک دوسرے سے اکتساب ہوا ہے۔ جس کتاب کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اُس کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوا کہ مصری جوتش کی کتابوں میں مبتدی اصول بیان ہوئے ہیں۔ جو نکات اور تفصیل ہندی کتابوں میں درج ہے وہ بے انتہا ہے اور سینکڑوں جوتشیوں کے ذاتی تجربے ہیں۔ لیکن دعویٰ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تتبع و تقلید کس نے کی۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ابتدائی اصول ایک قوم نے وضع کئے اور ترقی دوسری
یا متعلقہ قوم نے کی۔ البتہ اس قدر ظاہر ہے کہ ہندی جوتش میں شرح و بسط بہ درجہا زیادہ ہے۔ اس قدر بھی انصافاً ہم کو لکھنا واجب ہے۔ کہ ہندی جوتش کی بعض کتابوں میں عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور عربوں کا ایک خاص طریقہ شمار اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس فن میں مہارت رکھتے تھے اور ہندی اور عرب ماہرین علم آپس میں تبادلۂ معلومات کرتے رہتے ہیں۔

شمیم

تاریخ ابوالبشر کتاب حال میں شائع ہوئی ہے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے نے پروفیسر ڈ پاپتہ کی کتاب کے حصۂ اول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس میں جدید تحقیقات کے مطابق آغاز نوع انسان سے بحث کی گئی ہے۔ مفتی صاحب مستحق داد ہیں کہ انہوں نے ایسی دلچسپ علمی کتاب ترجمہ کے لئے انتخاب کی اور اس کا نہایت عمدگی سے ترجمہ کر کے اردو علم ادب میں ایک مفید اضافہ کیا۔ اس کتاب کی قیمت فی جلد مجلد ؏ اور غیر مجلد ؏ ہے اور صاحب مترجم سے تاج محل بھوپال کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

حکیم انخرسیس

(سلسلہ تاریخ الحکما)

یہ حکیم شہر اثینہ میں سینتالیسویں اولمپیاد میں آیا۔ اور اپنے شہر میں پہنچنے سے چند روز بعد مار ڈالا گیا۔ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں یہ ظاہر ہوا ہے۔ اُس زمانہ میں بہت سے بڑے بڑے حکیم موجود تھے۔ یہ حکیم تاتاری الاصل تھا۔ اور تمام حکماء میں نہایت عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا بھائی قدوید اس ملک تاتار کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام اغنوروس تھا۔ اور اس کی ماں یونان کی رہنے والی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں زبانیں جانتا تھا۔ نہایت فصیح اور خوش بیان شخص تھا۔ اکثر بیش قیمت لمبے جوڑے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ دودھ اور دہی کے سوا کچھ نہ کھاتا تھا۔ وعظ و نصیحت کے وقت بہت جلدی اور بہت مختصر بولتا تھا۔ اور الفاظ و عبارات دقیق کا استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی تقریر کے مضامین ہی ایسے باریک ہوتے تھے۔ بلاغت و ثروت کلام میں یہ کیفیت تھی کہ اُس کے جملے ضرب المثل بن گئے تھے۔ جو شخص کلام میں اُس کا تتبع کرتا تھا تو لوگ اس کی نسبت کہا کرتے تھے۔ کہ یہ شخص تاتاری عبارت بولتا ہے۔

حکیم انخرسیس نے بلادِ تاتار کا رہنا چھوڑ کر شہر اثینہ میں رہنا پسند کیا تھا۔ اس شہر میں آتے ہی سیدھا حکیم سولون کے مکان پر پہنچا۔ اور اس کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا اُس سے کہا کہ حکیم سولون سے کہہ دو کہ ایک شخص دروازے پر کھڑا ہے جو آپ سے ملنے اور آپ کے یہاں بہت مدت کے لئے رہنے کے قصد سے آیا ہے۔ سولون نے جواب میں کہلا بھیجا کہ انسان

صرف اس صورت میں مہمان کو اپنے یہاں رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے شہر میں ہو اور جہاں وہ مقیم ہو اس میں اسکو تصرف حاصل ہو"۔

انخرسیس یہ سنتے ہی بے تکلف اندر چلا گیا اور حکیم سولون سے کہنے لگا کہ "آپ اس وقت اپنے شہر میں ہیں اور اپنے ہی مکان میں مقیم ہیں۔ لہٰذا آپ مجھ کو بطور مہمان کے قبول کیجئے اور میری مصاحبت کا سامان مہیا کرائیے"۔ حکیم سولون اس حاضر جوابی سے بہت ہی خوش ہوا۔ اور حکیم انخرسیس کو اپنے یہاں رکھکر بہت ہی خوش ہوا۔ دونوں کی آپس میں ایسی محبت ہو گئی کہ آخر عمر تک برابر قائم رہی۔

حکیم انخرسیس کو نظم کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے اس نے بلاد تاتار کے قوانین کو نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نظم میں قوانین حرب بھی لکھے تھے۔

حکیم انخرسیس اکثر کہا کرتا تھا کہ درختِ انگور سے تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ نشہ۔ لطف۔ ندامت۔ شہر اثینہ کی مجلس سے اس کو اکثر تعجب ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ حکما احکام مفیدہ جاری کرتے ہیں اور حمقا اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ اس پر بھی تعجب کیا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص اگر کسی کو برا کہے خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو تو وہ سزا پاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں گالیاں تک معاف ہیں۔ چنانچہ کھیل کود میں۔ خواہ مخاطب کوئی بڑا ہی آدمی کیوں نہ ہو۔ اسے اس پر بھی تعجب ہوا کرتا تھا کہ اہل یونان اپنے دسترخوانوں پر پہلے متوسط درجہ کے پیمانوں میں شراب پیتے ہیں۔ اور پھر بڑے پیمانوں میں۔ حالانکہ انکو علم ہوتا ہے کہ نشہ ہو چلا ہے۔

حکیم مذاق کا کبھی متحمل نہ ہوتا تھا۔ اور خصوصاً انکا جو خوشی کی تقریبوں میں کئے جاتے ہیں۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ آدمی کو شراب پینے سے کس طرح روکا جائے۔ حکیم انخرسیس نے جواب دیا کہ مجھے تو اس ترکیب سے بہتر کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ اسکے پاس کوئی بدمست آدمی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اس کی حرکات کو دیکھکر اس فعل سے نفور ہوجائے۔

کسی نے پوچھا کہ "آپ کے ملک میں آلاتِ موسیقی ہوتے ہیں یا نہیں"؟ حکیم انخرسیس نے بطور سرزنش جواب دیا کہ ہاں آلاتِ موسیقی تو ہوتے ہیں مگر شراب نہیں ہوتی۔ جب کوئی شخص کھیل میں شریک ہونے کے لئے اپنے بدن پر تیل ملتا تھا تو حکیم انخرسیس کہا کرتا تھا کہ یہ شخص ایک بڑے جنون کی تیاری کر رہا ہے۔

ایک روز کشتی کے تختوں کی موٹائی ناپ کر کہنے لگا کہ ان میں سفر کرنیوالوں اور موت کے درمیان صرف چار انگل کا فاصلہ ہے۔

حکیم انخرسیس ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنی زبان اور پیٹ پر قابو رکھے۔ یہ حکیم ہمیشہ سوتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ اپنے مُنہ پر رکھکر سوتا تھا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ انسان کو چاہئیے کہ حفظِ زبان کا اہتمام کُلی رکھے۔ ایک شخص تاتار کا رہنے والا اثینہ سے اس کے پاس آیا تو حکیم انخرسیس نے اس سے کہا کہ میرے ملک نے مجھے بدنام کیا۔ اور تو نے اپنے ملک کو۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ کیا آدمیوں میں اچھے اور بُرے ہوتے ہیں؟" حکیم نے جواب دیا کہ کیوں نہیں؟ کیا ان کے زبان ہی نہیں ہوتی؟"

اس حکیم کا قول تھا کہ صرف ایک دوست جو حقِ دوستی و صحبت ادا کرے اُن بہت سے دوستوں سے بہتر ہے کہ جو حالتِ ثروت میں لوگوں کے پاس جمع ہوکر دوستی کا دم بھرا کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ لوگوں نے اس واسطے بازار میں بیٹھنا شروع کر دیا ہے کہ ان میں

سے بعض اس صحبت میں بیٹھ کر فانی ہو گئے ہیں۔

ایک روز یہ حکیم کسی راستے سے گذر رہا تھا کہ ایک مدہوش نے اس سے ازراہِ مذاق کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو بڑا حکیم سمجھتا ہے۔ حکیم انخرسیس نے اس کو دھکا دیکر کہا کہ کمبخت تو آج عالم جوانی میں دو چلو شراب کا متحمل نہیں ہوتا تو کل کو بڑھاپے میں پانی کا بوجھ کیونکر اٹھا سکیگا۔

حکیم انخرسیس اکثر قانون کو مکڑی کے جالے سے مثال دیا کرتا تھا۔ اور حکیم سولون پر ہنسا کرتا تھا کہ اس کے نزدیک وضع قانون سے انسان کی خواہشیں رک جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ برتن بنانے کے لئے کمہار کا چاک اسی حکیم کا نکالا ہوا ہے۔

اس حکیم نے ایک روز بتخانہ آفتاب کے کاہنہ سے جا کر پوچھا کہ آیا دنیا میں مجھ سے بھی کوئی بڑا حکیم ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں میزون شاہینی تم سے بھی بڑا حکیم ہے۔ اسکو سخت تعجب ہوا کہ میں نے اس کا کبھی نام بھی نہیں سنا۔ اور فوراً اس کی تلاش میں اس گاؤں میں پہنچا کہ جہاں یہ شخص بھاگ کر جا رہا تھا۔ دیکھا کہ میزون اپنی کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہے۔ حکیم انخرسیس نے اس سے کہا کہ اب کھیتی کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میزون نے کہا کہ بلکہ برعکس اس کے اب ہی تو کھیتی کرنے کا وقت ہے۔ اسی میزون کو افلاطون نے منجملہ حکما شمار کیا ہے۔ یہ ہمیشہ آدمیوں کی صحبت سے علیحدہ رہتا تھا۔ کیونکہ اس کو انسانوں سے بالطبع نفرت تھی۔ ایک دفعہ میزون ایک ویرانہ میں کھڑا ہوا دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ ایک شخص اتفاق سے وہاں سے گذرا اور پوچھنے لگا کہ تمہارے ہنسنے کا کیا باعث ہے۔ نہ یہاں کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد۔ کہا کہ یہی تو میری ہنسی کا سبب ہے۔

شاہ اکریسوس نے حکیم انخرسیس کا شہرہ سنکر بہت سا زر و مال اس کے پاس بھیجکر بلا بھیجا۔ انخرسیس نے یہ سب واپس بھیجدیا اور کہلا بھیجا کہ میں اس ملک میں

حصولِ اخلاق و زبان کے لئے آیا ہوں۔ سونے یا چاندی کا محتاج نہیں ہوں۔ جب میں عالمِ پیری میں اپنے وطن کو جاؤنگا تو مجھے نہایت لُطف و سرور حاصل ہوگا چلتے ہوئے میں تم سے بھی ملتا جاؤنگا۔ کیونکہ مجھے بھی تم جیسے شخص کی دوستی کی بڑی تمنا ہے۔

واپسی کے وقت حکیم انخرسیس کا گذر شہر قیربیک پر ہوا۔ اُس وقت اتفاقاً ایک بُت کی ماں کا عُرس تھا۔ حکیم نے بھی یہ دیکھکر اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر میں اپنے وطن بخیریت واپس پہنچ جاؤں تو ایسا ہی عُرس کیا کرونگا۔ وطن پہنچکر اُس نے ارادہ کیا کہ وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کی اصلاح کرے اور یونان کے قانون کو رواج دے۔ مگر کسی نے ایک نہ مانی۔ ایک روز خفیہ طور پر اُس نے اپنی نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وُہ عُرس کی رسوم ادا کر رہا تھا۔ کہ کسی شخص نے بادشاہ کو اطلاع دیدی۔ بادشاہ خود دوڑا آیا اور اس کو اس حال میں دیکھکر دُور سے تیر مار دیا جو کاری پڑا۔ جب رُوح نکلنے کے قریب ہُوئی تو اُس نے بآوازِ بلند کہا کہ مُلکِ یُونان نے جہاں میں لُغت و اخلاق کی تعلیم حاصل کرنے گیا تھا میری قدر کی۔ مگر میرے وطن نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔

انخرسیس کے مرنے کے بعد اس کی قدر ہُوئی اور لوگوں نے اسکی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس کا بُت بنایا +

(ترجمہ از عربی) محمد خلیل الرحمٰن

بلینک ورس

ذیل کا مضمون جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسہ عالیہ رامپور شارح "درۂ نادرہ" نے ارسال فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب کی تحقیق اور وسعت نظر قابل داد ہے :-

"فصیح الملک" میں ایک مضمون مولوی نجم الغنی صاحب کا میں نے دیکھا۔ جس کا عنوان "انشا پردازان اردو سے ایک اہم سوال" ہے۔ اس مضمون پر جناب احسن مارہروی نے ایک ایڈیٹوریل نوٹ بھی تحریر فرمایا ہے۔ پہلے ہم اس نوٹ کو کسیقدر مختصر کر کے درج کرتے ہیں۔ اور اس پر اپنی رائے ناقص کا اظہار کرینگے۔ بعدہٗ اصل مضمون کی نسبت جو کہنا ہوگا عرض کرینگے۔

(عبارت مختصر نوٹ)

جناب احسن تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک ہمارے دوست نے "ہماری شاعری کے لئے نیا میدان" کے عنوان سے اپریل ۱۹۰۹ء کے فصیح الملک میں۔ بلینک ورس کو نظم سمجھکر پیش کیا تھا۔ اور اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ اگر توسیع خیالات کے لئے اردو میں اس قسم کی نظمیں کہی جانے لگیں تو بہت فائدہ پہنچے"۔

جناب احسن نے اس مضمون پر جو رائے ظاہر کی تھی اُس میں ثابت کیا تھا کہ بلینک ورس انگریزی زبان کا نام ضرور ہے۔ مگر اس کا رواج انگریزی سے پہلے فارسی میں موجود ہے جسکو نثر مرجز کہتے ہیں۔

یہ بھی فرماتے ہیں :- "پہلے ہمارا خیال تھا کہ ایشیائی علوم کی ناواقفیت کے

سب سے اکثر انگریزی داں حضرات ایشیائی اصنافِ سخن کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ مگر اس مضمون کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شمس العلما مولانا حالی بھی یہی خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ نثر مرجز جسکو انگریزی میں بلینک ورس کہتے ہیں اک قسم نظم کی ہے۔

عام اس سے کہ بلینک ورس کا ترجمہ یا مقابل نثر مرجز ہو یا نہ ہوگا۔ انگریزی میں ضرور ایک قسم نظم کی ہے جس میں قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ زبانِ انگریزی میں بلینک کے معنے سادہ (یعنی معرّیٰ از قافیہ) اور ورس کے معنے نظم کے ہیں۔ چونکہ نظم انگریزی میں ایک چوتھی قسم گریمر کی ہے۔ اس لئے نحاۃ انگریزی تحت بیان پراسوڈی علم العروض گریمر میں قواعد نظم لکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر سی۔ نسفیلڈ صاحب بہادر نے بھی جو سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ کے ڈائرکٹر تھے۔ اپنی گریمر نمبر ۴ میں بلینک ورس کو تحت اقسام نظم لکھا ہے۔ اور ملٹن صاحب کی پیراڈائز لاسٹ سے اس کی مثال لکھی ہے۔ انگریزی میں بلینک ورس کے منجملہ اقسامِ نظم ہونے میں کلام نہیں۔ لہٰذا بلینک ورس کو انکا نظم سمجھنا بہت درست ہے۔ نوٹ کے بقیہ امور کی تحقیق کی نسبت آگے لکھونگا۔ طول و تکرار سے بچنے کے لئے یہاں ترک کرتا ہوں۔

مولوی نجم الغنی صاحب کا یہ فرمانا بہت درست ہے کہ نئی روشنی والے بموجب اَلنَّاسُ عَلیٰ دِیْنِ مُلُوکِھِمْ اندھا دھند تقلید انگریزی پر مٹے ہوئے ہیں۔ اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِرَ پر عمل بالکل نہیں۔

اسمیں بھی شک نہیں کہ فی زمانا جذبات اور نیچرل شاعری کی طرف طبیعتیں زیادہ مائل ہیں۔ مگر ہمارے اسلاف نے اس کام کو بھی باحسن وجوہ کر دکھایا ہے۔ چنانچہ جناب میر انیس صاحب نے اپنے مراثی میں صبح۔ شب۔ گرمی۔ بہار۔ صحرا اور بھائی بہن ماں بیٹے۔ دولہا دلہن کی گفتگوؤں میں۔ اور منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر نے اپنی مثنوی معراج المضامین میں تعریف صبح بنارس میں اور جناب میر نے اپنے گھر کی مذمت میں

کیا کیا نیچرل تصویریں کھینچی ہیں۔ اور غزل گوئی میں میرؔ۔ غالبؔ (صرف ایک رنگ کے اشعار میں) اور داغؔ نے کیا کیا جذباتِ عاشقی کو نظم فرمایا ہے۔ اُس کی کس مُنہ سے تعریف کیجائے۔ یہ کہنا انصاف کا خون کرنا ہے کہ ایشیائی شاعری پیشتر ان امُور سے خالی تھی۔ ہاں البتہ مغربی خیالات جواب اُردو کے سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہ پیشتر نہ تھے۔ کیونکہ اسوقت تک ہمارے اور اہلِ مغرب کے درمیان تبادلۂ خیالات کا اچھی طرح ذریعہ ہی حاصل نہ تھا۔ اور پھر لُطف یہ ہے کہ تقلیدِ فارسی ہزاروں قیوُد کے پابند رہکر اس وادیِ دشوار گذار کو بھی طے کیا ہے۔

"بلینک ورس کی خواہش اُردو میں بیجا ہے"

اوّل تو ایک بات جو ایک مُلک کے لوگ پسند کرتے ہوں۔ اُس کے پسند کرنے پر دُوسرے لوگ کیوں مجبُور کئے جائیں۔ ہمارے طبائع اُن سے ازرُوئے فطرت مختلف ہیں۔ جن چیزوں کو وہ حُسن سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک قبیح ہیں اور اُسی طرح بالعکس اِس کے۔ اِسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حُسن و قبح اشیا عقلی نہیں سوائے حسن صدق و قبح کذب کے بلکہ انتظامِ عالم اختلافِ طبائع ہی سے مرتُوط ہے۔ اگر اختلافِ طبائع نہ ہوتا تو تمام عالم کے انسان کچھ چیزیں اچھی پسند کرتے اور دُوسری چیزیں بوجہ ناپسند ہونے کے ترک کر دیتے جس سے وُہ صنائع معطّل رہتے اور ضروریاتِ عالم میں خلل واقع ہوتا۔ اِس اختلاف میں عجیب مصلحتِ باری ہے۔ اور ارتفاعِ اختلاف ممکن نہیں۔

جن اصُول اور خصُوصیاتِ مُلکی کے ساتھ یورپ والوں کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اُنمیں سے اکثر اصُول بوجہ اختلافِ طبائع ہماری طبیعتوں پر سخت گراں ہیں۔ چنانچہ اوزانِ انگریزی پر کیا منحصر ہے۔ بعض بحورِ عربیہ بھی ہماری طبیعتوں کو موزوں نہیں معلوم ہوتے۔ ایسے خواہشاتِ بیجا سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ ہم سے کہا جائیگا کہ وزنِ انگریزی پر اُردو

میں نظمیں کہی جایا کریں۔ جب خود فطرت نے ہر ملک کے امزجہ وطبائع و آب ہوا و اشیا و اشکال وغیرہ مختلف پیدا کئے ہیں۔ پھر ایک کی مرغوب چیزیں دوسروں کے پسند کیونکر ہو سکتی ہیں۔ ایسے امور کا ہم کو پابند کرنا گویا اصول نیچر کے خلاف ہم کو چلانا ہے۔

دوسرے یہ کہ زبان انگریزی کا قافیہ تنگ ہے۔ چنانچہ انگریزی میں سَن (آفتاب) بفتح اوّل کا قافیہ گوان (گیا) بروزن خوان۔ اور فیُر (اچھا) کا قافیہ آر (ہیں) اور پُٹ بضم (رکھنا) کا قافیہ نَٹ بالفتح (اخروٹ) اور لارڈ کا قافیہ ورڈ (لفظ) لاتے ہیں۔ ورڈس ورتھ اور لارڈ ٹینیسن اور ایمرسن اور لانگ فیلو کی نظمیں ملاحظہ ہوں۔ بوجہ ضرورت قافیہ۔ اِن میں سے بعض الفاظ کے تلفظ میں تغیر کیا جاتا ہے مگر نثر اور بول چال میں یہی تلفظ بتایا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ میں بہت سی مثالیں لکھتا مگر بخیالِ انقباضِ طبائع اردو دانان زیادہ مثالوں سے احتراز کیا۔ جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کے قوافی انگریزی میں کثیر الوقوع ہیں۔ پھر ایک اسٹینزے میں نہ تعداد مصاریع کا انتظام نہ قوافی کا کوئی بندوبست۔ انہیں وقوع انگریزوں کو نظم غیر مقفّی کہنے پر مجبور کیا۔ برخلاف ہماری زبان کے کہ ایک لفظ کے بکثرت قافیے موجود ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ہم نظم غیر مقفّی کہیں کسی بڑے سے بڑے۔ مضمون واقعہ۔ اور تاریخ کو ہم بہت آسانی کے ساتھ نظم کر سکتے ہیں اور ایسے طولانی مضامین کے لئے مثنوی اور مسدس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم ایشیائی لوگوں کی طبیعتوں کو بوجہ اُنس و عادت قدیم جو حظ کہ نظم مقفّی سے ہوتا ہے وہ نظم غیر مقفّٰے سے نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بلینک ورس کی طرف میلان نہیں ہے۔ کچھ نظمیں غیر مقفّٰے جو اُردو میں اب تک کہی گئیں۔ مرغوب طبع نہ ہونے سے اُنکو مقبولیت نہ حاصل ہوئی اور اُن کا کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے۔

سب سے زیادہ فائدہ نظمِ غیر مقفّٰی کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نظم میں وسعت اور سہولت ہوگی۔ جب قیدِ قافیہ ہم کو دقت میں نہیں ڈالتی ہے تو وسعت و سہولت ہی کیا ہوتی؟ بڑی بڑی ضخیم نظمیں ہونا دلیل عدم دشواری ہے؟ فارسی میں شاہنامہ - حملہ حیدری مرزا رفیع باذل - اور اُردو میں جلدہائے مراثی انیسؔ و دبیرؔ موجود ہیں - اگر سہولت بلینک ورس میں ہم تسلیم کرلیں تو سب سے زیادہ سہولت نثر میں ہے - اور یہ بلینک ورس سے بھی آسان ہے - کیونکہ نظمِ غیر مقفّٰی میں دقّتِ وزن پھر بھی رہتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ محض سہولت کوئی چیز نہیں بلکہ مرغوبِ طبع ہونا بھی ضروری ہے۔

باوجود قیود و پابندی جناب میر انیس نے وسیع میدان مرثیہ میں نیچرل شاعری کو ٹھیک موافق بول چال کے نظم کرکے دکھا دیا - چنانچہ مولوی حالی فرماتے ہیں - اگر فردوسی لکھنؤ میں ہوتا تو اُن کی تقلید کرتا - اور جناب اشہری فرماتے ہیں کہ مرثیہ اُن کی طرح کسی نے عربی و فارسی میں بھی نہیں کہا - پھر بتلائیے قید قافیہ کیا خرابی لاتی ہے۔

بہرطور پہلے بلینک ورس کی ضرورت اُردو میں ثابت کیجئے اور اُس کی ناگواری کو ہماری طبیعتوں سے دُور کرکے ہمیں اُس سے مانوس بنایا جائے - تو پھر ہم کو نظمِ غیر مقفّٰی کہنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے - نظم بلا قافیہ ہماری چیز نہیں ہے اگر اسوقت سے نام برآوردہ اشخاص نظم بلا قافیہ کہتے رہیں - بلا اس کے کہ اسی وقت سب کو متفق کرنے کی فکر کریں - تو آئندہ جب ہماری طبیعتیں اُس سے مانوس ہوگئیں اور ہمارا توحش دُور ہوگیا اور اُس کی خوبی ہماری سمجھ میں آگئی اور مقبولیتِ عام کا خلعت اُسکو ملگیا - اپنے آپ نظمِ غیر مقفّٰی کا رواج ہوجائیگا - اس وقت متفق بنانے کی کیوں فکر ہے - وقتِ ایجاد سب اُس سے موافق نہیں ہوا کرتے ہیں - آئندہ نسلوں کے مرغوبِ طبع اگر وہ ایجاد ہوتی ہے تو شائع

ہوجاتی ہے ورنہ نہیں۔

دیکھئے پیشتر عبارت مقفّٰی وپُرشوکت الفاظ کو لوگ بہت پسند کیا کرتے تھے مگر اُسی زمانہ میں جناب غالب مرحوم نے خطوط روزمرہ اُردو میں لکھنا شروع کئے وُہ بھی نہ بوجہ رغبتِ طبع بلکہ بمجبوری۔ چنانچہ خود اس رنگ کی عبارت کو بوجہ ضعفِ قوائے جسمانی لکھنا ارشاد فرماتے ہیں۔ مگر اب وُہی رنگ عام پسند ہوگیا اور اس طرح کی عبارت کو حسن سمجھا جاتا ہے۔

بلینک ورس و نثر مرجز

بلینک ورس کا مترادف نثر مرجز کو جناب شمس العلما مولانا حالی وجناب احسن ومولوی نجم الغنی صاحب تینوں اصحاب سمجھتے ہیں۔ اور وزنِ بحور کا ہونا بھی نثر مرجز میں تینوں بزرگوار تجویز فرماتے ہیں۔ مگر مولانا حالی صاحب اس کو از قسم نظم شمار کرتے ہیں اور باقی دونوں صاحب منجملہ اقسامِ نثر۔

اِن تینوں بزرگوں نے جو تعریف کہ نثر مرجز کی تسلیم کی ہے مجھے اُس سے اختلاف ہے۔ اِس وجہ سے بلینک ورس اور نثر مرجز میرے نزدیک ہم معنی الفاظ نہیں۔ کیونکہ بلینک ورس کا انگریزی میں از قسم نظم ہونا میں ثابت کرچکا ہوں اور نثر مرجز از قسم نثر ہے۔ پس اُس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ کلام کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک نظم اور دُوسرے نثر۔ جو کلام نظم ہے وہ نثر نہیں ہوسکتا اور جو کلام کہ نثر ہے وُہ نظم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ دونوں دو متقابل چیزیں ہیں۔ نظم میں وزنِ بحور معتبر ہے اور نثر میں نہیں۔ لہٰذا جس کلام میں بحور ہوگا عام اس کے کہ اُس میں قافیہ ہو یا نہ ہو وُہ نثر نہیں کہا جاسکتا۔ مرجز کو نثر کہنا اور اُسکو از قسم نثر گننا خود دلیل اس امر کی ہے کہ اس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئے ورنہ نثر کہنے کے کیا معنے ہونگے۔ اگر نظم و نثر میں فرق وزنِ بحور نہیں ہے تو ان دو نوں میں

مابہ الامتیاز پھر کونسی شے ہی۔ کیونکہ قافیہ تو نثر میں بھی ہوتا ہے۔

میرے نزدیک جو لوگ کہ تعریف نثر مرجز میں وزن سے مراد وزن بحر لیتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں وزن عروضی مراد ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق یمنی مقدمات ظہوری میں تعریف نثر مرجز یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"در اصطلاح اہل انشا مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد و سجع ندارد۔ ہمچوں۔ عزیزا! صرف اوقات بے فکر واہب کارساز۔ و خرچ انفاس بجز ذکر قادر کردگار حضرت تمام خسر کمال دارد"۔

اور فرہنگ اندراج میں لکھا ہے:۔

"مرجز بزائے معجمہ کمعظم نوعے از شعر۔ و باصطلاح اہل انشا قسمے از اقسام نثر کہ مرجز و مسجع و عاری است۔ پس مرجز نثرے باشد کہ کلمات فقرتین اکثر جا ہمہ ہموزن باشند و متقابل یکدیگر بدون عاتر سجع۔ مثال "خیال ناظم بے تعلق قامت دلربائے ناموزونست و قیاس ناثر بے تمسک کاکل مومیائی نامربوط"۔

اور یہی مسلک مصنفین غیاث و انشاء فیض رسان و احسن القواعد کا ہی۔ دیکھئے صرف و خرچ اوقات و انفاس۔ بے و بجز۔ فکر و ذکر۔ واہب و قادر۔ و کارساز و کردگار اور اسی طرح دوسری مثال میں الفاظ متقابلہ فقرتین میں وزن عروضی ہے اور قافیہ نہیں ہی اور فقرات اسکے موزون بھی نہیں ہیں۔

تعریف فرہنگ اندراج میں نوعے از شعر سے مراد یہ نہیں ہے کہ نثر مرجز میں وزن بحر ہوتا ہے بلکہ لفظ مرجز بلا قید لفظ نثر کی نسبت کہتے ہیں کہ جو شعر بحر رجز میں ہو اسکو مرجز کہتے ہیں۔ اور یہ معنی لغوی و وضعی بتاتے ہیں۔ بعدہٗ معنی اصطلاحی نثر مرجز کو منجملہ اقسام بتاکر اور لفظ فقرتین لاکر اور مثال کلام منثور سے دیکر واضح

کردیا کہ نثر مرجز نثر ہے اور اس میں وزنِ بحور نہیں ہوتا ہے۔ نثر و نظم دونوں کا وجود ایک ہی عبارت میں متعاممکن نہیں۔ کیونکہ وزن ہی شعر کو نثر سے جدا کرتا ہے۔

شعر کی تعریف میں قید مقفیٰ اور نثر مرجز کی تعریف میں قید وزن نے بہتوں کو دھوکے میں ڈالدیا ہے۔ جسکی وجہ سے تجویز وزن بحور بھی کرتے ہیں اور نثر بھی سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انشاپردازانِ اُردو نے نظم بلا قافیہ کہی یہانتک کوئی مضایقہ نہیں لیکن اسکو نثر مرجز سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اُس پر طرہ یہ کیا کہ تقابل میں الفاظ فقرتین کے ہموزن بوزن عروضی لانے کو بھی ترک کردیا جس کے بغیر نثر مرجز ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

کوئی اُن سے پُوچھے کہ تعریفِ نثر مرجز میں کلمات فقرتین کے بتقابل ہموزن ہونے کے معنے کیا ہیں۔ اوّل تو لفظِ کلمات لانیکی کیا ضرورت تھی دُوسرے اگر وزن سے مراد وزنِ بحور ہے تو تقابل میں ہموزن کیوں کہا۔ اِس لئے کہ شعر کا دُوسرا مصرع متقابل پہلے مصرع کے ہموزن ہی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ پہلے مصرع سے دُوسرے مصرع کا وزن مختلف ہو۔

تینوں صاحبوں کی تعریفِ مسلمہ نثر مرجز سے علاوہ مطالع کے (کیونکہ مطالع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے) ہر شعر غزل۔ قصیدہ اور قطعہ کا نثر مرجز ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اور غزل و قصیدہ و قطعہ منجملہ اقسامِ نظم ہیں پس ایک ہی وقت میں نظم بھی ہُوئے اور نثر بھی۔ اور یہ محال ہے۔

جناب مولوی نجم الغنی صاحب تو نثر مرجز میں وزنِ بحور مانتے ہیں اور فقرتین متقابلتین کا ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی تعریف سے جب تقابل بھی نہ رہا تو پھر ہم صنف نظم کو بلحاظ ہر مصرع نثر مرجز کہنے کے مستحق ہیں اور انہوں نے خود بھی آیات کے ایک ایک مصرع لکھے ہیں اور انکو نثر مرجز فرمایا ہے۔

جب تعریف نثر مرجز میں آپ نے فرمایا کہ ہر فقرہ وزن رکھتا ہو اور قافیہ نہو اور

متقابلہ غیر ضروری ٹھہرا تو قافیہ ہونے یا نہ ہونے کا لحاظ کس چیز سے کیا جائیگا - اور تعریف نثر مرجز میں قید قافیہ نہ ہونے کی بیکار ہو جائیگی -

تعریف شعر

اب رہا یہ امر کہ قید قافیہ حد شعر میں جیسا کہ بعض اساتذۂ عروض نے تعریف شعر لکھی ہے - آیا تحقق نفس شعر میں قافیہ شرط ہے یا نہیں - اس بارہ میں محققین فن عروض کی یہی رائے ہے کہ تحقق نفس شعر قافیہ پر مبنی نہیں - بلکہ وُہ ایک امر عارضی ہے - ورنہ تعریف شعر ناقص ہوگی - کیونکہ فرد پر جو منجملہ اقسام شعر ہے صادق نہ آئیگی اور تعریف کو جامع و مانع ہونا چاہیے

محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں شعر کی تعریف کلام موزون مخیل فرمائی ہے اور قافیہ کو داخل حد شعر نہیں مانا ہے - اور سکاکی نے بھی اسی قول کو مفتاح العروض میں ترجیح دی ہے - ان محققین کے قول سے ہر وُہ کلام کہ جس میں وزن بحور پایا جاتا ہو اور قافیہ چاہے ہو یا نہ ہو نظم ہی ہے - اس تعریف سے بلینک ورس یا نظم غیر مقفی داخل نظم ہے - مگر نثر مرجز کہ جس میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے داخل نظم نہیں ہو سکتی پس یہ ارشاد جناب حالی کا کہ بلینک ورس یا نظم غیر مقفی داخل نظم ہے بہت درست ہے مگر تعبیر بلینک ورس کی نثر مرجز کے ساتھ صحیح نہیں -

"سجع موازنہ"

اگر الفاظ متقابلہ ہموزن بر وزن عروضی میں وزن بحور بھی پایا جائے تو اُسے سجع موازنہ کہتے ہیں - چنانچہ سکاکی تلخیص المفتاح میں اور میر شمس الدین فقیر دہلوی حدائق البلاغت میں یُوں ارشاد فرماتے ہیں - کہ کل الفاظ دو فقرہ نثر یا دو مصرع نظم کے بر سبیل تقابل وزن میں متحد اور روی میں مختلف لانے کو سجع موازنہ کہتے ہیں اور یہ بمنزلہ ترصیع ہے - سجع متوازی میں (یہاں بھی اتحاد وزن سے مراد وزن عروضی ہے - ورنہ ایک شعر کے دو مصرعوں میں متحد الوزن کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ

ایک شعر کے دونوں مصرعے موزون ہی ہوا کرتے ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید فرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اور نظم میں یہ شعر حسان العجم خاقانی کا ہے

رشکِ نظمِ من خورد حسانِ ثابت را جگر   دستِ نثرِ من زند سحبانِ وائل را قفا

رشک کے مقابل میں دست اور نظم و نثر۔ خورد و زند۔ حسان و سحبان۔ ثابت و وائل۔ جگر و قفا باہمدگر وزنِ عروضی رکھتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہیں اور آیت میں بھی یہی صورت ہے۔ پس نثر مرجز اور سجع موازنہ میں نسبت عموم خصوص من وجہ ہے۔ کیونکہ سجع موازنہ نثر اور نظم دونوں میں پائی جاتی ہے اور مرجز صرف نثر میں۔ میرے نزدیک مرجز کو نثر کہنا اور پھر اسے نظم سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے۔ نثر کا نظم نہ ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔ کیونکہ میں نے اوپر ثابت کر دیا ہے کہ نثر مرجز بایں حیثیت کہ قسم نثر ہے اس میں وزنِ بحور نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ قافیہ کے بغیر بھی وجود شعر پایا جاتا ہے۔ اور قافیہ شعر کے لئے ایک امر عارضی ہے۔ نظم و نثر میں شے مابہ الامتیاز سوائے وزن بحور کوئی دوسری چیز نہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ بادلّہ و براہین میں نے اس امر کو ثابت کر دیا کہ کلام موزون غیر مقفّیٰ داخلِ نظم ہے اور نثر مرجز سے خارج ہے۔

بیشک ورس اور نظمِ غیر مقفّیٰ ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر بلینک ورس کا مترادف نہ سجع موازنہ ہے اور نہ نثر مرجز۔ سجع موازنہ میں کلماتِ متقابلہ کا ہموزن بروزنِ عروضی ہونا شرط ہے اور وزنِ بحور بھی پایا جاتا ہے اور بلینک ورس میں صرف وزن بحور ہوتا ہے اور نثر مرجز میں تقابل اور وزن شرط ہے اور وزن بحور ندارد۔ پس نثر مرجز اور بلینک ورس میں بڑا فرق ہے۔ اس سے تو سجع موازنہ ہی قریب ہے۔

جب میں یہاں تک لکھ چکا تو چہار شربت عزرائیل کی ملکی اُنہوں نے یہ تعریف

اور مثال لکھی ہے۔

مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود۔ اما فقرہ اولےٰ با فقرہ ثانی مساوی الوزن

باشد۔ مثال چشم کوکب مشتاق فیض از جمالِ پاک آں اختر لشکر است۔

دست دولت محتاج خیر از عطائے عام آں دارا حشمت است۔

یہی وزن سے مراد وزنِ عروضی لیتے ہیں۔ اور مثال نثر ہی لکھی ہے۔ امثلہ نثر مرجز کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وزن سے مراد۔ وزنِ حرفی مگر سجع موازنہ کی مثال میں جو شعر کہ خاقانی کا لایا گیا ہے۔ اس میں جگر کے مقابل وہموزن قفا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن عروضی معتبر ہے۔ خواہ وُہ وزن عروضی ہوتا ہو۔ یا وزنِ حرفی۔ نثر مرجز میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے۔

(باقی دارد)

شرح تعزیراتِ ہند۔ مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل لاہور نے ایک بڑے کام کا تہیّہ کیا ہے۔ جس میں امید ہے کہ وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرینگے۔ تعزیراتِ ہند کی ایک ضخیم شرح اُردو میں وُہ لکھ رہے ہیں۔ جو بارہ حصوں میں شایع ہوگی اور جس کا ہر حصہ ایک سو بیس صفحہ سے کم نہ ہوگا۔ پہلا حصہ دسمبر ۱۹۱۰ء میں چھپا ہے اور اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ باقی حصص یکے بعد دگرے جلد جلد شائع ہوتے رہینگے۔ یہ کتاب باعتبار لکھائی چھپائی کے بہت اچھی چھپی ہے۔ اس کی قیمت فی حصہ ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ اور یہ وہی تدبیر ہے جس سے انگریزی میں لکھی ہوئی قانونی کتابیں عموماً بیچی جاتی ہیں۔ تاکہ یکمشت قیمت کا بوجھ خریداروں پر نہ پڑے۔ جہاں تک حصہ اول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ شرح باعتبار مطالب کے مفید ہے اور اس میں تمام ضروری فیصلے عدالتہائے عالیہ کے دیئے گئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ قانون پیشہ لوگوں کے لئے بہت کارآمد ہے اور دیگر شائقین بھی اس سے معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ قانون پیشہ اصحاب مرزا صاحب کی اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کی حوصلہ افزائی کرینگے ✦

ٹرکی کی مسلمان عورتیں

ریورنڈ کینن سیل صاحب ڈی - ڈی کا یہ مضمون ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ "انڈین ریویو" میں پہلی دفعہ شائع ہوا تھا - اس کے بعد اکثر انگریزی پرچوں مثلاً "دی انڈین سوشل رفارمر" وغیرہ نے اسکو نقل کیا - میں نے اسی زمانہ میں ان حضرات کی دلچسپی کے لئے جو انگریزی سے ناواقف ہیں اس کا ترجمہ کیا تھا مگر اس وقت تک اس کے شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی - اب ناظرین مخزن کی خدمت میں حاضر ہے -

جن لوگوں نے ٹرکی اور ہندوستان دونوں ممالک کی سیاحت کی ہے - وُہ ہندوستان کے مقابلہ میں ترکی مسلمان عورتوں کی آزادی دیکھکر سخت متحیر ہوتے ہیں - وہاں کی عورتیں ہندوستان کی طرح مدت العمر زنانہ کی چار دیواری میں محدود نہیں ہوتیں اور نہ دُنیاوی زندگی اور مناظرِ قدرت کے دیکھنے سے محروم - ٹرکی میں مُسلمان عورتیں سب مُسلمان عورتوں کی طرح بڑے بڑے شخصی اور قانونی حقوق رکھتی ہیں - بحیثیت بیوی کے مُسلمان عورت اپنی جائداد پر بلا شرکتِ غیرے قابض رہتی ہے اور اپنی املاک پر آزادانہ اختیارات رکھتی ہے - بلا شوہر کی شراکت و امداد کے وُہ مُدعی یا مدعی علیہ بن سکتی ہے - وُہ جائداد کی وارث ہوسکتی ہے اور اپنی پرورش اور نان و نفقہ کے مناسب انتظام کے مطالبہ کا اپنے شوہر پر پورا حق رکھتی ہے - اسی طرح اور بہت سی باتوں میں بلحاظ قانونی حقوق کے وُہ دُوسری اقوام کی عورتوں پر فوقیت رکھتی ہیں - لیکن باوجود ان آسانیوں کے اِن عورتوں کی مجموعی حالت نظامِ تمدن پر ایک بدنما داغ ہے - اس کے اسباب کوئی ناقابلِ علاج نہیں ہیں - حرم کی پابندیاں اور زنانہ کی سختیاں کسی شرعی تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم و رواج اور تعصب و بدگمانیوں کی بدولت ہیں - لہٰذا ضرورت

ہے کہ سمجھدار اور باخبر ترک بہت جلد اُس کی اصلاح پر کمر باندھیں اور ترقی کے دلدادہ مسلمان دوسرے مقامات پر بھی اس ضروری تغیر و تبدل سے غافل نہ رہیں۔

ترکوں میں مانوگیمی یعنی وحدت الازدواج کا عام قاعدہ ہے۔ اُمرا میں صرف چند ہی ایسے ہیں جنہوں نے اپنی پہلی بیوی پر دوسری اور تیسری یا چوتھی بیوی کا اضافہ کیا ہو۔ طلاق اگرچہ چنداں ناممکن الحصول نہیں تاہم بہت ہی کم رائج ہے۔

متموّل لوگوں کے مکانات دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ یعنی (۱) سلاملق مردانہ اور (۲) حرم یا زنانہ۔ حرم عموماً عمارت کا نہایت پاکیزہ اور بہت آرام دہ حصّہ ہوتا ہے۔ وہاں صرف وہ مرد جا سکتے ہیں جو عورتوں سے کوئی رشتہ رکھتے ہوں جیسے باپ بیٹے۔ بھائی۔ خسر وغیرہ۔ اس قاعدہ کی کوئی بہت سختی کے ساتھ پابندی نہیں کیجاتی اور خصوصاً نوجوان ترک جماعت (ینگ ٹرکش پارٹی) کے اراکین میں جو ٹرکی کے اعلیٰ تعلیم و ترقی یافتہ مسلمان ہیں۔ بہت دور کے عزیزوں اور بلکہ شوہر کے ذاتی دوستوں کو بھی گھر کی خواتین کی سوسائٹی میں شریک ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ٹرکی کی عورتیں بڑی مہربان مائیں ہوتی ہیں۔ محبّت و اُلفتِ مادری ان میں بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اکثر اپنے بچّوں کے ساتھ بیجا نازبرداریوں اور لاڈ اور پیار کی بھی عادی ہوتی ہیں۔ اسی طرح لڑکے اپنی ماں کے ساتھ بیحد محبت کرتے ہیں اور اپنی ماؤں کے بڑے ہی دلدادہ ہوتے ہیں۔ انکے اس طرزِ عمل کی اصلی محرک پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث ہے اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِكُمْ یعنی بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

جب کوئی ماں اپنے شادی شدہ فرزند کے ساتھ رہتی ہے تو گھر پر اسی کی حکومت ہوتی ہے۔ بہو کا درجہ بالکل ماتحتانہ ہوتا ہے اور اس کے رسم و رواج کے سانچے میں

ڈھلی ہوئی پابندیاں بڑی ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اِن مصائب کو وُہ بیچاری صرف اس دلخوش کن خیال میں برداشت کرجاتی ہے کہ آخر ایک روز اُسے بھی اپنی بہو پر یہی فرمانروایانہ اقتدار حاصل ہونگے۔ آئے دن کے دُکھ اور تکلیفوں میں محض آیندہ کی خوشگوار اُمیدیں اسکے لئے بہت کچھ تسلی و دلاسا کا باعث ہوتی ہیں۔

تُرکوں کی خانگی زندگی میں لونڈیوں کی کثرت ایک بہت بڑا نقص ہے۔ شرعی لحاظ سے غلامی کے لئے اسیران جنگ کا ہونا شرط ہے۔ قسطنطنیہ میں بردہ فروشی کی دُکانیں بند کرادی گئی ہیں۔ اور عام طور پر اس کی قطعی ممانعت ہوگئی ہے۔ لیکن خفیہ طور پر ابھی اس کا رواج باقی ہے۔ چھ سے دس سال تک کی عُمر کے بچے خریدے جاتے ہیں۔ جن میں کچھ بھی استعداد و قابلیت کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ انکی بڑی ہی خدمت ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تربیت سے ان کو بہت باکمال اور شائستہ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ ان کے طرز و انداز میں دلکشی اور دلفریبی پیدا کرائی جاتی ہے۔ غرض انہیں ہر طرح اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے اس قسم کی لڑکیاں بڑی بڑی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بہت غیر معمُولی خوبصُورت اور نہایت حسین لڑکی ہو تو سلطان کے حضور میں پیش کی جاتی ہے۔ سُلطان بھی اگر اپنے افسران اعلیٰ میں سے کسی کو اس عزت افزائی سے مفتخر فرمانا چاہیں تو حرم سرا میں سے کوئی کنیز مرحمت فرماتے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنے لڑکے کی شادی کسی ایسی لڑکی سے جو اس کی ہمپایہ ہو کرنے کے کثیر اخراجات نہ برداشت کرسکتا ہو تو وُہ اپنے فرزند کے لئے ایک کنیزک جو کسی متموّل خاندان کے زیر تربیت رہی ہو خریدتا ہے۔ اس کی اولاد جائز تصور کیجاتی ہے اور اولاد ہوجانے کے بعد وُہ بیچی نہیں جاسکتی۔ اکثر اوقات وُہ آزاد کردی جاتی ہے۔ اور اس سے شادی کرلی جاتی ہے۔ وُہ اُس وقت آزاد ترکی عورتوں کی ہم رُتبہ بنجاتی ہے اور اس کے تمام شخصی حقوق قائم ہوجاتے

ہیں۔ اکثر دفعہ انکی قسمت زوردار ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس طرح کی خانگی غلامی کا معاشرت پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور عورت ذات کو اس کے حقیقی درجہ اور اصلی منزلت سے گھٹا دیتا ہے۔

حرم کی چپ چاپ زندگی میں سب سے بڑی ہلچل اس وقت واقع ہوتی ہے جب کسی لڑکے کی شادی کا وقت قریب آتا ہے اور اُس کے لئے ایک پسندیدہ لڑکی کی فکر ہوتی ہے۔ اگر ماں کی نظر میں رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کے زمرہ میں کوئی موزوں دُلہن نہ نکلے تو آخر کار دُوسری جگہ اس کی تلاش کی ضرورت ہوتی ہے۔ مختلف طریقوں سے اس کے پاس ایسی ناکتخدا لڑکیوں کے نام پیش ہوتے ہیں جو اس کے لڑکے کی بیوی بننے کے لایق ہوں۔ پھر وُہ کسی پیشہ ور مشاطہ کو ہمراہ لیکر ان لڑکیوں کے مکانات پر جاتی ہے۔ ہر جگہ صاحب خانہ بڑے ہی آؤ بھگت کے ساتھ حرم کے خاص ملاقاتی کمرہ میں اس سے ملتی ہے۔ اس کے بعد لڑکی بہت عُمدہ پوشاک زیب بدن کرکے اور خوب بناؤ سنگار کرکے وہاں آتی ہے۔ اِن نئے مہمانوں سے باادب ملتی ہے اور قہوہ سے اِن سب کی تواضع کرتی ہے۔ اپنے آپ کو ایک پسندیدہ۔ خوش اسلوب اور دلکش انداز میں بتلانے کے بعد وُہ چلی جاتی ہے۔ نئے ملاقاتی ماں سے اس کی لڑکی کی بڑے ہی مبالغہ کے ساتھ تعریف کرکے رخصت ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام لڑکیوں کے مکانات کو جانے اور ان سبھوں کو دیکھ چکنے کے بعد ان کے حُسن و قبح۔ ان کے صفات اور انکی دلفریبیوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ اس پر بحث ہوتی ہے اور آخر کار باتفاق رائے ایک لڑکی کی نسبت رائے قائم کی جاتی ہے۔ ضروری بات چیت اور قول و قرار کے بعد کسی مناسب وقت پر شادی ہو جاتی ہے۔

روزانہ زندگی کی یکسانیت میں دُوسرا تغیر حمام کو جانا ہے۔ حمام فی الاصل ایک طرح

کا عورتوں کا کلب ہے جہاں نئی نئی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ دُنیا کی خبریں معلوم ہوتی ہیں اور اِدھر اُدھر کی غپ شپ میں بہت خوش گوار طریقہ سے وقت گذارا جاتا ہے۔ بعض خانگی مراسم سے وابستہ چند مذہبی غسل ہیں جو عموماً حمام میں کئے جاتے ہیں۔ وہاں کی خواتین کا عام قاعدہ ہے کہ دوستوں کے زمرہ میں بڑی ہی مسرت و شادمانی کے ساتھ اکثر دِن دِن بھر حمام میں گذارتی ہیں۔ شوہر کی اجازت سے عورتیں ہَوا خوری یا خرید فروخت کے لئے باہر جا سکتی ہیں۔ نواحِ قسطنطنیہ میں باسفورس کے کنارے۔ بعض مقامات ایسے دلکش۔ خوشنما۔ پُرلطف اور دلآویز ہیں۔ اور شہر کے قریب بعض ایسے خاموش، پُرفضا سبزہ زار اور زندگی بخش تفرج گاہ ہیں۔ جنکو عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ ان جگہوں پر ایک روز بسر کرنا بڑے ہی لُطف و شادمانی کا باعث ہوتا ہے۔ سودا سوال لینا بھی ایک طرح کی تفریح ہے۔ امیروں میں یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ حبشی خواجہ سرا ہمیشہ بحیثیت ملازم خاص اور محافظ کے بیگمات کے ہمراہ رہتے ہیں۔ سلطانی حرم کی بیگمات کے ہمراہ رکاب اسی طرح کے خواجہ سرا بہت زرق برق وردیوں میں ہمیشہ ہوتے ہیں۔ جو خواتین اس طرح باہر نکلتی ہیں وہ ایک ریشمی اوڑھنی اور ایک باریک گاج کا نقاب استعمال کرتی ہیں[1]۔ یا جیسا کہ آجکل بہت زیادہ رواج ہے۔ ایک "چارشف" ہوتا ہے۔ اس کے دو ریشمی دامن ہوتے ہیں۔ ان میں سے چھوٹے کو سر پر ڈال کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ لیا جاتا ہے۔ ریشم یا ململ کا ایک مربع ٹکڑا چہرہ پر آویزاں رہتا ہے۔ جس سے صورت چھپ جاتی ہے۔ بعض اوقات اسے پیچھے کی طرف بھی ڈال لیا جاتا ہے۔

حرمِ سلطانی میں کئی سو عورتیں ہیں۔ خاص قوانین و قواعد کے مطابق

---

[1] دستوری حکومت کے بعد سے یہ رسم بھی اٹھا دی گئی۔ ترکی مسلمان خواتین اب بلا کسی نقاب کے باہر نکلتی ہیں۔ (مترجم)

وہاں کاروبار چلتے ہیں۔ فرمانروا سلطان کی والدہ جو والدہ سلطانہ کہلاتی ہے ہر حرم کی سردار ہوتی ہے۔ حرم کے اندر رہنے والوں پر یہ پوری حکومت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ولیعہد کی بیوی کا درجہ ہے۔ ہر خاص خاتون کے لئے اس کے علیحدہ ملازم اور اس کا علیحدہ حصّہ مکان ہوتا ہے۔ والدہ سلطانہ کو نئے حکمران کے تخت نشین ہونے پر اس کی والدہ کو اپنی خدمت سپرد کردینی پڑتی ہے۔ اسی طرح پچھلے فرمانروا کی تمام خواتین نئے حکمران کی خاتونوں کو اپنی جگہ دیتی ہیں۔

والدہ سلطانہ کو اس کی بھاری خدمتوں میں بارہ خواتین سے مدد ملتی ہے۔ ان کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ حرم سرا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے دوسروں کی تربیت کریں۔ یہ اکثر کنیزیں ہوتی ہیں جو بالکل کمسنی میں خرید لی جاتی ہیں۔ خود مددگار عورتیں بھی عموماً وہ کنیزیں ہوتی ہیں جو سلطان کی توجہ اپنی طرف معطوف نہ کرا سکی ہوں۔ اور جنہیں اب باہر شادی کرنے کی قطعی امید نہیں۔ مناسب پاسبانوں کی محافظت میں یہ عورتیں سیر و تفریح کے لئے باہر نکلتی ہیں۔ درگاہوں وغیرہ کی زیارت کرتی ہیں۔ بہرکیف ان کی زندگی بہت یکساں طریقہ سے بسر ہوتی ہے۔ اور اس میں ان کی دماغی ترقی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ جو وقت باہر جانے یا خانگی کاروبار میں صرف نہیں ہوتا۔ وہ بالکل اپنے لباس و زیورات کی دیکھ بھال اور اسی طرح کی دوسری ادنیٰ اور فضول باتوں میں گذرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر درجہ کی عورتوں میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ پچھلے دنوں اگرچہ لڑکیوں کے مدارس کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا لیکن اس سے چنداں فائدہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ لڑکیوں کو جلد مدرسے اٹھا لینے کے باعث انکی تعلیم بہت ناقص رہجاتی ہے۔

ٹرکی کی خانہ بدوش اقوام کی مسلمان عورتیں جیسے کہ کرد ہیں زیادہ آزاد زندگی گذارتی ہیں۔ وہ بڑی شہسوار ہوتی ہیں اور بڑی بڑی مہموں میں اپنے شوہروں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ وہ نہایت محنتی۔ مستعد اور چالاک ہوتی ہیں۔ اپنے خاندان اور اپنے قبیلہ کے معاشرتی اور سیاسی امور میں بہت کچھ حصہ لیتی ہیں۔ وہ کسی طرح کا نقاب وغیرہ نہیں استعمال کرتیں لیکن سفر کے وقت اپنے چہرہ کے کچھ ضروری حصہ پر کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ وہ دوسری مسلمان عورتوں کی نسبت بہت زیادہ آزادی سے متمتع ہوتی ہیں اور بیرونی دنیا کو بہت کچھ دیکھتی بھالتی ہیں۔ لیکن اس سے کوئی برا اثر ان میں نہیں پیدا ہوا۔ بلکہ بخلاف اس کے ان کی کھلی ہوئی کاروباری زندگی نے ان میں خود داری کا بہت بڑا مادہ پیدا کر دیا ہے اور ان میں اخلاق کا ایک بہت اعلیٰ معیار قائم ہو گیا ہے۔ انہیں جو کچھ آزادی حاصل ہے اسے وہ نہایت عقلمندی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اور انکے اطوار و خصائل اور انکی چال چلن میں بہ نسبت دوسروں کے بہت کچھ درستگی۔ دانشمندی اور شائستگی ہے۔ بزرگترین اسلامی ملک کی مسلمان عورتوں کے متذکرہ بالا کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی حالت میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔ تاہم وہ ہندوستان کی مسلمان عورتوں سے بدرجہا اچھی حالت میں ہیں۔ اس بارے میں بہت ہوشیاری اور خبرداری کے ساتھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر "بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے" تو پھر کس قدر ضروری اور اہم بات ہے کہ ماں جسمانی لحاظ سے مضبوط و قوی۔ دماغی لحاظ سے ذی ہوش۔ سنجیدہ اور فہیم۔ اپنے گھر اور خاندان کے انتظام میں ہوشیار اور کافی دستگاہ رکھنے والی ہو۔ اس کے دماغی حدود بہت وسیع کئے جانے چاہئیں۔

سید خورشید علی (حیدرآباد۔ دکن)

لکھنؤ کا شاہی زمانہ

شاہی زمانہ کچھ اسی لحاظ سے قابلِ قدر نہ تھا کہ اس کے دور میں غلّے کی ارزانی بارش کی فراوانی پیداوار کی کثرت اور شاہی فیاضیوں سے لوگ خوشحال اور فارغبال تھے کیونکہ ایک لحاظ سے اگر خیال کیجئے تو روزمرّہ کی فوجداریاں اور بانکوں کی تیغ زنی شہزوروں کی ڈاکہ زنی مارپیٹ دھینگا مُشتی نوچ کھسوٹ ذرا ذرا سی بات پر خون کی ندیاں بہانا چوریاں ڈاکہ زنی چھاپے مارنا گرہ کاٹ لینا گھر لوٹ لینا دن دہاڑے لپاڈگی یہ سب خرابیاں ایسی تھیں جنکا ذکر سنکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر محکمۂ عدالت کی بدعنوانیاں مقدمے کی سماعت نہ ہونا سفارشوں کا لحاظ کرنا پولیس کی بے وقعتی اور سونے میں سہاگہ تھی۔

گلباز خاں شاہی چور جو ہمیشہ اپنی بدکرداریوں سے جیل خانے میں رہا کرتا تھا۔ اور آخر کو اس کی شناخت کے لئے شاہی حکم سے اس کے دونوں گال میں پیتل کے داغ دیئے گئے تھے مگر اللہ رے چوری اور سینہ زوری ایسی دھاک بندھی ہوئی تھی کہ جس مہاجن سے کہلا بھیجا کہ ہم کو دس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے ہاتھ باندھکر روپیہ حاضر کردیا اور جو کچھ چین چپڑ کی پہلو بدلے ناک بھوں چڑھائی دون کی لی روپیہ تو اسوقت تیار نہیں ہے کل منیب جی آلیں تو لے لینا آج جنم اشٹمی ہے۔ دو چار ہنڈیاں سکارنا ہیں ابھی اننت چودس تک تو ہم روپیہ نہیں دے سکتے۔ بڑے لالہ تیرتھ گئے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ شاہ جی کی شامت آگئی۔ بیٹھے بٹھائے عذاب مول لیا۔ رات کو دندناتے ہوئے آدھمکے۔ نہ کہیں پولیس ہے نہ روندہے۔ شاہ جی کے ہاتھ پاؤں کھٹیا سے باندھ دیئے اور ترول چھاتی پر رکھدیا اور گرمای ہوئی دھن دولت پوچھ پوچھ کر کھود کھاد کر باندھ لی اور

چمپت ہوئے۔ مزے ہونے لگے۔ کچھ یار دوستوں میں بانٹی کچھ محلّے کے غریب غربا کو دی کنیا کی شادی کرادی۔ اگرچہ حرام کی کمائی تھی لیکن اس کا مصرف نیک کاموں میں ہوا۔

گلباز کو لوگ میر صاحب میر صاحب کہتے تھے محلّے بھر کے لوگ اُن سے خوش جس محلّے میں یہ رہے۔ کبھی کسی پسنہاری کے یہاں بھی ایک جھاڑو کی چوری نہ ہوئی تھی۔

اپنے کمال میں ایسے فرد تھے کہ جو منزلے پر چشم زدن میں چڑھ جانا انکے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میر صاحب سے اُنکے دوست نے پوچھا کہ آجتک تمہارا کسی بہادر سے بھی سامنا ہوا ہے۔ کہنے لگے جان ایسی بُری ہے کہ تلوار کی آنچ کے سامنے لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑے بڑے سورما وقت پر دبک جاتے ہیں لیکن اس بارے میں ہم ایک عورت ذات کی بہادری کا ذکر نہ کرنا حق پوشی سمجھتے ہیں جس نے ہم ایسے دس بہادروں کو زیر کرلیا تھا۔

محمد علی شاہ کا زمانہ تھا ہمارا آغاز شباب اور ہمارے ساتھ دس شاگرد پیشہ جیدار سورما سپہگری کے فن میں ہوشیار ہوقت ہماری نگہ میں آدمی کی وقعت ایک مچھر سے زیادہ نہ تھی۔ ایک روز خبر ملی کہ درگاہ کے قریب حکیم سید علی کے مکان میں دہلی کی ایک بیگم بہت مالدار آئی ہوئی ہیں۔ ہم نے اپنے دستور کے موافق اپنے ایک شاگرد سے کہلا بھیجا اگر لکھنؤ میں رہنا ہے تو ہمارا حق پہلے دیدو۔ بیگم صاحب نے کہا کہ میر صاحب کی شہرت میں سُن چکی ہوں اور دو ہزار روپیہ اُنکی نذر کرنے کو رکھا ہے مگر تم کو نہ دونگی تم انہیں کو بھیجدو۔

بیگم صاحب نے تو درحقیقت یہ بات سچے دل سے کہی تھی مگر چور کا دل کتنا ہوتا ہے۔ ہمارے شاگرد کو اس دال میں کچھ کالا معلوم ہوا۔

آٹھ روز ٹال کر ہم دسوں آدمی مسلح ہوکر بیگم صاحب کے مکان پر پہنچے ایک

شاگرد نے کہا آپ لوگوں کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
میں جاکر جو کچھ پونجی ہے سب سمیٹ لاتا ہوں۔ رات کے دو بجے ہونگے کہ یہ مکان کی دیوار پر چڑھ کر زنانہ کود پڑا۔
اتفاق سے بیگم صاحب اس وقت پیشاب کی ضرورت سے اُٹھی تھیں۔ دو لونڈی ایک ہاتھ میں شمع اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا لئے ہوئے ساتھ تھی۔ دھماکے کی آواز سنکر جو لونڈی نے آدمی کو دیکھا تو دُوہ دُوہائی کہکر بیہوش ہوگئی۔ بیگم صاحب نے لوٹا پکڑ لیا۔ بیگم صاحب کے گھر میں مرد کا نام نہ تھا۔ مامائیں اصیلیں اپنے اپنے کونے میں دبک رہیں لیکن بیگم صاحب نے نہایت استقلال سے کہا کون؟ ہمارے شاگرد نے جواب دیا ہم ہیں۔ کہا کیوں قضا نے گھیرا ہے جا سیدھا لیٹ جا۔ اس نے کہا سیدھی طرح سے اپنا زیور اُتار کر رکھدو اور روپیہ کا صندوقچہ حوالے کردو نہیں تو تمہاری قضا پھڑپھڑا رہی ہے۔
بیگم صاحب نے کہا اچھا تو اپنا وار کر۔ ہمارے دم میں جب تک دم ہے ایک پیسہ نہ دینگے۔ شاگرد نے پہلے تو دھمکایا۔ تلوار میان سے کھینچکر اُٹھائی گر یہ بھی بھبکیت نکلی اور پینترا بدل کر ڈٹ گئی اور کہا ہاں دیکھوں تو سہی تو کیسا تلوریا ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ بھرپور مارا بیگم نے لوٹے پر روک لیا۔ اسی طرح اُس نے کئی ہاتھ مارے بیگم سب خالی دیگئی۔ اتنی دیر میں پھرتی سے بیگم نے اپنا ریشمی رومال جو گلے میں بندھا تھا کھولا۔ ایک موٹا پیسا ازار بند سے کھول کر اُس کے کونے میں باندھ خوب بل دیئے اور ہنکٹی بچا کر وہی رومال گردن پر کھینچ مارا جس کی چوٹ سے یہ غش کھا کر گر پڑا۔ جب اسکو بہت دیر ہوگئی تو ہم میں سے دُوسرا آدمی کود گیا اور اُس نے جو اپنے ساتھی کو مرا ہوا پایا تو نہایت غصے میں بیگم پر تلوار کے ہاتھ لگائے مگر وُہ بھی ایسی ماہر فن تھی کہ سب ہاتھ لوٹے پر روکے اور جب اپنی باری آئی

تو گھسا کر وُہی رُومال مارا کر وُہ بھی غش کھا کر گر پڑا۔ یکے بعد دیگرے ہمارے سب آدمی کام آگئے تو گھبرا کر ہم خود کُودے۔ مکان کو گنجِ شہیداں دیکھکر ہماری آنکھوں میں خُون اُتر آیا اور بیگم پر بہت خشمناک حالت میں ہم نے حملہ کرنا چاہا۔ اُس نے کہا میر صاحب! تم ایک نامی اُستاد ہو۔ میں تم سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتی اور نہ اس میں میرا رتی بھر قصُور تھا۔ میں نے تمہارے لئے دو ہزار روپیہ الگ رکھا تھا لیکن تمہارے شاگرد کی حماقت سے یہ نوبت پہنچی۔ ہم نے کہا اب تو جو کچھ ہونا تھا وُہ ہو چکا۔ میرے قوّتِ بازو تُو بہادر سپاہی تو نے مار ڈالے اب اس کے بعد زندگی کا کچھ مزا نہیں اور بہادر کے ہاتھ سے مرنا میں اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں عورت پر کیا ہاتھ اُٹھاؤں تو ہی پہل کر۔ بیگم نے کہا میر صاحب! خاطر جمع رکھو۔ یہ سب زندہ ہیں مرے نہیں ہیں۔ انکو ابھی اچھا کئے دیتی ہوں لیکن اس شرط سے کہ یہ سب ننگے سر اور ننگے پاؤں میرے گھر سے جائیں اور صبح کو اپنا جوتا اور ٹوپی لینے آئیں۔ میں نے طوعاً و کرہاً اس شرط کو منظور کر لیا۔ اُس نے ہر ایک کی گردن آہستہ سے ہلائی وُہ ہوشیار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ جب اس طریق عمل سے سب اچھے ہو گئے تو مَیں نے کہا جس طرح تم نے ان سب کو بیہوش کیا۔ ایسا ہی ایک ہاتھ مجھ پر بھی مارو اس نے میرے لحاظ کی وجہ سے بہت پس و پیش کیا۔ جب میرا اصرار بڑھ گیا تو وُہ رومال مجھ کو بھی رسید کیا۔ میں بھی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اُسی وقت میری گردن بیگم نے ہلائی۔ میں اچھا ہو گیا۔ جب ہم سب جانے لگے تو اُس نے دو ہزار روپیہ ہماری نذر کیا۔ ہم نے کہا اب ہم روپیہ نہیں لے سکتے اور نہ تمہارے یہاں آج سے کوئی آئیگا۔ تم چین سے پاؤں پھیلا کر سویا کرو۔ جہاں پر اُس نے پنجہ مارا تھا اُس دن سے آجتک وہاں درد ہوتا ہے۔ ہم نے تو اس عورت کے مقابلے میں کسی مرد کو بھی نہیں پایا۔

یہ حال تو چوری اور سینہ زوری کا تھا۔ چوک میں روز دو ایک سے بات بات پر تلوار چل جاتی تھی۔ ہر ایک بانکے کے پاس دو تلواریں ہوتی تھیں۔ ایک ہاتھ میں ایک پر تلے میں ذرا سی چشمک پر تیغ کھنچی اور شپاشپ چلنے لگی۔

ان سب باتوں پر بھی لوگ شاہی زمانے کے معترف نظر آتے ہیں تو آخر وہ کون سی بات تھی جس سے اس زمانے کی اسقدر عزت ہے۔ بات یہ ہے کہ شاذ و نادر واقع تو ہر زمانے میں ہوا کرتے ہیں لیکن عام طور پر شاہی زمانے کی سوسائٹی پر نظر دوڑائی جائے اور اگلے لوگوں کے طرز معاشرت پر غور کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے اور اس زمانے کے لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت کے لوگ بخیلی تن پروری اور عمدہ پوشاکی اور خود پسندی کو انتہائی امارت سمجھتے ہیں اور اس زمانے کے لوگ اپنی دولت کو کنبہ پروری اور نیکنامی کی غرض سے صرف کرنے کو ریاست سمجھتے تھے۔ وضعداری کو اپنا جوہر سمجھتے تھے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ سلطنت کیسی ہی عادل اور منصف مزاج نیکدل رحیم کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر رعیت کا طرز معاشرت خراب ہے تو سلطنت کو قانون کی کل اسی رخ پر پھیرنا پڑتی ہے۔ اور اگر سلطنت کے افعال ناشائستہ قانون ناقابل عمل ہیں مگر رعیت کی طرز معاشرت عمدہ اور شریفانہ ہے تو سلطنت کو وہی رنگ اختیار کرنا ہوگا۔

یہ قانون قدرت ہے کہ جیسا طرز معاشرت مجموعۃً لوگوں کا ہوتا ہے اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑتا ہے تمام دنیا کی مخلوقات پر ایک قانون نافذ نہیں ہوسکتا۔

شاہی قانون کا سبک اور برائے نام نفاذ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ

عام طور پر شریف نیک چلن ایماندار اور خوش اخلاق تھے غلہ ارزاں تھا شہر میں امن برستا تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے لوگوں کو بےفکری تھی لباس پوشاک اور کھانے پینے میں بہت تکلفات نہ تھے۔ چور اُچکے بدمعاش بھی اپنی کمائی نیک کام میں صرف کرتے تھے۔ بنی جان طوائف نے پچاس ہزار روپیہ خرچ کرکے چوک میں امام باڑہ بنوا دیا جو آجتک موجود ہے۔ عباسی جان گوہر جان کے امام باڑے دیکھکر لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ انکی ساری کمائیاں شہر کی آبادی برقرار رکھنے کے لئے صرف ہوتی تھیں۔

دہلی کے ایک بزرگ عمدۃ الملک اسلام خان مشہدی وزیر شاہجہان کے پڑوتے سید حیدر حسین صاحب ہیں اسوقت لکھنو میں موجود ہیں۔ تخمیناً اسّی برس کا سن شریف ہے۔ آپ بُرہان علی خاں جلاوت جنگ کے نواسے ہیں۔ قدیم مکان نیل کے کٹرے میں تھا۔ واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کے آغازِ حکومت میں بیس روپیہ کی کرائے کی بہل کرکے پندرہ روز میں لکھنو آئے۔ فرماتے ہیں کہ اسوقت کے لکھنو کا کیا پوچھنا۔ شہر رشکِ جنت بنا ہوا تھا۔ لکھنو بھر میں کہیں سڑک کا نام نہیں۔ دوطرفہ سربفلک عمارتیں۔ عالی شان مکانات۔ تپلی تپلی گلیوں میں دوطرفہ دوکانیں مینا بازار سے چینی بازار تک دوکانوں میں ہر طرح کے تاجر پیشہ جابجا ناچ رنگ کے جلسے ہورہے تھے۔ قیصر باغ کی برجیوں پر سنہری کلس چڑہائے جاتے لوگ عموماً متواضع با اخلاق تھے اسی طرح آور لکھنو کے شاہی زمانہ دیکھنے والے بڈھے قدیم طرزِ معاشرت کا ذکر کرکے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہی زمانہ ایک خواب تھا جسکا سماں آنکھوں میں اب تک بندھا ہوا ہے۔ آہ کیا کیا لوگ تھے۔ شاہی عملے میں شرفا اہلکار تھے۔ کسی نیچ قوم کو سرکاری ملازمت کا عہدہ نہیں ملتا تھا۔ ایک کماتا تھا دس کھاتے تھے۔ اناج سستا تھا۔ غریب سے

غریب آدمی کے یہاں دو چار مہمان بنے رہتے تھے ذرا ذرا سی بات پر نالشا نالشی نہ ہوتی۔ سرکار دربار میں جاتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تھے۔ بڑے بڑے معاملے آپس میں فیصلہ ہو جاتے تھے۔ اس قدر خود غرضی کا بازار گرم نہ تھا۔ اگلے وضعداروں میں پنڈت دلارام کشمیری شاہی میں بانگرمو کے ٹھیکہ دار تھے۔ مزاج میں خیر تھی ایک بارہ دری اپنے نام سے بنوائی۔ وسعت اور خوبصورتی میں اسکے ساتھ کی ایک تھی۔ اسکو تمام شہر کی حاجت روائی کیواسطے وقف کر دیا تھا۔ بیاہ شادی یا اور کسی تقریب یا غمی کی مجلس کیلئے جسکو ضرورت ہوئی اطلاع کر دی اور صاحب خانہ نے دری چاندنی تمگیری قنات جھاڑ کنول۔ مردنگیں دیوارگیریاں رنگل قالین سے آراستہ کر دیا۔ زیادہ ضرورت ہوئی دیگیں اور خوان پوش وغیرہ بھی موجود۔ یہ سب سامان بارہ دری کے کوٹھے پر مستعد رہتا تھا۔

اسی طرح تمام عمال سرکاری کی فیاضی اور سخاوت کا حال تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک خوش نیت مخیر اور نیکی کیطرف راغب تھا۔

مشہدے سال بھر بھیک مانگ کر جو روپیہ جمع کرتے وہ یوم عاشورہ سید الشہدا کی مجلس میں لٹا دیتے۔

مہاراجہ ٹکیت رائے نے جس قدر دولت کمائی معہ تنخواہ کے سب تالاب کنوئیں اور مسجدیں اور مندروں کی تعمیر میں صرف کر دی۔ آپ ہمیشہ سادہ لباس اور سادہ وضع سے بسر کی۔ شاہی زمانے کو جو لوگ ابتک یاد کر رہے ہیں وہ محض اگلے لوگوں کے اخلاق تواضع بردباری نیک چلنی وضعداری اور ملک کی مجموعی حالت اور شریفانہ برتاؤ کا ماتم کرتے ہیں اور یہ تو اُسوقت تک رونا رہیگا جب تک ہم اپنی حالت کو نہ بدلینگے درحقیقت یہ ہماری بداخلاقیوں کا رونا ہے ✦

خواجہ محمد عبد الرؤف عشرت لکھنوی

وقت

سینکا (Seneca) کا قول ہے کہ ہم سب کی وقت کی شکایت کرتے ہیں اور باوجود اس امر کے ہم کو اس سے جس قدر کہ ہم کو معلوم ہے بہت کچھ زیادہ انجام دینا ہے وہ بیان کرتا ہے کہ ہماری زندگیاں یا تو بالکل کچھ کام نہ کرنے۔ یا کسی کام کی بات نہ کرنے یا ایسے کام کے کرنے میں جو ہم کو نہیں کرنا چاہئے صرف ہوتی ہیں۔ ہم ہمیشہ اس امر کے شاکی رہتے ہیں کہ ہماری مدت عمر بہت کم ہے۔ مگر ہم عمل اس طرح پر کرتے ہیں گویا کہ اس کا کوئی اختتام نہیں۔

اس متبرز فلسفی نے بلحاظ اس امر کے۔ ہمارے اس اختلاف کو جو خود ہم کو اپنی ذات سے ہے اپنی مختلف طرز تحریر اور خیالات میں جن سے کہ اس کی تحریرات مختص ہیں بیان کیا ہے ہم نے اس امر پر اکثر غور کیا ہے کہ بنی نوع انسان ایک امر میں جو پہلے امر کے مثل ہے کلیتہً خود اپنی ذات سے اختلاف کرتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہم اپنی کل مدت عمر پر شاکی معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ہم اس کے ہر ایک زمانہ کے ختم ہو جانے کے متمنی ہیں۔

خورد سال لڑکا اس امر کا متمنی ہے کہ وہ جوان ہو جائے اور پھر کاروباری آدمی بنجائے۔ بعدازاں جائداد حاصل کرے اور پھر خطابات حاصل کرے اور پھر کنارہ کش ہو جائے۔ اس طرح اگرچہ ہر شخص زندگی کے زمانہ کا تھوڑا ہونا چاہتا ہے مگر اس کے چند حصے دراز اور دشوار گذار معلوم ہوتے ہیں۔ ہم عام طور پر اپنے وقت کے دراز ہونے سے خواہشمند ہیں لیکن اگر ہم سے ممکن ہو تو اس کے حصوں کو جن سے کہ وہ بنا ہوا ہے خوشی سے چھوٹا کر دیں۔ ایک دانشمند بہت اچھی طرح اس امر پر مطلق ہو جائیگا-

اگر تمام وقت جو موجودہ لمحہ اور اگلے چوتھائی سال کے آخری دن کے درمیان اس کے سُود ادا ہونے کا دن واقع ہے - نیست و نابود ہو جائے - ایک مدبّر اس امر پر کہ اُس کی زندگی کے تین سال ضائع کر دیئے جائیں قانع ہو جائیگا اگر وُہ معاملات کو زمانہ کے ایسے انقلاب کے بعد اُس طرح جس طرح کہ اس کے دماغ میں ہے ترتیب دیکھیگا - ایک عاشق بخوشی اپنی زندگی کے اُن تمام لمحوں پر خط بطلان کھینچنے کے لئے تیار ہے جو اُس کے معشوق کی خوش آیند مُلاقات کے اور اس وقت کے درمیان گذرنیوالے ہیں پس اس تیزی سے جس تیزی سے کہ ہمارا وقت گذرتا ہے - ہم اپنی زندگی کے اکثر حصّوں میں بہت خوش ہوں اگر وُہ اس سے زیادہ تیزی سے گذرے - دن کے بہت سے گھنٹے جو ہم پر گراں گذرتے ہیں - صرف وُہی نہیں بلکہ ہم سال کے سال اُڑا دینا چاہتے ہیں اور وقت کو بالکل اس طرح گذارتے ہیں جس طرح کہ کوئی ایک ایسے مُلک میں ہو کر گذرے جو بہت سے جنگلوں اور چٹیل میدانوں سے پُر ہو - جس سے کہ وُہ اُن چند چھوٹی بستیوں یا خیالی آرام کے مقاموں تک جو اس کے بعد واقع ہیں پہنچنے کے واسطے خوشی خوشی جلد گذرنا چاہتا ہو -

اگر ہم اکثر آدمیوں کی زندگی کو بیس حصّوں میں تقسیم کریں تو ہم کو یہ امر معلوم ہوگا کہ اُن بیس حصّوں میں سے کم سے کم اُنیس خالی ہیں جو نہ تو خوشی ہی میں صرف ہوئے ہیں اور نہ کسی کام کے کرنے میں مگر اس حساب میں مَیں اُن لوگوں کی زندگی کو شامل نہیں کرتا جو ہمیشہ کاروبار کی وجہ سے عجلت میں رہتے ہیں - بلکہ صرف اُن لوگوں کی زندگی کو شامل کرتا ہوں جو ہمیشہ کاروباری دُنیا میں مشغول نہیں رہتے اور مَیں اُمید کرتا ہوں کہ میری یہ خدمت اُن لوگوں کو ناپسند نہ ہوگی اگر مَیں اُنکی زندگی کے خالی اوقات کے باکار بنانے کے لئے چند طریقے تجویز کروں - طریقے جو مَیں اُنکے سامنے پیش کرونگا مفصلہ ذیل ہیں:-

اوّلاً نیکی کرنا اُس کے نہایت عام معنوں میں۔ وُہ خاص تجویز جس میں کہ معاشرتی نیکیاں شامل ہیں ایک نہایت محنت پسند دل کو کام میں لگا سکتی ہے اور ایک آدمی کو اُس شخص سے جس کی زندگی حددرجہ کی مشغولیت میں گذرتی ہو زیادہ مشغول رکھتی ہے۔ جاہل کو صلاح دینا حاجت مند کی ضرورت رفع کرنا اور ستم رسیدہ کو تسلّی دینا وُہ فرائض ہیں جو قریب قریب ہماری روزانہ زندگی میں پائے جاتے ہیں ایک آدمی کو اکثر ایک جماعت کی برافروختگی کے دُور کرنے کے ایک مستحق آدمی کی بابت انصاف کرنے کے۔ حاسدوں کے حسد کی آگ بجھانے کے۔ غصہ وروں کے غصہ کو فرو کرنے کے اور متعصب لوگوں کو راہ راست پر لانے کے اتفاقات ہوتے ہیں اور ان میں سے سب مشاغل ایک سمجھدار انسان کے لئے مناسب و موزون ہیں۔ اور اُس شخص کے لئے جو اپنی خوشی سے اُن میں اپنے آپکو مشغول کر سکے اطمینان بخش ہیں۔

ایک قسم کی اور نیکی ہے جو اُن تنہا گھنٹوں کے لئے جن میں ہم کلیتاً جلسوں اور باہم گفتگو کرنے سے علیحدہ خود اپنی ذات پر چھوڑ دئے جاتے ہیں مشغلہ ہو سکتی ہے۔ میرا مطلب اُس تعلّق خاص سے ہے جو ہر ایک عقلمند مخلوق کو اپنے بزرگ و برتر پیدا کرنے والے کے ساتھ رکھنا چاہئے۔ وُہ آدمی جسکی عادت خدا کی حضوری میں رہنے کی ہے ہمیشہ خوش دل رہتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے سب سے زیادہ عزیز اور اچھے دوست کی صحبت میں خیال کرکے ہر لمحہ اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ وقت اُس پر کبھی گراں نہیں گذرتا اور یہ ناممکن ہے کہ وُہ اکیلا رہے (کیونکہ اس کا خدا ہے اس کے ساتھ) اُسکے خیالات و جذبات اُن گھنٹوں میں جنہیں کہ اور لوگوں کے نہایت بیکار رہتے ہیں۔ کامل مشغولیت رہتے ہیں۔ وُہ جب ہی کہ معاملات دُنیا سے دُوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا دل رُوحانی آگ سے مشتعل ہو جاتا ہے اور

اُمیدوں سے پُر ہو جاتا ہو اور اُس کی حضوری کے خیال سے جو ہر جگہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ مسرور ہوتا ہے۔ یا برخلاف اس کے اپنے خوف۔ غم اور تصورات کو اُس پروردگار حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہے۔

مَیں نے اس موقعہ پر انسان کے صرف نیک ہونے کی ضرورت کو اس لئے مدنظر رکھا ہے۔ تاکہ وُہ کچھ کر سکے اور بیگانہ نہ رہے۔ لیکن اگر ہم آگے غور کریں کہ نیکی کرنا اُسوقت تک کے لئے جس وقت تک کہ وُہ ختم ہو۔ صرف ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ اُس کا اثر ہماری بقا کے اُن حصوں پر پڑتا ہے جو ہماری قبر کے بعد ہیں اور یہ کہ ہماری تمام آئندہ بقا کی جزا یا سزا اُنہی گھنٹوں پر منحصر ہے جنکو ہم اس دُنیا میں نیکی یا بدی میں صرف کرتے ہیں۔ پس اس طریقہ سے اپنے وقت کو گذارنے کے لئے ہمارے پاس دو دلیلیں ہیں۔

جبکہ ایک آدمی صرف تھوڑا سا ذخیرہ اپنی حالت درست کرنے کے لئے رکھتا ہے۔ اور اُسکو اچھی طرح عمل میں لانے کے مواقع بھی رکھتا ہے۔ اُس کی بابت ہم کیا خیال کرینگے۔ اگر وُہ اُنیس حصّہ برباد کر دے اور شاید بیسواں حصّہ اپنی بربادی اور ضرر میں صرف کرے لیکن بہ توجہ کہ دماغ میں ہمیشہ جذبات نہیں ہو سکتے اور نہ نیکی کرنے کے درجہ تک کا اُس میں جوش ہوتا ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ ایسے فرصت کے اوقات کے لئے مناسب مشاغل بتائے جائیں۔

مجھے یہ امر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ میرے خیال میں ایسے مشاغل سے جو صرف بے ضرر ہوں اور جنکے اختیار کرنے کی سوائے اُنکی بے ضرری کے اَور کوئی وجہ نہ ہو ہمہ تن مانوس ہو جانا عقل رکھنے والی مخلوقات کے درجہ سے گھٹا ہوا ہے۔ اس امر کا فیصلہ مَیں نہیں کرونگا کہ آیا کسی قسم کے کھیل کے متعلق اس سے کچھ اَور زیادہ بھی ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ لعرہے کہ میرے

خیال میں نہایت سمجھدار لوگوں کو گھنٹوں پتوں کا ایک مٹھا تقسیم کرتے ہوئے اور پھانٹتے ہوئے دیکھنا اور کوئی گفتگو سوائے بازی کے اصطلاحات کے نہ کرتے ہوئے اور کوئی دوسرا خیال سوائے سُرخ یا سیاہ دھبوں کے جو مختلف رنگوں میں باہم ترتیب دیئے گئے ہوں آنے ہوئے نہ دیکھنا۔ نہایت تعجب خیز ہے۔ کیا کوئی آدمی اس قسم کے لوگوں کو یہ شکایت کرتے ہوئے کہ زندگی کا زمانہ بہت کم ہے سُنکر نہ ہنسیگا۔ اسٹیج کو اگر باقاعدہ ہو تو نہایت اعلیٰ اور مفید دلچسپیوں کا مخزن سمجھنا چاہیئے لیکن دل کبھی کسی چیز پر اسقدر رغبت سے متوجہ نہیں ہوتا جس قدر کہ ایک نہایت خاص دوست کی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت زندگی میں دور اندیش اور نیک دوست کی صحبت سے حظ اُٹھانے سے بہتر کوئی برکت نہیں۔ وُہ دل کو تسلی دیتا اور ہلکا کرتا ہے۔ سمجھ کو ترقی دیتا اور صاف کرتا ہے۔ تخیل اور علم کو بڑھاتا ہے۔ نیکی اور اچھی تجاویز کو پیدا کرتا ہے۔ خواہشات کو قابو میں رکھتا اور ٹھنڈا کرتا ہے اور زندگی کے اکثر خالی اوقات میں باعث دلچسپی ہے۔ ایسے خاص دوست کے علاوہ ایک شخص کو ایک ایسے شخص سے عام گفتگو کرنیکی کوشش ہونی چاہیئے جو ان لوگوں کو جن سے کہ وُہ گفتگو کرتا ہے محظوظ کر سکے اور اپنا اچھا اثر ڈال سکے اور ان دونوں صفات کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اور بہت سے مشاغل زندگی ہیں جنکے شامل کرنیکی ہر ایک فرد بشر کوشش کرے۔ تاکہ تمام موقعوں کچھ نہ کچھ مشغلہ ہو بنسبت اسکے کہ سُست پڑا رہکر دماغ پریشان کیا جائے یا کسی ایسے جذبہ سے جو اتفاق سے سُستی کی دلدل میں پھنسانا چاہے سُستی میں پڑ جائے۔

ایک آدمی کا جو علم موسیقی نقاشی یا نقشہ کشی کا مذاق رکھتا ہے۔ ایک ایسے شخص سے مقابلہ کیا جائے جو ان ہنروں سے مذاق نہیں رکھتا تو مقابلۃً مذکورہ بالا شخص ایک دوسری سمجھ کا آدمی کہا جا سکتا ہے لیکن زندگی کے تمام مشاغل میں سے اپنے خالی اوقات کے پُر کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی امر نہیں کہ مفید اور دلچسپ مصنفوں کی کتابیں پڑھی جائیں +

محمد بدر الدین سیوہاروی

تعلقاتِ زن و شو

مکالمہ

میاں۔ تم نے مخزن میں بنت الوقت کا مضمون دیکھا۔ یہ بتاؤ کہ وہ تمکو کچھ پسند ہی؟

بیوی۔ کس لحاظ سے؟

میاں۔ آیا اُس میں جو کیرکٹر دکھائے گئے ہیں اُنکو تم پسند کرتی ہو۔

بیوی۔ مجھے تو وہ اصلی کیرکٹر نہیں معلوم ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہی جیسے ہندوستانی گڑیاں۔ کہ چار کالے ڈورے سے ٹانکے مار دیئے آنکھیں ہوگئیں۔ دو اَور لگا دیئے بھویں بن گئیں۔ ایک کپڑے کو گول مروڑ کے متوازی سی دیا ہاتھ ہوگئے

میاں۔ بہت زور کی کہی۔ واقعی اگر بنت الوقت کوئی اصلی جیتی جاگتی بیوی ہوں تو بڑی کہہ مکرنی بیوی ہیں۔ یہ بھی مانتی جانتی ہیں کہ "میری تو دونو جہان کی فلاح اسی شخص (خاوند) کی ذات پر منحصر ہے" اور اگر وہ کہیں تو اپنا کلیجہ تک نکال کے رکھدوں"۔ اور خاوند سے ذرا ذرا سی باتوں پر لڑتی بھی جاتی ہیں۔ سارے قصّے میں شروع سے اخیر تک ایک جگہ یہ نہیں دکھایا کہ انہوں نے خاوند کی کونسی بات مانی یا خاوند کے لئے کیا تکلیف گوارا فرمائی۔ اُلٹا اُسکو خواہ مخواہ ستایا ہے۔

بیوی۔ جی ہاں۔ وہ تو بیچارا کام میں مصروف ہے اور آپ ایک شعر کے معنی پر بحث کرنے کے لئے اور امیر اور داغ کا مقابلہ کرنے کو جس طرح صاحب بہرے کو پکارتا ہے اِس طرح اپنے خاوند کو آواز دیتی ہیں اور اپنی بات کی پیچ کی یہ حالت ہی کہ خود ہی فخریہ لہجہ میں فرماتی ہیں" مگر میں بہی

کہے گئی کہ تم ایک بھی نہیں دکھا سکتے" اور اس پر طرّہ یہ کہ خفا بھی ہو گئیں لیکن انکا خاوند بھی کوئی بیچارا بڑا ہی غریب مزاج آدمی ہوگا جو اپنا کام چھوڑ کر بیگم صاحبہ کے حکم پر دوڑا دوڑا چلا آیا۔ تم تو اول آتے ہی نہیں اور جو آتے تو میری جان کھا جاتے کہ ایسی فضول بات کے لئے مجھے کام پر سے بلایا۔

میاں۔ شاید ان میاں بیوی کی نئی شادی ہوئی ہوگی جو کام کی پروا نہ کی۔

بیوی۔ نئی شادی کہاں سے ہوتی ہوگی۔ بچہ تو اتنا بڑا موجود ہے کہ باوا کی انگلی پکڑ کر اُنکے ساتھ کچہری جانے کو مستعد ہے۔

میاں۔ جی ہاں یہ حماقت مزید برآں۔ جس طرح جُہلا بچّوں کو عید کی نماز میں بیوی کے کہنے سے لیجاتے ہیں اور نمازی نماز پڑھتے ہیں اور بچّے روتے رہتے ہیں۔

بیوی۔ لے کیسے نہ جاتے۔ بیگم صاحب کا حکم بھی تھا۔ دیکھو تابعدار میاں ایسے ہوتے ہیں۔ تم جیسے تھوڑا ہی۔ کہ بچّے کو میرے ساتھ بھی نہیں سونے دیتے۔

میاں۔ تم تو دوسری بحث چھیڑتی ہو۔ مگر یہ دیکھا کہ بیوی صاحبہ نے بچّے کو ضد کرنے کا سبق کس صفائی سے دیا ہے اور میاں سے کس طعن سے بات کی ہے کہ "اگر قیصر کی جان تم کو ایسی دوبھر ہے"۔ گویا بے کچہری گئے قیصر مرا ہی جاتا۔

بیوی۔ شاید دوبھر کا محاورہ کھپانا ہو اس لئے یہ فقرہ لکھدیا ہو۔

میاں۔ ممکن ہے۔ اور دیکھو میاں جب کچہری سے واپس آتے ہیں تو باوجود امّاں جان کی نصیحت کے میاں سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا۔ اور اُدھر قیصر صاحبزادے کو دوسرے دن کے لئے پھر میاں کے کندھے پر سوار کرا دیا کہ "قیصر ہمارے کل پھر چلے جانا خفا نہ ہو"۔ کچہری کیا ہوئی۔ نانی جی کا گھر ہو گیا۔

بیوی۔ تم نے ایک بات کا خیال نہیں کیا مزاج میں سنجیدگی بھی ہے۔ چنانچہ نرس کا ذکر

بھی ازبس ضروری تھا۔ نرس کیا ہوگی۔ کوئی ایسی ویسی ہوگی جو بچہ ایسا ضدی ہے کہ باوا کے سر پر چڑھا جاتا ہے۔

میاں۔ آجکل کے مضامین میں عورتوں نے چھری کانٹے سے میز پر کھانے نرس۔ سائے وغیرہ کا تذکرہ کرنا فیشن کر رکھا ہے۔ اس کے بغیر اُنکی انگریزیت میں فرق آتا ہے۔

بیوی۔ انگریزیت یا میمیت؟

میاں۔ (جواب ٹال کر) اچھا اس مضمون میں جو نکات بحث طلب ہیں اُن پر بھی تم نے غور کیا۔

بیوی۔ مثلاً؟

میاں۔ مثلاً یہ کہ میاں بیوی کی محبت خط مستقیم کی سی رہنی چاہیے۔ ایک۔ بیوی کو ہر وقت میاں سے طنزاً گفتگو کرنی چاہئیے۔ دو۔ بیویوں کو اپنا دماغ شعراء کے کلام کے مباحثے میں صرف کرنا چاہئیے۔ تین۔ بیوی کو میاں کا نام لینا چاہیے۔ یہ چار مسئلے ہیں۔

بیوی۔ بی بنت الوقت صاحبہ کا یہ خیال کہ "شادی کے یہ تین سال مجھ کو پہاڑ معلوم ہوتے۔ اگر میری اُنکی ہفتے میں دو ایک دفعہ لڑائی نہ ہوتی رہتی"۔ نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا خیال ظاہر کرنے والی اپنا نام بنت عنب رکھ لے تو زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ عربدہ جوئی اُسی کا کام ہے۔ تسکر رنجی کے گھاؤ بھی زیادتی سے دن بدن گہرے ہوتے جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ ہنسی میں کھنسی ہو جاتی ہے۔ گھڑی گھڑی لڑنے جھگڑنے سے اور پھر ملنے سے بچھورا پن اور بچپن معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں جو ایک جگہ بنت الوقت نے اقرار فرمایا ہے کہ میری خفگی کوئی سچ مچ کی تھوڑا ہی ہے اور اس جھوٹی

خفگی پر بعض بعض جگہ اپنے خاوند کو ڈانٹا ہے تو اس سے مجھے بڑے بڑیا کی کہانی کا وُہ فقرہ یاد آتا ہے کہ "دُر موئے میری آنکھیں دُکھتی ہیں"۔ اور ملاپ پر وُہی کہ "ماری کوٹی کو نے لاگی میں کیا تجھ سے روٹھی تھی"۔

بیگم صاحبہ کا رُوٹھنا۔ میاں کا خوشامد کرنا۔ اور انکے سوال جواب میں تھیٹر اور گلزار نسیم کا مزا آتا ہے۔ میاں بیوی سے ایک تصویر دکھا کر اسکی تعریفوں پر تعریفیں کرتے ہیں اور آخر کار بیوی صاحبہ جل بھُن کر اٹھوانٹی کھٹوانٹی لیکر جا پڑتی ہیں اور میاں مناتے ہیں تو فرماتی ہیں "مجھ سے کیا کام اپنی پسند والی سے جا کر ایسی خوشامد کی باتیں کرو"۔ یہ اندر سبھا کا سین نہیں تو اور کیا ہے۔

میری رائے میں تو بنت الوقت کی ساس کی نصیحت بہت درست ہے۔ کہ میاں کے آرام کا خیال رکھنا چاہیئے اور اس سے خواہ مخواہ نہ اُلجھنا چاہیئے۔ خاصکر جب وُہ تھکا ماندہ ہو۔

میاں۔ مَیں تمکو اتنا عقلمند اور نکتہ سنج نہ سمجھتا تھا۔ اچھا یہ تو پہلے سوال کا جواب ہُوا۔ دُوسرے سوال کا کیا جواب ہے۔

بیوی۔ اسی میں وُہ بھی آگیا۔ ہروقت میاں سے چھیڑ چھاڑ بنت الہوا کو کرنی جائز ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں عشق کا چٹخارہ متانت لیا ہُوا ہونا چاہیئے ہروقت طنزاً گفتگو کرنا بدمزاجی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہر ایک خاوند بنت الوقت کے میاں کی طرح سہار کرنے والا نہیں ہوسکتا۔ اگر جاہل ہے تو وُہ بھی اپنی بدمزاجی دکھائیگا اور ممکن ہے ہاتھا پائی کی نوبت پہنچے۔ اگر پڑھا لکھا ہے تو وُہ گھر میں آنا چھوڑ دیگا۔ تم نے ایک دن مجھے شیکسپیئر کا ایک قصہ سُنایا تھا جس میں ایک بدمزاج بیوی کی اوّل مرمت اور آخر

میں درستی ہوئی ہے۔ بنت الوقت کو وُہ قصّہ ضرور پڑھنا چاہئے۔

میاں۔ نہیں مگر وُہ تو بہت محبت والی بیوی ہیں۔

بیوی۔ لفظی اظہار میں تو کم سے کم ضرور۔ تیسرے اور چوتھے مسئلے کا حل اب تم کرو۔

میاں۔ شاعری اگرچہ زمانہ جاہلیت کی نشانی ہے لیکن اس کا لُطف اُٹھانے کے لئے بڑی لیاقت اور علم درکار ہے اور ہماری اُردو اور فارسی کی شاعری کی ظاہری صُورت ایسی ہے کہ جو شخص صرف لکھ پڑھ ہی سکتا ہو اور اچھا تعلیم یافتہ نہ ہو اسکے لئے شاعری میں کسی قسم کا حصّہ لینا قطعی مخرب اخلاق ہے۔ اور چونکہ ہماری مستورات کو اور بہت سے مفید مشاغل موجود ہیں۔ اس لئے انکو اس سے پرہیز ہی لازم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اُردو کے ناول بھی ضرر رساں ہیں۔ میرے خیال میں تاریخی قصص مثل قصص ہند و مذہبی کتب مثل الکلام اور بزرگان اسلام کی سوانح عمری اور سفرنامے انکے لئے زیادہ فائدہ مند اور دلچسپ ہونگے۔ تاریخ میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند کے بہت سے حصّے نہایت دلچسپ ہیں۔

اب رہا بیوی کو میاں کے نام لیکر پکارنے کا مسئلہ۔ میری رائے میں نام لینا تو ہرگز مناسب نہیں۔ اس لئے کہ ہماری سوسائٹی میں صرف اپنے سے چھوٹے کا نام لیتے ہیں۔

بیوی۔ تم نے ناصر دلہن کی نسبت کیا رائے قائم کی؟

میاں۔ اچھّی خاصی بھولی بھالی پیاری دلہن ہے۔ اگرچہ بنت الوقت صاحبہ اسکو روشن خیال لڑکیوں میں شمار کرتی ہیں لیکن میرے ذہن میں تو اُنکی تصویر یُوں آتی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہے۔ پور پور چھلّے پہنے ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ گول چہرہ ہے۔ جھکی ہُوئی بیریاں ہیں ڈھیلے

پائچوں کا پاجامہ ہے۔ گہنا ہاتھوں میں سونے کا بے ترتیبی کے ساتھ کہنیوں تک پہنچتا ہے۔ کان دُہرے ہو گئے ہیں۔ گلے میں سونے کے ساتھ پوتھوں اور شیشے کے جوے بھی پہن لئے ہیں۔ قد چھوٹا۔ بدن دوہرا۔

بیوی۔ (قہقہہ لگا کر) یہ تم نے کیونکر جانا۔

میاں۔ اس قسم کے خیالات کی عورت ٹھیٹ دیسی ہوگی اور ایسا ہی لباس پہنیگی۔

بیوی۔ اس کا کیرکٹر بتاؤ۔

میاں۔ کیرکٹر کی سُنئے۔ وُہ فرماتی ہیں "اتنا بڑا گھر اماں جان کے نہ ہونے سے سُونا سُونا معلوم ہونے لگا"۔ بچّوں کے نہ ہونے سے تو گھر سُونا سُونا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وُہ جب ہوتے ہیں تو غل غپاڑہ رہتا ہے۔ لیکن اماں جان کے نہ ہونے سے انکا گھر جو انکو سُونا سُونا معلوم ہونے لگا تو غالباً انکی اماں جان ہر وقت چلّاتی رہتی ہونگی اور اگر ایسی اماں جان کی وہ تعریف کرتی ہیں تو قطعی ظاہرداری برتتی ہیں اور ٹھیٹ دیسی لوگوں کا قاعدہ کلیہ ہے پھر ارشاد کرتی ہیں "اصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کے گھر میں ہونے سے کچھ دل کو اطمینان سا رہتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بی ناصر دلہن نری دلہن ہی ہیں۔ اگر وُہ گڑیا ہوتیں تو اور بھی اچھا تھا۔ یعنی خود کچھ بھی نہ کرنا پڑتا۔ ہر وقت طاق زیب سجی رہتیں۔ اس فقرے سے صاف ظاہر ہے کہ ناصر دُلہن کو اپنے اوپر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ نہ انکی اپنی کوئی رائے ہے۔ نہ اپنی رائے پر اطمینان ہے۔ اس لئے اماں جان کے سہارے جیتی ہیں۔ لیکن کہیں خدانخواستہ اماں جان جنّت آشیاں ہو گئیں۔ تو کیا ہوگا۔ یہ ہمارے ہندوستانیوں کی طرز زندگی کا بہت کمزور پہلو ہے۔ بڑوں کے آگے چھوٹے کوئی چیز ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دبتے دبتے غلامی کی خصلتیں

پیدا ہو جاتی ہیں اور نہ اپنے اوپر بھروسا رہتا ہے۔ نہ بے سہارے کے کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی لگام دوسرے کے ہاتھ میں دینے سے خوش رہتے ہیں۔

بیوی۔ ناصر خود جب اماں جان سے آنا دیتے ہیں تو کیا انکی بیوی کو نہ دبنا چاہئے۔

میاں۔ ناصر صاحب بھی تو اسی طرز زندگی میں پرورش پا چکے ہیں جس کی بیتے اوپر ہو گی۔ ولایت کے درزیوں نے اگر انکی پوشش بدل دی تو کیا ہے اب دیکھئے عورت تو عورت ناصر مرد ہو کر اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ جس بات کو برا نہیں سمجھتا۔ اُس پر کھلم کھلا عمل کر سکے۔ برخلاف اس کے چوری چھپوں کام کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا۔ گویا اماں جان کے ڈر نے صاحبزادے کو اس قدر چوٹا بنا دیا ہے کہ اُن کی چوری کا لپکا ولایت کی رہایش میں بھی نہ گیا۔ "ڈیر کینیز"، "اور کنسر ویٹو" کہنا تو سیکھ لیا۔ مگر انہیں میرا مُردہ ہی دیکھنا نصیب ہو جو اب کے چلنے سے انکار کرو" کی قسم کے فقرے نہ بھولے۔ یعنی اُنکے دماغ میں سے وہ ادہامی کثافت ابھی تک نہیں نکلی جو گھٹی کے ساتھ ہمیں پلائی جاتی ہے۔ جب میاں ایسے ہیں تو بیوی تو ان سے کچھ درجہ بڑھی ہوئی ہی ہونی چاہئے۔ وہ یہ فقرہ سن ہی نہیں سکتی مُنہ بھینچے جا رہی ہیں۔ کہ گویا ادھر یہ لفظ مُنہ سے نکلے اور اُدھر ناصر کے مُرغِ رُوح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ بیچاری مجبور ہے کیا کرے آخر میاں کا کہنا ماننے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اور یا تو کس شدّ و مدّ سے تھیٹر جانے سے انکار تھا اور یا ایک ہی قسم پر جھٹ سے تیار ہو گئیں مطلب یہ کہ نہ کوئی اصول ہے نہ کسی کام کی بُرائی بھلائی دریافت کرنیکی قابلیت اماں جان تھیٹر میں جانے کو بُرا سمجھتی ہیں۔ دُلہن جان بھی بُرا سمجھتی ہیں

میاں نے قسم دی - بیوی اسکو اچھا سمجھنے لگیں - گھر میں یہ سنتی ہیں کہ اماں جان بڑی بوڑھی ہیں - میاں اُنکے بیٹے ہیں اُنکے خورد ہیں - اسلئے شرافت کا تقاضا اسی امر کو سمجھتی ہیں کہ اماں جان کی بات رد نہ کریں اور اُنکے مقابلے میں میاں کو بالکل کچھ نہ گردانیں - کس قدر جہالت کا خیال ہے - میاں اور بیوی کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ اس میں تیسرا آ ہی نہیں سکتا - خواہ وُہ ماں ہو یا اپنا بچہ ہی کیوں نہ ہو - میاں کو مقدم بیوی ہے اور بیوی کو مقدم میاں ہے - جب یہ ہوتا ہے تو میاں اور بیوی یکجان اور دو قالب ہوتے ہیں - اور جب تک ایسا نہ ہو تب تک میاں بیوی کے تعلقات میں ضرور رخنہ باقی رہتا ہے -

بیوی - آپ مجھے لکچر پلانے لگے - بہت خوب -

میاں - آپ یُوں سمجھیں -

بیوی - بس اب سو ئے سنسار اور جاگے پاک پروردگار آپ بھی سو جائیں اور بس لکچر کو پھر کے لئے اٹھا رکھیں -

"زمزم"

اولڈ بوائے - علیگڈھ کالج کے ہواخواہ بالعموم اور پُرانے طلبہ بالخصوص اس نئے ماہوار رسالہ کا جو چند ماہ سے مقام بنارس سے جاری ہوا ہے نہایت خوشی سے خیر مقدم کرینگے - اسکے اڈیٹر عشرت حسین صاحب بی - اے اور اسسٹنٹ اڈیٹر سید منظر علی صاحب ہیں - دونوں صاحبان اپنے رسالہ کو پُرانے طالبعلموں کے لئے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے - امید ہے کہ علیگڈھ کے سب پُرانے طلبہ جو عموماً خوشحال اور کامیاب صاحب ہیں - اس نئے علمی پودے کی آبیاری کرینگے -

شاعری

شاعر کا اوج طبلِ سدرہ سے کم نہ تھا — رکھتی تھی جن دنوں پر پرواز شاعری
خدمت گذارِ شاعرِ خوش گو تھا ہر امیر — تھی ہر وزیر و شاہ کی دمساز شاعری
گرویدہ اک جہان تھا اس کے جمال کا — کرتی تھی اپنے حسن پہ خود ناز شاعری
ہوتی تھی ہر رئیس کی مجلس میں اس کی قدر — رہتی تھی بزم و رزم میں ممتاز شاعری
بھرتے تھے موتیوں سے سب اہلِ سخن کے منہ — کرتی تھی شاعروں کو سرفراز شاعری
تسخیر قلب ہوتے تھے تاثیرِ شعر سے — حسنِ بیاں میں رکھتی تھی اعجاز شاعری

شاعر کی قدر فخرِ دو عالم نے کی حفیظ
رکھتی ہے یہ سند پہ اعزازِ شاعری

ہمارا ترانہ

اغیار سے یہ کہہ دو ہے یہ مکاں ہمارا — یہ سرزمیں ہماری یہ آسماں ہمارا
یہ باغ و راغ سارے جتنے ہیں سب ہمارے — یہ آبجو ہماری یہ گلستاں ہمارا
ہوتے ہیں کون اس میں صیاد اور گلچیں — مدت سے اس چمن میں ہے آشیاں ہمارا
اپنے لہو سے ہم نے ہر نخل کو ہے سینچا — ہم باغباں ہیں اس کے یہ گلستاں ہمارا

گلگشت ایسی بھائی کچھ ہم کو اس چمن کی
جس سے نہ یاد آئی پھر بھول کر وطن کی

اے اجنبی اگر تو واقف نہیں عرب سے — جو پوچھتا ہے ہم سے نام و نشاں ہمارا

مسکن قدیم اپنا ہی سرزمین بطحا — پہلے ہوا جہاں سے چشمہ رواں ہمارا
جو چاہے دیکھ آئے بیت الحرام مکہ — قائم ہے اُس زمیں پر اب تک نشاں ہمارا
مرجع ہمارا اب تک ہی خاک پاک یثرب — جس خاک میں ہے سوتا وہ گلہ باں ہمارا

ہم اہل بادیہ ہیں اسلام کے فدائی
اس دین کے فدائی اس نام کے فدائی

ضرب المثل ہماری مہماں نوازیاں ہیں — ہم کو عزیز جاں سے ہے میہماں ہمارا
حاتم سے نام روشن ہمت کا ہے ہمارے — جود و سخا میں عالم ہے مدح خواں ہمارا
ہم نے کبھی کسی سے آنکھیں نہیں چرائیں — مانگا ہی ہم سے اُس نے گو نقد جاں ہمارا
دب کر کسی کے آگے گردن نہیں جھکائی — اس واسطے لقب ہے شیر ژیاں ہمارا

ابنائے بادیہ ہم ڈرتے نہیں کسی سے
البتہ چھیڑ پہلے کرتے نہیں کسی سے

وہ آبنائے مغرب یعنی کہ جبل طارق — صدیوں اُڑا کیا ہے اس پر نشاں ہمارا
یہ سرزمین مشرق کہتے ہیں ہند جسکو — قرنوں رہا ہے اسپر سکہ رواں ہمارا
ہرقل کا تاج اب بھی ہے زیب سر ہمارے — ہے پائے بوس اب تک تخت کیاں ہمارا
دشمن جو ہم سے آکر میدان میں لڑے ہیں — بھولے نہیں وہ اب تک زخم سناں ہمارا
پہنچے ہیں ہم یہاں تک خیبر کو پار کرکے — کیا روکتا ہمالہ بحر رواں ہمارا
قومیں یہاں کی ہم سے پسپا ہوئی ہیں لیکن — ہر جنگ میں رہا ہے پلہ گراں ہمارا
مدت تک اس زمیں پر کی ہم نے حکمرانی — صدیوں رہا ہے تابع ہندوستاں ہمارا
گھربار ہم نے اپنا چھوڑا اسی کی خاطر — اس درجہ مہرباں تھا کچھ میزباں ہمارا

اب وہ ہوا یہاں کی ایسی ہمیں خوش آئی
ہم نے عرب سے آکر بستی یہاں بسائی

ہندوستاں میں بستے گذری ہیں آٹھ صدیاں
ہر ذرہ اس زمیں کا ہے رازداں ہمارا

ماں باپ ہیں ہمارے مدفون خاک اس میں
اس خاک سے بنا ہے ہر نوجواں ہمارا

بیجا نہیں جو اسکو سمجھیں وطن ہم اپنا
زیبا ہے گر کہیں ہم ہندوستاں ہمارا

بھارت ہماری ماں ہے ہم اسکے بالکا ہیں
ہے اب تو برج باشی کل خانداں ہمارا

بیوپار ہے ہمارا حب وطن کا سودا
اس جنس کا ہے جویا یہ کارواں ہمارا

اس دھن میں چار سو ہم پھرتے ہیں مارے مارے
گو تھک گئے ہیں لیکن ہمت نہیں ہیں ہارے

نیرنگ

تصوّر

اے تصور تیری خوبی کیا کسی سے ہو بیاں
تیری جدت آفرینی کا ہے قائل اک جہاں

تو کرے دم بھر میں رنگا رنگ بزم آرائیاں
تو اگر چاہے بنا دے ایک گل سے گلستاں

تو مٹائے آکے دل سے رنج کے داغ و نشاں
تو دکھائے سیر باغ رشک گلزار جناں

تو بڑھائے حسب منشا شان اشیائے نہاں
شئے ہر اک معلوم و مجہول آگے تیرے عیاں

دور کی دیکھی ہوئی شے دم میں تجھ سے ہو عیاں
دور اندیشی میں اک تو ہی ہے یکتائے زماں

کھینچتا ہے اس طرح تصویر یار دلستاں
دیکھکر صنعت تری ہوتے ہیں گم تاب و تواں

خواہشوں کے پیش کرتا ہے تو نادر ارمغاں
تو بناتا ہے عجب دلچسپ قصے داستاں

جمع کر دیتا ہے تو اک دم میں گنج شایگاں
صرف کر دیتا ہے اک لمحے میں دولت بیکراں

تجھ سے بنتا ہے سکندر دم کے دم میں سرگراں
تجھ سے بنتا ہے تونگر دم میں مفلوک زماں

کیسی ہے خود اختیاری ذات میں تیری نہاں
کوئی مجبوری نہیں جو روک لے تیری عناں

کیوں نہ شاعر تجھکو چاہیں شاعروں کی تو ہے جاں
کیوں نہ عارف تجھ کو مانیں تو ہی اسرار داں

مونسِ خلوت کوئی تجھ سا زمانے میں کہاں
وقتِ بد میں تو ہی دائم غمگسار و مہرباں

تیری آمد ہی مبارک دل مصفا ہو جہاں
تو ہی ہر باطن کے حق میں اک بلائے ناگہاں

عیب کو معیوب کے تو صاف کرتا ہی بیاں
جذبۂ باطن کا ہو جب فعل ظاہر ترجماں

مول لیتا ہی مصیبت تجھ سے نادانِ ہاں
رحمتیں پاتا ہے تجھ سے مردِ عاقل بیگماں

تیری خیر اندیشیاں کرتی ہیں دل کو شادماں
تیری خیر آگاہیاں ہوتی ہیں تسکین بخش جاں

ہوتی ہی سچی خوشی اس شخص ہی کو بیگماں
تو لباسِ صدق میں ہوتا ہی جسکا میہماں

تیری خوبی پر ہی دلدادہ ذہین تفتہ جاں
کر رہا ہی تو ہی اس کی غمگساری ہر زماں

سید محمد مصطفیٰ ذہین

یار کا خط

مرحبا! کاغذ کے ٹکڑے میں ترے قربان ہوں
خوش ہوں گو محسن ترا گرویدۂ احسان ہوں

پارۂ کاغذ نہیں حرزِ دلِ غمگیں ہے تو
قلبِ مضطر کے لیے سرمایۂ تسکیں ہی تو

معدنِ الطاف ہے تو مخزنِ اسرار ہی
جامعِ اوصاف ہے عکسِ دلِ دلدار ہی

کم نہیں تیرے شکن چینِ جبینِ یار سے
شان میں نقطے فزوں خالِ رخِ دلدار سے

تو اگر دو چار دن بھی غم رُبا آتا نہیں
حق تو یوں ہی پھر مجھے دُنیا کا کچھ بھاتا نہیں

وصل تیرا کم نہیں کچھ مجھ کو وصلِ یار سے
کیوں نہ ہو تو بھی تو آخر ہے اسی سرکار سے

ہو نہ ہو قایل کوئی اس مختصر تحریر کا
میں سمجھتا ہوں نوشتہ ہے مری تقدیر کا

جب کبھی مجبور ہونگا دادخواہی کے لیے
پیش ہوگا چار یاروں میں گواہی کے لیے

حالِ دل تجھ سے کہونگا پھر کبھی دل تھام کر
منزلوں آیا ہی چل کر اب ذرا آرام کر

امر ناتھ محو

شادی کی مبارکباد

یہ نظم دیر میں شائع ہوئی ہے۔ مگر شعر کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ ہمارے کرم فرما پنڈت نرائن پرشاد صاحب بیتاب نے اپنے دوست مسٹر کیفیا دیتن کی "منشی" بی۔ اے کی شادی میں (جو ماہ اپریل میں ہوئی تھی) یہ اشعار بطور تہنیت نظم کئے تھے۔ قافیہ و ردیف کی دقت اور بندش کی آسانی بالخصوص قابل تعریف ہے

تری شادی سے دنیا میں بڑھی توقیر شادی کی
بنے طالع بنے قسمت بنے تقدیر شادی کی

جہاں میں بج رہے ہیں شادیانے تیری شادی کے
خوشی عالم میں ہے اور دھوم عالمگیر شادی کی

ادھر شادی کہ ہونے سے ترے سر پر بندھا سہرا
ادھر سہرے کے بندھنے سے کھلی تقدیر شادی کی

شباب[1] اپریل کا ہے چیت فصلی کا بڑھاپا ہے
مناتے ہیں خوشی ملکر جوان و پیر شادی کی

تو شادی کیلئے دنیا میں اور تیرے لئے شادی
تری جاگیر شادی اور تو جاگیر شادی کی

ترے گھر کے در و دیوار سے شادی برستی ہے
برنگ ابر باراں چھا گئی تاثیر شادی کی

تری شادی نے اپنا کر لیا پابند شادی کو
منڈھے یہ بیل چڑھکر بن گئی زنجیر شادی کی

نگاہوں کو تری مدِ نظر تھی خانہ آبادی
نشانہ جا کے تھے تاک میں یہ تیر شادی کی

ملی تھیں پہلے صرف آنکھیں مگر اب انگلیاں بھی
وہ تھی تدبیر منگنی کی۔ یہ ہے تقدیر شادی کی

ترا سہرا یہ جھک جھک کر بلائیں تیری لیتا ہے
کہ ہوتی ہے خوشی خوش ہو کے دامنگیر شادی کی!

بہن میری دلہن ہیں اور بھائی جان ہیں دولہا
برادر جسم شادی۔ جان ہیں ہمشیر شادی کی

دلِ بیتاب سمجھیگا ٹھکانے لگ گئی محنت

[1] اپریل کی ۱۶ تاریخ اور چیت فصلی کی ۲۹۔

ہوئی مقبول اگر یہ نذر پُر تحقیر شادی کی

(ایضاً بقیہ قافیہ تصویر)

پکارے خامشی میں بھی خوشی سے تحریر شادی کی
مزہ جب ہے کہ مُنہ سے بول اُٹھے تصویر شادی کی

شفق رنگِ خوشی تارے ہیں پھول اور کہکشاں سہرا
فلک بھی تیری شادی سے بنا تصویر شادی کی

چمن لائے اِدھر سہرے - جھنک لائی اُدھر کنگنا
زمیں خاکہ ہے شادی کا - فلک تصویر شادی کی

دُلہن کی آنکھ میں دولہا دُلہن دولہا کی آنکھوں میں
جدھر دیکھو نظر آتی ہے اِک تصویر شادی کی

ابھی خاموش تھا نوشہ ابھی کرنے لگا باتیں
خُدا کی شان مُنہ سے بول اُٹھی تصویر شادی کی

نظر آتی ہے ہر صُورت سے صُورت شادمانی کی
بنا ہے سر بسر آتی ہُو بہو تصویر شادی کی

دُلہن شرمیلی - دُولہا مطمئن خاموش ہیں دونو
کوئی دیکھے کہ بتلا - کوئی تصویر شادی کی

تصوّر میں جب آئے ساتھ ہی نوشاد و نوشابہ[۵]
وہیں میری نظر میں کھنچ گئی تصویر شادی کی

دیا ہے کام اُس نے تیری شادی میں مصوّر کا
کھچی ہے خامۂ بیتاب سے تصویر شادی کی

[۵] دلہن کا نام

محنت

کام سے ہے آدمیت کام سے آرام ہے
آدمی کی زندگانی کا سبب بس کام ہے

آدمی وُہ ہے جسے مطلب ہو کم آرام سے
اسکو ہونا چاہیئے دن رات رغبت کام سے

آدمی آفاق میں جو کام کے لائق نہیں
یاد رکھو سیشہ جیسے ہیں وُہ فائق نہیں

آدمی گر محنتی ہے اور دیانتدار ہے
کام اُسے فکر معیشت کے لئے درکار ہے

کام فخر نوجواں ہے کام فخر پیر ہے
کام سے سوسائٹی میں عزت و توقیر ہے

کام کو تعلیم قدرت کا طریقہ یاد ہے
سارے اُستادوں سے بہتر کام اُن کا یاد ہے

مردمِ اعلیٰ کے دیکھو گر اُٹھا کر واقعات
تم پہ کھل جائے کہ تھے کیا محنتی وہ باصفات

چاہیئے ہر کام میں ہم کو اُنہی کی پیروی
کی جنہوں نے صَرفِ تحقیقات اپنی زندگی

جو کئے تجویز اُنہوں نے کام یاں اپنے لئے
پائی دادِ مردمی ایسی دلیری سے کئے

آج کل تعلیم کا ڈنکا بجا ہے خلق میں
دھیان اب تہذیب کا کیا جا بجا ہے خلق میں

خلق میں پیدا کیا ہے اب یہ شہرا کام نے
کارخانہ ہے ترقی کا نظر کے سامنے

درجہ اعلیٰ کچھ نہ کچھ ہے تو ریاضت دوستو
قیمتی ہر چیز کی قیمت ہے محنت دوستو

گلشنِ راحت نہیں پھلتا ریاضت کے بغیر
کام کچھ بھی ہو نہیں سکتا ہے محنت کے بغیر

بوستانِ خلق میں جو مرد گذرے ہیں بڑے
کام تھے اُنکے زبردست اور بازُو اُنکے کڑے

رنج اُٹھائے کام میں محنت سے بیزاری تھی
صبر سے محنت اُنہوں نے رات دن جاری رکھی

ہاں طبیعت بھی نہایت تیز اُنہوں نے پائی تھی
اُنکے حصہ میں ذہانت بھی خداداد آئی تھی

پر اُٹھاتے تھے وہ تکلیف اور زحمت رات دن
جان و دل سے وہ کیا کرتے تھے محنت رات دن

بلکہ محنت ہی نہیں در اصل زحمت بھی کوئی
کام کچھ اُمید سے کیجے تو ہے عینِ خوشی.

تھا یہ قول سینٹ آگسٹاین اہلِ یقیں
کچھ نہ کرنے کے برابر کوئی بھی محنت نہیں.

برکتیں نازل ہوں اُس پر حق تعالیٰ کی سدا
صَرف جس نے عمر کو کارِ خلائق میں کیا.

برکتیں اُس پر بلائیں فکر کی سہتا ہے جو
اور کارِ نیک ہر دم سوچتا رہتا ہے جو

الغرض ہر کام میں مشکل روا محنت سے ہے
کام جو دنیا میں ہے وہ کام کا محنت سے ہے

جان ہو قربانِ خوبیٔ بیانِ سنسکرت
اِک مثل کیا خوب کہتی ہے زبانِ سنسکرت

شیر وہ ہوتا ہے میدانِ جہاں میں کامیاب
اپنے جو گل سے بدن کو کام میں کر دے گلاب

ضعف ہے اُنکا قوی ہیں وہ نہایت بزدلے
اپنی ناکامی میں کرتے ہیں جو قسمت کے گلے

[illegible] [illegible]

اپنی تمنّا

گھر سے لایا ہے اُٹھا کر ہمیں شوقِ دیدار ۔۔۔ دیکھنے آئے ہیں گلشن میں گُلِ تر کی بہار
توڑ لیجائیں یہ ہرگز ہمیں منظور نہیں ۔۔۔ اپنا دل بھی اسے دیجائیں تو کچھ دور نہیں
بیٹھے پاس بہت عزت سے دیکھینگے اسے ۔۔۔ ایسے بیٹھینگے کہ پہلو میں بٹھا لینگے اسے

یہ ہے کون اُٹھاتا ہے یہ قصہ کیا ہے ۔۔۔ کیا کوئی عاشقِ شیدا بھی یہاں بیٹھا ہے
کس لئے مارا مجھے میں کہو تو نوں کیا مارا ۔۔۔ بوئے بدنی کی ہے فریاد کہ نیزا مارا
پھول کے ساتھ تو موجود اک آفت بھی ہے ۔۔۔ اس کی قربت میں تو کانٹوں کی عنایت بھی ہے

شاہدِ گُل کو حفاظت کی ضرورت نکلی ۔۔۔ دولتِ حسن کو بھی سانپ کی حاجت نکلی
اسکو زیبا ہے یہی جو گُلِ خوشبو پالے ۔۔۔ شانِ گُل خوب کیا تو نے کہ بچھو پالے
ہاں تماہول تجھے کی تو نے یہ اچھی تدبیر ۔۔۔ چلتی ہے اپنی سی تدبیر پھر آگے تقدیر

پھول [illegible] پاتا ہے ۔۔۔ دامن اسکا بھی تو کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے
کبھی تقصیر سے ہوا کے جو یہ بچتا ہے ادھر ۔۔۔ تو ذرا بھی نہیں آتا ہے نہیں رحم اس پر
اور بھی دُکھے ہوئے دل کو دکھا دیتے ہیں ۔۔۔ زخم یہ پھول سی پتی میں لگا دیتے ہیں

نازکی پر بھی یہ ساتھ آہ یہ حالت کیسی ۔۔۔ ہے لکھی پھول کی قسمت میں مصیبت کیسی
جسمِ نازک تو مصیبت کا سزاوار نہ تھا ۔۔۔ گُل کسی طرح سے بھی قابلِ آزار نہ تھا

پیاری صورت کے لیے تو نہ برائی ہوتی کاش ایسوں کے تو حصے میں بھلائی ہوتی

درد ہر اک کے لئے یوں تو برا ہوتا ہے لیکن اچھوں میں یہ اندوہ فزا ہوتا ہے
نہ دکھائے کہیں اللہ مصیبت آتی اب تو تکلیف کسی کی نہیں دیکھی جاتی
اے خدا چھین لے آلام زمانے بھر کے اور سب دیدے مجھے درد محبت کرکے
بیوفا جان جو جائے تو وفا کر جائے
تیرا بندا تیرے بندوں کے لئے مر جائے

[illegible]

سالِ نو کی مبارکباد

مبارک زمانہ کو دورِ گلستاں مبارک ہو عالم کو عشرت کا ساماں
مبارک ہو دستِ جنوں کو گریباں مبارک ہو عشاق کو چاکِ داماں
عروسِ چمن کو یہ جوبن مبارک ہو گلچیں کو گلگشتِ گلشن مبارک
مبارک دلِ خستہ کو زخم پنہاں مبارک تمنائے شورِ نمکداں
صبوحی کشو جام و مینا مبارک یہ مسرت دلکش مہینا مبارک
مبارک مڈل والوں کو فاقہ مستی مبارک شریفوں کو یہ دورِ پستی
مبارک ہو دربار والوں کو دہلی مبارک ہمیں اپنی چھوٹی حویلی
مبارک ہو انگلینڈ کو جشن شاہی مبارک ہو دشمن کو دورِ تباہی
مبارک ہو مخزن تمہیں سالِ نو کی
مبارک تمہیں روز افزوں ترقی

سردار عبدالحمید خاں یوسفزئی

تازہ غزلیں

(از جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے — نہ بن پڑتی ہی ہنستے اور نہ روتے
شب فرقت اسی حسرت میں گذری — ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے
کہیں یہ راز کیا اے ہنسنے والے — اگر جیتے تو کچھ دن اور روتے
بہت جھگڑے رہے فرقت کی شب تک — نہ دنیا تھی نہ ہم تھے صبح ہوتے
یہ کس نے خواب میں جلوہ دکھایا — یونہیں ہم رہ گئے سوتے کے سوتے
عزیز اب ضبط سے بھی کام لو کچھ
ارے مر جاؤ گے کیا روتے روتے

(از جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب لکھنوی)

روح نکلے گی جو ساقی ترے ترسانے سے — سیدھی کوثر کو چلی جائیگی میخانے سے
حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن — ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے
آپ بھی جلتے ہیں اوروں کے جلانے والے — ہم کو روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے
محفل آباد رہے خیر سے خم کی ساقی — ایک دو گھونٹ ملا چھلکتے ہوئے پیمانے سے
قطع کر رشتۂ تسبیح اگر دانا ہے — کشت امید ہری ہوگی نہ اس دانے سے
دیکھ لو چل کے ذرا سیر ہاں کبھی عشرت
دو قدم خانۂ اللہ ہے بت خانے سے

(از پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول ساقی دہلوی)

کیا خستہ سارِ شوق ہیں رنگِ وفا سے ہم تقریب کوئی ہو تو ملیں دلربا سے ہم
آئینہ دِل کا صاف ہوا ذکرِ قلب سے ہم رنگِ جلوہ ہو گئے ذوقِ صفا سے ہم
ایمن کیا ہے شیوۂ تسلیم نے مجھے بے خوف ہو گئے ہیں ہجومِ بلا سے ہم
تم کو نہیں خیال کسی دردمند کا شاداں ہیں یا حزیں ہیں تمہاری بلا سے ہم
تسکین ہے کوئی رنگِ تمنا نہیں رہا فارغ ہوئے ہیں کشمکشِ مدعا سے ہم
بیرخ وُہ ہم سے گو رُخِ نازک مزاج ہے کیونکر ملینگے شاہدِ گلگوں قبا سے ہم
بیگانہ آپ ہو گئے خلوت گزیں جو ہیں اب کیا یگانہ ہونگے کسی آشنا سے ہم

ہے شوقِ دید حضرتِ اقبال کا ہمیں
کس دن ملینگے دیکھئے جادو نوا سے ہم

(از میر مہدی علی صاحب شہید)

دینے والے آپ ہیں الزام کے چھیڑنے والے دلِ ناکام کے
گر اثر ہے نالۂ بیتاب میں وُہ چلے آئینگے دلکو تھام کے
کعبۂ ابرو سے پھرنے کے نہیں ہم بہت پابند ہیں اسلام کے
سب کو ہی معلوم تم سے عشق ہے کیوں نہ صدقے ہوں تمہارے نام کے
جس طرف لیجائیگا جائینگے ہم ساتھ ہیں اب تو دلِ ناکام کے
ہم وفا کے واسطے پیدا ہوئے یہ تو کہئے آپ ہیں کس کام کے
مضطرب ہے خانماں وحشت زدہ نام ہیں یہ عاشقِ ناکام کے
کون رکھے دوستوں سے اب اُمید سب ہیں اے دل اپنے اپنے کام کے
مر کے اُٹھے اُسکے در سے اے شہید ایک ہی ہو تم بھی اپنے نام کے

(از جناب مظہر تھانوی)

جفا کی انتہا ہے اور میں ہوں　　غم راحت فزا ہے اور میں ہوں
ستم سے بھی اب اُس نے ہاتھ کھینچا　　تمنائے جفا ہے اور میں ہوں
تصور ہے کسی کا مونس غم　　خیالِ دلربا ہے اور میں ہوں
رُخِ رنگیں کا اُنکے ہے تصوّر　　خیالِ خوشنما ہے اور میں ہوں
نشاں ملتا نہیں کچھ قافلہ کا　　بس اک بانگِ درا ہے اور میں ہوں
الٰہی کعبہ دل کو بچانا　　کہ وہ کافر ادا ہے اور میں ہوں
نگاہِ سحر آگیں پڑ رہی ہے　　وہ چشمِ فتنہ زا ہے اور میں ہوں
زمانہ برسر بیداد ہے اب　　خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں
شریکِ غم نہیں فرقت میں کوئی　　فقط دستِ دعا ہے اور میں ہوں
معاصی میں ملے کیا خاک لذّت　　غمِ روزِ جزا ہے اور میں ہوں

رسائی یار تک مشکل ہے مظہر
کہ آہِ نارسا ہے اور میں ہوں

(از سید رضی حیدر صاحب رضی)

زیبا ہے روئے یار پہ دامن نقاب کا　　گویا ہے آفتاب پہ دامن سحاب کا
مستانہ چشم جوشش جوانی دکھا گئی　　نشہ چھپا نہ بادۂ حسن شباب کا
رہنے نہ دینگی دھجیاں اُنکی نگاہ کی　　آنکھوں میں اب گذر نہیں ممکن حجاب کا
کہتی ہے منہ پہ چنچل چتون یہ صاف صاف　　آنکھوں کے پاس تک نہ گذر ہو حجاب کا

حیراں ہوں مجھ سے کیوں وہ خفا ہو گئے رضی
غصہ کی کوئی وجہ نہ باعث عتاب کا

ی

قدرتی خضاب

یہ خضاب مہندی وغیرہ کے جوہر سے خوشبودار بصورت عرق تیار کیا گیا ہے۔ بالوں کو سیاہ اور چمکدار بنا دیتا ہے۔ چونکہ کنگھی سے لگایا جاتا ہے اسلئے داغ نہیں دیتا۔ جن لوگوں کو مُنہ پر نزلہ گرنے کی شکایت ہو اُنکے لئے نہایت مفید ہے۔ شیشہ اور کنگھی ہاتھ میں لی اور بالونکو سیاہ کر لیا۔ اِدھر لگاؤ۔ اُدھر خشک ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں نہانے اور دھونے سے نجات دینے والا کیسا عمدہ خضاب ہے۔ **قیمت** فی شیشی جو قریباً ایک سال کے لئے کافی ہے دو روپیہ (عہ) نمونہ کے لئے ۸ر (علاوہ محصولڈاک وخرچ پارسل بذمہ خریدار) پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔

بال اُڑانیکا تیل

کے بالونکو ۵ منٹ میں اُڑا دیتا ہے۔ جلد کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ قریباً ۶ ماہ تک کافی ہے۔ **قیمت** شیشی ۲ر علاوہ محصولڈاک وغیرہ

بواسیر خونی وبادی

کی نہایت عمدہ مجرب دوائی ہمارے پاس موجود ہے۔ ۵ یا ۶ یوم کے استعمال سے بیماری جڑ سے اُکھاڑ دیتی ہے۔ **قیمت** ۱۲ گولیاں عہ روپیہ علاوہ محصولڈاک وغیرہ

تاپ تلی

یہ ایسا نامراد مرض ہے کہ مریض کو چین نہیں لینے دیتا۔ اگر آپ کو مجرب دوائی کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمایئے۔ دوائی کھانے اور لیپ کرنیکے لئے ارسال ہوگی۔ ایک ہفتہ کے استعمال سے مریض انشاءاللہ تعالیٰ بالکل صحتیاب ہوگا۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ ہوگا۔ **قیمت** (عہ) علاوہ محصولڈاک وغیرہ

سرمہ نور العین

کے وہ لوگ جو دن رات کی محنت سے آنکھوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یا وہ طالب علم ہیں۔ یا وہ دفتروں کے ملازم یا وہ اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہیں اور آنکھوں کی شکایت ہے۔ ہمارا سُرمہ منگا کر استعمال کریں۔ یہ سُرمہ کمزوری بصر۔ دن رات کی تھکان۔ پڑوال۔ آنکھوں سے پانی جانا۔ خارش۔ دھند۔ جالا وغیرہ کو دُور کرتا ہے۔ رات کو سوتے وقت سُرمہ کے بموجب لگاویں سب شکائتیں (انشاءاللہ تعالیٰ) رفع ہونگی۔ **قیمت** فی تولہ (عہ) علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ۔ منیجر کارخانہ قدرتی خضاب تلونڈی راہ والی ضلع گوجرانوالہ۔

عالیجناب نواب وقار الملک بہادر کی نام نامی کو
زندہ اور ہر وقت یاد رکھنے کے لئے ہم نے

وقار الملک

ترکی ٹوپی ابھی حال میں ولایت کے مشہور کارخانہ کرسٹی سے بنوا کر منگوائی ہے۔ اس جدید ٹوپی کی وضع اسقدر فیشن ایبل اور خوشنما ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت مع پھندنا صرف ۸ علاوہ محصول

محسن الملک پیٹنٹ

یہ اس نئی طرز کی خوشنما ٹوپی کا نام ہے جو اپنی خوبصورتی کے سبب تمام ملک میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور آج ہر فیشن ایبل شخص کے سر کا طرہ زیب ہے۔ تمام استر چمڑے کا ہے قیمت للعہ علاوہ محصول

فرمائشوں کے ساتھ سر کا ناپ آنا ضروری ہے۔ ہر رنگ کی ٹوپیاں موجود ہیں جس رنگ کی ضرورت ہو مفصل تحریر فرمائیے +

ٹول کی عمدہ سلی سلائی قمیصوں کے علاوہ ہر قسم کا مال ہمارے ہاں سے با رعایت و کفایت مل سکتا ہے +

عبد الرشید برادر جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

عرق ماء اللحم انگوری دوآتشہ

جس میں انگور سیب بہی اور تیتر بٹیر مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں اور مشک و زعفران ملا کر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ کیا دوا ہے خالص ڈالر کوئی طبیب یہ بوتل میں فروخت کر سکتا ہے ہرگز نہیں

عرق ماء اللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر ہوتا ہے کہ اسکی نازک ساخت کو مضبوط کر کے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے۔ بلغم پیدا ہونی بند ہو جاتی ہے ضیق النفس (دمہ) کو تا دمی۔ کھانسی جلد دور ہو جاتی ہے۔ اور جن بچوں میں سل کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی سے مرا ہو تو بطور حفظ ماتقدم اسکے پینے سے بچ سکتا ہے۔ جن طالبعلموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو۔ ذہین۔ ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہئے۔ تاکہ وہ کثرت محنت سرکاری کی وجہ سے بے وقت موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کا ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے۔ سر میں درد رہتا ہے۔ سر گھومتا ہے سر میں بوجھ رہتا ہے آنکھیں کمزور۔ تکان۔ پٹھوں میں اکڑاؤ اور بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ تریاق مضرات شراب ہے۔

تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی حرکت کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن تپش دل غشی اور سانس پھولنا بند ہو جاتا ہے۔

چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اخلاط ردیہ مادہ سوداویہ کی پیدائش غیر معمولی کو دور کر دیتا ہے اور اس کے افعال باقاعدہ بناتا ہے۔

پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ہضم کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم۔

چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کے باعث کثرت ادرار رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ اصلی حالت پر آ جاتے ہیں

ساتواں اثر اعضا کے ساسل پر اور نزار پر یہ ہوتا ہے کہ تولد دود تھد۔ دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی دوسری زندگی گذرتی ہے۔ گھوڑے کی طرح ہر کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے۔ اعضا مسلوخہ درست ہو جاتے ہیں

آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ زہریلے اجزاء کو تحلیل کر کے خون صالح بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون میں کر کے جسم میں تازہ جان پھونک دیتا ہے جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔

الغرض عرق ماء اللحم اعضا کے بیکار کو کارآمد خفتہ کو بیدار۔ غافل کو ہوشیار اور ہشیار کو بارونق بنا دیتا ہے

قیمت ایک بوتل دو روپے (عہ) چھ بوتل گیارہ روپے (للعہ) درجن بوتل (عنعہ)

نوٹ۔ (۱) بذریعہ ریل پارسل تین بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا۔ (۲) نئے خریدار قیمت پیشگی معہ محصول بذریعہ منی آرڈر روانہ فرمادیں (۳) ریل کے ذریعہ منگانے پر محصول کم لگیگا۔ ریلوے اسٹیشن و لائن کا پتہ صاف لکھیں۔ **کتاب حل المشکلات** پتہ لکھنے والوں کو مفت دی جاتی ہے

حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکما لاہور

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شراکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۲ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اسکی اسقدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سنیے روح کیا چیز ہے! روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنجاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر بی۔ این صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ظلہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی لاگ سے چاق اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چٹ ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لیکچرروں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سرٹیفکیٹوں اور موجودہ ہنیا زمانہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اسوقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کے بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت عمل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کامل تیر بہدف دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت لو اغذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ہی دن [illegible] ابتدا ہی حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ خود اسکی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائینگے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ)

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیا گر پروپرائٹر شفا خانہ عام لاہور سے طلب کرو

[illegible]ن مجید کا باب معجزہ

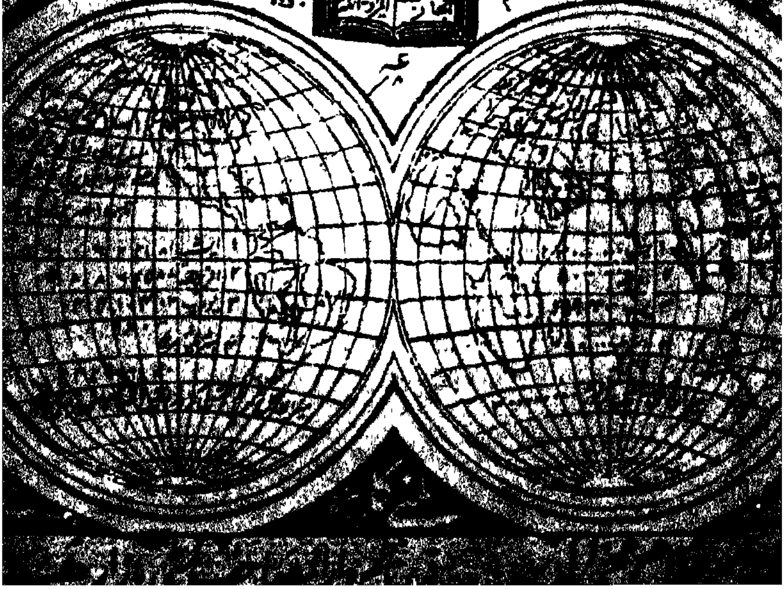
(۱) قرآن پاک کی [illegible] کا معجزہ تو ہر ایک مسلمان
(۲) [illegible] ہے [illegible] یہ نیا معجزہ صنعت تحریر جو
(۳) حمائل شریف کا صنعت جیسا اشتہار کے [illegible]
(۴) [illegible] صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں پہلی چھٹی یعنی درمیانی سطر
(۵) [illegible] پانچ پانچ سطریں ہیں اور صنعت تحریر ہے
(۶) کہ اس حمائل شریف کے تمام صفحات میں ایک صفحہ کی درمیانی سطر
(۷) [illegible] پانچویں سطر [illegible] مقابل ہے
(۸) [illegible] والی سطریں شروع ہوتی ہیں [illegible]
(۹) [illegible] شروع ہوتی ہیں [illegible] درمیانی چھٹی سطر کا مقابل
(۱۰) ایک صفحہ کی درمیانی چھٹی سطر [illegible] آپ جانچ سکتے ہیں سارے
(۱۱) قرآن شریف میں یہی صنعتی تحریر کا ہونا معجزہ قرآن نہیں تو کیا ہے؟

وجیہ انعام

[illegible] ثابت کر دے کہ حمائل شریف اعجاز [illegible] صنعت [illegible] بیان کئے [illegible] ازالصنعت حمائل شریف [illegible]

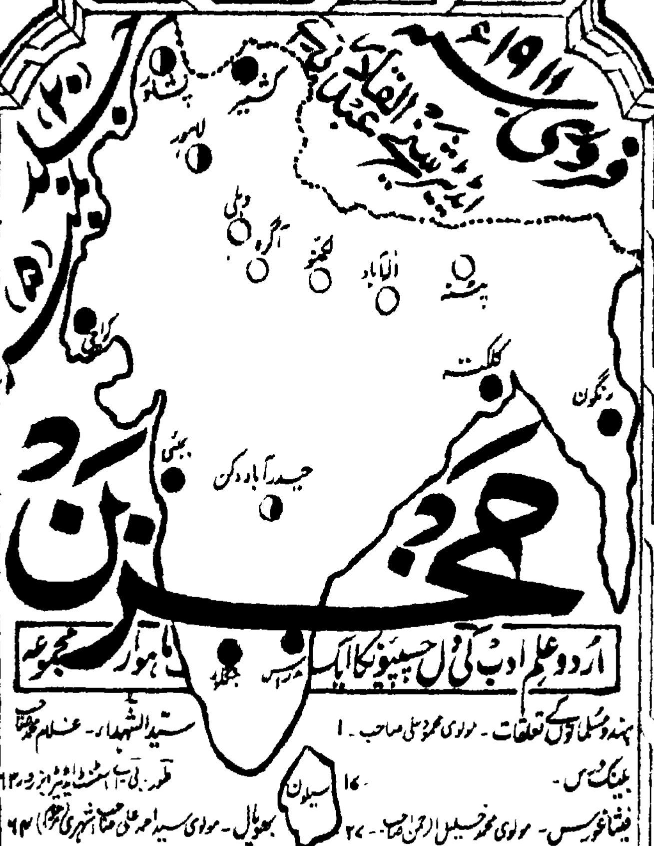
اس اعجاز صنعت حمائل شریف [illegible]
بطور تبرک ہر ایک مسلمان [illegible] کو رکھنا چاہیے





فروری ۱۹۱۱ء
جلد (۲۰)
نمبر (۵)
زیر نگرانی شیخ عبدالقادر

مخزن



اردو علم ادب کی ترقی چاہنے والوں کا ایک ماہوار مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں ۔
○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◑ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے ۔

باہتمام منیجر نولکشور پریس میں چھپا اور منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے شائع کیا ۔

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم دوم عہ فی پرچہ ۳ آنہ

مخزنِ حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم

بالتصاویر طبع ثانی

خانصاحب حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی شمس الاطبا سابق ڈاکٹر سفارت خانہ انگریزی متعام سیستان و ممبر مجلس حفظ الصحت بنام ہمایوں اعلیحضرت شہنشاہ ایران و ممتحن جماعت حکیم حاذق اسلامیہ کالج وغیرہ

چونکہ دُکھ درد اور بیماریاں ہمیشہ انسان کے ساتھ ہیں اور اُنکے لئے کوئی وقت یا موقع مقرر نہیں۔ پھر بعض بیماریاں آناً فاناً ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ ڈاکٹر یا طبیب نہ ہو تو بیمار کے تلف ہو جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ مگر ڈاکٹر یا طبیب کا ہر دم پاس ہونا مشکل ہے۔ ایسی صورتوں میں اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ ایک ایسی عمدہ جامع کتاب گھر میں موجود ہو جس کی مدد سے سمجھدار آدمی معمولی مرض کا خود علاج کر سکے اور خطرناک امراض میں ڈاکٹر یا طبیب کے آنے تک بیمار کو معقول طور پر سنبھال سکے۔ پس اس مطلب کے لئے مخزنِ حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم اسم بامسمّیٰ کتاب ہے جس کا طرزِ بیان ایسا سلیس و آسان ہے کہ معمولی اُردو خواں مرد اور عورتیں بھی وقت ضرورت اس سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اسی لئے ہندوستان کے اکثر نامی گرامی ڈاکٹروں حکیموں و عالموں۔ فاضلوں اور مشہور اخبارات کے قابل ایڈیٹروں کا متفقہ قول ہے کہ مخزنِ حکمت ہر ایک اُردو خواں کے پاس ضرور موجود ہونی چاہیئے۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں۔ حصہ اول میں تشریح جسم انسان (بالتصویر) حفظ صحت اور تیمارداری (بالتصویر) تین علیحدہ علیحدہ بابوں میں مذکور ہیں۔ حصہ دوم میں بخارات امراض عامہ اور متعدی یعنی چھوت دار امراض کے مفصل بیان کے علاوہ سر سے پاؤں تک کے تمام امراض کا علیحدہ علیحدہ بندرہ بابوں میں بیان ہے۔ حصہ سوم میں مردوں۔ عورتوں (خصوصاً حاملہ و زچہ) اور نوزائیدہ بچوں کی خاص خاص بیماریوں کے علاوہ امراض متعلقہ جراحی۔ ناگہانی و اتفاقی حادثات مثلاً مجروح کو اُٹھا کر لے جانا (بالتصویر) اُتری ہوئی یا شکستہ ہڈیوں کو باندھنا (بالتصویر) تمام قسم کی زہریں اور انکا ڈاکٹری و دیسی مجرب تریاقات اور لغات الادویہ ڈاکٹری وغیرہ مندرج ہیں۔ ہر مرض کے شروع میں پہلے اس مرض کے ڈاکٹری و طبی اور اُردو نام بطور سُرخی لکھے ہیں۔ پھر اس مرض کے اسباب علامات و تشخیص اور پھر اس کا علاج ڈاکٹری (جس میں یورپ و امریکہ کی مجرب پیٹنٹ دوا بھی تحریر ہیں) اور پھر یونانی علاج (جس میں دیسی سہل الحصول دواؤں کے مجرب نسخے ہیں) تحریر کیا گیا ہے۔

بلا جلد للعہ — **درحقیقت "مخزنِ حکمت" سے کوئی گھر خالی نہیں رہنا چاہیئے۔** — مجلد للعہ

حجم کتاب ایک ہزار تین سو چوبیس صفحات (۱۳۲۴) لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت {بلا جلد چار روپے / مجلد چار روپے آٹھ آنے} ملنے کا پتہ کتب خانہ جناب شمس الاطبا (گمٹی بازار) لاہور

مخزن

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

"ہندو مسلمانوں کے تعلقات" ایک ایسا مبحث ہے جو اول تو ہمیشہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کا مدار اس مسئلہ کے حل ہونے پر موقوف ہے۔ لیکن ان دنوں میں خصوصیت سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حال ہی میں ہندو مسلمانوں کے سر برآوردگان قوم نے الٰہ آباد میں ایک جلسہ کر کے یہ قرار دیا ہے کہ رفع تنازعات کی تدبیریں ہونی چاہئیں۔ مولوی محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے بہت عمدگی سے اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے:-

تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ بلکہ کشیدگی عداوت تک پہنچ گئی ہے اور یہ بھی سب کو مسلّم ہے کہ اس اختلاف سے اخلاقی۔ اقتصادی۔ سیاسی اور مذہبی غرض بہت سے نقصان ہیں جو فریقین برداشت کر رہے ہیں۔ نیز یہ خواہش بھی اکثر فہمیدہ افراد کو ہے کہ یہ اختلاف دور ہو جائے لیکن کوشش کی جانب آجتک ایک قدم بھی نہیں اٹھا اور کوشش تو ایک جانب اخباروں میں جو قلمی مضامین اس اختلاف کو بڑھانے اور ایک فریق کو دوسرے کے مظالم سنانے اور کینہ

وعداوت کو بھڑکانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اتفاق پیدا کرنے کے تذکرے
اُنکے مقابل میں کچھ بھی نہیں۔ اور اخباروں کو تو اس ملک میں ابھی ملکی مصلحت اندیشی
اور خیرخواہی کا حامی تسلیم کرنے میں تامل بھی ہے اور وُہ باستثنائے اندک قوم کے
بگڑے ہوئے مذاق سے فائدہ اُٹھا کر اپنی گرمی بازار سے مطلب رکھتے ہیں تعجب
اُن قومی مجلسوں پر ہے جن میں عموماً قوم کے روشن خیال بزرگوار اور قومی اور ملکی
مصلحتوں کو بخوبی سمجھنے اور سمجھانے والے جمع ہوتے ہیں وُہ بھی اکثر اپنی قومی حقوق
کی حفاظت کرتے ہوئے دُوسروں پر حملہ کرتے اور عداوت بھڑکاتے تو دیکھے جاتے
ہیں لیکن باستثنا بعض تقریروں کے کسی کانفرنس کسی کانگریس کسی انجمن اور کسی
سبھا میں کبھی یہ ریزولیوشن پیش نہیں ہوا کہ "ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کا نفاق
ملک کے لئے اور دونوں قوموں کے لئے مضر ہے اور ضرورت ہے کہ ہر فریق عداوت
کے خیال کو مٹا کر اپنی قوم کے ساتھ دُوسری قوم کے فوائد کو بھی ملحوظ رکھے اور حتی الوسع
دوستانہ امداد دے"۔ تعلیمی ضرورت مسلّم ہے۔ پولیٹیکل اغراض مقدم ہیں۔ اُنکے لئے
تو اکثر سنا گیا ہے کہ عمدہ مضامین لکھنے کا اہتمام ہوا ہے اور اچھی تجویز پیش کرنے پر
توجہ کی جائیگی۔ مگر ملک میں اتفاق کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور ابتک کوئی
ایسی تحریک سُننے میں نہیں آئی تھی کہ عداوت و نفاق کے اسباب اور ان کو
دُور کرنے کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے غور کیا جائے۔ البتہ اب اب
کچھ آواز پیدا ہوئی ہے اور کہیں کہیں یہ چرچے ہونے لگے ہیں اور چند ایک مضامین
بھی دیکھنے میں آئے ہیں لیکن مسئلہ مہتم بالشان ہے ایک دو تحریروں سے
حل ہونے والا نہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک کے سب بہی خواہ غور کریں اور
اسباب عداوت کو تشخیص اور دفعیہ کی تدابیر کو معین فرمائیں۔ اور اس مرحلے کو صفائے
دل سے اور قومی طرفداری سے الگ ہو کر طے کرنے کے بعد وُہ وقت آسکیگا کہ

اتفاق اور اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔

اگرچہ اس مضمون کی جانب توجہ نسبتاً عدم کے برابر ہے مگر پھر بھی اسباب عداوت بہت سے سُننے میں آئے ہیں ہر شخص نے کسی نہ کسی واقعہ کے باعث عداوت ہونے پر یقین کر چھوڑا ہے اِس لئے متخیلہ کا رستہ صاف ہے اور تسلیم شدہ اسباب کو دیکھنے کے بعد عداوت کی تحقیقی وجہ تک پہنچ جانا ممکن ہے۔

گاؤکشی۔ اکثر کہنے والے اور بالخصوص ہندو خیال کرتے ہیں کہ ان کے مذہب میں گائے کی تعظیم فرض ہے اور مُسلمان گاؤکشی کے عادی ہیں اِس لئے ہندو اِس ظلم کو دیکھ نہیں سکتے اور مُسلمانوں سے عداوت رکھنے پر مجبور ہیں۔ اِس بارے میں اسقدر تسلیم کرنے میں تو مجھ کو تامل نہیں کہ اگر گائے کو ذبح کرنے کی ضرورت نہ ہو اور صرف اس خیال سے ذبح کیجائے کہ ہندو ہمسائے جلیں اور طیش کھائیں تو ایسا فعل سخت مذموم ہے اور ہمارے مذہب نے ہمسائیوں کی رعایت بلاقید مذہب فرض قرار دی ہے۔ قرآن پاک میں جَارِ الْجُنُبِ یعنی اجنبی ہمسائے پر احسان کرنے کا حکم ہے اور ہمارے ہادی (رُوحی فداہ) کا ارشاد ہے کہ مجھے ہمسائے کے ساتھ رعایت کرنے کی یہانتک تاکید کی گئی ہے کہ میں خیال کرتا تھا کہ شاید اسکو ورثہ میں شریک کیا جائیگا۔ اور ایک موقع پر ارشاد ہے کہ وُہ ہرگز مُسلمان نہیں جسکے ہمسائے کو اس سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ رہے۔ اور نیز اگر کسی کام میں کچھ فائدہ نہ ہو تو اسلام میں اسکو لغو کہتے ہیں اور قرآن نے لغو کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ ہمسائیوں کے ناراض ہونے کی مضرت بھی ہو۔ لیکن مسلمانوں کے اس فعل کو باعثِ عداوت قرار دینے سے پہلے یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ گاؤکشی کی رسم ہندوستان میں مُسلمانوں کے ساتھ آئی ہے اور اس زمانے میں ہندوؤں کے اندر گائے کے دیوتا اور اوتار ہونے کا خیال بھی نقلی معنوں میں موجود

تھا لیکن اختلاف ایک طرف ملک گیری کی لڑائیاں ختم ہو جانے اور ملک میں امن قائم ہونے کے بعد ہمیشہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جاتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتے رہے۔ اور اب جبکہ گائے یا دیگر حیوانات کو دیوتا سمجھنے کا خیال معدوم ہوتا جاتا ہے۔ عداوت کی آگ بھڑکتی جاتی ہے اب بھی ہندو پارٹی کا جو حصہ قدیم مذہب پر قائم ہے اور گائے کی پرستش کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پارٹی میں عداوت کے خیالات بہت کم ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مسلمان بزرگوں کو مانتے۔ اُنکے مزاروں پر منتیں چڑھاتے اور مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے ہیں اور اختلاف جسقدر رہے اُسی جدید پارٹی کو ہے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے بہت قریب آ گئے ہیں اور خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے اور اپنے اصول کے رو سے گائے کو بھیڑ بکری کی طرح صرف ایک مفید جانور مان سکتے ہیں پس جب گائے کو مذہبی عظمت دینے والے اختلاف نہیں رکھتے یا کم رکھتے ہیں اور اسکو جانور سمجھنے والوں کا دل صاف نہیں تو معلوم ہوا کہ گاؤکشی عداوت کا باعث نہیں بلکہ عداوت کسی اور وجہ سے ہے اور اس کو بھڑکانے کے لئے گاؤکشی بطور ایک موثر حیلہ کے پیش کیجاتی ہے۔

دوسرے گائے کی مذہبی عظمت بیشک ہندوؤں کے تمام قدیم فرقوں میں ہے۔ لیکن گائے کے علاوہ اور جانور بھی ہیں جنکو بعض فرقے واجب التعظیم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض یا یوں کہنا چاہیئے کہ ہندوؤں کا اکثر حصہ جیو ہتیا کو ناجائز اور ظلم جانتا ہے اور ان میں سے بعض مُنہ پر پٹی باندھتے ہیں اور پاؤں میں جوتی نہیں پہننے کہ فضا کے کیڑے نہ تلف ہوں ۔ ان سب کے خلاف خود بعض ہندو گوشت کو علانیہ استعمال کرنے والے موجود ہیں۔ پس اگر گائے پر ظلم کرنے سے

مسلمان قابل عداوت ہیں تو دیگر جانوروں کی ہتیا کرنے والے ہندوؤں سے سانپوں تک کو دُودھ پلانے والے ہندو ضرور مخالف ہونے چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہے اور واقع میں جو بات ایک شخص کے مذہب میں جائز مان لیجائے ناجائز کہنے والے اُسکو مجبور کرنے کا حق نہیں رکھتے ۔ اس لئے جو لوگ ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے اور دُوسرے کے افعال اور اختیارات میں دخل نہیں دیتے وُہ عقلمند ہیں ۔ اور جو اس لئے عداوت رکھتے ہوں کہ دُوسرے لوگ ہمارے مذہبی حکموں کی تعمیل کیوں نہیں کرتے اور جس فعل کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں اُس کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں ۔ قوم کے عقلمندوں پر فرض ہے کہ ایسے نادانوں کو سمجھائیں نہ یہ کہ اُنکے لئے غیر مذہب والوں سے عداوت پیدا کریں ۔

تیسرے اگر مُسلمان گائے کو اس لئے ذبح کرتے ہوں کہ ان کو اس کی ضرورت ہے یا وُہ صحیح طور پر یا نادانستہ اسکو مذہبی فرض سمجھتے ہیں تو خواہ ہندوؤں کے نزدیک مسلمان ضرورت سمجھنے یا مذہبی حکم ماننے میں غلطی پر ہوں وُہ اپنے نقطۂ خیال سے مجبُور ہیں اور ان کو ایسے فعل پر اگر وُہ غلط ہے اِنصاف کے رُو سے سمجھانا فرض ہے نہ کہ عداوت کرنی اور نقصان پہنچانا ۔ اور اگر اس لئے ذبح کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو رنج پہنچے تو ایسے ہمسائے جن کے ساتھ پُشت ہا پشت سے بود و باش ہے ۔ اور آپس میں روزانہ ہزاروں طرح کا ضروری اور برادرانہ لین دین ہوتا ہے انکو چڑانے اور رنج پہنچانے کا خیال پیدا ہو اس کا بھی کوئی باعث ہونا چاہئے بے وجہ ایسی حماقت نہیں ہوسکتی ۔ اِس لئے اگر مان لیا جائے کہ مُسلمان اُنکو چڑاتے ہیں تو عداوت کا وجود اس سے پہلے ہوگا جس سے چڑانے کا خیال پیدا ہوا ۔ اِس لئے عداوت کا باعث گاؤکشی نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور گاؤکشی کا فساد اُس کا نتیجہ سمجھنا چاہئے ۔

غرض اگرچہ میں دل سے چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اختیار سے اپنے ہمسائیوں کے مذہبی نفرت کا خیال کر کے ہز مجسٹی امیر کابل کی مثال کی پیروی کریں اور جہاں تک ہو سکے گاؤکشی کی رسم کو کم کر دیں۔ مگر اس خیال کو یقیناً غلط سمجھتا ہوں کہ گاؤکشی سے ہندو مسلمانوں میں عداوت پیدا ہوئی ہے۔ البتہ اب عداوت پیدا ہونے کے بعد اس خیال کو پیش کر کے نادانوں کو بھڑکایا جاتا ہے اور اس وجہ سے جو لوگ نفرت کرنے لگے ہیں دانا ہندوؤں کا فرض ہے کہ انکو سمجھائیں اور بھڑکانے والوں کی نیت ظاہر کریں۔ ان کے بھائی میں بعض گورکھشا سبھاؤں نے جو روش اختیار کی ہے میرے نزدیک نہایت ہمدردانہ نہایت مفید اور نہایت مناسب ہے اور وہ لوگ مسلمانوں سے نفرت رکھنے اور گاؤکشی کے بہانے سے مسلمانوں کو بھڑکانے کی بجائے اس طرح سے گائے کی قیمت زیادہ کر سکتے ہیں اور اگر اپاہج جانوروں کی خبرگیری کے ساتھ عمدہ نسل پیدا کرنے کا بھی انتظام کیا ہے تو ایک مفید نسل کو ترقی دینے کے خیال سے یہ بھی مناسب ہوگا کہ مسلمان ان لوگوں کا ہاتھ بٹائیں اور اس نسل کی حفاظت اور افزائش میں مدد دیں۔

مذہبی خیالات بعض طبیعتوں کو مسلمانوں کا مسلمان اور ہندوؤں کا ہندو ہونا بھی اختلاف کا سبب معلوم ہوتا ہے اور وہ لوگ مذہبی اختلاف کے ساتھ قومی اتفاق کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ بیشک مذہبی اختلاف جبکہ کوئی مذہب نیا پیدا ہو مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ ادھر نیا مذہب لانے والوں میں ایک جوش ہوتا ہے اور اپنے عقاید کو زور کے ساتھ ظاہر کرتے اور انکی اشاعت کی آرزو رکھتے ہیں اور ادھر پرانے مذہب والے پہلی بار اپنے مذہب کی تردید سننی گوارا نہیں کرتے اور اس طرح برحسب موقع جنگ و جدال کشت و خون مقدمات یا سخت کلامی تک نوبت پہنچتی ہے اور کئی کئی طرح کی رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ ادھر والوں کا جوش کم ہونے لگتا ہے اور ادھر والوں کو نئی بات سنتے سنتے مساوات ہو جاتی ہے

اور مخالفت کی جگہ صرف اختلاف رائے رہجاتا ہے اور دشمنی کی جگہ مصالحت عود کر آتی ہے ہندو مسلمانوں پر یہ سب مرحلے گذر چکے ہیں - اب نہ مسلمان اس ملک میں نئے آئے ہیں اور نہ ہندوؤں نے یہ خیالات پہلے پہل سُنے ہیں - اس لئے یہ تازہ عداوت جو پیدا ہوئی ہے اس کا باعث مذہبی اختلاف نہیں -

مذہبی بحثیں - البتہ مذہبی بحثوں کی جیسی کچھ آزادی اور خیالات کو مشتہر کرنے کی جیسی کچھ سہولت اس زمانے میں ہے پہلے نہ تھی اور بیشک اس آزادی اور اس سہولت سے فائدہ اُٹھا کر ہر دو فریق نے اپنے خیالات کی اشاعت پہلے سے زیادہ کی ہے - نہ صرف یہ بلکہ بہت کچھ سختی اور دل آزاری کا رواج ہو گیا ہے اور ملک کے بہت سے دانا اس کو عداوت کا باعث قرار دیتے ہیں - گو اس میں تو شک نہیں کہ ایسے مباحثے جو تہذیب اور انسانیت سے بہت دور ہیں عداوت کو ترقی دیتے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو چونکہ دونوں طرف جاہل زیادہ ہیں ممکن نہیں کہ کبھی مصالحت پیدا ہو - اور بد قسمتی سے ملک کا مذاق ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ان خلاف تہذیب تحریروں کو جائز سمجھا جاتا ہے اور محض حق کو تلاش کرنے کے لئے مہذبانہ گفتگو کسی کو پسند نہیں اس لئے امید نہیں ہے کہ یہ زہریلی ہوا ملک سے جلدی نکل جائیگی - لیکن ان سب باتوں کو مان کر بھی محض مذہبی بحث کو عداوت کا سبب قرار دینے میں تامل ہے - دیکھنا چاہیے کہ ایک تو مذہبی اختلاف ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک عرصے کے بعد مخالفت کا باعث نہیں رہتا اور یہاں وہ عرصہ گذر چکا ہے اور ایک اپنے اختلافی خیالات کو تہذیب کے ساتھ ظاہر کرنا اور دوسرے کے خیال کو نرمی کے ساتھ غلط ثابت کرنا - یہ بھی ابتدا میں مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے اور نئے مذہب کی نرم بات بھی گوارا نہیں ہوتی مگر ایک عرصے میں یہ بات نہیں رہتی اور خدا کو نہ ماننے والے کا انکار اور بیانات

کو خدا جاننے والے کا اصرار اجنبی معلوم نہیں ہوتا اور ہم روزانہ اپنے دوستوں میں ایسی بحثیں کرتے رہتے ہیں اور جب تک تہذیب کی پابندی رہے رنج پیدا نہیں ہوتا اور پھر اگر کوئی شخص جوش میں تیز ہو جاتا ہے اور ناگوار کلمہ کہہ بیٹھتا ہے۔ اگر خالص دوستوں کا مجمع ہے تو اُس کو ہنسی میں اُڑا دیا جاتا ہے اور اس شخص کو غصیلا اور پاگل کہکر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مجمع میں دو ایسے شخص موجود ہوں جن میں پہلے سے رنجش ہے اور ان میں ایسی زیادتی ہو جائے تو پھر بات کا بتنگڑ بنجاتا ہے اور بحث سے لڑائی ہونے لگتی ہے۔ اُس وقت کہنے کو یہی کہا جاتا ہے کہ اُس نے بدتہذیبی کی تھی۔ ہمارے پیشواؤں کو بُرا کہا تھا یا کُفر کا کلمہ بولا تھا۔ اِس لئے غصہ آگیا۔ مگر حقیقت میں لڑائی کا باعث وُہی پہلی رنجش ہوتی ہے اور یہ فعل اُس رنجش کو پوشیدہ سے ظاہر کر دینے کا اور آئندہ کے لئے بڑھا دینے کا باعث ہوتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ ہندو مسلمانوں کا مذہب نیا نہیں۔ ہندوستان میں اس میل کو ہزار برس سے زائد گذر گئے اور اس عرصے میں جس قدر اشاعت مسلمانوں کے عقائد کی ہندوؤں میں اور ہندوؤں کے عقائد کی مسلمانوں میں ہو چکی ہے۔ آجکل کے پریس اور اخباروں نے اس سے زیادہ واقفیت کیا پیدا کر دی ہوگی۔ اِس لئے صرف اتنی بات سے آج مخالفت پیدا ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ رہیں مذہبی دل آزار تحریریں انکو اس آزاد زمانے میں شروع بیشک دو ایک ہندو مسلمان مذہبی دیوانوں نے کیا ہوگا۔ مگر بجائے اسکے اس نئے فعل پر لعنت بھیجنے کے اب جو بعض آریا اور بعض مسلمان مذہبی اخبار نویس اور پیشہ ور بحث کرنے والوں نے ایک دُوسرے کو گالیاں دینے کا طریق اختیار کرلیا ہے اور پبلک اُن کی تحریروں کو اس شوق سے دیکھتی ہے کہ اُن کے برابر اشاعت اور اخباروں کی نہ ہوگی تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ پہلے ہی

دونوں فرقوں میں رنجش ہے اور اب ایک دوسرے کی گالی گلوچ اس رنجش کا بدلہ لینے اور مخالفانہ جذبہ کو بھڑکانے کا باعث ہو رہی ہے۔ اِس لئے مَیں عداوت کا نشان ان دِل آزار تحریروں سے پہلے دیکھتا ہوں اور باہم گر علت و معلول نہیں سمجھتا۔

اِس استدلال میں ایک نقص رہگیا کہ آریا پارٹی ایک جدید فرقہ ہے اور ان میں جدّت کے سبب سے جوش بھی بیحد ہے۔ اگرچہ آریا نے پُرانے ہندؤں کے بہت سے وُہ خیالات چھوڑ دیئے ہیں جن سے مسلمانوں کو اختلاف تھا اور اگر رواداری اور تحمل سے کام لیا جاتا تو مذہبی خیال سے پُرانے ہندؤں کی نسبت اُنکے ساتھ زیادہ دوستی ہوسکتی تھی۔ مگر اُنہوں نے چھُوٹتے ہی تمام مذاہب کی تردید اس بد آہنگی سے کی کہ دلوں میں ناسور ڈالدیئے اور اُدھر بعض جواب دینے والے بھی ایسے جوشیلے نکلے کہ مخالفت کی آگ بیش از پیش بھڑکتی گئی اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی عداوت کا باعث ہندو مسلمانوں کا مذہبی اختلاف نہیں تو آریہ مسلمانوں کا مذہبی اختلاف ضرور ہوگا۔ کیونکہ یہ تازہ پیدا ہوا ہے اور ابھی مخالفت کے عرصے کو طے نہیں کرچکا۔ لیکن مَیں جو عداوت کو اس اختلاف پر مبنی نہیں سمجھتا تو اِس لئے کہ کچھ تو باعث ہوگا جس سے آریا نے مذہبی حیثیت سے قریب آنے کے باوجود مسلمانوں سے لڑائی اَور زیادہ ٹھان لی اور دوسرے آریہ پارٹی کا اثر پنجاب اور ممالک متحدہ میں زیادہ ہے اور اس سے آگے کہیں تو کچھ بھی نہیں اور کہیں ہے مگر کم۔ لیکن مخالفت اور کاوش اگر موجود ہے تو وُہ پنجاب کے ہندو مسلمانوں میں جس قدر ہے اسی شدت سے بمبئی پریسیڈنسی اور بنگال کے روشن خیال طبقہ میں موجزن ہے اور جو شکایتیں

یہاں ہیں وہی وہاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر آریاؤں کا اختلافِ مذہب مخالفت کا باعث ہو جب بھی اس کے علاوہ ایک اور سبب ضرور موجود ہے جس نے یہاں سے وہاں تک تمام ایسی جگہوں میں آگ لگا چھوڑی ہے جہاں آریا اثر نہیں پہنچا۔

مسلمان بادشاہوں کے مظالم۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمان بادشاہوں کے ظلم و ستم نہیں بھولتے اور وہ مسلمانوں سے صاف نہیں ہو سکتے اور مسلمان ہندوؤں کے ایسے تذکروں سے ناراض ہوتے ہیں۔ اس لئے عداوت چلی جاتی ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ اگر کسی خاص مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے کسی خاص ہندو یا کسی جماعت کو تکلیف پہنچی ہے تو ایسے بادشاہ بھی مسلمانوں ہی میں گذرے ہیں جو نہایت رحمدل و فیاض منصف اور منتظم تھے تاریخ کو دیکھا جائے تو ایسوں کی تعداد زیادہ نکلیگی بہ نسبت ان لوگوں کے جنکے تعصب و ظلم کی فریاد کی جاتی ہے۔ پس اگرچہ ہندوؤں کا مسلمانوں کے مظالم کو یاد کرنا اور دہرانا مسلمانوں کو برا معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں کو اس کی ترغیب کیوں ہوئی۔ ایک آدھ بادشاہ کی جگہ وہ سب بادشاہوں کو ظالم کہیں اور ایک آدھ سچے واقعے کی جگہ سیکڑوں غلط روایتیں ظلم و جور کے متعلق اخبار کریں اور بجائے کسی بادشاہ کا ذاتی فعل کہنے کے ان مفروضہ ظلموں کو مسلمان بادشاہوں کا اور اسلام کا خاصہ قرار دیں سلو پھر جب وہ سب معاملہ گذر چکا اور جو لوگ انکے خیال میں ظالم تھے مر چکے اور اب جو مسلمان زندہ ہیں انکو ان افعال میں کوئی دخل نہیں تو ان لوگوں سے عداوت رکھیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کے ہم قوم بادشاہ گذشتہ زمانے میں ہم پر ظلم کیا کرتے تھے یہ سب زبردستیاں بغیر کسی پہلی کاوش کے

سلیم المزاج آدمی کے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ چہ جائیکہ خواہ مخواہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم اُنکے ارتکاب کو اپنا مشن بنا لے اور رات دن تحریر و تقریر میں غلط روایتوں کا وظیفہ رٹے۔

چھوت کا مسئلہ۔ ہندوؤں کا چھوت کا رواج بھی بعض لوگوں کو رنجش کا سبب معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی سودا لینے کے لئے ہم ہندو دکان پر جاتے ہیں اور وہ کہتا ہے "میاں جی پرے پرے" اور اُدھر ہم سے زیادہ میلے لباس اور میلے جسم کا کوئی ہندو آکر اسی دوکان سے کوئی کھانے کی چیز ہاتھ میں اُٹھا کر بھاؤ پوچھتا ہے اور ہمارے ہاتھ پر مٹھائی کا دونا اُوپر سے پھینک دیا جاتا ہے۔ تو ایسا سلوک بیشک از حد ناگوار گذرتا ہے۔ ہندو اگر اس رسم کو ترک کر دیں تو ملک کی قسمت میں بڑا انقلاب پیدا کرینگے۔ مگر جب دوکاندار خود میلے ہوتے ہیں اُن کے ہندو گاہک میلے ہوں جب بھی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہم صاف شستہ ہوں جب بھی دامن سے چھونے کے قابل نہیں۔ اس منظر کو دیکھکر میں تو دل میں ہنسا کرتا ہوں۔ کیونکہ ہم پر کیا منحصر ہے اُنکے ہاں آپس میں اعلیٰ ذات کا ہندو ادنیٰ ذات کے ہاتھ کا پکا نہیں کھا سکتا حقہ نہیں پی سکتا۔ البتہ کلی پی سکتا ہے۔ کوئی برتن کو منہ لگا کر پانی پی لے جب تک مٹی سے مانجھ نہ لیا جائے سگا بھائی منہ نہ لگائے گا۔ ہاں چاندی یا سونے کا برتن ہو تو مانجھنے کی ضرورت نہیں۔ اُس میں ناپاکی نہیں گھستی۔ اپنے گھر کا کھانا کھانے بیٹھیں تو باپ بیٹا اور بھائی بھائی ایک برتن میں نہیں کھا سکتے۔ چوکے میں کھانا کھانے جائیں تو خود انکا اپنا بدن بھی گندہ ہے نہا کر آئیں۔ دھوبی کے دھوئے کپڑے گندے ہیں۔ نہا کر وہی دھوتی اپنے ہاتھ سے نچوڑ لیں تو پاک ہے۔ وہ باندھ کر کھانے بیٹھیں۔ غرض اُن کے

ہاں چھوت کے مسائل ایسے عجیب اور خلافِ قیاس ہیں کہ سب کو دیکھنے کے بعد غصہ نہیں آتا۔ تعجب رہ جاتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ صرف مسلمان کی چھوت دیکھکر اکثر دلوں میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام بھی آج کا نہیں اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے باوجود ان پر حاکم ہونے کے یہی سلوک دیکھنے کے عادی ہیں اس لئے اب اگر محض اس وجہ سے غصہ آیا ہے تو کیوں آیا۔ اور کیا بات دل میں سمائی کہ جو کام سیکڑوں برس سے دیکھتے تھے اور برا نہ مانتے تھے اب اسی کام پر دفعۃً جھلا اٹھے۔ ضرور کوئی وجہ ہے اور وہی وجہ عداوت کا باعث ہے۔

طلب حقوق۔ ایک وجہ یہ بھی خیال کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے میں ہندؤں کا ساتھ نہیں دیا اور اپنے لئے جداگانہ حقوق طلب کرنے لگے۔ جس پر ہندؤں کو طیش آیا اور یہ بھی ان کے حقوق کے خلاف اور اپنے خاص حقوق کے متعلق کوشش کرنے لگے۔ اس واقعے سے انکار نہیں اور بیشک مسلمانوں نے کانگریس اور سپلف گورنمنٹ کے بہت سے مطالبات میں ہندؤں سے اختلاف کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بعض مطالبات کو جو ہندؤں کی طرف سے پیش ہوئے نامناسب سمجھتے ہیں اور اس خیال سے وہ مجبور ہیں کہ ایسے مطالبات میں شریک ہوں۔ کچھ حقوق جو وہ جداگانہ طلب کرتے ہیں انکو اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور حتی الوسع ہندؤں کے حقوق میں دست اندازی کرنی نہیں چاہتے۔ پس اگر اس سے پہلے دلوں میں صفائی ہوتی تو ملکی معاملات میں اختلاف رائے اور حقوق کا معاملہ ایسا نہ تھا جس پر عناد پیدا ہوجاتا۔ ایسا اختلاف اور ایسیر قانونی جد وجہد اور ملکوں میں بھی ہوتے ہیں۔ انگلستان کے اندر پولٹیکل

معاملات میں کئی کئی فریق موجود ہیں اور ہر فریق اپنی رائے الگ اور اپنے حقوق جداگانہ رکھنے کا دعویدار ہے۔ یہی حال میں عوام اور اُمرا کے حقوق میں بحث ہو رہی ہے۔ عوام انکا جداگانہ مجلس قائم کرنے کا حق نہیں سمجھتے اور اُمرا اپنے دیرینہ اختیارات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اپنی اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ لیکن باوجود اس کے انگلش نیشن ایک چیز ہے اور عناد و عداوت کا کوئی نشان نہیں۔ حلف شاہی کے الفاظ پر رومن کیتھولک فرقے کو اعتراض ہے۔ بعض پروٹسٹنٹ الفاظ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ پارلیمنٹ میں بحث زور سے ہوئی۔ مگر کینہ وری سے واسطہ نہیں اور یہ سب اس لئے کہ پہلے سے کوئی عناد موجود نہیں اور حقوق پر اصرار کرنا اور رائے میں اختلاف رکھنا تقاضائے بشریت سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان میں رائے مختلف ہونے اور حقوق طلب کرنے پر ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے تو سبب یہی کہ دل پہلے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ہم شخصی معاملات میں دیکھتے کہ دو بھائی جائداد تقسیم کرنی چاہتے ہیں۔ اگر سلوک ہوتا ہے تو چُپ چاپ فیصلہ ہو جاتا ہے اور ایک بھائی کچھ زیادہ لے جائے تو کہا جاتا ہے کہ "خیر بھائی لیگیا غیر تو نہیں" لیکن اگر پہلے سے دلوں میں کینہ ہوتا ہے یا بھڑکانے والے جادو چلاتے ہیں تو زیادہ لینا ایک طرف بھائی کو اُس کا حق دینے میں بھی تامل ہوتا ہے اور عدالتوں میں تمام جائداد کو برباد کر دینا گوارا کرتا ہے یہی صورت یہاں ہو گی کہ پہلے سے کاوش موجود ہے۔ مانگنے والوں کے دل میں نہیں تو بھڑکانے والوں کے دل میں ہے۔ وہی پہلی کاوش خواہ کسی کے دل میں ہو۔ حقوق طلب کرنے پر ظاہر ہوتی ہے اور عداوت کا موجب بنتی ہے۔

سب کا مجموعہ۔ غرض میرے خیال میں مذکورہ بالا اسباب میں سے کوئی ایک بھی صفائی کے بعد عداوت پیدا کرنے کے لئے کامل سبب بننے کے قابل نہیں

اور اگر کہا جائے کہ کامل سبب نہ سہی کسی قدر نفرت توان وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے الگ الگ نہ سہی۔ سب مل کر عداوت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو میں کہونگا کہ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان میں سے نفرت کسی سبب سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ پیدا شدہ نفرت کو بڑھانے اور بھڑکانے کے لئے یہ سب باہم بہانہ ضرور بن سکتی ہیں اور اس لئے یہ اور بھی ناممکن ہے کہ پہلے دلوں میں صفائی ہو اور یکایک گاؤکشی کو دیکھکر غصہ کی آگ بھڑکانے کا خیال آنے لگے۔ مذہبی اختلاف کو دیکھکر دل آزاری کی خواہش ہونے لگے۔ مسلمانوں کی حکومت کا خیال آئے اور بادشاہوں پر غلط الزام لگانے اور اسلام کو بدنام کرنے کی سوجھنے لگے اور حقوق طلب کریں تو اس کو بھی دشمنی کا باعث سمجھیں۔ غرض ہر ادا بُری معلوم ہو اور ہر بات میں فی نکالی جائے۔ یہ ہو ہی سکتا ہے۔ اس صورت میں کہ عداوت پہلے موجود ہو اور آتشگیر مادہ کو صرف بتی دکھانے کی دیر ہو۔ اس لئے ہمیں ان سب امور سے پہلے کے واقعات میں اس ناگوار تخم کا پتہ لگانا چاہئے۔

عداوت کا وجود۔ مگر کیا عداوت موجود ضرور ہے؟ ہم تو دیکھتے ہیں اب بھی ہندو مسلمان ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کے دوستوں کے دائرہ میں اگر زیادہ ہمقوم ہیں تو چند دوسرے گروہ کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ کاروباری لین دین کے علاوہ برادرانہ لین دین بھی جاری ہے اور احسان و مروت کے نشان بھی کہیں کہیں دیکھے جاتے ہیں۔ کسی مسلمان کی کوشش سے ہندو کو اور ہندو کی کوشش سے مسلمان کو نوکری بھی ملجاتی ہے۔ فقیر صدا کرتا ہے اور ہندو پیسہ دیدیتے ہیں۔ سادھو الکھ جگاتا ہے اور مسلمان عورتیں کہتی ہیں ہندو ہے روٹی نہ لیگا آٹا دیدو۔ یہ کام ہوتے رہتے ہیں۔ مگر جہاں تو بھی جہاں چند ہندو مسلمان جمع ہوں اور کسی پولیٹیکل مسئلہ کا ذکر چھڑ جائے یا کسی فرقے

کے حقوق کا تذکرہ ہو۔ دُوسرے گروہ والے باوجود دوست ہونے کے اُسوقت وُہ بات کرینگے جو اپنے فرقہ کی فیور میں ہو اور دُوسرے کی بات کاٹنے کو فرض سمجھینگے۔ کسی فریق کا ایک ممبر برسرِ حکومت ہو تو اپنے محکمہ میں نیچے سے اوپر تک اپنے ہمقوموں کو جمع کرنا خواہ اُنکا کوئی حق نہو اور دُوسری قوم کو بیدخل کرنا خواہ وُہ زبردست حقوق رکھتے ہوں فرض وواجب جانتا ہے۔ ہندو مسلمانوں کے فساد نئے نہیں۔ دو برتن بھی پاس رکھے ہُوئے ٹکرا جاتے ہیں اور شریر اور فتنہ پرداز ہر قوم میں موجُود ہیں اور بالعمُوم لڑائی ہوتی بھی جبھی ہے کہ ایک طرف سے شرارت ہو تو دُوسرے اس سے بڑھکر شرارت کا ارتکاب کریں ورنہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی اور ایک فریق بالکل صلح جو ہو تو چند شریروں کو خود ان کے ہمقوم بھی دبا سکتے ہیں اور اس لئے لڑے میں زیادتی عمُوماً دونوں کی ہوتی ہے مگر ایسے موقعوں پر بجائے شریروں کا کھوج لگانے اور اُن کی بدذاتی کو ظاہر کرنے کے۔ تمام حمایت کرنے والے تمام قانون پیشہ اور تمام لیڈر اپنی قوم کو مظلوم اور دوسروں کو فتنہ پرداز ثابت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور نہ صرف مقامی اشخاص بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک یہی فیلنگ کام کرنے لگتا ہے اور تمام مُلک میں ہر شخص اپنی قوم کی مصیبت کا مرثیہ پڑھتا اور دُوسروں کے جور و ظلم کی فریاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک فریق گورنمنٹ سے کوئی درخواست کرتا ہے اور درخواست ضرور نہیں کہ ہمیشہ ناواجب اور دُوسرے فریق کے حق میں مضر ہی ہو مگر مُلک کے رہنما اخباروں اور مضمون نگاروں کی ڈیوٹی ہے کہ ہموطنوں کی ہر درخواست کو غلط کہیں اور اپنی قوم کے حق میں ظلم سمجھیں۔ اور کبھی کسی درخواست اور مسئلہ کی نسبت نہیں دیکھا گیا کہ ایک نے دُوسرے کے حق میں خیر کا کلمہ کہا ہو۔ وُہ باستثنا خال خال نفوسِ قدسیہ کے جو شاذ و نادر اس کے خلاف

عمل پیرا ہوں تمام ملک کا یہی طریق ہو رہا ہے۔ پس ایک طرف اس طرح کی باہمی ہمدردی اور دُوسری جانب اس طرح کی خلا اور بیگانگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اشخاص باہم گر ہمدرد اور دوست ہیں مگر قوم بحیثیتِ قوم ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچکر ایک طرف دونوں قوموں کے پہلے تعلقات اور دُوسری طرف قومیت کی نسبت موجودہ عقاید اور خیالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخالفت اور عناد کے دو سبب ہیں۔ دونوں فرقوں کے پہلے تعلقات میں انقلاب پیدا ہونے سے ایک حد تک خود غرضی پیدا ہوئی تھی اور کچھ عرصے کے بعد وہ معدوم ہو جانے کو تھی مگر قومیت کے موجودہ عقائد نے جو خاص اسباب سے پیدا ہوئے خود غرضی کو عداوت تک پہنچایا اور جب تک خیالات کی یہ حالت ہے۔ عداوت کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی جائیگی۔

(باقی دارد)

غزل

اہلِ ہستی کو عدم کا مرحلہ درپیش ہے — موت کو نزدیک جو سمجھے وہ دُور اندیش ہے
میکدے میں عمر گزرے اور دامن تر نہ ہو — میکشو پیرِ مغاں پہنچا ہوا درویش ہے
کچھ نہ کچھ حسرت زدوں کے ہو ستانے میں مزہ — درد اُسی کی جان کا دشمن ہے جو دل ریش ہے
آخرِ سن میں ہوئی ہے شیخ کو عقبیٰ کی فکر — آدمی سیدھا ہے لیکن عاقبت اندیش ہے
آنکھ کی پتلی سے دُنیا دیکھکر آنکھیں کھُلیں — کوئی ہو کتنا ہی کم پھر بھی وہ ہم سے بیش ہے

کچھ ریاضت کی بھی ہے کشکول میں پونجی حفیظ
یا دکھانے کو گلے میں خرقۂ درویش ہے

بلینک ورس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

مولوی نجم الغنی صاحب نے بجائے سہ اقسام، ایک چوتھی قسم مقفیٰ در لکھی ہے۔ حالانکہ مقفیٰ کوئی مستقل قسم نثر کی نہیں۔ بلکہ مسجّع میں داخل ہے۔ چنانچہ علامہ سکاکی تجنیس میں فرماتے ہیں السَّجعُ هُوَ فِی النَّثرِ کَالقَافِیَةِ فِی الشِّعرِ سجع کی تین قسمیں ہیں: مطرف، مرصع و متوازی۔ متوازی کی ایک صورت مقفیٰ بھی ہے۔ قتیل و عبدالرزاق و صاحب غیاث و مؤلف فرہنگ انندراج و مصنف انتا، فیض رسان سب کے سب تین ہی قسمیں۔ مرجز و مسجع و عاری لکھتے ہیں۔ اور ملا حسین واعظ کاشفی نے بھی بدیع الافکار میں یہی تین قسمیں لکھی ہیں۔

پھر سجع کی تعریف و مثال میں بھی سہو ہوا ہے۔ فرماتے ہیں: "مسجع وہ نثر ہے کہ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں اور حرف آخر میں بھی موافق ہوں یعنی پہلے فقرے کے تمام الفاظ دوسرے فقرے کے تمام الفاظ سے وزن و حروف آخر میں موافقت رکھتے ہوں جیسے۔ کانِ ملاحت معدوم میان الخ۔ اور جانِ صباحت موسوم دہان الخ" نہیں معلوم مولویصاحب نے تعریف مسجع جو لکھی ہے یہاں وزن سے وزن بحور کیوں نہیں مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح نثر مرجز میں بھی وزن سے مراد وزن صرفی ہی ہے۔

تعریف سجع جو مولوی صاحب نے لکھی ہے وہ تعریف ترصیع ہے جو سجع کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اور سجع اُن تینوں قسموں کو شامل ہے۔ اور سجع کی تعریف یہ ہے کہ پہلے فقرے کے آخر کا کلمہ دوسرے فقرے کے آخر

کے کلمہ سے حرفِ اخیر میں موافق ہو۔ اور یہ تعریف سکاکی اور فقیر دہلوی نے لکھی ہے۔ اور قتیل کہتے ہیں۔ مسجع نثریست کہ در آخر فقرہ لفظے آرند و مقابل آن لفظ در فقرہ دیگر لفظے باشد کہ در روی و ردف یا ردفین و تاسیس و دخیل و حرف وصل وغیر آں موافق بایں لفظ باشد و مقید بوزنے نبود۔ جیسے قاصد تمہارا خط لایا۔ اور تمہارا پیغام سنایا۔ الف اوّل لایا اور سنایا میں روی اور موافق ہے مگر وزن لایا اور سنایا کا مختلف ہے۔

پس مختصر تعریف ہر سہ اقسام نثر کی یہ ہوئی کہ مسجع وہ نثر ہے کہ جس میں قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔ اور رجز وہ نثر ہے کہ جس میں وزن صرفی یا عروضی ہو اور قافیہ نہ ہو اور عاری وہ نثر ہے جس میں نہ وزن ہو اور نہ قافیہ۔ ان تینوں نثروں کی تعریف میں وزن سے مراد کہیں بھی وزنِ بحور نہیں۔ اور یہی تعریف ملا حسین واعظ کاشفی نے بدیع الافکار میں تحریر فرمائی ہے۔ اور بیان اقسام نثر سے پہلے تعریف نثر یوں لکھی ہے۔ کلامے را گویند کہ موزون نباشد۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے یہ مضمون کس کے مضمون کو دیکھکر لکھا ہے۔ اگر جناب احسن کے دوست کے مضمونوں کو دیکھکر لکھا ہے تو اگرچہ وہ مضمون بھی میرا دیکھا ہوا نہیں ہے مگر جناب احسن کے نوٹ سے جس قدر مستنبط ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ بلینک ورس یعنی نظم غیر مقفیٰ کے اردو میں بھی لکھے جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ نثر مرجز ہو یا کوئی اور چیز یا پیشتر سے نظم غیر مقفیٰ کا وجود فارسی میں پایا جاتا ہو۔ آپ کا جو جی چاہے بلینک ورس کا نام اردو میں رکھئے مگر اس امر میں رائے ظاہر کرنا چاہئے کہ بلینک ورس کی اردو میں لکھے جانے کی ضرورت ہے یا نہیں اور اس سے نظم اردو میں سہولت و وسعت ہوگی یا نہیں۔

نوٹ اور مضمون دونوں میں اس امر پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ بلینک ورس نثر مرجز ہے اور اس کا وجود ہمارے یہاں پیشتر سے فارسی میں پایا جاتا ہے۔ اس پہلو پر بحث نہیں کی گئی کہ آیا نظم بلا قافیہ مشرقی لوگوں کو مرغوب ہے یا نہیں۔

زبان پابندِ قواعد نہیں

مولویصاحب یہ بہت صحیح ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک زبان کی تقلید دُوسری زبان میں پُورے طور پر نہیں ہو سکتی ہے۔ گو وُہ زبان اس دُوسری زبان کی تحت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہر زبان کی کچھ خصوصیات خاص ہیں۔ مگر جس قدر کہ ہمارے جدید روشن خیال اشخاص مغربی تقلید کے دلدادہ ہیں۔ اسی قدر ایشیائی تعلیم کے فریفتہ اپنی مشرقی تعلیم پر مستبد ہیں۔ چنانچہ جناب آغا رفیق صاحب بلند شہری۔ فصیح الملک نمبر (۱) جلد ۴ میں تذکیر و تانیث الفاظ عربیہ سے بحث کرتے ہوئے قاعدہ کُلیہ عربیہ کُلُّ الجُمُوعِ مُؤَنَّثٌ کا پابند ہم کو اُردو میں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے علاوہ اُس جمع کے کہ جس کا مفرد مؤنث ہو۔ ہمیں ہر ایسے جمع کو بھی مؤنث ہی بولنا چاہیئے کہ جس کا مفرد مذکر بھی ہو۔ کیونکہ کُلیہ بلا کسی قید کے ہے۔ اس لحاظ سے اوراق۔ اوصاف۔ اوقات بھی مؤنث ہی ہونگے۔ حالانکہ جناب احسن نے فصیح اللغات میں ان جمعوں کو مذکر لکھا ہے۔

جناب والا! زبان قواعد کی پابند نہیں اور قواعد پابندِ زبان ہوتے ہیں۔ زبان قواعد سے مقدم ہے اور قواعد زبان پر بنائے جاتے ہیں۔ پھر کیوں آپ زبان کو قواعد کے تحت میں لاتے ہیں۔ تذکیر و تانیث ہو یا کوئی دُوسری بات متعلق زبان اس میں بول چال کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک مُدت بعد

جب زبان میں تغیر ہو جاتا ہے۔ اور تذکیر و تانیث میں زیادہ ہوتا ہے۔ تو ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ قواعد میں ترمیم ہوتی رہے۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ الفاظ عربیہ رائج اُردو میں اعتبار قواعد عربی کا کیا جائے اور نہ ایسا کسی زبان میں ہوتا ہے۔ گلاس انگریزی زبان کا لفظ ہماری زبان میں گھل مل گیا ہم اس کو مذکر بولتے ہیں۔ لیکن انگریزی میں وہ (نیوٹر) ہے یعنی نہ مونث نہ مذکر۔ انگریزی میں مذکر کے لئے (ہی) اور مونث کے لئے (شی) اور نیوٹر کے لئے (اِٹ) ضمائر ہیں۔ اور ہمارے یہاں یہ تیسری قسم ضمیر کی سرے ہی نہیں۔ تو چونکہ گلاس انگریزی سے اُردو میں آیا ہے لہٰذا اصل انگریزی کے تتبع کے لئے اب ہم ایک ضمیر neuter (نیوٹر) ایجاد کریں۔ فارسی کے افعال میں تذکیر و تانیث نہیں ہے۔ مگر عرب جو اسمار کہ فارسی سے اپنی زبان میں لے گئے ہیں مثل فیل و نرجس وغیرہ ان اسمار کے ساتھ اپنی قرارداد کے موافق فعل مذکر یا مونث لاتے ہیں۔ اگر اصل کا لحاظ کیا جاتا تو چاہیئے تھا کہ عربی میں ایسے افعال بھی ایجاد کرتے کہ وہ نہ مذکر ہوتے اور نہ مونث۔

اسی طرح اُردو میں بھی الفاظِ عربیہ کی تذکیر و تانیث بلحاظ روزمرہ اُردو ہونا چاہیئے۔ عام اس سے کہ موافق عربی ہو یا نہ ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ میرے بحث سے خارج ہے لہٰذا زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ افراط و تفریط ہر دو گروہ کے ذکر میں یہ بحث بھی ضمناً آگئی۔ اکثر لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور قواعد کو اصل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ زبان کے پابند قواعد ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب قواعد سے انحصار نہیں ہو سکتا ہے اور زبان میں اس بنائے ہوئے قاعدہ کے خلاف بھی پایا جاتا ہے تو مجبوراً شاذ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قواعد اصل ہوں تو شواذ غلط ٹھہریںگے۔

ہمارے اولڈ فیشن کے لوگ علم کو منحصر عربی میں سمجھتے ہیں آخر کسی وقت میں معانی بیان وغیرہ علوم کی تدوین نہ تھی اسکو زبان پر لحاظ اور غور کر کے قواعد بلاغت ایجاد کئے۔ کیا اب یہ ممکن نہیں کہ بلا استمداد عربی کوئی صحیح الدماغ قواعدِ بلاغت اُردو میں بھی ایجاد کر سکے اور نئی اصطلاحیں اُردو کے لئے نکالے۔ میرے نزدیک تو فیضانِ الٰہی میں کمی نہیں آئی ہے اور اب بھی موجد ہونا ممکن ہے۔ یہ امور یعنی ایجاد فنون وصنائع نبوت نہیں ہیں۔

آیات نہ نثر مرجز ہیں اور نہ شعر

جن آیات کو جناب مولوی صاحب نے نثر مرجز کہا ہے وہ نثر مرجز دو وجہوں سے نہیں۔ اوّل تو نثر مرجز میں وزنِ بحور نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ثابت کر چکا ہوں اور ان آیات میں وزن بحور موجود ہے۔ دوسرے انکا فقرہ متقابلہ نہیں ہے جس سے یہ دیکھا جائے کہ الفاظ متقابلہ وزن میں متحد ہیں یا نہیں اور قافیہ پایا جاتا ہے یا نہیں کہ حکم مرجز لگایا جا سکے۔

اور شعر اس وجہ سے نہیں کہ شعر بحر مسدس میں چھ رکن پر اور بحر مثمن میں آٹھ رکن پر تمام ہوتا ہے۔ اور ان آیات میں ایسا نہیں ہے لہذا کوئی آیت بھی ان میں سے شعر نہیں۔ کیونکہ ہر آیت مرقومہ میں یا تین رکن ہیں یا چار رکن۔ حاصل یہ کہ مصرع پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اور یہ سب آیات مصاریع مختلفہ ہیں۔

قرآن شریف میں دو مصرعے ہموزن بامعنی ایک ساتھ برابر برابر کہیں نہیں ہیں یہ ایک جگہ پر جو آیت دوسرے پارہ کے آخر میں موزون ہے۔

يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

جو بحر کامل میں ہے اور وزن اُس کا مستفعلن متفعلن متفاعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن ہے۔ یہ شعر اس وجہ سے نہیں ہے کہ جزو آیت ہے اور بغیر اول و آخر کچھ ملائے ہوئے اس کے معنے ناتمام ہیں۔ چنانچہ شروع اس آیت کا یہ ہے وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ اور آخر اسکا یہ ہے مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔

دوسری جگہ یہ جزو آیت اٹھائیسویں پارہ آخر سورہ تحریم میں۔

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ

بحر رمل میں ہے بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن دو بار جبکہ دونوں مصرعوں کی آخری۔ ت کو منون پڑھیں۔ اور اگر ساکن پڑھیں تو وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان ہوگا۔ اور اس آیت کی بھی وہی حالت ہے۔ چنانچہ اس کا اول عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ۔ اور آخر اس کا ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ہے اور بغیر اول و آخر ملے ہوئے آیت سے معنے مستقل و مفید پیدا نہیں ہوتے۔

اور تیسری جگہ یہ جزو آیت پارہ الٓمّٓ بعد نصف میں ہے۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

اس آیت کا بھی تعلق اول سے اور آخر سے ہے جب تک انفسکم نہ ملایا جائے بے معنی ہے۔ پس یہ سب آیتیں بھی بوجہ کلام مفید ہونے کے کلمات ہیں اور بغیر انضمام بعض الفاظ دیگر معنے تمام نہیں ہوتے۔ اس بنا پر یہ کلام ہی نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ شعر۔ کیونکہ شعر کو کلام موضوع ہونا چاہیئے۔ کلام غیر مفید کلام ہی نہیں۔ اور جب معنوں کا لحاظ نہ کیا جاتے تو ہر نثر سے جتنے شعر جی چاہے نکال لو۔

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ استدلال میرا اگر صحیح ہے تو مَیں نے یہ بات بالکل نئی نکالی ہے اور یہ جواب کسی نے آجتک نہیں لکھا ہے۔ عمد و قصد دسُوءِ ادب جتنے جواب دئیے جاتے ہیں سب نکافی ہیں۔ کسی شعر میں جب وزن موجود ہے تو وہ حقیقۃً شعر ہے۔ چاہے عمد و قصد ہو یا نہو۔ اور اسی طرح سُوءِ ادب سے آیت کو شعر نہ کہنا جبکہ وُہ شعر ہو۔ شعر ہونے سے خارج نہیں کرتا۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ ناظرین میرے اس مضمون میں بہت سی نئی باتیں پائینگے۔ اور بعض امُورِ غیر حل کو اس میں حل دیکھینگے۔

بعض مُصنفینِ فنِ عروض نے بانغ نظری سے کام نہ لیکر تعریفِ شعر میں قیدِ قصد قائل لگا کر شعر بلا قصد کو شعر کو نہیں مانا ہے اور یہ بھی اُن کی کم توجہی ہے۔ جب اس میں وزنِ شعری موجود ہے تو وُہ شعر بھی ضرور ہے۔ فرض کرو کہ ایک شعر جو حقیقۃً بلا قصد نظم ہُوا ہو اور وُہ کسی وقت ہمارے سامنے آئے اور ہم کو کوئی علم قصد یا غیر قصد کا نہ ہو تو باوجود وزن شعر نہ کہا جائیگا تو اَور کیا کہا جائیگا۔ میرے نزدیک وہ شعر ضرور ہے مگر اُس کا کہنے والا شاعر نہیں۔ اگرچہ بقصد و اختیار خود شعر نہیں کہہ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ مقولہ مسلّم ہے۔ مَنْ قَالَ بَیْتَیْنِ فَھُوَ شَاعِرٌ کیونکہ ایک شعر تو بلا قصد ممکن ہے مگر دوسرا شعر اُسی ردیف و قافیہ میں بلا قصد ممکن ہی نہیں۔ شعر کسی طرح سے اپنے قواعد پر صحیح اُتر جائے۔ وُہ شعر ہے مگر شاعر ہونے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت ہے۔ قائل بلا قصد شاعر نہیں۔ محققینِ فنِ عروض تعریفِ شعر میں نہ قیدِ قصد لگاتے ہیں اور نہ قیدِ قافیہ۔ اور یہی تعریف صحیح ہے۔

فرقِ نظم و شعر

شمس العلما جناب مولوی حالی صاحب نے تعریفِ منطق کو مختلط نہیں کیا ہے کیونکہ منطقیین کے نزدیک شعر میں وزن کی بھی ضرورت نہیں ہے اور جناب مولوی عبد الغنی

نثر مرجز میں تجویز وزن کر کے اُسے از قسم نظم شمار کرتے ہیں اور شعر میں بھی وزن مانتے ہیں پھر اختلاط تعریف منطق کہاں سے آیا۔

اس میں شک نہیں کہ کسی نے نظم و شعر میں کچھ فرق نہیں کیا ہے مگر بعض اُمور مقتضی اس بات کے ہیں کہ دونوں میں کچھ فرق ہو مثلاً ایک مصرع بامعنی ہمارے سامنے آئے اُسے شعر اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ شعر میں چھ رکن یا آٹھ رکن ہونا چاہئیں۔ اور ایک مصرع میں تین یا چار ہی رکن ہونگے۔ اور بوجہ وزن نثر بھی نہیں کہہ سکتے۔ پھر آخر اس کا نام کیا رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ کلام منظوم کہیں۔

میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ نظم کو مقابل نثر ایک جنس یا مقسم قرار دیکر یہ تعریف کیجائے۔ کلام موزون مخیل۔ تاکہ تمام اقسام کلام موزون پر صادق آئے حتیٰ کہ فرد اور مصرع پر بھی اور نظم غیر مقفیٰ پر بھی۔ اور شعر کو نظم کی نوع یا قسم مانکر یہ تعریف کیجائے۔ کلام موزون مخیل مقفیٰ۔ پس گویا تقسیم کلام اس طرح ہو گئی۔ کلام کی دو قسمیں ہیں منثور و منظوم۔

کلام منثور کی تین قسمیں ہیں۔ مرجز و مسجع و عاری۔

اور کلام منظوم کی دو قسمیں ہیں نظم مقفیٰ۔ و نظم غیر مقفیٰ۔

نظم مقفیٰ کی نو قسمیں ہیں۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مخمس۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔

غیر مقفیٰ کی ایک قسم ہے فرد۔ اور اس صنف میں بلینک ورس شامل ہے۔ مولوی نجم الغنی صاحب شعر کے لئے قافیہ کو ضروری بھی فرماتے ہیں اور فرد جو بلا قافیہ اکثروں کے نزدیک ہو اُس کو شعر بھی سمجھتے ہیں۔ جب تعریف شعر کلام موزون مقفیٰ مانی گئی تو یہ تعریف فرد پر کیونکر صادق آئیگی۔

ایک قول حکما کا بھی ایسا ملتا ہے کہ جس سے نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ حکما کا قول ہے کہ نسبت تالیفیہ جس چیز میں پائی جاتی ہے باعث انجذاب و اہتزاز نفس ہوتی ہے۔ اور تالیفیہ عبارت ہے نسبت قدر تفاوت میان اوسط و اصغر بقدرِ تفاوت میان اوسط و اکبر مثل نسبت اصغر باکبر سے۔ اور بہت سے دقائق علوم و اسرارِ حکمت مبنی بر احکام نسبت ہیں۔ اسی نسبت شریفہ لعنائی کی وجہ سے کہ اجزائے عناصر میں ہے تعلق نفس بدن کے ساتھ پایا جاتا ہے اور جب زوال اس نسبت کا ہو جاتا ہے تو باعثِ قطعِ تعلقِ نفس و بدن ہوتا ہے۔ اور جب یہی نسبت اعضا میں پائی جاتی ہے تو حُسن ہے اور اصوات میں پائی جائے تو نغمہ ہے اور کلام میں پائی جائے تو نظم و فصاحت ہے اور حرکات میں پائی جائے تو ناز و ادا ہے اور عناصر میں پائی جائے تو اعتدال مزاج ہے اور نفس میں پائی جائے تو عدالت ہے اور نفس ہر مقام میں عاشق و طالب اس نسبت کا ہے۔

یہ تعریف نظم کی عام تر ہے - نظم کی اس تعریف کے بعد شعر کی تعریف چاہے کلام موزون مخیل کہیئے یا کلام موزون مخیل مقفٰی۔ بہرصورت نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں ہونگی۔ اور مولانا حالی کا نظم و شعر کو دو جداگانہ چیزیں سمجھنا صاف و درست معلوم ہوگا۔

مولوی نجم الغنی صاحب کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی قافیہ کو نظم ہی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں نہ شعر کے لئے۔ اس تحریر میں سہو کاتب و ناقل کو اگر دخل نہیں ہے تو میری رائے اس کے برعکس ہے۔ یعنی نظم کے لئے قافیہ ضروری نہیں اور شعر کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ نظم مقابل نثر ہے۔ نہ شعر۔ پس نظم کو شعر سے عام ہونا چاہیئے۔

مقدمہ دیوان جناب حالی دامت فیضہٗ میرا دیکھا ہُوا ہے مگر میرے پاس موجود

نہیں ہے۔ جواب دیکھکر اطمینان کرلیتا۔ مگر اس تحریر کو صحیح مانکر ماننا ضرور ہے کہ قولِ اوّل جناب شمس العلما اس صورت میں معارض قولِ ثانی ہے۔ اس لئے کہ بلینک ورس کو نظم غیر مقفّٰے بھی فرماتے ہیں اور پھر قید قافیہ بھی نظم ہی کے لئے ضروری ارشاد کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو اُسے شعر غیر مقفّٰے کہنا چاہئے تھا۔

اگرچہ میں صاحبِ مذاق بزرگ نہیں اور نہ مثل مولانا حالی اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن جناب احسن نے نوٹ میں تحریر فرمایا تھا کہ (اگر مولانا حالی خود اس باب میں تحریر فرمائیں تو کیا کہنا ورنہ اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی صاحبِ مذاق بزرگ اس مغالطے اور معمے کو ضرور حل فرمائینگے) مَیں نے اپنے آپ کو صرف کوئی نہ کوئی مین سمجھکر خامہ فرسائی کرکے دوسروں کا وقت لیا اور اپنا وقت صَرف کیا ہے۔ اگر اس مضمون میں سے کچھ بھی پسند اربابِ کمال ہو جائے تو زہے قسمت +

سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی۔

کُلیّاتِ اسمٰعیل

مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کے کلام کے دلدادہ یہ سُنکر خوش ہونگے کہ اُنکی دلچسپ سلیس اور معنی خیز نظموں کا بیش بہا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اردو اورینٹل پبلشنگ کمپنی میرٹھ سے مل سکتا ہے۔ چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے۔ سرِ ورق پر جناب مولانا کی ہاف ٹون عکسی تصویر ہے۔ علاوہ درسی اور قومی نظموں کے مولانا کا دیوان بھی اس کلیات میں شامل ہے اور قابلِ دید ہے۔ کتاب کا حجم ۳۷۵ صفحہ ہے اور قیمت مع جلد صرف دو روپیہ ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب عام طور پر مقبول ہوگی+

حکیم فیثاغورس

(سلسلۂ تاریخ الحکما)

حکیم فیثاغورس قریب ختم اولمپیاد سنہ ۶ء میں ظاہر ہوا اور سنہ ۶۲ء اولمپیاد میں ایطالیہ (اٹلی) کو چلا گیا۔ اور اسّی (بقولے نوے ۹۰) سال کی عمر میں راہیِ مُلکِ بقا ہو گیا۔

مُلکِ اٹلی میں ایک فرقہ فلاسفہ یونیاؔ کے نام سے موسوم ہے۔ وُہ اسی حکیم کے متبع ہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ یونان میں طالیسؔ اور اٹلی میں فیثاغورس فلاسفہ کے اُستادِ اوّل ہیں۔

ارستیب غرفیانی نے لکھا ہے کہ اس حکیم کو فیثاغورس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ اکثر اپنی قوتِ کہانت کے باعث غیب کی باتیں بتلایا کرتا تھا۔ اور آخر وُہ باتیں اسی طرح واقع ہوتی تھیں جس طرح وُہ بیان کرتا تھا۔

اِسی حکیم نے سب سے پہلے بلحاظِ تواضع یا کسر نفسی اپنے آپ کو حکیم نہیں کہلایا بلکہ فلسفی کا لقب اختیار کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ یہ حکیم جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد کا نام امینزارک نقاش تھا۔ لیکن بعض محققین کا قول ہے کہ وُہ طوسکانا کا رہنے والا تھا اور اُن ہی جزائر میں سے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں پیدا ہوا تھا۔

فیثاغورس اپنے باپ کا ہنرِ نقاشی خوب جانتا تھا۔ چنانچہ اُس نے تین سونے کے پیالے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نقش و نگار کر کے مصر کے تین مشہور قسیسوں کو تحفہ میں بھیجے تھے۔

اس حکیم کو اپنے معلمِ اوّل فیرسیدس سے بے انتہا محبت تھی۔ اور استاد بھی

اپنے شاگرد سے بہت محبت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ فیرسید بیمار ہوا۔ حکیم فیثاغورس اس کی عیادت کے لئے گیا تو اُستاد نے شاگرد کو آتے دیکھکر اس خوف سے کہ کہیں میرا مرض متعدی نہ ہو اور فیثاغورس اس میں مبتلا نہ ہو جائے فوراً دروازہ بند کرا دیا اور اپنی انگلیاں دروازے کے سوراخ میں سے نکال کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ لو ان کو دیکھکر سمجھ جاؤ کہ میں کتنا نحیف و نزار ہو گیا ہوں۔

فیرسید کے مرنیکے کئی سال بعد تک فیثاغورس وہیں رہا۔ اور اس زمانہ میں ہرمودامنط سے بہت ربط وضبط رکھا۔ آخر شوقِ تعلم وسیاحت نے اسکو ترکِ وطن پر مائل کیا۔ اپنا تمام اثاثہ فروخت کر کے وطن سے چل پڑا۔ ایک مدت طویل مصر میں رہا اور بہت سے قسیس سے ملا اور اُنکے دین کی خفیہ رموز سیکھے۔ اسی زمانہ میں اُس کے بادشاہ بولیقراط نے امزیس بادشاہِ مصر کو اس حکیم کے عزت واحترام کرنے کو لکھا۔ اس کے بعد فیثاغورس کلدانیوں کے مُلک میں اس غرض سے گیا کہ وہاں مجوسیوں کا علم سیکھے۔ پھر بلادِ مشرق میں پھرتا پھرتا مملکت اکریطہ میں پہنچا اور حکیم ایمینڈس سے مل کر دوستی پیدا کی۔ اور وہاں سے پھر اپنے وطن جزیرہ ساموس چلا گیا۔ یہاں آکر اُس نے دیکھا کہ اُس کے اہلِ وطن پر زیرِ حکم بولیقراط سخت ظلم وتعدی ہو رہا ہے۔ جس سے اُس کو سخت رنج ہوا۔ مگر سوا اس کے اور کچھ نہ بن پڑا کہ اُس نے خود ہمیشہ کے واسطے ترکِ وطن کر دیا اور ملک اٹلی کے شہر باقروطوں میں گیا اور میلون کے مکان پر فروکش ہوا۔ اور یہیں بیٹھکر اُس نے تعلیم وتعلم کا وہ سلسلہ جاری کیا کہ جس نے اسکو فلاسفہ اٹلی کا اوستاد الکل بنا دیا۔ چند ہی روز میں اسکا شہرہ تمام ملک اٹلی میں پھیل گیا۔ اور شاگردوں کی وہ کثرت ہوئی کہ تین سو سے زیادہ تعداد پہنچ گئی۔ ایک فرقہ ہی الگ بن گیا۔ جو ملک میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ شہزادہ "نوما" بھی ان ہی لوگوں میں ایک تھا کہ جو شہر اوقرطون میں فیثاغورس کی ملازمت میں رہا اور اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے اُس کی خدمت وصحبت نہ چھوڑی۔ لیکن تحقیق یہ ہے کہ شاہ نوما حکیم فیثاغورس سے بہت پہلے ہو گذرا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ اس بادشاہ کی رائے کو یہ حکیم بہت ہی پسند کرتا تھا۔

حکیم فیثاغورس کا قول تھا کہ ایک دوست کی چیز گویا تمام دوستوں کا مال ہی۔ دوستی تمام دوستوں کے درمیان میں رشتہ مساوات پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام شاگرد یک جان وچندین قالب تھے۔ کوئی چیز کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہ تھی۔ بلکہ ایک کی چیز سب کے استعمال میں آتی تھی۔ حتی کہ نقدی کا بھی یہی حال تھا۔

فیثاغورس کا ہر ایک شاگرد پانچ برس اُس کے پاس رہتا تھا۔ پہلے سال وُہ اپنے معلم کے اصُول کو صرف سُنا کرتا تھا۔ اس کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی معاملہ میں لب کشائی کر جائے۔ اس امتحان طویل اور اس شدت کو برداشت کرنے کے بعد اسکو اجازت ہوتی تھی کہ وُہ کلام کر سکے اور فیثاغورس سے مل سکے یا بات کر سکے۔

فیثاغورس نہایت صاحب رُعب وداب۔ معتدل القامت حسین صورت شخص تھا ہمیشہ پاک وصاف سفید صوف کے کپڑے پہنتا تھا۔ حظوظ نفس کی طرف کبھی مائل نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی اپنا راز اس کو بتلا دیتا تو وُہ اُس کو کبھی ظاہر نہ کرتا تھا۔ کسی شخص نے اس کو کبھی ہنستے۔ مذاق کرتے یا فضول بات زبان سے نکالتے نہ سُنا۔ غیظ وغضب میں بھی کبھی کسی کو ملامت نہ کرتا تھا۔ اپنے غلاموں کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ مارتا تھا ان ہی صفات سے اس کے شاگرد اس کی الوہیت کے قائل ہو گئے تھے۔ تمام ملک سے لوگ اس کے پاس فوج درفوج آتے تھے۔ اور اس کے حلقۂ درس میں بیٹھکر اس کی باتیں سُنتے اور ان پر غور کرتے تھے۔ جس شخص کو اُس سے باتیں

کرنے یا پاس بیٹھنے کا موقعہ مل جاتا تھا وُہ اپنے آپ کو سعید ترین انسان سمجھتا تھا۔

فیثا غورس نے لوگوں کی درخواست پر ہر فرقہ کے لئے الگ الگ قوانین بنا دئے تھے۔ اس حکیم کا احترام اس درجہ تک لوگوں کے دلوں میں بڑھ گیا تھا کہ عوام الناس اپنے بتوں کی طرح اس کی بھی قسم کھایا کرتے تھے۔ اس کا قول تھا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے اوپر اس درجہ جبر کرے کہ وُہ ایسا صاحبِ کمال ہو جائے کہ لوگ اس کا نام سُنتے ہی اس کے کامل ہونے کی تصدیق کریں۔

فیثا غورس کا خیال تھا کہ اس عالم کو رُوح و ادراک حاصل ہے۔ اسی رُوح سے اور بہت سی ارواح نکلتی ہیں۔ جو تمام آدمیوں اور حیوانات میں منقسم ہیں۔

فیثا غورس کا خیال تھا کہ رُوح فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک جسم سے نکل کر بذریعہ ہوا کے دُوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے خواہ کوئی جسم اس کو مل جائے۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی انسان کی رُوح نکل کر کسی گھوڑے۔ بھیڑئیے۔ گدھے۔ مُرغ یا مچھلی یا کسی اَور کے جسم میں داخل ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کی رُوح انسان ہی میں اور حیوان کی حیوان ہی میں داخل ہو۔ بلکہ رُوح کو جو جسم ملجائیگا اُسی میں داخل ہو جائیگی۔ یہی وجہ تھی کہ فیثا غورس جانوروں کے کھانے سے منع کرتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کا یہ خیال تھا کہ ایک مکھی یا مچھر کے مار ڈالنے کا اُتنا ہی گناہ ہے جتنا کہ ایک آدمی کے قتل کر دینے کا۔ کیونکہ تمام ارواح ایک ہیں اور وُہی تمام حیوانات میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

جب فیثا غورس نے ارادہ کیا کہ اپنے شاگردوں سے تناسخِ ارواح تسلیم کرائے تو اس نے اُن سے بیان کیا کہ مَیں عطارد (یکے از بتانِ یونان) کا بیٹا ہُوں۔ اور سب سے پہلے ایثالیدس کے قالب میں تھا۔ عطارد نے مجھ سے کہا تھا کہ بقاء دوام کے سوا جو کچھ تم مجھ سے طلب کرو۔ مَیں تمہیں عطا کر دوں۔ مَیں نے اُس سے ایسی قوت مانگی کہ جس کے ذریعہ سے مَیں دُنیا کے تمام حالات اور اپنی پچھلی زندگی کے حالات و

واقعات کو یاد رکھ سکوں۔ چنانچہ اُسیوقت سے مجھے وہ علم حاصل ہو گیا۔ جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے۔ وہ مجھے معلوم ہے اور نیز میری پچھلی زندگیوں کے حالات مجھے پوری طرح یاد ہیں۔ غرض ایثالیدیس کے قالب سے نکلکر میں اوفوریہ کے قالب میں آیا۔ جنگ ترواده میں موجود تھا اور ایک شخص مینلاس نامی کے ہاتھ سے میں نے زخم شدید کھایا۔ اس کے بعد میں ہرموتیموس کے قالب میں آیا۔ اور اس حالت میں میں نے اس عطیہ کو ثابت کرنا چاہا جو مجھے عطارد سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ میں شہر برانخید میں جاکر ہیکل اپولون میں گیا اور وہاں میں نے وہ سپر دیکھی۔ جو مینلاس نے اپنے مقابل سے بحالت جنگ چھینی تھی اور اپنی فتح کی یادگار میں اس ہیکل کو نذر کردی تھی۔ ہرموتیموس کے قالب سے نکل کر میں ایک چڑی مار کے جسم میں آیا اور اُس سے جدا ہوکر اس جسم فیثاغورسی میں۔ اس تناسخ میں میں اُس زندگی کو شمار نہیں کرتا ہوں کہ جو بقالب مرغ وطاؤس میں نے گذاری ہے"۔

اسی ضمن میں فیثاغورس نے یہ بھی بیان کیا کہ جب میں میدان جہنم کی سیر کر رہا تھا تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ہزیودس شاعر کی رُوح ایک ستون سے بندھی ہُوئی ہے اور اُس کے گلے میں طوق پڑے ہُوئے ہیں۔ اور وہ سخت شدتیں اُٹھا رہی ہے۔ پھر ہومیرس شاعر کی رُوح کو دیکھا کہ وہ ایک درخت پر ٹنگی ہُوئی ہے اور ہرطرف سانپ اُسکو لپیٹے ہوُئے ہیں۔ یہ اُن جھوٹوں کی سزا ہے کہ جو بتوں کی شان میں بکے تھے۔ اسی میدان میں میں نے اُن لوگوں کی رُوحوں کو سخت ترین عذاب میں دیکھا کہ جو اپنی عورتوں سے اچھی طرح پیش نہ آتے تھے اور اُنکو بُرا سمجھتے تھے۔

کہتے ہیں کہ فیثاغورس نے اپنے لئے ایک تہ خانہ بنوایا۔ اور اس میں داخل ہونے سے پہلے اپنی والدہ سے عہد لے لیا کہ جب تک میں اس تہ خانہ سے نکلوں جو کچھ میرے پیچھے شہر بھر میں واقعات گذریں نہایت تحقیق کے ساتھ انکو قلمبند کرتی رہے۔

پھر تہ خانہ میں گھُس کر اندر سے قفل لگا لیا۔ اور ایک سال برابر باہر نہ نکلا۔ اور جب نکلا تو نہایت نحیف و لاغر۔ ژولیدہ مو۔ پریشان رُو تھا۔ اور لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کہ مَیں دوزخ کی سیر کے لئے گیا تھا۔ اور اپنی تصدیق کے لئے اُس یادداشت کے رُو سے جو اُس کی ماں نے اُس کے واسطے تیار کر رکھی تھی وُہ تمام واقعات بیان کر دیئے جو اُسکی غیر حاضری میں گذرے تھے۔ چنانچہ لوگ اسکو معمولی انسانوں سے کچھ زیادہ سمجھنے لگے۔

ایک روز فیثا غورث معمولی سالانہ کھیلوں میں شامل تھا کہ اُس نے ایک آواز ماری جسکو سُن کر ایک گِدھ اُڑتا ہوا اُتر آیا جسکو دیکھکر لوگ حیران رہ گئے۔ یہ بھی فیثا غورث کا ایک کرشمہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ وُہ ایک گدھ کو پوشیدہ طور پر اس کی مشق کرا چکا تھا کہ اس کی وُہی خاص آواز سُن کر اُتر آیا کرتا تھا۔ اُس نے اپنا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھلانے کے لئے ایک یہ بھی ترکیب کر رکھی تھی کہ اپنے گھُٹنے سے اوپر ایک ران سونے کی بنوا رکھی تھی۔

بُتوں کے سامنے وُہ ہمیشہ آٹے یا گیہوں کی قربانی چڑھایا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ذی الارواح کی قُربانی بُتوں کی گُستاخی ہے۔ کیونکہ وُہ ایسی قربانیوں سے سخت ناراض ہوتے ہیں۔

فیثا غورث کے اصُول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ شکم سیری کو کسی قدر کم کھانے پر ترجیح دیتا تھا۔ تاکہ صحت قائم رہ سکے اور غور و فکر میں بندۂ شکم ہونا مانع نہ آسکے۔ اور عقل کو اپنے کام میں لگنے کا موقع مل سکے۔ جو کچھ وُہ دُوسروں سے کرانا چاہتا تھا۔ پہلے اس کی مثال اپنی ذات پر قائم کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اُس نے پانی ہی پی پی کر کئی دن گذار دیئے ہیں۔ اور اگر غذا کھائی ہے تو بہت تھوڑے سے دانے یا شہد یا میوے یا کوئی ترکاری۔ باقلہ وُہ کبھی نہ کھاتا تھا۔ نہ اس کے چھوڑنے کی کوئی وجہ کسی کو معلوم تھی۔

فیثاغورس کہا کرتا تھا کہ لوگ بحالت حیات دُنیا اُن لوگوں کی طرح ہیں جو کسی میلے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض تو آئے اور سیر کر کے چلے گئے۔ بعض نے خرید فروخت کی۔ بعض نے اپنے جدال و قتال سے لوگوں کو سیر دکھائی۔ بعض محض اسیر فخر ہیں اور بعض بندۂ حرص۔ بہت کم ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے لئے کسی چیز کی خواہش یا دُعا نہ کرے کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے لئے کونسا امر مناسب ہے اور کونسا نہیں۔

فیثاغورس کہتا تھا کہ انسان کی عمر کے چار مساوی حصے ہیں۔ بیس برس کی عمر تک وہ بچہ رہتا ہے۔ چالیس برس کی عمر تک جوان۔ ساٹھ تک مرد جوان اسی تک بوڑھا۔ اس کے بعد جو عمر گذرے وُہ زندگی میں شمار نہیں ہے بلکہ وبالِ جان ہے۔

اس حکیم کو علم ہندسہ و ہیئت کا بڑا شوق تھا۔ اسی نے یہ بات معلوم کی ہے کہ جو ستارہ بعض وقت صبح کو نکلتا ہے وُہی ستارہ بعض وقت شام کو نکلا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اسی نے اسکو ثابت کیا ہے کہ مثلث قائم الزاویہ کے وتر کا مربع باقی دونوں ضلعوں کے مربع کے مجموعہ کے برابر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب فیثاغورس نے یہ مسئلہ ثابت کیا تو اس کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہانتک اسکو الہام الٰہی سمجھا۔ اور فوراً یہ ارادہ کیا کہ سَو گائیں برائے اظہار شکر قربانی کرے۔ اگرچہ یہ امر تمام کتابوں میں درج ہے۔ لیکن جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ وُہ ذوی الارواح کی قربانی جائز نہیں رکھتا تھا تو قابلِ اعتبار نہیں رہتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح اُسکے متبع آٹے اور شہد کی گائے اور بکری بنا کر قربانی کرتے ہیں اُس نے بھی کر دی ہو تو ممکن ہے۔ بعض نے یہی لکھا ہے کہ اُس کو

اسی خوشی میں شادی مرگ ہوگیا۔ لیکن حکیم لوتھر نے لکھا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔

یہ حکیم اپنے شاگردوں کی آپس میں دوستی قائم رکھنے میں بہت ساعی رہتا تھا اور اکثر اُن کو بذریعۂ اشارات کے تعلیم دیتا تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم میزان سے بڑھ جاؤ یعنی حدودِ قانون سے نہ گذر جاؤ۔ کہا کرتا تھا جو کچھ تمہیں میسّر ہو اُس کو ایک ہی وقت نہ کھا جاؤ۔ یعنی آئندہ کا خیال رکھو۔

اپنے شاگردوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ ہر شخص سوتے وقت اپنے نفس سے مخاطب ہو کر یہ کہے کہ اے نفس آج تو نے کیا کیا۔ کہاں رہا۔ اور کیا کیا اچھا یا بُرا کام کیا وغیرہ۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ اپنا ظاہر حال اصل حال سے موافق رکھیں۔ خوشی و رنج کا اظہار نہ کریں۔ والدین کے ساتھ نیکی کرتے رہیں۔ ورزش کریں تاکہ بہت موٹے نہ ہو جائیں۔ اپنے اُستادوں کا ادب کریں۔ اور اپنی عمر بیسفر میں ضائع نہ کریں۔ عبادتِ الٰہی کی سخت تاکید رکھتا تھا۔

اس حکیم کا ایک تاتاری غلام زاموکنیز نامی تھا جس نے اپنے آقا سے تمام علوم سیکھے تھے اور اس کے قواعد معارف معلوم کئے تھے۔ جب وہ اپنے وطن میں واپس گیا تو تاتاریوں نے اس کا بڑا احترام کیا۔ اس کے لئے قربانیاں لیں اور اس کو بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔

فیثاغورس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کی اصل اوّل ایک ہی ہے۔ اسی سے اعداد نکلتے ہیں۔ اسی سے نقطے۔ نقطوں سے خطوط۔ خطوط سے سطوح۔ سطوح سے اجسام اور اجسام سے عناصر اربعہ یعنی آب۔ آتش۔ ہوا۔ خاک۔ جس سے عالم بنا ہے۔ جو ہمیشہ تحلیل اور متغیر ہوتا رہتا ہے۔ ایک چیز دوسرے میں جا ملتی ہے۔ جواہر عالم میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ جو کچھ تبدیلی نظر آتی ہے وہ محض تغیر ہے۔

اس حکیم کا قول ہی کہ زمین گول ہے - عالم کے درمیان میں واقع ہے - اور ہر طرف آباد ہے - یعنی اگر ایک شخص کے قدم سے لیکر خط کھینچا جائے تو وہ خط دوسری طرف کے آدمی کے قدم پر ختم ہوگا - یہی خط اس کرہ کا قطر سمجھنا چاہیے
بقولِ فیثا غورس جو ہوا محیطِ زمین ہے وہ نہایت آہستہ چلتی ہے اور بھاری ہے - یہی وجہ ہی کہ اس دنیا کے تمام حیوانات میں مرنے کی قابلیت ہے - برخلاف اس کے جو ہوا محیطِ آسمان ہے وہ نہایت رقیق ہے اور بہت تیز چلنے والی - اسی وجہ سے جو ذوی الارواح آسمان میں ہیں وہ غیر فانی ہیں اور اپنے ازلی و ابدی ہونے کی وجہ سے حق رکھتے ہیں کہ اُن کو خدا کہا جائے - چنانچہ چاند اور سورج اور تمام ستارے یہی خدا ہیں - کیونکہ وہ اس رقیق ہوا اور اس حرارت میں واقع ہیں جسکے اثر سے زوال نہیں ہو سکتا -

اس حکیم کی وجہ موت میں مختلف اقوال ہیں - بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے بہت سے شاگرد نکال دیئے - جس سے اُن کو سخت غصہ آیا - اور اُنہوں نے اس مکان میں آگ لگا دی جس میں یہ حکیم مقیم تھا - بعض نے لکھا ہی کہ شاہ اقرولیس نیاط نے اس خوف سے اُس کے گھر میں آگ لگا دی تھی کہ کہیں وہ جمعیت بہم پہنچا کر اس کا تخت و تاج نہ چھین لے - جب فیثا غورس نے ہر طرف شعلے اُٹھتے ہوئے دیکھے تو اپنے چالیس شاگردوں کو ساتھ لیکر وہاں سے بھاگ نکلا اور ایک ایسے جنگل میں پہنچ گیا جہاں بھوکوں مر گیا - بعض نے لکھا ہے کہ اس جنگل میں باقلا بہت ہوتا تھا - مگر اُس نے نہ باقلا کھایا نہ کھیتوں کو روندا اور اسی حال میں مر گیا - بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ وقت نے ایک دوسری قوم پر فوج کشی کی - یہ قوم اس حکیم کی مداح اور صحبت یافتہ تھی - اس لئے فیثا غورس نے ان کا ساتھ دیا - اور جب یہ شکست کھا کر بھاگے تو فیثا غورس بھی اُن کے

ساتھ تھا۔ اثنائے راہ میں ان فراریوں کو باقلا کے کھیت میں سے گذرنا پڑا۔ مگر اس حکیم نے اس کھیت کو نہ روندنا چاہا۔ اور وہیں کھڑا رہ گیا۔ فوج مظفر نے اُس کو وہیں اپنا نشانہ بناکر قتل کردیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اُس کے بہت سے شاگرد سوا معدودے چند کے قتل کردیئے گئے۔ ان ہی بقیۃ السیف میں اس کا شاگرد اشیتاس باشندہ طرنطینہ تھا کہ جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مہندس تھا +

محمد خلیل الرحمٰن

(ترجمہ از عربی)

غزل

کوئی عالم میں باوفا ہی نہیں
اب کوئی ہم کو پوچھتا ہی نہیں

کہکے بیت الصنم سے ہم پلٹے
کیا ہمارا کوئی خدا ہی نہیں

دیدنی ہے مرا تغیر بھی
کوئی عالم میں آشنا ہی نہیں

تم سے کہتا ہُوں دردِ دل اپنا
کچھ سُنا تم نے یا سُنا ہی نہیں

کہکے یہ مرگیا مریضِ غم
اِس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

دل نہیں جب تو کیا جیوں میں کہ
میری کشتی کا ناخدا ہی نہیں

اے مرا حال پُوچھنے والے
زیست کا کوئی آسرا ہی نہیں

تُم تھے اور ہم تھے دَورِ ساغر تھا
ہائے وُہ وقت بھُولتا ہی نہیں

چشمِ تر دل میں جس سے طُوفاں تھا
وُہ تو قطرہ ابھی بہا ہی نہیں

آہ کرتے ہیں کہہ دو گردوں سے
ہم نہیں یا یہ فتنہ زا ہی نہیں

جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا
واں کوئی ہم سے بولتا ہی نہیں

لاکھ دُنیا نے کھائے ہیں چکر
اپنے مرکز سے میں ہٹا ہی نہیں

واہ کیا زندگی ہماری تھی
رہ کے دُنیا میں کچھ کیا ہی نہیں

اے شبِ ہجر کس سے حال کہوں
کوئی اسوقت جاگتا ہی نہیں

کیا اُٹھیں ہم عزیز مقتل سے
فیصلہ تو ابھی ہوا ہی نہیں

میر انیس اور ہم

اس عنوان میں ایک مضمون رسالہ مخزن نومبر سنہ ۱۹۱۰ء میں میری نظر سے گذرا۔ یہ مضمون جناب واصلی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ کو ایک شاعر وہبی مانا ہے اور اُن کی شاعری کی نوعیت کو بہمہ وجوہ اعلیٰ معیار پر تسلیم کیا ہے لیکن اس رَو میں فاضل نامہ نگار سے جو غلط فہمی واقع ہوئی ہے وُہ مخزن کے ناظرین اور ہندوستان کی پبلک کو غلطی میں ڈالتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کمی کو پُورا کر دیا جائے۔ فاضل مضمون نگار یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اگر یہ بزرگ لندن میں پیدا ہوتے تو اس وقت اُنکے کمال کی چار دانگ عالم میں دھوم ہوتی" مَیں عرض کرتا ہوں کہ جس طرح مغربی اہلِ کمال کی شہرت ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں عالمگیر ہے اسی طرح اس شاعر فلسفی کی شہرت سات سمندر پار پہنچکر (انسائیکلوپیڈیا) کے صفحاتِ زریں میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں ترقی علم و فن کا آفتاب معراجِ کمال پر ہے۔ اور ہندوستان پر جہالت و غفلت کی تاریکی چھائی ہے۔ مگر متوزخانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملکوں میں علم و عمل پھیلانے کا زمانہ وہاں کے باشندوں کو تقریباً چار سو سال سے نصیب ہوا اور ہندوستان میں تعلیم مغربی کے آفتاب کی شعاعیں صرف پچاس سال سے نُور افشانی کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس کمی پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھنا پڑتا ہے کہ باوجود عدم اسباب و علل میر انیس کی شہرت کمال کو مقبولیت کے فرشتوں نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ فاضل مضمون نگار نے میر انیس کی شہرت اور مقبولیت پر محض ایک سطحی نظر ڈالی ہے اگر اُنکی نظر تحقیق میں ذرا

تعمق اور ذوق ہوتا تو انکو معلوم ہو جاتا کہ میر انیس کے کلام اور میر انیس کی شہرت کس مپرسی کی حالت میں نہیں اور ہندوستان کا کوئی شاعر یا اہل کمال میر انیس کی شہرت کے قریب ابھی تک نہیں پہنچا اور نہ سو پچاس سال کی دوڑ میں پہنچ سکتا ہے۔

قطع نظر اسکے مشرقی دنیا میں ابھی تک وہ طریقہ ہی جاری نہیں کہ جس ذریعہ سے اہل کمال کی شہرت غیر ملکوں کے باشندوں تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ جو کچھ بات میر انیس کو حاصل ہوئی یا محض تائید آسمانی یا تاثیر فلسفہ شاعری سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان میں اردو لٹریچر کی ترقی کا زمانہ دیکھتے ہوئے لندن کے لٹریچر سے مقابلہ کرنا کیسی غلطی کی بات ہے۔ جس قوم کو اپنی زبان کی درستی اور اسکو اعلیٰ پیمانہ پر لانے میں صدیاں گذر گئی ہوں۔ اس کے مقابل میں اُردو کے طلوع ہونیوالے آفتاب نے ابھی ایک منزل بھی طے نہیں کی ہے۔ ایسی حالت میں مغربی اہل کمال اور مشرقی شعراء کا موازنہ کرنا جادۂ تحقیق و انصاف سے انحراف کرنا ہے۔ ہندوستان کے مشاہیر اہل کمال سے قطع نظر کر کے اب مجھے صرف میر انیس کی شہرت کی بابت جناب واسطی کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہے۔

سُنئے ہندوستان کے شہروں میں نصف باشندوں کے گھروں میں میر انیس کا متبرک کلام موجود ہے۔ ہندوستان کے بچے اور عورتیں بھی اس مقدس نام سے ناواقف نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ پھر اور شہرت اور مقبولیت کس چیز کا نام ہے۔ انیس انیس پرانے خیال والوں کے بستوں میں اور انگریزی تعلیم یافتوں کی میزوں پر موجود ہیں۔ موجودہ اہل قلم کیسی ہی بے پروائی کریں مگر اس قدرتی شہرت کو کوئی روک نہیں سکتا۔ فاضل مضمون نگار ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں :- میر صاحب کی سوانح عمری اور انکے حالات زندگی۔ اُنکے کلام پر تنقید لکھنا تو ایک مہتم بالشان کام تھا اُنکے معتقدین بلکہ اعزہ و اقربا سے اتنا نہ ہو سکا کہ مرحوم کے کلیات

کا ایک صحیح نسخہ تو تیار کر دیتے اِس بے دردی مُردہ دلی بے حسی اور بے پروائی کا یہیں خاتمہ نہیں ہُوا بلکہ یہاں تک تحمل اختیار کیا کہ میر صاحب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرثیے بھی مرحوم کے گھرانے والوں نے آپس میں اس طرح تقسیم کر لیے جیسے جائداد اور انہیں اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کا مال۔ اکثر متداول اور مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند الحاقی بیان کئے جاتے ہیں۔ رسم الخط اور کتابت کی غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ ناقدری اور بے توجہی پر غصہ اور افسوس آتا ہے"۔

جناب واسطی کو یہ تو معلوم ہے کہ میر انیس کے متعلق مختلف مضامین کے علاوہ تین مبسوط کتابیں تین سال کے اندر چھپ کر شائع ہوگئیں اور اپنے اپنے طور پر مقبولیت حاصل کر چکیں مگر دنیا میں اقتدار پرستی اور وجاہت پسندی کی ہوا ایسی تیز چل رہی ہے کہ انصاف کے پھول پامال ہوئے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کی تصنیف کی بابت حضرت واسطی اس طرح مدح سرائی فرماتے ہیں: "علامہ شبلی! آپ جگ جگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار چاند لگیں کہ آپ نے میر صاحب کے کلام کو اصولی نظر سے ملاحظہ فرمایا۔ موازنہ انیس و دبیر کو میں آپ کے اولیات میں سے سمجھتا ہوں۔ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمانہ حال کے اصولِ تنقید کے موافق میر صاحب کے کلام پر ریویو لکھا" خیال فرمایئے اور انصاف کیجئے کہ جب آپ علامہ شبلی کی بابت جوشِ عقیدت میں ایسی رطب اللسانی فرمائیں اور غریب احسن اور مرحوم اثہری کی تالیف کو نقش ثانی اور ثالث بنا کر خاموش ہو جائیں تو ہم جیسے بےسواد کم علم اہل قلم کا حوصلہ پست ہو جائے یا نہیں۔ جب ہماری محنت اِس طرح خاک میں ملائی جائے تو دوسرے اہل قلم کو بمقابل ان شمس العلماؤں کے دنیا میں کچھ کام کرنے کا حوصلہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کی تالیف کو جوشِ عقیدت اور اقتدار پرستی کی وجہ سے آپ نے بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور واقعاتِ انیس اور حیاتِ انیس کا نام سن کر

آپ نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ اُونہوں ایک عالم کی تصنیف کے مقابل میں احسن نے کیا لکھا ہوگا اور اشہری مرحوم نے کیا توپ داغی ہوگی۔ مجھے خود ہسابات کا اقرار ہے کہ میرے مخدوم علامہ شبلی علمی دُنیا میں ایک قابلِ قدر شخص ہیں مگر نفسِ معاملہ سے اغماض کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اشہری مرحوم کی حیاتِ انیس میں صداقتِ واقعات سے مجھے انکار ہے تاہم اُنکی کتاب میں حسبِ قدر محاسن ہیں۔ مَیں نے اپنی کتاب میں اُن کی مدح سرائی کی ہے۔ اسی طرح ان تینوں کتابوں پر کافی نظر ڈال کر ہر ایک کی مخصوصات کا تذکرہ اگر آپ فرماتے تو ایک غریب کم علم بھی آپ کی رائے کا منت پذیر ہوتا۔ آپنے اولیت کا سہرا علامہ شبلی کے سر پر باندھا مگر اولیت کا انعام دینے میں سب سے زیادہ آپ نے بیدردی اور کم توجہی فرمائی۔ مجھے اُمید ہے کہ اس مضمون کو ملاحظہ کرنے کے بعد آپ حیاتِ انیس اور واقعاتِ انیس پر دوبارہ نظر ڈالینگے اور انشاء اللہ اپنے مضمون مندرجہ رسالہ مخزن کا موضوع آپ واقعاتِ انیس میں پائینگے کیونکہ مقید کا حصہ واقعاتِ انیس کے لئے مخصوص ہے۔ اب رہا یہ امر کہ میر انیس کے مرثیے جائداد کی طرح تقسیم ہوگئے تو اس میں شک ہی کیا ہے۔ خاندان انیس کی معاش کا مدار جب مرثیہ خوانی پر ہے تو مرثیوں کو اُنکی جائداد کہنا نہایت درست ہے۔ اُنکا حق تھا اُنہوں نے لیا اور قبضہ کر لیا کیونکہ اُن مرثیوں سے اُنکو اپنی مالی منفعت اور ترقیٔ خاندان کی اُمید تھی۔ وہ وارث تھے۔ میراث کے مستحق تھے تو اس میں کوئی مقامِ استعجاب و اعتراض نہیں اور نہ کوئی حق تلفی کہہ سکتا ہے۔ الحاقی بندوں کی بابت میرا یہ جواب ہے کہ پیشہ ور مرثیہ خوانوں نے اپنی ضرورت کے لئے ان بزرگوں کے کلام میں تصرف کیا۔ دیہاتی اور قصباتی لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے کسی نئے مرثیے کا مطلع چرا کے میں خلط کر دیا۔ کسی کے بند کسی میں ملائے۔ کسی کی جنگ کسی میں داخل کی اور مالی فائدہ اُٹھایا یہ محض اُنکی ابلہ فریبیاں ہیں۔ اس فعل کا اثر میر صاحب یا اُنکے خاندان پر کیا پڑ سکتا ہے

مرثیہ تو مرثیہ ہے جب علما سے دین سیکڑوں حدیثوں کو وضعی اور اختراعی قرار دے رہے ہیں اور آجتک اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا تو مرثیہ خوانوں نے اپنے فائدہ کے لئے اگر ایسے تصرفات کئے تو اصلی چیز پر کیا الزام آسکتا ہے ۔ جو لوگ تحقیق سے کام لیں اُنکو میرانیس کے صحیح مرثیے دستیاب ہوسکتے ہیں ۔ اب رہی کتابت رسم الخط یا خواندگی کی غلطی اس کا مطلب بھی کاتب اور خواندہ کے سر تھوپا جائیگا مصنفین اس الزام سے ہمیشہ بری ہیں آتی احتیاطیں تو آج تک کسی سے ہوسکیں اور نہ آیندہ ہوسکتی ہیں ۔

یہ بھی فقرہ جناب واسطی تحریر فرماتے ہیں کہ "میر صاحب کے عزیزوں نے اُن مرثیوں کو اس طرح چھپالیا جیسے چوری کا مال" ۔ میرے نزدیک یہ غلط فہمی ہے بلکہ اس طرح چھپالیا جیسے کوئی شخص بیش قیمت جواہر کو چوروں سے چھپاتا ہے ۔ پھر بھی اگر چور کبھی اتفاق سے کامیاب ہوگئے تو بجائے ایک بیش قیمت ہیرے کے کہیں کانچ کا نگینہ لگا دیا اور کہیں پتھر کا ٹکڑا نصب کردیا جس سے آج مخالفین کو اعتراضوں کا موقع ملا ۔ میر صاحب کے خاندان سے جو مرثیہ تقسیم ہوا وہ صحیح نکلا اُس کے بعد ایک دوسرے سے سیکڑوں نقلیں اُتارتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ غلطیوں کی تعداد بڑھتی گئی ۔ اُن غلطیوں کا صحیح کرنا خاندان میر انیس کا کام نہ تھا اور نہ یہ امر ممکن تھا کہ سیکڑوں مرثیے تلاش کر کے اُنکی تصحیح کی جاتی ۔

دوسری یہ بات کہ بہت سے مرثیہ خوان اس قسم کے ہیں کہ جو سال بھر حجامت بناتے ہیں یا تارکشی کرتے ہیں اور محرم میں فتوح حاصل کرنے کے لئے نخاس سے دو دو پیسے والے چھپے ہوئے مرثیے مول لیکر نہایت شان و شوکت سے شہر کے باہر نکلتے ہیں اور اپنے آپ کو ارشد تلامذہ انیس و نفیس ظاہر کرتے ہیں ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو معزز حضرات کو اُن کی میزبانی کا شرف کیونکر حاصل ہو اور جہان کو فائدہ کیونکر پہنچے ۔ اب اگر ایسے لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ اِپی ہوئی کسے کہتے ہیں تو وہ

غریب کیا جواب دے سکتے ہیں۔ کسی کام کا اہل ہونا اور بات ہے اور کسی کام کو فنوناً اختیار کرنا اس کے کچھ اور معنی ہیں۔

ایک مقام پر فاضل مضمون نگار صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

دو برس ہوئے کہ راقم کو ایک لکھنوی ذاکر کی عزت میزبانی نصیب ہوئی۔ خاندان میر صاحب سے تعلق تلمذ بیان کرتے تھے۔ مرثیوں کے چیدہ چیدہ بند سُنانے لگے پیپلا سروہی کھانڈا وغیرہ الفاظ جو آئے تو ایک صاحب پُوچھ بیٹھے کہ حضرت پیپلا سروہی اور کھانڈا میں کیا فرق ہے ؟

تیور بدل کر فرمایا کہ یہ بال کی کھال نکالنا بزقصابوں کی طرح کچھ پنجابیوں ہی کو خوب آتا ہے۔ اُنہوں نے پھر پوچھا کہ حضور ! یہ اُپی ہوئی کیا ؟ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ "بہی اُپی ہوئی"۔

مرثیہ خواں صاحب کے جواب سے اُنکی تہذیب بتا رہی ہے کہ وُہ کس درجہ کے مرثیہ خواں تھے مگر مرثیہ خواں سے زیادہ ہمیں سوال کرنے والے کی حالت پر افسوس کرتا ہُوں کہ وُہ (پیپلا) بھی نوع اسلحہ سے سمجھے۔ کھانڈا یہ بھدا لفظ مجھے یقین نہیں آتا کہ میر انیس کے کلام میں کہیں ہو ایک مقام پر حضرت واسطی میر انیس کے نقادوں سے فرمایش کرتے ہیں کہ میر صاحب کے کلام میں جابجا تلمیحاً اُحد خندق خیبر بدر صفین وغیرہ کا ذکر آگیا ہے۔ نقاد کو یہ بھی بتانا چاہئیے کہ یہ مقامات کہاں ہیں اور کس سنہ میں ان مقامات پر غزوات واقع ہوئے۔

یہ مقامات کہاں ہیں۔ اسکو جغرافیہ بتائیگا اور کون کون لڑائی کس سنہ میں ہوئی۔ اِس مسئلہ کو تاریخ حل کریگی۔ پھر آپ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ کمان چلہ گوشہ وغیرہ سے لوگ ناواقف ہیں۔ تیر اور خدنگ سوفار پیکان ناوک کسے کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

ہاں ایک آپ کا سوال یہ بھی ہے کہ ابن سعد خولی شمر سنان بن انس حُر مسلم عوسجہ عنتر مرحب کون تھے۔ یہ بھی تنقید کرنے والے کو بتانا چاہیئے۔ مَیں عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ علم رجال سے حل ہو جائیگا اور اگر ایک مرتبہ ہم کسی جاہل کو بتا بھی دیں تو پھر بھول جائیگا۔ اب رہے اہل علم۔ انکی پیشِ نظر کتب علم رجال و انساب ہیں وُہ دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں جناب واسطی جناب رشید مدظلہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور انکو یادگار جناب نفیس تحریر فرماتے ہیں۔ یاللعجب آپ اپنے ہمعصروں کا حال نہیں جانتے اور سیکڑوں برس گذشتہ کے اسمار کی تحقیق میں اتنی کوشش۔

سُنئیے یادگار جناب نفیس :- برادر مکرم دُولہا صاحب ہو سکتے ہیں یا اخی معظم میر علی محمد صاحب عارف کو یادگار نفیس کہنا چاہیئے۔ ہاں البتہ انیس کے نواسے ہونے کی وجہ سے۔ مخدوم و مکرم رشید صاحب یادگار کہے جاسکتے ہیں۔ بہرکیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اصل مقصد یہ ہے کہ جناب واسطی جناب رشید مدظلہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ میر انیس کے تمام کلام پر تنقید لکھ ڈالئے اور تنقید میں ان مطالب کو پیشِ نظر رکھئے۔ لوازم شاعری تخیل انیسی۔ فنون سپہگری علم رجال علم انساب تشریح آلاتِ حرب و ضرب۔ تفصیل اقسام اسلحہ توضیع غزوات جناب رسالت مآب صلعم فہرستِ اسما، مجاہدین و انصار شمار افواج کفار۔ نقشہ میدان کربلا وغیرہ وغیرہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ مَیں بھی دعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم میرے مخدوم کی عمر میں پچاس سال اس کام کے لئے اور عنایت فرمائیے کہ وُہ اپنے فرائض حصولِ معاش یعنی مرثیہ گوئی کو چھوڑکر ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ مگر خوف یہ ہے کہ اسکو بھی لوگ نقش برآب کہکر خاموش ہو جائینگے۔

سید مہدی حسن احسن لکھنوی

ہجوم فرائض

توکز محنتِ دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہ مضمون لاہور کی پردہ کلب کے ایک جلسہ میں جس میں ہندو مُسلمان معزز خواتین اور بہت سی انگریز لیڈیاں شریک تھیں۔ برج کماری صاحبہ نے جو کہ دیوان نرندر ناتھ صاحب بہادر ایم۔ اے کی صاحبزادی ہیں پڑھا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ ہم اسے نہایت خوشی سے چھاپتے ہیں۔

ایشور نے انسان کو خلعتِ ہفت پارچہ یعنی حواسِ خمسہ اور عقل و روح سے سرفراز کر کے خطابِ اشرف المخلوقات عطا کیا جو اس کی حالت کے بالکل مناسب تھا۔ عقل کا بیش بہا تحفہ اپنی تمام پیدا کردہ مخلوقات میں سے اس کو بخشا۔ ہندوؤں کا فلسفہ بُدھی کو آتما کا اعلیٰ ترین وصف قرار دیتا ہے۔ ہماری مُسلمان بہنوں کی دینی کتاب قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا نے امانتِ عقل کو زمین آسمان اور پہاڑوں کے آگے پیش کیا۔ مگر سب نے اسکو لینے سے پہلوتہی کی اور ڈر گئے مگر انسان نے اس کو قبول کیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وُہ بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی نادان تھا۔ عقل کے قبول کرتے ہی ہزاروں فرائض لاکھوں بکھیڑے کروڑوں مخمصے۔ اِنسان پر پڑ گئے۔ جانوروں کی طرح صرف زندہ رہنا اپنی ضروریات مہیا کر لینا اور اپنا پیٹ پالنا ہی اس کا فرض نہ رہا۔ بلکہ اپنے ہمجنسوں کے فرائض انکے ناموس کا پاس انکے بہبُود کی کوشش سب اس پر فرض ہوا۔ غرض اس چند روزہ زندگی میں فرائض کا بڑا بھاری ہجوم اس کے واسطے ہو گیا اور زندہ رہنا اور دُنیا

کی نعمتوں سے حظ اٹھانا ۔ کوئی آسان کھیل نہ رہا ۔ بلکہ اس سفر کی راہ پُرخطر اور منزلیں بہت ہی دشوار گذار بن گئیں ۔ ایک یونانی مصنف کا قول ہے کہ انسان ایک نقطہ کی مانند ہے جسکا مرکز صرف ایک اور دائرے بہت سے ہیں ۔ پہلا دائرہ والدین وغیرہ کا ۔ دُوسرا گھربار بال بچوں کا ۔ تیسرا دیگر عزیز و اقربا کا ۔ چوتھا ملک وملت کا ۔ ہمیں اکثر خیال آتا ہے کہ اگر ان سب فرائض سے آزاد ہوتے تو شاید ہماری زندگی بہت اچھی طرح کٹتی ۔ مگر یہ خیال محض غلط ہے ۔ شروع شروع میں تو ان سب فرائض سے الگ ہو بیٹھنا شاید کچھ بھلا معلوم ہو ۔ مگر رفتہ رفتہ اس قسم کی آزادی ضرور دُوبھر معلوم ہونے لگے گی ۔ اور جی چاہیگا کہ اُسی طرح پابند فرائض ہو جاویں اور ان تمام فرائض کو جن کی ادائیگی روزِ ازل سے ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے ادا کریں اور اس راحت کی وجہ سے جو اس سے حاصل ہو ۔ اطمینان سے بیٹھیں ۔ ایک دُوسرا مصنف کہتا ہے کہ فرض ادا کرنے سے وہ فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے جو کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو تختِ زرّین پر بیٹھکر اور مرصع تاج سر پر رکھ کر بھی نہیں ہوتی ۔

میں اس وقت اُس فرض کی نسبت کچھ کہنا چاہتی ہُوں ۔ جس کا سب سے آخر نام لیا ہے ۔ یعنی فرض ملک وملت ۔ یہ فرض کسی ایک شخص پر نہیں ہر بلکہ قوم کے ہر فرد پر اپنے ملک کو بنانا اس کی گری ہُوئی حالت کو اُبھارنا ۔ کھُوئی ہُوئی عظمت اور برباد شدہ حرمت کو سنبھالنا ۔ وہ مُلک جو کسی وقت دُنیا کی اعلیٰ ترین قوموں میں سے تھا مگر جس کی عظمت دورِ فلک نے جو کبھی کسی مُلک یا قوم کی حالت ایک سی رہنے نہیں دیتا ۔ جس کا روزِ ازل سے بنا بنا کر بگاڑنا اور جگا جگا کر سُلا دینا شیوہ رہا ۔ آج ہماری حالت بھی دگرگوں کر دی ۔ یہاں تک کہ گذشتہ عظمتوں کے صرف تذکرے ہی باقی رہ گئے ہیں

ہے کیسا یہ انقلاب جاری زماں ہیں سائر مکاں میں ساری
نہ اس سے خاکی بچا نہ ناری فلک پہ پہنچا زمیں پہ چھاکر

اب ہماری نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت گردن پر سوار ہے۔ اُمرا۔ جو ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جنکو ملت کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے۔ زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کی طرف متوجہ نہیں۔ ایسی قوم کو سنبھالنا اسکی بگڑی بنانا۔ اسکی حالت درست کرنا کسی ایک فرقہ کی کوشش سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر شخص کی بڑی جانفشانی سے ہو سکتا ہے۔ کسی عالیشان اور خوبصورت عمارت کے بنانے میں طرح طرح کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔ نرمی سختی نزاکت پختگی وغیرہ وغیرہ۔ عمارتِ قومی کی بنیاد میں اگر انکسار کی ضرورت ہو تو ہم سب کو بھی کنکر بنکر پڑ جانا چاہئے۔ وہ وقت بھی آئیگا کہ ہم اسکو ایک عالیشان اور خوبصورت عمارت بنا ہوا دیکھینگے۔ اب صرف زبانی جمع خرچ ہی کی ضرورت نہیں بلکہ سخت محنت کی حاجت ہے۔ جو ابھی تک کہیں نظر نہیں آتی۔

اس نیک کام کا آغاز کسی خاص تعریف یا شہرت حاصل کرنے کے خیال سے نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ صرف اپنے ملک کی محبت اور فرض کے خیال سے۔ ملک رُوم میں ایک زمانہ تھا جب وہاں کے پہلوان دمعذوں اور جنگلی جانوروں سے نہایت بہادری کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔ مگر ان کی وہ بہادری اور دلیری اس خیال سے کہ وہ صرف روپیہ کے لالچ اور لوگوں سے تعریف حاصل کرنے

کے لئے بھی ہرگز پسندیدہ نہیں ۔ خدا کے غیر فانی ہاتھوں کی بنائی ہُوئی چیزیں بھی رفتہ ہی رفتہ ترقی کرتی ہیں اور یہی اصُول نباتات ۔ جمادات ۔ حیوانات سب پر حاوی ہے ۔ ترقی ملک و ملت بھی ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہی شروع ہوتی ہے ۔ جو ایک روز اپنی ترقی سے اہل دُنیا کو محوِ حیرت کر دیتی ہے ۔ انگلستان جیسا اسوقت ہے صدیوں کی کوشش کے بعد بنا ۔ وہاں کی عمارتِ قومی کے معماروں اور تہذیب بنانے والوں میں ہزاروں مثالیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی خدمتِ ملکی و قومی میں وقف کر دی اور انکا نام بھی کسی کان تک نہ پہنچا ۔ نہ ان کی سوانح عمریاں لکھی گئیں ۔ نہ ماتمی جلسے ہُوئے ۔ نہ کسی نے فاتحہ پڑھی ۔ اور نہ کوئی چشم تر ہُوئی ۔ اگرچہ اُنہوں نے دُنیا میں نام نہ پایا ۔ عمر بھر اپنی کوششوں کو کامیاب ہوتا نہ دیکھا ۔ مگر اپنا فرض ادا کیا اور مثال قائم کر گئے ۔ اور آنے والوں سے اُمید رکھی کہ وُہ اُنکی ڈالی ہُوئی بنیاد کو مکمل کرینگے ۔ دُنیا ایک میدانِ کارزار ہے جس میں فتح کا فخر اور تعریف حاصل کرنے والے معدودے چند ہیں ۔ اگرچہ ظفر چھوٹے چھوٹے کاموں پر ہی مبنی ہے ۔ خداوندِ دو عالم نے انسان کو وُہ قوتِ ارادہ بخشی ہے کہ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو ہرگز کوئی بات مانع نہیں ہو سکتی ایک انگریز فلسفی جان سٹوارٹ مل کا قول ہے کہ ہم یہ بخوبی معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم کسی جادو کے زور سے کسی خاص بات کی پابندی پر مجبور نہیں ۔ اور جو کچھ بہتر سمجھیں کر سکتے ہیں ۔ اور اس کے برخلاف خیال کرنا اپنی قابلیتوں کو گھٹانا اور اپنے رُتبہ کی ہتک کرنا ہے ۔ آئین و قوانین کا مقرر ہونا اور سب کا ان پر عمل کرنا اس بات کی پُوری پُوری دلیل ہے ۔ ایک دُوسرا مصنف کہتا ہے کہ سب سے بڑا کمینہ وہ ہے جسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں ۔ اور جو اپنے ارادہ کو پورا نہیں کرتا

جب تک ہر فرد بشر جس میں ہم عورتیں بھی شامل ہیں۔ اپنی فلاح کی کوشش کرے اور جو کچھ بن پڑے کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ہماری ترقی مشکل ہے۔ ہمارا فلاح ملک و ملت میں دخل دینا اور اپنی بہبودی اور بہتری کی کوشش کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ غیر ملک تو رہے درکنار ہمارے اپنے ہندوستان میں عورتیں ہمیشہ ملکی خدمات بجا لاتی رہی ہیں۔ سوشل ترقیوں کی کوشش تو خیر ان کے بس کی ہی بات ہے۔ ہندو اور مسلمان بہنوں نے بعض موقعوں پر ملکی امور میں عجیب و غریب بہادری دکھائی ہے۔ راجپوتانہ کی تواریخ کے صفحات راجکماریوں کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے پیارے ہند کی مستورات ہمیشہ سے اپنے اس بڑے فرض سے ایسی غافل نہیں تھیں۔ جیسی کہ اب ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک اور ملت کے لئے جان دینے کو آمادہ تھیں اور اس زندگی کو جو خدمات ملکی اور قومی میں صرف ہوئی۔ ابدی زندگی کہتی تھیں۔ مجھے اس مضمون کو اپنی بہنوں کے آگے پڑھکر ان کو اپنے فرائض یاد دلانا منظور ہے۔

ہمارے ملک کی فلاح بغیر ہماری مدد کے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بقول ایک لائق خاتون کے عمارت قومی کے معمار مرد نہیں بلکہ ہم ہیں۔ ہم سب کو واجب ہے کہ تھوڑا تھوڑا حق اپنی قوم کی مائیں اور بہنیں ہونے کا ادا کریں اور ان کاموں کی بنا ڈالیں کہ جو ابھی تو نہیں مگر وقت پاکر وہ نتائج پیدا کرینگے۔ جن سے ہماری قوم کی فلاح میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ اور ہم سب اس اشتیاق کے ساتھ اس مبارک وقت کی منتظر رہیں۔ جب ہمارے لگائے ہوئے پودے برگ و بار لائینگے۔

مس نرندر ناتھ

تصویر کے دو رُخ

"رشید - اخاہ کب آئے - رہے تو اچھے - کہو لکھنؤ اور دیوبند میں کیسی گذری - سُنتے ہیں کہ ان دونوں جگہوں میں عربی فارسی کی تعلیم کا انتظام اچھا ہے اور غریب و نادار طالبعلموں کو بھی مخیر و مستطیع لوگ امداد پہنچاتے ہیں - تم نے خوب مُستعدی سے پڑھا ہوگا - ماشاء اللہ تم پہلے ہی سے طبیعت دار تھے - یہاں بھی جب تک تم رہے اپنے ہم سبق لڑکوں میں بڑھ چڑھ کر تھے - ذہین تم تھے ہی اور تمہیں عربی فارسی پڑھنے کا بھی شوق تھا - اُستاد تو تم سے خوش رہے ہونگے اور تمہارے ساتھیوں نے بھی تمہاری خداداد لیاقت دیکھکر کہا ہوگا کہ یہ بھی کچھ ہے - ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو کہ آجکل لوگوں کی طبیعتیں انگریزی پر اتنی مٹی ہوئی ہیں کہ عربی فارسی کا نام تک نہیں لیتے بیٹا! انگریزی پڑھنے میں تو کوئی ہرج نہیں لیکن اُسی کے ساتھ ہم پر فرض ہو کہ ہم اپنے مذہب کو نہ بھولیں اور خدا و رسُول کو پہچانیں - خدا ان لوگوں کی ہمت میں برکت دے جو اس زمانے میں بیچاری عربی فارسی کی دستگیری کرتے ہیں۔"

"رشید! تم تو بہت اچھی اچھی باتیں سیکھ کر آئے ہو - اب تو ہم کو جو بات نہ معلوم ہوگی تم سے پوچھا کرینگے اور تم بھی بتانے میں لحاظ نہ کرنا - دیکھو تو تم کتنی اچھی تقریر کرتے ہو اور بات بات میں قرآن و حدیث کی سندلاتے ہو - ہاں بھئی کیوں نہ ہو "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"!
ہم تو پہلے ہی بھائی جان سے کہتے تھے کہ انشاء اللہ تعالیٰ رشید بہت

یاقت حاصل کریگا۔ الحمدللہ کہ تم نے میری بات رکھ لی۔ ہاں بیٹا! دیکھو تم یہاں
لف نہ کرو۔ یہ تمہارا گھر ہے میں تم کو سعادت (ان کا لڑکا) سے کم نہیں سمجھتا۔
چھا آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اچکن اُتار کر کیل سے لگا دو"۔

واہ بھئی واہ! اب کوئی جانے کا وقت ہے۔ کھانا تیار ہے۔ کھا کر آرام
سے یہیں لیٹنا۔ شام تک چلے جانا۔ اس وقت دھوپ بھی زیادہ ہو گئی ہے
تکلیف ہو گی۔ اور ابھی تو تم سعادت سے نہیں ملے وہ اب آتا ہی ہوگا۔
ل سے اپنی خالہ اماں کے یہاں گیا ہے۔ اُن کا تو اصرار تھا کہ میں سعادت
د دو چار دن نہ آنے دونگی مگر میں نے کہا کہ نہیں اس کے پڑھنے کا ہرج ہوگا۔

"ہاں سعادت اب مکتب جاتا ہے۔ پہلے تو ڈیڑھ سال تک میں نے خود
سے گھر پر پڑھایا اور جب دو چار فارسی کی کتابیں نکل گئیں تو میں نے اُسے مولوی
ظہر اسلام صاحب کے سپرد کر دیا ہے۔ مولوی صاحب بیچارے بہت نیک
دمی ہیں اور لڑکوں کو ایسی محبت کے ساتھ پڑھاتے ہیں کہ وہ اُن سے بہت
نوس ہو جاتے ہیں۔ اب سعادت کا یہ حال ہے کہ مکتب جانے سے ذرا
ی جی نہیں چُراتا۔ بلکہ اگر روکو بھی تو نہیں مانتا۔ کل کی بات ہے کہ گھر
ں حضرت (ان کے پیر) کی دیگ تھی۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور
زیزوں کو مدعو کیا تھا۔ تمہاری چچی (ان کی بیوی) نے سعادت سے کہا
آج مکتب نہ جانا۔ گھر پر ہی رہنا۔ سب لوگ آئینگے۔ دیکھنا بھالنا۔ مگر
نہ مانا۔ میں نے سمجھا کہ شاید میرے خیال سے یہ ایسا کہتا ہے۔ میں نے
ی اس سے کہا کہ ہاں آج پڑھنے نہ جانا۔ ہم مولوی صاحب سے کہدینگے۔
ا پر وہ کہنے لگا کہ نہیں باوا! میں جلدی چلا آؤنگا۔ سبق کا ہیکو ناغہ ہو"۔

" لو سعادت بھی آ گیا۔ سعادت ادھر آؤ۔ دیکھو تمہارے رشید بھتیا

آئے ہیں۔ دونوں بھائی ملو۔ رشید تم نے تو اسے پہچان لیا ہوگا۔ لیکن شاید اس نے تمہیں نہ پہچانا ہو (سعادت سے) یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ تمہارے چچا جان جو لا لا کر مٹھائی اور کھلونے دیا کرتے تھے اور تمہیں بہت پیار کرتے تھے۔ اُن کے یہ بیٹے ہیں"۔

"اچھا سعادت! اب اپنے بھیا کو کھانا نہ کھلاؤ گے۔ دیکھو تیار ہوگا۔ لوا لاؤ"۔

"دیکھو میاں رشید! تم تکلّف نہیں چھوڑتے۔ ارے بھائی کھانے میں تو کسی کو تکلف نہ کرنا چاہئیے اور پھر یہ تو تمہارا گھر ہے۔ گھر میں آدمی کو کس بات کا لحاظ ہوتا ہے خوب سیر ہو کر کھاؤ"۔

"گل چمن! دیکھ رشید کے لئے اور میٹھا لانا۔ سعادت! یہ کباب کی طشتری رشید کی طرف بڑھا دو۔ رشید! دیکھو یہ میٹھی چٹنی کتنی لذیذ ہے اور یہ پیٹھے کا مربہ خاص قسم کا ہے۔ اس ٹکڑے کو دیکھو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بالکل کچے ہوں۔ مگر ذائقہ میں بہت اچھے ہیں۔ کھانے میں بھی کرکراہٹ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ترکیب سے بنتا ہے"۔

"بس واہ! ابھی اور کھاؤ۔ تم تو اس قدر تکلف کرتے ہو جس کی انتہا نہیں۔ اچھا بالائی کے ساتھ تھوڑا سا میٹھا اور کھا لو۔ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دو ایک قاش مربے کی اور لو۔ منہ نمکین کرنے کے لئے اچھا تھوڑا سا شامی کباب چکھ لو"

"بخدا! میں نے تمہاری وجہ سے کوئی تکلف نہیں کیا۔ گھر میں جو کچھ معمولی طور سے پکتا تھا وہی تمہارے سامنے آیا ہے۔ صرف میٹھا اور پکوا لیا تھا اور یہ مربے وغیرہ تو میرے ہاں ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ گاجر کا

حلوہ سعادت اپنی خالہ اماں کے یہاں سے لایا تھا۔ اُن کو مربّے اچار۔ چٹنی وغیرہ بنانے کا بہت شوق ہے۔"

"بھئی اب جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں شام تک جانا۔ اب یہیں کچھ دیر آرام کرو۔"

"خیر! اگر ایسی ہی مجبوری ہے تو مَیں زیادہ اصرار نہیں کرتا۔ لیکن میاں رشید کبھی کبھی اس طرف آنکلنا چھوٹے کو بہت بہت پیار کرلینا۔ آج تم سے اس کی علالت کا حال سُنا ہے۔ میری طبیعت لگی رہیگی۔"

"اچھا (گلے لگاکر) خدا حافظ" (رشید کے ہاتھ میں دو روپیہ رکھدیتے ہیں اور رشید واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے)۔

"نہیں نہیں مَیں نہ مانوں گا۔ خالی ہاتھ تھوڑے جاؤگے۔ بھئی اچھا اگر تمہیں لینے میں عار ہے تو راستے میں کہیں سے چھوٹے کے لئے مٹھائی لیتے جانا اور دیکھو مخدوم تمہارے ساتھ آتا ہے۔ اس مرتبان میں کچھ مربّہ اسے دیدیا ہی گھر میں سیہون کو دیدینا ...."

میر فرخندہ علی پُرانی وضع کے ایک متوسط الحال پیرمرد اپنی نشستگاہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔ یہ کمرہ ان کا گویا ڈرائنگ رُوم ہے۔ لیکن یہاں آپ کو آرائش کا وہ سامان نظر نہ آئیگا جسکے بغیر کسی مہذّب جنٹلمین کی عزت میں بٹّہ لگجاتا ہے۔ پھر بھی دیکھئے باوجود اپنی سادگی کے یہ جگہ کس قدر دلچسپ ہے۔ دری کا فرش ہے۔ اس پر سفید برّاق چاندنی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ صدر میں ایک قالین لگا ہُوا ہے اور اُس پر دیوار سے ملا ہُوا ایک گاؤ تکیہ رکھا ہے۔ تکیہ پر بھی صاف غلاف چڑھا ہُوا ہے۔ ایک کونے میں آگرے کی بنی ہُوئی خوبصورت جانماز بچھی ہے اور اس کے سرے پر عقیق البحر کی ایک تسبیح رکھی ہے۔ جانب مغرب ایک مختصر الماری

میں کچھ کتابیں ہیں۔ کتابوں میں آجکل کے ناول نہیں جو نوعمروں کو اپنے پیچھے باؤلا بنائے ہُوئے ہیں بلکہ اُن میں زیادہ تر فارسی تصانیف ہیں۔ ان کو میر صاحب نہایت عزیز رکھتے ہیں اور فرصت میں ان کے مطالعہ سے حظ حاصل کرتے ہیں اور اکثر اُن کے پُرلُطف مضامین اپنے یار دوستوں کو بھی سُناتے ہیں۔

اس وقت ایک نوجوان ان کا مخاطب ہے۔ یہ میر صاحب کے ایک دوست کا صاحبزادہ ہے۔ میر صاحب اور اس کے والد میں بہت ارتباط ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہمدردی و محبت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ میر صاحب اپنے دوست کو جن کا سن ان سے کسیقدر زیادہ ہے۔ بھائی جان کہا کرتے ہیں۔ رشید کو دیکھکر میر صاحب بہت مسرور ہیں اور اُن کی خوشی کا اظہار اُنکی حرکات وسکنات سے ہو رہا ہے۔ دیکھئے باتیں بھی کتنے مزے کی ہیں کہ دلی محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ باتیں کیا ملنساری اور بزرگانہ عنایت کی ہُوبہو تصویر ہیں۔

نئی روشنی والے پُرانی وضع کے بزرگوں کو خواہ کسی قدر ذلت کی نگاہ سے دیکھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ وضعداری اور خلوص و محبت کے خاص طور پر پابند ہوتے ہیں۔ محدود خیالات اور کم نظری کے باوصف اُن میں بعض مخصوص صفات ایسی پائی جاتی ہیں جو ہمارے ملک کے نئے طبقہ میں بالکل مفقود نظر آتی ہیں۔ ان میں وُہ اوصاف بدرجہ اتم موجود ہوتے ہیں جو حقیقی اُلفت اور صحیح ہمدردی کی سچّی تصویر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اُن کا خلق ظاہری نمائش اور بناوٹ سے معرّا ہوتا ہے۔ اُن کا اخلاق نہایت وسیع اور ہر کہ ومہ کے ساتھ یکساں رہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وُہ قومی ہمدردی سے محض ناواقف ہوتے ہیں۔ تاہم فرداً فرداً وُہ اپنے دوستوں آشناؤں۔ مہمانوں اور عزیزوں کے ساتھ ایثار نفس اور خالص اُنسیت کا برتاؤ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

اُن میں ایک قابلِ تعریف بات یہ ہوتی ہے کہ ظاہرداری اور تصنّع سے اُن کے قول و فعل کو مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ جو بات اُن کے دل میں ہوتی ہے اُس کے اظہار میں وُہ تامّل نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ اَوروں کے جذبات کو صدمہ پہنچانا گناہِ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔ اُن کی وضع و قطع سیدھی سادی ہوتی ہے۔ اُن کا طرزِ زندگی سادگی اور کفایت شعاری کا مکمل نمونہ ہوا کرتا ہے۔ اُن کی گفتگو بے تکلف اور روزمرّہ کی زبان میں اُنکے اصلی خیالات و خواہشات کا سچا عکس ہوتی ہے۔ وُہ جس سے ملتے ہیں خلوصِ دل کے ساتھ اور بے غرض ملتے ہیں۔ غیروں کی امداد میں اُن سے جو کوشش ممکن ہوتی ہے اُس سے اُنہیں دریغ نہیں ہوتا۔ غرضکہ وُہ نہایت راستباز اور متواضع ہوتے ہیں اور اُنہیں خلاقِ مجسم کہنا واقعیت کا اظہار کرنا ہے۔

اِس کے برخلاف ہم پر نظر ڈالئے جو نئی روشنی کے شعاعوں سے اپنے دل و دماغ کو منوّر کر چکے ہیں اور عالی خیال و تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُس جماعت سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ جس کی حوصلہ افزا و دل خوش کن مساعی پر مُلک کی نجات منحصر ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھئے اور ہماری اور اُن بڑے بوڑھوں کی حالتوں کا موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ وہاں اگر نمائش اور ظاہرداری کی جھلک تک نظر نہ آئیگی تو ہم یہاں سر سے پیر تک تصنّع سے ملوّث دکھائی دینگے۔ جس چیز کا نام ہم نے تہذیب رکھا ہے وُہ آپ کو ہمارے یہاں چند معاشرتی پابندیوں کی صُورت میں ملیگی۔ جس چیز کو ہم اخلاق کہتے ہیں اُسے آپ ہمارے یہاں چند خوش آیند الفاظ کے بھیس میں پائینگے۔ ہمارے یہاں محبّت و ہمدردی اُس تصویر کا نام ہے جو اوپر سے نہایت خوش وضع اور نظر فریب بنائی گئی ہے لیکن اُس میں جان نہیں۔ ہمارے یہاں اخلاص و

مرقت کا لقب اُن خیالات کو دیا گیا ہے جو اظہارِ تدمّغ و تمکنت کے طریقے پر دوسروں کی سامنے ظاہر کئے جاتے ہیں۔ قومی ہمدردی ہمارا صبح و شام کا وظیفہ ہے لیکن یہ اُس شاعر کی دُعا کی طرح بے اثر ہے جس نے اپنی نارسائی قسمت پر عاجز آ کر یہ کہدیا تھا کہ ؎

ناکارہ ہو گئے اب سے دُعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

تصویر کا ایک رُخ دیکھنے کے بعد بھی اگر آخری فیصلہ تک پہنچنا دشوار ہو تو آیئے ہم عینی مثال و مشاہدے سے یہ بات آپ کے دل نشین کر دیں کہ غریب پُرانے قسم کے بزرگوں کو جنھیں ہم بعض اوقات پیر فرتوت کہکر اپنی دریدہ دہنی کا ثبوت دینے میں عار نہیں رکھتے۔ نئی اُمّت سے سچّے اور صحیح اخلاق و تہذیب میں کسی حد تک فائق ہیں یا نہیں۔

حامد و محمود دونوں نئی طرز کے تعلیم یافتہ نوجوان۔ دونوں مغربی وضع کے پابند اور دونوں ہیچ پیچ کے صاحب بہادر ہیں۔ طرزِ معاشرت کی یکسانیت کے ساتھ خیالات کی یکرنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا ہے۔ ناواقف لوگ جانتے ہیں کہ حامد و محمود ایک جان دو قالب ہیں۔ مگر آہ! یہاں وُہ سچی اُلفت نام کو بھی نہیں۔ بے تکلفی یہاں عنقا صفت معدوم ہے یہاں اُس خلوص و یگانگت کا سایہ تک نہیں پڑا جس کی وجہ سے میر فرخندہ علی رشید کے والد کو بھائی جان کہنے پر مجبور تھے اور جس نے سعادت کے کان میں پھونکدیا تھا کہ رشید تیرا بڑا بھائی ہے۔ یہاں تو ڈیر محمود ڈیر حامد کے القاب ہیں جو خواہ کسیقدر دلچسپ معلوم ہوں لیکن معنوی اعتبار سے ان الفاظ کے مہمل ہونے میں شبہ نہیں۔

لیکن حامد و محمود کے دل میں بھی کبھی اس بات کا گمان نہ گذرا ہوگا کہ آپس کی

پاسداری کے باوجود وہ ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھانے کے مجاز ہیں خواہ محمود حامد سے دن بھر میں بیس دفعہ ملنے آئے۔ لیکن حامد ہی کو قسم ہے کہ اگر اُسے ایک پیالی چاء کے لئے بھی پُوچھے۔ اسی طرح جب تک کوئی موقع نہ آئے اور خاص طور پر دعوت کا پیام نہ بھیجا جائے اُس وقت تک حامد کو محمود کے یہاں کھانا حرام ہے۔ باتیں کرنے میں اُسے یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ غیر ضروری امور میں مسٹر محمود کا وقت نہ ضائع کرے نہ طول کلامی سے دماغ پراگندہ ہونے پائے۔ گفتگو پر اگر سرسری نگاہ ڈالیئے تو تصنّع اور ریاکاری کے رنگ میں رنگی ہوئی پائیگا اور اُس میں اُس فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی کا نام تک نہیں جو دو قلبی دوستوں کی بات چیت میں ہونا ازبس لازمی سمجھی جاتی ہیں۔

"ڈیر حامد! مجھے آپ سے ملکر بیحد مسرت ہوئی۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ آپ کا مزاج بخیریت ہوگا"۔

"تھینک یُو۔ مَیں آپ کے اس عنایت آمیز استفسار کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہُوں اور ایک خاص ضرورت سے مَیں آپ کو اسوقت تکلیف دینے پر مجبور ہُوا ہُوں کہ ...."

"اِس بارے میں مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا اُس کے لئے مَیں ہر طرح حاضر ہُوں لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میری کوشش اس امر خاص میں شاید زیادہ کارگر نہ ہو۔ باوجودیکہ مسٹر فلاں کی مجھ پر نظرِ عنایت ہے۔ مگر وہ کسی قدر خشک مزاج واقع ہُوئے ہیں اور اُن کے سامنے کسی ضرورت کو پیش کرتے ہُوئے پس و پیش ہوتا ہے کہ کہیں زبان نہ خراب ہو"۔

"ڈیر محمود! مَیں اس معاملہ میں آپ پر بار ڈالنا پسند نہ کرتا لیکن چونکہ یہ ایک قومی کام ہے اور آپ ہر کارِ خیر میں حصّہ لینے کے ایک طرح سے عادی ہیں اس لئے

میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اپنی امکانی امداد سے دریغ نہ فرمائیں۔"

"ہاں ہاں۔ میں آپ کو پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ میں آپ کا ہمخیال ہوں اور تعلیم نسواں کے مسئلہ سے تو مجھے خصوصیت کے ساتھ وابستگی ہے۔ لیکن کیا کروں۔ مکروہاتِ دُنیاوی سے سر اُٹھانے کی بھی فرصت جلسہ کا زمانہ بہت قریب ہے اور ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ افواہاً میں نے سُنا ہے کہ کوئی مولوی صاحب ہیں اُنہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے اور لوگوں کو اس جلسے کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ حامد! ان مُلّانوں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ یہ کسی پہلو چین نہیں لینے دیتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور مشکل سب سے بڑی یہ ہوتی ہے کہ عوام انہیں کم عقلوں کی تقلید کو جنّت کی کُنجی سمجھتے ہیں۔ ان سے خُدا سمجھے۔"

"ان تمام دقتوں کے باوصف ہمیں اپنے کام کی طرف غفلت نہ کرنا چاہئے ہاں اچھا یاد آیا محمود! میں نے لعل محمد (حامد کا ملازم) کے ذریعہ کل اُس کتاب کی قیمت آپ کی خدمت میں بھیجدی تھی جو میں آپ کے یہاں سے ایک ہفتہ ہوا ضرور تا لے گیا تھا اور جس کے اتفاقیہ گم ہو جانے کا حال بھی میں کئی دن ہوئے آپ سے عرض کر چکا ہوں۔"

"بیشک مجھے وہ رقم مل گئی ہے اور میں آپ کی اس توجہ کا شکرگذار ہوں۔"

"اب میں اپنی باتوں سے آپ کا زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہتا اور اجازت طلبگار ہوں۔"

"بہت خوب۔ اب میرے کھانے کا وقت بھی آگیا ہے۔ گڈ بائی۔"

گفتگو میں سنجیدگی اور متانت کا پہلو قائم رکھنے کی کوشش پوری پوری کی گئی ہے۔ لیکن اس لب ولہجہ ان تکلف آمیز الفاظ اور ان مہذب مگر خشک خیالات

سے ان دونوں دوستوں کے خلوص و محبت کا کس حد تک اظہار ہوتا ہے؟ آہ! فرمانبرداری اور شائستگی تہذیب اب ہمارے رگ و ریشہ میں گم ہو چکی ہے اور مفرط اخلاق ہماری صفاتِ حسنہ سے کب کا خارج ہو چکا۔ اسی افسوسناک انقلاب کو دیکھ کر حضرت لسان العصر کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہے۔ اکبر؛

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اپ لوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیرسر ہی یا جناب مکرمی ہے

[illegible]

ایک آنہ فنڈ

لکھنؤ میں کچھ عرصہ سے ایک فنڈ قائم ہے۔ جس کا مقصد مساجد کی مرمت اور آبادی ہے۔ یہ فنڈ چھوٹی مقدار کے چندوں سے بہت بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس کی رفتارِ ترقی اسی طرح قائم رہے۔ حال میں سیّد خلیل احمد صاحب آنریری سکرٹری نے اس فنڈ کی دوسری رو داد شائع کی جو دلچسپ معلومات سے پُر ہے اور جس سے اس جماعت کے کام میں خاطر خواہ ترقی نظر آرہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مساجد بہت کچھ توجہ اور امداد کی محتاج ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ مخیّر اصحاب اس کارِ خیر کی مدد فرما کر داخلِ حسنات ہونگے ؞

کلامِ اکبر

مذہبی وعظ کا سودا نہ رہا گو سر میں — میرزایانہ تعلّی تو ہے لٹریچر میں
کھیتیاں خشک ہوئیں سوکھ گئے گلشن و باغ — عرش پر پھر بھی ہے ایران کی انشا کا دماغ
دہر کہتا ہے کہ اس آتشِ فارس کو بجھا — ڈارونیہ انہیں کرمک کے مضمون سجھا
تازی و پارسی جب تک کہ نہ یہ بھولیں گے — اِن کے اوہام سدا عرش ہی پر جھولینگے
خیر ماضی نہ سہی حال کی نظمیں دیکھو — حضرتِ اکبر و اقبال کی نظمیں دیکھو
ان کو کس بحر سے مضمون کے دُر ملتے ہیں
وُہ ترانے ہیں کہ افلاک سے سُر ملتے ہیں

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں — مُسلموں کے جاہ و شانِ تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اسکی ضرورت ہی نہیں — میرزایانہ ادا تھی تمکنت کی بات تھی
خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھیگا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی — شبِ گناہ و نمازِ سحر یہ خوب کہی
فنِ لطیف سٹرک خوشنما ہو ز ہر شب — یہ لُطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک کا ہے لحاظ فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کہی
ہزار جان سے مشتاق خود ہوں خدمت کا — تمہارے کام میں اور دردِ سر یہ خوب کہی
درست ہیں عقیدے نہیں عمل اچھے — دُعا میں کیوں نہیں ہوتا اثر یہ خوب کہی

مری نگاہ میں اے ہمنشیں جہاں ہے سیاہ — شبِ فراق میں لطفِ قمر یہ خوب کہی
جنابِ شیخ کا ہو جاؤں معتقد معقول — نگاہِ یار رہے بے اثر یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکرِ مآلِ کار چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

نظمِ رخصت

یہ نظم مسٹر وہاج الدین حیدر صاحب بیرسٹر لکھنؤ نے اپنے بھتیجوں نظام الدین حیدر اور وحید الدین حیدر کے لندن جانے کے وقت بمبئی بھیجی تھی کہ جہاز پر قدم رکھتے ہی اُن کو ملے:-

نظام جاتے ہو لندن مگر خیال رہے! — وحید تم کو بھی اندیشۂ مآل رہے!
ہمارے دردِ جدائی کا کچھ اثر بھی ہے — ہمارا حال ہے کیا۔ کچھ تمہیں خبر بھی ہے!
خبر ہے تمکو یہ کیوں دے رہے ہیں اِذنِ سفر — تمہارے ہجر کا رکھتے ہیں دل پہ کیوں پتھر
یہ جانتے ہو کہ ہم سب کو آرزو کیا ہے؛ — جو بھیجتے ہیں تمہیں اُن کو جستجو کیا ہے!
یہ آرزو ہے کہ دُنیا میں شاد و کام رہو — دُعا یہ ہے کہ زمانہ میں نیکنام رہو
سُنو کہ خواہشِ اوّل یہی ہے ہم سب کی — وہاں بھی تم کو رہے قدر اپنے مذہب کی
وُہ مذہبِ حنفی ضد جو ہے تعصب کا — کہ جس کا مسئلۂ خُلق نقش ہے جب کا
مگر بُرا نہ سمجھنا کسی کے مذہب کو — ہمیشہ چشمِ محبت سے دیکھنا سب کو
اُصول میں ہیں صریحاً تمام مذہب ایک — غرض ہے ایک ہی اصلاحِ نفس مطلب ایک
وہاں تمہیں نظر آئیگی اِک نئی دُنیا — نظر فریب تماشا ہے جسکے گلشن کا
کھلے ہُوئے ہیں بہارِ طرب کے گل ہر سُو — نگارِ عیش کے بکھرے ہی رہتے ہیں گیسو
نگاہ محوِ تماشائے شاہدِ گُل ہے — دلوں کے تاک میں وارستہ زلفِ سُنبل ہے

کنارِ ٹیمس وُہ ہنگامۂ نشاط و وہ دُھوم — محاذِ آبِ سمندر وُہ جھمگھٹے وُہ ہجُوم
وُہ بال رُوم میں رقص و سرود و عیش و نشاط — کہ جس کے آگے نہیں جشنِ جم کی کوئی بساط
بھرے ہُوئے ہیں تھیٹر قمر جبینوں سے — نظر کو بھی نہیں ملتی جگہ حسینوں سے
سماں یہ دیکھ کے جو لوگ بُھول جاتے ہیں — وُہ راہِ منزلِ مقصود بھُول جاتے ہیں
بہارِ گلشنِ دُنیا ہے آدمی کے لئے — مگر بنا نہیں انسان محض اسی کے لئے
ضیائے شمعِ شبستاں ہر رات بھر کیلئے — فضائے منظرِ بُستاں ہر اک نظر کے لئے
قرینِ عقل نہیں دِل پہ ہو نظر غالب — نظر فریب بھی کھائے تو دل نہ ہو طالب
وُہ دِل کہ خونِ شرافت ہو موجزن جس میں — شعاعِ مہرِ سعادت ہے ضَوفگن جس میں
کمالِ علم ہی غایت ہو اہلِ بینش کی — سمجھتے ہیں جو غرض اپنی آفرینش کی
اِسی سے ہجر گوارا بہ جبر کرتے ہیں — خُدا کو سونپتے ہیں تم کو صبر کرتے ہیں
اکیلے جاتے ہو پردیس میں خدا حافظ — جہاں مقام ہو ہر دیس میں خُدا حافظ

دِلِ بیقرار سو جا

ناظرینِ مخزن منشی دُرگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کے انتقالِ پُرملال کی خبر غالباً اخبارات میں دیکھ چکے ہونگے۔ ان کے گذر جانے سے اُردو علم ادب کا ایک سچا خادم دُنیا سے اُٹھ گیا۔ افسوس کیسے کیسے لوگ کوچ کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی بھیجی ہُوئی دو ایک نظمیں ہمارے ذخیرہ میں باقی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے شاعر کے حسبِ حال ہو چکا دِلِ بیقرار مُدت العمر تڑپ تڑپ کر آخر ایسی نیند سو گیا ہے جس سے حشر تک بیدار نہیں ہوگا:۔

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سو جا — کہ گذر گئی شب آدھی۔ دلِ بیقرار سو جا

نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی۔ یہ ہولے سے جھونکے　　تجھے دے رہے ہیں لوری۔ میرے غمگسار سو جا
یہ تری صدائے نالہ۔ مجھے متہم نہ کر دے　　میرے پردہ دار سو جا۔ میرے رازدار سو جا
تجھے خون لا رہا ہے تیرا دمبدم تڑپنا　　ترے غم میں آہ! کب سے ہوں میں اشکبار سو جا
ابھی وہاں یہاں ہی تو نہیں عاشقی کے قابل　　یہ تپش کا آہ! شیوہ نہ کر اختیار سو جا
نہ تڑپ زمیں پہ ظالم! تجھے گود میں اٹھا لوں　　تجھے سینے سے لگا لوں۔ تجھے کر لوں پیار سو جا
تجھے جن کا ہے تصور۔ اے مست جام الفت　　انہیں انکھڑیوں کے صدقے! مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے۔ شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم! دل بیقرار سو جا

([illegible])

شاعر خلقی ہوتا ہے

جلوۂ ماہ سے اسے نسبت　　کرمکِ شب کو لاکھ تابندہ
ذرہ کسبِ ضیا سے ہوتا ہے　　صورتِ مہر کب درخشندہ
باز آ اس خیالِ باطل سے　　ورنہ آخر کو ہوگا شرمندہ
شاعری کسب سے اگر آتی　　اک زمانہ تھا اس کا جویندہ
مٹے ہوتے یہ شاعر خلقی　　نام رہتا نہ ایک کا زندہ
تجھ کو اس میں اگر ہے کچھ پس و پیش　　اک سند ہے یہ بیتِ آیندہ

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

([illegible])

سید الشہداء حسینؓ

تجھ پر سلام اے شہ جانباز کربلا! اے یکہ تاز عرصۂ خوشنودیٔ خدا!
تنہا ادھر تو لشکرِ مور و ملخ اُدھر بیکس پہ یعنی نرغۂ افواجِ فتنہ گر!
ناری محاصرین تھے نورِ الٰہ کے
قبطی تھے گرد موسیِ طورِ الٰہ کے

کیا جانے کوئی کیا تھا بیابانِ کربلا صد دشتِ حشر گوشۂ میدانِ کربلا
غربت، پیاس، بھوک، کڑاکے کی دھوپ تھی سہمی ہوئی تھی جان ہر اک جاندار کی
غش کھا رہے تمام جوانمرد مرد تھے چہرے برنگ چہرۂ مدقوق زرد تھے
بازارِ کشت و خون کی گرمی وہ الاماں! لاشوں کے ڈھیر کشتوں کے پشتے یہاں وہاں
پائے ثبات تیرے کب لڑکھڑائے ہیں؟
بل کب تری جبینِ شجاعت پہ آئے ہیں؟

دنیا پہ مر رہے ہیں جہاں کے ستیزہ جو ہیں پیروانِ آز یہاں کے ستیزہ جو
دُوجی فدا کے معرکۂ کارزار میں کی تو نے جاں نثار رہ کردگار میں
باطل پرست حق سے نہ تجھ کو ہٹا سکے موجِ ضعیف کوہ کو کیونکر ہلا سکے
مضبوط خاک و خون سے تیرے بنا دیں
تصویر درد دم سے ترے ماجرائے دیں

اے آنکہ از منِ تو شانِ نمازِ عشق! شرحِ حکایت تو بیانِ نمازِ عشق!
امت نے تجھ پہ ہاتھ جفا کے اٹھائے ہیں تو نے اٹھا ستم میں تو دعا کے اٹھائے ہیں
یہ حوصلہ یہ صبر یہ گردہ یہ دل کہاں! انسان کے وجود میں یہ آب و گل کہاں!

رازِ نہفتہ تیری شہادت بتا گئی　　　　قاتل کی تیغ چوم کے تہ رگ سنا گئی

ہے بند بوالہوس پہ درِ ایوانِ یار کا

خنجر کی دھار رہ ہے شبستانِ یار کا

بھوپال

مولوی سید امجد علی صاحب اشہری مرحوم و مغفور کا کلام جب کبھی مخزن میں نکلا۔ نہایت شوق سے پڑھا گیا۔ مندرجہ ذیل نظم اُن کی پُرانے مسودات میں ملی ہے۔ اِسے ہم تبرکاً چھاپتے ہیں۔ ع اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

میں اٹاوہ سے چلا صورتِ نبضِ مضطر　　　　آیا بھوپال میں جوں آپ میں آتا ہے بشر

خستگی کھونے کو میں راہ کی سویا شب کو　　　　صبح کو اُٹھ کے چلا دیکھنے آثارِ سحر

سورۂ نور زباں پر ہوئی جاری میرے　　　　فرحت افزا میں ہوا فاتحہ پڑھنے کو گزر

اِس میں مدفون ہیں نواب سکندر بیگم　　　　جو زمانہ میں ہوئیں نورجہانِ (نام باغ) دیگر

کیا بتاؤں تمہیں کیسی تھی کتابی صورت　　　　کیا کہوں کیسی تھی پُر نور جبینِ انور

سطوت و رعب تھا صورت سے نمایاں اُنکی　　　　سارے اعضا کا تناسب تھا مناسب یکسر

قدسیہ بیگم بھوپال تھیں مادر اُن کی　　　　تھیں جہانگیر کی خاتون خجستہ گوہر

انتظام اُن کا ہے مشہورِ زمانہ ایسا　　　　جو ہے ضرب المثلِ (نواب جہانگیر محمد خاں) عام میانِ کشور

قبرِ باقی پہ ہوا لوٹ کے پھر فاتحہ خواں　　　　تھے سکندر کے جو داماد تہمتن پیکر

آپ ہی اپنا نقیب (نواب باقی محمد خاں) انکو سمجھتا تھا جہاں　　　　تھے یہ امراؤ (امراؤ دولہ) کبھی شاہ جہاں کے شوہر

کیا کہوں تم سے میں کیسا تھا بھلا قامت　　　　کیا سینہ تھا گلا کیسا تھا کیسی تھی کمر

کیسی آنکھیں تھیں کہ شرمندہ ہو نرگس اُن سے — کیسے رخسار تھے جن سے ہو پشیماں گُلِ تر

کوٹ کی دمع میری آنکھوں میں ہے اب تک بھری — تاج کس درجہ تھا مرحوم کے کھلتا سر پر

بارہ سیر اُنکی بتاتے ہیں غذا تھی پہلے — شوق ورزش کا تھا کرتے تھے بہت ڈنڈ مگدر

لیک بیمار ہوئے جب تو ہُوئی یہ حالت — گُھل گیا جسم ہُوئے سُوکھ کے بالکل لاغر

پانچ ماشہ انہیں بتلایا تھا ساگودانہ — اس کے کھانے میں بھی ہوتا تھا تکلف اکثر

احسن اللہ کو دلی سے بلایا لیکن (حکیم احسن اللہ خاں) — ایک یاقوتی نو معجون نے بخشا نہ اثر

تھک گیا تھا میں بہت اس لئے واپس آیا — دُوسرے روز گیا صُبح کو سُوئے دیگر

شہر بھوپال سے باہر جو گیا تو دیکھا — اِک حظیرہ ہے بنی قبر ہے اُس کے اندر

امتیاز اس سے نمایاں ہو پتا دیتی ہے (منشی امتیاز علیخاں) — اس میں اِک حاتمِ ثانی ہے وزیرِ کشور

میری تاریخ کا اس پر کتبہ کندہ ہے — جو کہ ہے آیہ قرآنِ خدائے اکبر

قبر صدیق حسن خاں کی اسی سمت ملی — جو تھے علامہ بھوپال میانِ کشور

عقدِ ثانی تھا کیا شاہ جہاں نے ان سے — اور اب ان کا شرف کیا کہوں اس سے بڑھکر

ہائے دُنیا بھی عجب محفلِ عبرت دیکھی — شمع کے پھول سرہانے تھے نہ پروانے کے پر

عاقبت دیکھی تو ہموار ہے راہِ سُنّت — آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر

پھر ملی جانبِ چپ راہ میں چلتے چلتے — قُدسیہ بیگم بھوپال کی قبرِ انور

کرتے حُفّاظ تھے قرآں کی تلاوت بیٹھے — ہوتے نازل طبقِ نُور فرشتے لیکر

یاں سے جاکر میں گیا باغِ نشاط افزا میں — جسمیں طُوبیٰ سے نظر آئیں سرافراز شجر

دیکھی اس باغ میں اِک قبر مصفّا میں نے — مدفنِ شاہجہان بیگم والا گوہر

دیکھنا ہو جسے ہمت کا نمونہ اُن کی — دیکھے بھوپال میں وہ تاج محل کو جاکر

ایک مسجد وُہ بنا کی تھی کہ ثانی اُس کا — دیکھنے میں نظر آتا نہ میانِ کشور

فرش تھا شیشہ کا اٹلی سے منگا کر رکھا — اور بلّور کا بنوایا تھا اُس کا منبر

آگئی اُنکی قضا رہ گئی مسجد باقی
پڑھ سکیں اُس میں نہ وہ ہائے نمازِ آخر

شوقِ تعمیر میں تھیں شاہ جہانِ ثانی
جود و اکرام میں رکھتی تھیں نہ اپنا ہمسر

ہائے اس طرح اکیلا تو نہ دیکھا تھا کبھی
پاس حاجب ہے نہ دربان ہے نہ کوئی نوکر

آہ یوں بنتِ سکندر ہو زمیں میں پنہاں
یوں چھپے خاک میں سلطان جہاں کی مادر

بادشاہوں کی صفت رکھتی تھی انکی فطرت
تاجداروں کے خیالات تھے ان کے (عالیہ والیۂ بھوپال) یکسر

ہوگئے فرطِ سخا سے تھے دوشالے کمبل
ہو رہے سیلہ و مندیل تھے ململ سے بتر

یا خدا کی ترے بندوں پہ ہے اُس نے بخشش
بخشدے تو بھی اُسے جنتِ علیا یکسر

یا خدا واسطہ آدم و حوا تجھکو
یا الٰہی تجھے سوگندِ شفیعِ محشر

یا الٰہی تجھے معصومیِ زہرا کی قسم
یا الٰہی تجھے از بہرِ جنابِ حیدر

اُس کو سادات کی تعظیم جو منظور ہوئی
تو بھی تعظیم سے رکھ اُس کو قریبِ کوثر

اُس نے دلداریِ اطفالِ یتیماں کی ہر
اُنکے اشکوں سے تو دھو ڈال گنہ کا دفتر

آیا پھر نوحہ کناں باغِ حیات افزا میں
اس میں تھے حسرت و ارمان کھڑے پیٹتے سر

قمریاں سوگ میں بیٹھیں تھیں جھکائے گردن
بلبلیں نوچ رہی تھیں چمنستان میں پر

پھول کملائے ہوئے شاخوں پہ غنچے لٹنگ
بیلیں مرجھائی ہوئی پھولوں کی تھیں خاک بسر

پتے ملتے کفِ افسوس نظر آتے تھے
نخلِ ماتم تھا بنا باغ میں ہر ایک شجر

اس میں مدفون ہیں **نواب نظیر الدولہ**
تھے جو بھوپال میں سلطانِ جہاں کے شوہر

دفن ہیں **آصف و بلقیس** بہن زیرِ زمیں
جیسے بدلی میں چھپیں ساتھ قمر کے اختر

کتخدا ابھی نہوئی تھیں ابھی دونو بہنیں
آنے پائے نہ تھے گلزارِ تمنا میں ثمر

ایک تھی حافظۂ مصحفِ قرآنِ کریم
لڑکیاں ایسی کہاں ہند میں آتی ہیں نظر

بیلیں شادی کی منڈھے پر نہیں چڑھنے پائیں
چھو لینے پائے نہ تھے ہائے جوانی کے شجر

آیۂ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار پڑھو
اور دیکھو یہ ہے دنیائے دنی کا منظر

اُٹھیری تا بجا یاد کروگے اِن کو
آہ و شیون سے تمہیں ضبطِ فغاں ہی بہتر

قطعۂ عزیز

میرے ایک دوست نے یہ طرح مجھ کو بھیجی اور قطعہ کی فرمایش کی تھی اُسکی
ایک نقل ہدیۂ مخزن کرتا ہوں :- (عزیز لکھنوی)

حسرتِ مُردہ کا ماتم دار رہنے دیجئے
میرے سینہ میں دِلِ غمخوار رہنے دیجئے

جنبشِ ابرو ہے کافی نیم بسمل کیلئے
دیکھئے میری طرف تلوار رہنے دیجئے

آپ کیوں دامن سے پوچھیں خون کے آنسو میرے
اُن ستاروں کو یونہیں سیّار رہنے دیجئے

باز آیا مہربانی سے میں باز آیا حضور
آپ مجھ کو جان سے بیزار رہنے دیجئے

دِل اگر یاد آئیگا حسرت سے کر لونگا نظر
کچھ دِنوں یہ خوں بھرا سوفار رہنے دیجئے

رُوح تازہ ہے یہ ہر اک آبلہ کے واسطے
پائے زخمی ہیں میرے کچھ خار رہنے دیجئے

کیا نگاہِ ناز سے پھر ہوگا جرّاحی عمل
میرے دِل کا زخم دہندار رہنے دیجئے

پارہ پارہ جسمِ مُردہ کس لئے کرتے ہیں آپ
زہرِ غم کے کچھ یہ آثار رہنے دیجئے

دِل کے ذرّے مجتمع ہو کر بنے کیوں تُو طُور
بس بس اے موسیٰ یہیں اسرار رہنے دیجئے

اور ہی گرمی ہے اب سمتِ مزاجِ حُسن میں
وُہ پُرانا عشق اور وُہ پیار رہنے دیجئے

عشق کا طرزِ تمدّن دَور نے بدلا ہے اب
قصّۂ جانبازیٔ اغیار رہنے دیجئے

قیس کے افسانہ اور مجنوں کے افسانہ کو بھی
اب یہ اگلے وقت کے اذکار رہنے دیجئے

اب نمائش حُسن کی ہر سال ہوتی ہے حضور
نازِ یکتائی یہ وُہ اِصرار رہنے دیجئے

اس صدی کے مرنے والے جی نہیں سکتے کبھی
وُہ قیامت خیز اب رفتار رہنے دیجئے

آجکل تشریح ہوتی ہے نئے اجسام کی
ہر بنِ مُو کو نہ آتش بار رہنے دیجئے

اب زمانہ ایسی باتوں کا اثر لیتا نہیں
شکوہ ہائے گنبدِ دوّار رہنے دیجئے

بن پڑے حضرت تو خادم قوم کے بنجائیے
اب گل و بلبل کے یہ اشعار رہنے دیجئے

چاہئے کالج میں پڑھئے بھی علومِ مغربی
اب یہ حمد اللہ اے سرکار رہنے دیجئے

کچھ نہ کچھ تو دیکھئے یورپ کی تحقیقات سے
منطقِ پارینہ کے اسفار رہنے دیجئے

واں ابھی تک ہو چکا ترسٹھ عناصر کا ظہور
آپ آب و خاک و باد و نار رہنے دیجئے

سُنکے یہ شیخِ طریقت ہو گئے مُلّا جلال
بولے اپنی شوخی گفتار رہنے دیجئے

مجھ کو کافی ہیں حدیثیں شارعِ اسلام کی
لندن و پیرس کے اب اخبار رہنے دیجئے

دل ہے میرا چاشنی گیر مزاج المومنین
آپ اپنی شوخی گفتار رہنے دیجئے

آپ سے میں لوں سند ہرگز نہیں ہے احتیاج
یہ اجارہ میرا اے سرکار رہنے دیجئے

قلزمِ فطرت کے اُس پار آپ کر سکتے ہیں سیر
ہوں میں تردامن مجھے اِس پار رہنے دیجئے

میں نے مانا آپ پکے مادّی ہیں اے جناب
اشتہارِ واجب الاظہار رہنے دیجئے

قول لیکن آپ ہی جانیں مجھے تو اے جناب
پیروِ قولِ شہِ ابرار رہنے دیجئے

حفظ کب تک ہونگے ملفوظات اسپنسر کے اب
کچھ تو یادِ احمدِ مختار رہنے دیجئے

میں نے مانا تار برقی میں ہے الہامی اثر
خیر اب اس قسم کے اذکار رہنے دیجئے

ہیں خلافِ پردہ نسواں اگر ہوں بھی تو کیا
شوق سے انکو سرِ بازار رہنے دیجئے

جھوٹا قرآں کل عدالت میں اٹھا ہے تھا کون
راستی کا اپنی اب اظہار رہنے دیجئے

دیجئیگا آپ انہیں افسر خزانے جب ملا ہیں
شاعرِ مفلس ہوں میں یہ بار رہنے دیجئے

دوربینیں کام دینگی اور نہ آلاتِ رصد
اس ستارہ کو تو تہمت مدار رہنے دیجئے

بندہ پرور بھیجئے خط لکھ کے اردو میں مجھے
کس سے پڑھواتا پھروں نگار رہنے دیجئے

دیکھئے جا کر کلیسا میں بُتانِ مغربی
مجھ کو اس مسجد ہی کا غمخوار رہنے دیجئے

دوزخی سمجھا ہوں راستی مُرتشی دونوں کو میں — آپ اپنا کینہ دینا رہنے دیجئے
مبغضین ذوالفطرہ ہوں میں امامِ قوم کی — آپ یونہیں اس کی اب فقار رہنے دیجئے
پردۂ امیدِ صحت میں ہے ذاتی انتفاع — ہیں بیماری کو شش بیکار رہنے دیجئے
دیجئے غیروں کو چندہ حیف مذہب کے لئے — آپ اپنا بذل و ایثار رہنے دیجئے
ہو خیال اس کا کہیں پیدا تشکر رنجی نہ ہو — آپ یہ شیرینیٔ گفتار رہنے دیجئے
مجھ سے تقلید آپ کے آئین کی ممکن نہیں — مجھ کو آپ آزاد و خود مختار رہنے دیجئے
اتحادی قوتِ ملکی کے پیرو ہوں جناب — اپنے ملت کا مجھے غمخوار رہنے دیجئے
صدرِ اعظم مجلس مشروطہ کے ہو جائیں آپ — مجھ کو حضرت محوِ استغفار رہنے دیجئے
شکلِ اقلیدس نہیں ہے یہ جسے سمجھیں ہیں آپ — یوں ہیں قسمت کا خطِ پرکار رہنے دیجئے

بڑھ گیا پارہ کہیں اصلی حرارت سے جناب
شعلہ باری مزاجِ حار رہنے دیجئے

کاہلی

کاہلی سے اچھے اچھوں کی خراب اوقات ہے — مشکلوں کا زندگی بھر سامنا دن رات ہے
سچ ہے سستی سے جہاں میں آدمی بیکار ہے — سارے آزاروں سے بدتر ایک یہ آزار ہے
جاں کو بھی ایماں کو بھی بس موجبِ نقصاں ہے یہ — شک نہیں کچھ باعثِ بربادیٔ انساں ہے یہ
کاہلی ہے باعثِ افزائشِ آلام و غم — شادمانی و خوشی ہوتی ہیں اس عادت سے کم
بھاری ہو جاتی ہے آخر کاہلوں کی زندگی — روز جب تعطیل ہو تو کیا خوشی تعطیل کی
ہاں مزا تعطیل کا ملتا ہے کچھ محنت کے بعد — لطفِ راحت آدمی پاتا ہے کچھ محنت کے بعد

بسترِ راحت پہ فرماتے ہیں جو جلوہ گری
کاہلی کی اُن سے رہتی ہے سدا ہمبستری

اُن سے کب ہوتا ہے کوئی کام اچھا خلق میں
اُنکی بیکاری نہیں کرتی ہے رسوا خلق میں

روز ہو جاتے ہیں دنیا میں ہزاروں اتفاق
اُنکو ملتی ہی نہیں ہے خوابِ غفلت سے نجات

خوب یاد آیا مجھے اک عالمِ ذی فن کا قول
قابلِ تحسین ہے کہ جانسن کا قول

فی الحقیقت جسکو کہنا چاہیے کچھ کاہلی
واقفِ ناقابلیت ہی کی ہے خو جاہلی

یعنی ہیں ناقابلیت سے تو واقف سر بسر
اُس کمی کو وہ نہیں تسلیم کرتے خود مگر

جو ہے ٹیلر کا سخن اس بات میں پُر زور ہے
آدمی اس کاہلی سے زندہ زیرِ گور ہے

مثلِ مُردے کی ہے جسکو کاہلی کا ہے مرض
کچھ اُمید اس سے خدا کو نے خدائی کو غرض

بے خبر رہتا ہے وہ دُنیا کی محسوسات سے
بے تعلق اختلافات و ضروریات سے

زندگی کے دن ہوں پورے اسلیے جیتا ہے وہ
مثلِ حیوانات آبِ زندگی پیتا ہے وہ

میوہ ہائے سبز نباتات دن خوراک ہے
زندگی جس طرح سے کیڑوں کی زیرِ خاک ہے

عرصۂ مرگ آئے ہستی سے بھی ہوں نابود وہ
لیکن اس عرصہ میں کچھ کرتے نہیں موجود وہ

ہل چلاتے ہیں نہ کرتے بار برداری ہیں وہ
اک مریضِ لاعلاجِ دردِ ناچاری ہیں وہ

کرتے ہیں جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں سب بے فائدہ
موجبِ نقصاں رسانی بے سبب بے فائدہ

وقت اور طاقت کو کر دیتی ہے عنقا کاہلی
خلق میں ہے سب سے بڑھکر صرفِ بیجا کاہلی

(ماخوذ از انگریزی) سید امیر حیدر بخت



تازہ غزلیں

(از حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف الصدق حضرت جلال لکھنوی)

اس طرح دل دکھایئے جس میں مزا ملے وہ درد ہو کہ بس کی نہ ہرگز دوا ملے
تاکا ہے دل کسی کا جو یہ پوچھتے ہیں وہ چوری کرے کوئی تو اسے کیا سزا ملے
ہے میرے دل کو ان سے تمنا وصال کی جنکو خیال میں بھی جو دیکھا جدا ملے
اٹھ اٹھ کے بیٹھتا ہے کسی کا غبار کیوں ہے منتظر کہ دامن باد صبا ملے
تھا رخ دل و جگر کی طرف سے پھرا ہوا اس کج ادا کے تیر بھی تو کج ادا ملے
بیخوف ہو کے پھر تو خطا پر خطا کریں بڑھ جائیں حوصلے جو سزا پر سزا ملے
ان کو جفائیں کر کے مٹانے سے کام ہے حسرت ملے امید ملے مدعا ملے
شکوہ کسی سے دل کے نہ ملنے کا کیا کریں دو حرف لفظ دل میں یہ بھی جدا ملے
تسکین بھی ہوا ہے تڑپ بھی علاج ہے ہم سب میں خوش ہیں درد ملے یا دوا ملے
بنتا ہے یہ جو دیر کا نقشا کسی کا دل کعبہ اگر بنے تو اسی میں خدا ملے
ہو لطف کی نگاہ بھی اہل گناہ پر ملتی ہوئی کرم سے تمہاری سزا ملے
دل چھین لیں ادا سے اشارے نگاہ کے جب لطف ہے کہ شوخ کسی کی حیا ملے
دل بھی گئے ہیں ضبط زباں بھی چھپائے ہیں مشکل ہے مدعی کو مرا مدعا ملے
بولا سما کے دل میں یہ تیر نگاہ ناز لے دیکھ ہم ہجوم تمنا سے کے ملے
دل جا رہا ہے کوچۂ دلدار کی طرف آنکھیں خیال کرتی ہیں وہ نقش پا ملے
یہ آرزو ہے سینے سے مجھ کو لگائیے یہ چاہتا ہوں درد جگر کی دوا ملے
بیتاب دل جو ہو تو سنبھلتا ہے کس طرح ہم پوچھ لیں کہیں جو کوئی مبتلا ملے

دیکھا جو ہم نے تم کو تو آنکھیں نکال لیں | آخر گھورتا ہے اسے بھی سزا ملے
اس کا نشان پوچھ رہے ہو تم ارے کمال | جسکا خیال میں نہ کہیں نقش پا ملے

(از جناب احمد علی صاحب شوق ۔ قدوائی ۔ لکھنوی)

وُہ خوش کہ ہیں جگر کو نظر میں لئے ہوئے | میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
آیا ہوا عدم سے تو بزمِ وجود میں | آئے ہیں وُہ عدم کو کمر میں لئے ہوئے
نالوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر | بیٹھے رہوگے درد کو سر میں لئے ہوئے
نکلتے ہیں وُہ حیلے سے پسینے میں ڈوب کر | ہر کوئی مجھ کو دیدۂ تر میں لئے ہوئے
وسعت ہمارے عشق جنوں زا کی دیکھنا | دُنیا کے حُسن کو ہے یہ سر میں لئے ہوئے
جو تم نے دی نسیم کو ۔ او ۔ وُہ ہے کوچہ گرد | ہم کو ملی تھی راہگذر میں لئے ہوئے
کیا شوق اسی پہ چرخ تنک ظرف کو ہے کبر | ایک اشرفی ہے جیب سحر میں لئے ہوئے

(از جناب عیش بھوپالی)

میری حسرت اور خالی جائے گی | ہوش کی لو یہ نہ ٹالی جائے گی
مٹنے والے ہزاروں ہوں تو کیا ! | جان ہے گر جانے والی جائے گی
آہ کیا لٹے جائیگی اس دل کے ساتھ | تیری تصویر خیالی جائے گی
مر کے بھی جانے سے چھٹتی ہے کہاں | جان پھر قالب میں ڈالی جائے گی
ماشاءاللہ قدر میرے دل کی یہ | پھر اسی پر خاک ڈالی جائے گی
آئینہ دیکھا تو میرا ہرج کیا | تیری شانِ بے مثالی جائے گی
مدتیں بیت گئے زمانہ ہو گیا | یہ میری آشفتہ حالی جائے گی
[illegible] طبیعت کو مری | [illegible] بے مثالی جائے گی

چھپکر تیار ہے

صبح زندگی

شائقین کو مژدہ ہو کہ یہ کتاب جس کا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جسکی فرمائشیں قبل مخزن میں چھپنے سے بہت پیشتر ہی موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوش قلم دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے۔ قسم اول کی کاغذ کی چونکہ کھپت زیادہ ہے۔ اس لئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوانی چاہئیں۔ یہ کتاب دو سو چھتیس (۲۳۶) صفحہ کی ہے اور اس میں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے وہ تمام حالات جو تربیت سے متعلق ہیں قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کواری لڑکیوں کو جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرز بیان ایسا موثر ہے کہ ضرور دلنشین ہوتا ہے! خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے۔ چھاپنے۔ کاڑھنے کی بہت سی باتیں تصریح سے لکھی گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دیئے گئے ہیں عورتوں کی زندگی پر استانی کا وعظ اس کتاب کی روح رواں ہے! وداع کا سماں۔ پھوپھی کا بھتیجی کو رخصت کرنا اور آخری نصیحتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں! زبان کے متعلق بیان کرنیکی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کتاب ایک مستند اہل زبان یعنی منازل السائرہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبدالراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ باعتبار واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر آتالیقی کتاب زنانہ لٹریچر میں موجود نہیں + قیمت قسم اول (عا) قسم دوم (عہ) علاوہ محصولڈاک +

درخواستیں بنام مینیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

عرق ماء اللحم انگوری دو آتشہ

جس میں انگور۔ سیب۔ بہی اور بیتر۔ بٹیر۔ مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں اور مشک و زعفران ڈال کر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے۔ نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ کیا دواؤں میں خالص ڈال کر کوئی طبیب بیس روپیہ تولہ میں فروخت کر سکتا ہے ہرگز نہیں

عرق ماء اللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی نازک ساخت کو مضبوط کر کے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے بلغم پیدا ہونی بند ہو جاتی ہے ضیق النفس (دمہ) کو تادم دور۔ کھانسی جلد دور ہو جاتی ہے۔ اور جن بچوں میں سل دق کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی سے مرا ہو تو بطور حفظ ماتقدم اسکے پینے سے بچ سکتا ہے۔ جن طالبعلموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو۔ ذہین۔ ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہئے۔ تاکہ وہ بکثرت محنت سر کھپانے کی وجہ سے بے وقت موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کی ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے۔ سر میں درد رہتا ہے۔ سر گھومتا ہے۔ سر میں بوجھ رہتا ہے۔ آنکھیں کمزور۔ تکان۔ بیچوں میں آواز اور بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ تریاق مضرات شراب ہے۔

تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی حرکت کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن۔ جوش دل۔ غشی اور دل کا بیٹھ جانا بند ہو جاتا ہے۔

چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اصلاح اور پیدائش مادہ سوداویہ کی بیماری جس میں غیر معمولی کو دور کر دیتا ہے اور اس کے افعال با قاعدہ بنا دیتا ہے

پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ہضم کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم۔

چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کے باعث کثرت ادرار اور رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ صحیح حالت پر آ جاتے ہیں

ساتواں اثر اعضائے تناسل پر اسکا یہ اثر ہوتا ہے کہ تاثر دور شدہ دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی خوشگوار زندگی گزرتی ہے۔ گھر سے لوگ خوش۔ کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے۔

آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ زہریلے اجزا کو تحلیل کر کے خون صالح بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون کر کے جسم میں تازہ جان پھونک دیتا ہے جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔

الغرض عرق ماء اللحم اعضائے بیکار کو کار آمد، خفتہ کو بیدار۔ غافل کو ہوشیار اور ہوشیار کو بار تیار بنا دیتا ہے

قیمت ایک تولہ دو روپے (عہ) چھ تولہ گیارہ روپے (للعہ) [illegible] تولہ (عنہ)

نوٹ۔ (۱) بیرونجات میں تین تولہ سے کم روانہ نہ ہوگا۔ (۲) نئے خریدار قیمت پیشگی معہ محصول ارسال فرماویں (۳) ریل کے ذریعہ منگانے پر محصول کم لگیگا۔ ریلوے اسٹیشن و لائن کا پتہ صاف لکھیں۔ کتاب حل المشکلات پتہ لکھنے والوں کو مفت دیجاتی ہے

حکیم ڈاکٹر حاجی غلام نبی زبدۃ الحکماء لاہور

نمونہ — **کیا واقعی سچائی نہیں ہے؟** — از اشتہار

تازہ شہادت جناب انسپکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات اسکی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے۔

خضاب عالمگیر اسکی تعریف اسقدر ہی کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا۔ بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی عہ

مرشد افیون اس عرق کے چار روز استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے مروڑ اور دست نہیں آنے ملتے

دافع بواسیر خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسّے بلا ضرر منیت و نابود ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ بھر میں صحت کامل۔ قیمت ع

ممیرا کا سرمہ دھند۔ غبار جالا۔ پھولا۔ سُرخی پڑوال گکرہ رہونکا شرطیہ علاج موتیا بند کے لئے تیر بہدف۔ آنکھوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہے فی تولہ عہ خاص ممیرہ فی تولہ عہ

اکسیر الحیات
حلق سے اترتے ہی فوراً کمزور اور مردہ اعضا پر اثر کرتی ہے

اکسیر الحیات
دل و جگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دور کر کے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات
طاقت کے لئے تیر بہدف اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات
ضعف مثانہ کے لئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے

اکسیر الحیات
کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چہرے کی بے رونقی اڑجاتی ہے۔ چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات
کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دبلے پتلے آدمی کو پر زور بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات
کی ان گنت خوبیاں ہیں جو لکھنے میں نہیں آسکتیں غرضکہ تمام امراض جسمانی کا مکمل علاج فی شیشی عہ

تازہ شہادت۔ جناب شیخ فرزند علی صاحب ڈپٹی انجنیر اسسٹنٹ فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات مسیحا سے بڑھکر ثابت ہوئی ہے آپکے علاج کا قائل ہوں

گلگونہ ترنجی اگر آپ حسن لا زوال حسن میں دلفریبی کی شان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ضرور گلگونہ ترنجی منگائیں چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیل چھائیاں اور محاسے دور کر کے رخسار مثل گلاب بنا دیتا ہے۔ حسن پرست احباب قدردانی فرمائیں۔ قیمت عہ

ہیرا تیل خوشبودار زندہ دل دوستو! ہم نے آپ کی خاطر ایک اعلیٰ اور خوشبودار تیل ہیرا آئل بنایا ہے جس کی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے۔ بالوں کو نرم اور ملائم اور چمکدار بنانے کے علاوہ درد سر کو مفید ہے۔ دماغ کی کمزوری اور خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور بڑھاتا ہے اعلیٰ

صاف نگار ہیرا آئل معہ نورانی علی گوہر

ڈاکٹر محمد علی سند یافتہ ایل ایم ایس شفاخانہ مشیر صحت شہر فیروزپور (پنجاب)

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

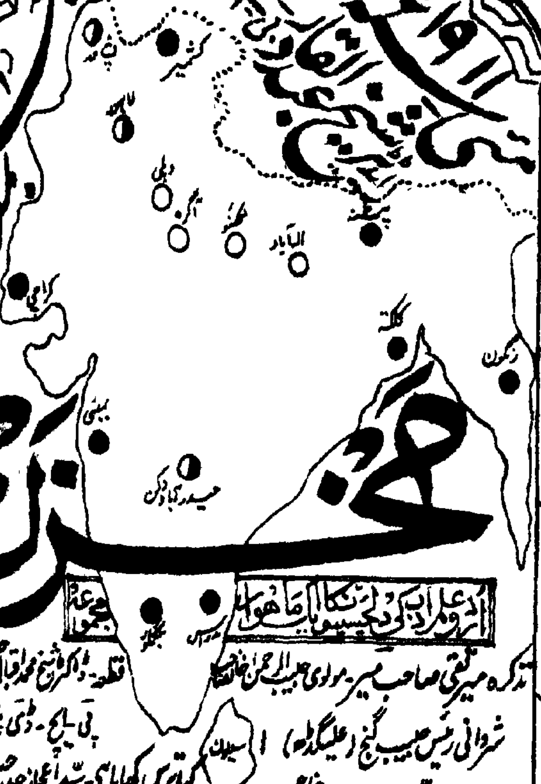
اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلاشراکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اسکی اسقدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نتائج سے محروم رہا ہے۔ سنیئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہزور بنتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر پی۔ این صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ معظم خلد اللہ ظلہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی لاگ سے چاق اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چت ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لیکچرار معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ امتیاز انہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اسوقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت حال ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کا مل تیر بہدف دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت لوز اغذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ ابتدا ہی حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ خود اسکی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائینگے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۸)

حکیم محمد شریف آئی ٹی ڈاکٹر کیمیاگر پروپرائٹر شفاخانہ عام لاہور سے طلب کرو

جملہ حقوق محفوظ

جلد ۲۱ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۱۱ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۲۹ھ



مخزن

اردو علم و ادب کی دلچسپ و بانکا ماہوار مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◉ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام منیجر نول کشور پریس لاہور چھپا اور شیخ فضل الہی سوداگر کتب نے شائع کیا

قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک قسم دوم ع فی پرچہ ساڑھے تین آنے

مخزن

تذکرہ میر تقی صاحب میر

جناب مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب حسرت شروانی رئیس حبیب گنج (علیگڑھ) اُن چند احباب خاص میں ہیں - جو مخزن کے حال پر خاص نظر عنایت رکھتے ہیں - گزشتہ چند ماہ میں میں نے بتجدید توجہ کی اُن سے درخواست کی - میں اُن کا نہایت ممنون ہوں کہ اُنہوں نے باوجود کثرت کار میری درخواست کو شرف قبول بخشا اور تذکرہ میر کے ایک نادر قلمی نسخہ کا یہ ریویو مخزن کیلئے لکھا۔

مدت ہوئی آبحیات میں تذکرہ میر کا ذکر پڑھا تھا - جب ہی سے شوق مطالعہ دل میں جاگزین تھا - آخر قسمت نے یاوری کی - ایک محترم نے پتا دیا - اور مولوی رضی الدین صاحب وکیل شاہجہان پور کے الطاف بے پایان سے قلمی نسخہ مل گیا - دیکھا اور بار بار دیکھا - پڑھا اور رکھ دیا - فرصت کہاں کہ رسم قدیم تازہ کرتا اور یاران نکتہ دان کو صلائے عام ہوتی - مگر شیخ کی توجہ اثر سے خالی نہیں - کچھ اس انداز سے اگلی صحبتیں یاد دلائیں کہ ناچار بزم ادب میں حاضر ہونا پڑا - کتاب خانے میں جو چیزیں وقتاً فوقتاً لکھنے پڑھنے کے واسطے منتخب کرکے علیحدہ رکھ چھوڑی ہیں اُن میں تذکرہ میر بھی تھا - شکر ہے کہ اُس کی نوبت آگئی - خداوند تعالیٰ وقت دے کہ پھر پہلے کی طرح کچھ گھنٹے مجلس روحانی (کتابینی نے

؎ ایڈیٹر رسالہ مخزن

میں صرف او دل و دماغ بزرگانِ معنوی کی فیضِ صحبت سے مالا مال ہوں۔
مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تحریر سے میر صاحب کے تذکرہ کی یہ شان معلوم ہوتی ہو کہ جن شعرا کا مذکور ہے اُن میں سے ایک بھی طعنہ و ملامت سے نہیں بچا۔ یہاں تک کہ ولی کو جو نوع شعرا کے آدم ہیں اُنکے حق میں فرماتے ہیں "شاعریست از شیطان مشہور تر"۔ میر صاحب کی بد دماغی جو مشہور عالم ہے اس بیان کو قرین قیاس ثابت کرتی تھی۔ مگر سخت حیرت ہو کہ صورتِ حال بالکل برعکس ہو۔ میر صاحب مرحوم نے کسی کے بھی متعلق طعن و ملامت سے کام نہیں لیا۔ ہر موقع پر اساتذہ کی نسبت کمال نیازمندی اور ہمسروں کے ساتھ پورے حفظِ مراتب کا پاس و لحاظ رکھا ہو۔ اوّل سے آخر تک میر صاحب کی محبت و قدر دانی کا جلوہ ہر شاعر کے حال میں عیاں ہو۔ جن دو ایک شعرا کا ذکر کشادہ دلی سے نہیں کیا۔ ان پر بھی طعن نہیں ہو بلکہ اُن کی خود نمائی یا کج خلقی کی شکایت کی ہو۔ معلوم نہیں مصنف آبحیات نے کونسا تذکرہ دیکھا جو میر صاحب کے حق میں سمِ قاتل تھا۔ یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ جو تذکرہ میں نے دیکھا وُہ اَور ہو اور صاحب آبحیات کے زیرِ مطالعہ میر صاحب کا دُوسرا تذکرہ رہا ہوگا۔ اِس لئے کہ آزاد نے لکھا ہو کہ میر صاحب اپنے تذکرہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ یہ اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہو۔ اب میرے پاس کا نسخہ تصنیف مابعد نہیں ہوسکتا۔ اِس لئے کہ یہ محض اوائل شاعری کی تصنیف ہو۔ جبکہ میر صاحب اکبرآباد سے دہلی میں نو وارد تھے۔ اس سے پہلے ایک اور بھی تذکرہ لکھا ہو۔ یہ بعید از قیاس ہو۔ معہذا محض ابتدائے عمر میں بد دماغی اور اساتذہ پر طعن و ملامت خلافِ دستور ہے۔ بہرحال یہ معمّا کسی طرح حل نہیں ہوتا کہ تذکرہ آبحیات میں جن مضامین کا حوالہ ہو وُہ کس تذکرہ سے ماخوذ ہیں۔ بطور نمونہ میں چند شعرا کے متعلق میر صاحب کے

ریمارک اپنے زیر مطالعہ نسخہ سے نقل کرتا ہوں۔ ولی کی نسبت فرماتے ہیں:۔

"شاعر ریختہ از خاک اورنگ آباد ست۔ میگویند کہ در شاہجہان آباد دہلی نیز آمدہ بود ..... از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد و احوالش بہ کماینبغی معلوم من نیست"۔

سودا کی بابت لکھتے ہیں:۔

"میرزا رفیع سلمہ المتخلص بہ سودا۔ جوانے ست خوش خلق و خوشخو گرم جوش یار باش شگفتہ رُوی ..... غزل و قصیدہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب میگوید۔ سرآمد شعرائے ہندی اوست۔ ملک الشعرائی ریختہ او را شاید ..... اکثر اتفاق طرح غزل باہم می اُفتد غرض از مغتنمات روزگار ست۔ حق تعالے سلامتش دارد۔

خواجہ میر درد صاحب کا ذکر سُنو:۔

میاں صاحب میاں خواجہ میر سلمہ اللہ تعالیٰ۔ المتخلص بہ درد۔ جوش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خوشنوان چمن این فن ..... متوطن شاہجہان آباد ست بزرگ۔ بزرگ زادہ۔ جوان صالح از درویشی بہرہ وافی دارد فقیر را بخدمت او بندگی خاص ست

میرزا مظہر صاحب علیہ الرحمۃ کے حال میں لکھا ہے:۔

مرد یست مقدس مطہر درویش عالم صاحب کمال شہرۂ عالم بے نظیر معزز مکرم اصلش از اکبر آباد۔

اب معمولی شعرا کا حال دیکھئے۔ کوئی شاعر ہیں شوق۔ انکے ذکر میں لکھتے ہیں:

شوق۔ میاں حسن علی شوق تخلص از شاہجہان آباد ست سپاہی پیشہ۔ شاعر ریختہ شاگرد خانصاحب سراج الدین علیخاں ست بندہ را بخدمت او ربط کلی ست۔ اکثر اتفاق ملاقات می اُفتد

اِن حالات کو پڑھ کر خود میر صاحب نے اپنی نسبت جو الفاظ لکھے ہیں انکو پڑھیے اور اُن کی عالی ظرفی و پاک نفسی کی داد دیجیے - اپنے ذکر میں صرف اس قدر لفظ تحریر فرماتے ہیں -

میر فقیر حقیر میر تقی مولف این نسخہ متوطن اکبر آباد - بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہان آباد ست -

اس تذکرہ کی زبان فارسی ہے اور یہ اس زمانہ کا عام رنگ تھا - بلکہ بعد کو بھی بہت عرصہ تک اُردو شعرا کے تذکرے فارسی ہی میں لکھے گئے - وجہ یہ کہ ہر چند میر و مرزا کی مانند اساتذہ کی جادو بیانی نے نظم اُردو کا سکہ دلوں پر نقش کر دیا تھا - مگر نثر اُردو کو شرفِ قبول مدت تک حاصل نہ ہوا - موجودہ نسل سے پہلے جو بزرگ تھے خود اُنہوں نے خط کتابت عرصہ تک فارسی میں کی تھی - اور آخر عمر میں انقلاب زمانہ نے انکو اُردو لکھنے پر مجبور کیا تھا - دربار قبول میں نثر اُردو کی رسائی ابھی ابھی تو ہوئی ہے - غرض تذکرہ کی زبان فارسی ہے اور خاصی فارسی ہے - حجم سوا سو صفحہ کا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک شعرائے اُردو کی تعداد کثیر پیدا ہو چکی تھی - ردیف الف سے لیکر ردیف یا تک ہر ردیف کے تخلص نظر آتے ہیں -

میر صاحب نے خود تو اپنا حال قصداً بہت کم لکھا ہے تاہم ضمناً مختلف مقامات سے انکے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں - وطن اکبر آباد تھا - تالیف تذکرہ سے کچھ عرصہ پہلے دہلی تشریف لائے تھے - خواجہ ناصر صاحب عندلیب والد خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں زیادہ باریاب رہے - اُنہوں نے انکے جوہر دیکھے اور حوصلہ بڑھایا اور فرمایا "میر تقی تو میر مجلس خواہی شد" ہر مہینے کی پندرھویں تاریخ کو خواجہ صاحب کے یہاں مجلسِ مشاعرہ ہوا کرتی

تھی۔ جب وہ درہم برہم ہوگئی تو خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو۔ چنانچہ اس کے بعد میر صاحب کے مکان پر ہر پندرھویں کو شعرا کی بزم آراستہ ہوتی تھی۔

جن مجلسوں نے میر اور مرزا سے شعرا کی تربیت کی ہو وہ دنیا کے سامنے فخر اور بجا فخر کر سکتی ہیں۔ اکثر شعرا کے حالات میں اپنی دوستی اور ملاقات کا ذکر کرتے ہیں اور مراتب دوستی اور اس کے نباہ کی کیفیت بھی صاف صاف لکھتے ہیں۔ جن سے بگاڑ ہو گیا تھا۔ ان کے حال میں بگاڑ کی کیفیت بھی لکھدی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے احباب کا دائرہ وسیع تھا اور اس زمانہ میں دوستی اور محبت محض خالی الفاظ نہ تھے (جیسے ہمارے زمانے کے "میرے معزز دوست" "قدیم دوست" "لائق دوست") بلکہ الفاظ کے کچھ معنی تھے اور معنی کے ساتھ برتاؤ اور اخلاص کے لوازم۔ اپنے آپ کو شاگرد سراج الدین علیخاں صاحب آرزو کا لکھا ہے بلکہ استادی سے بھی بڑھکر تعلقات واضح ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں "سراج الدین علیخاں صاحب کہ اُستاد و پیر و مرشد بندہ است"۔

معلوم نہیں کہ میر صاحب کے تعلقات خان آرزو سے کب کشیدہ ہوئے جیسا کہ تذکرہ آبحیات سے واضح ہوتا ہے۔ اس تذکرہ کی تصنیف تک تو پوری نیازمندی قائم تھی۔

اُس عہد کی سوسائٹی کے حالات جو اس تذکرہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ صاف مشاہد ہیں کہ ہر چند وہ زمانہ پولیٹکل حالت کے لحاظ سے انتہائے شورش اضطراب اور بدامنی کا تھا تاہم اگلے علم دوست بزرگ

بے نظیر ہمت اور استقلال کے ساتھ علوم و فنون کی خدمت میں مصروف تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب۔ میرزا مظہر جانجاناں علیہ الرحمۃ۔ حکیم شریف خانصاحب اور اور گروہا گروہ۔ ہر علم و فن کے اساتذہ اور اہل کمال اسی پُر آشوب زمانے میں ایسے گذرے ہیں جن پر علمی تاریخ ہمیشہ فخر کریگی۔ افسوس آج باوجود یکہ ساری دنیا پر امن و امان کا سایہ ہے لیکن ہماری علمی مجالس میں یا شور و شغب ہی یا سناٹا۔ غرض دونوں بیکار۔ میر صاحب نے اشعار کس رنگ کے انتخاب کئے ہیں۔ اسکو بھی ملاحظہ کیجئے۔ سودا سے

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے | کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا
سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن | بازی اگرچہ پا نہ سکا سر کو کھو سکا
کس مُنہ سے پھر تو آپکو کہتا ہی عشقباز | اے رُو سیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

خود اپنے لئے اشعار انتخاب کئے ہیں سے

کس طرح سے جانئے یاراں کہ یہ عاشق نہیں | رنگ اُڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا

دیگر

مت کر عجب جو میر ترے غم میں مر گیا | جینے کا اس مریض کے کوئی بھی ڈھنگ تھا

خواجہ میر درد سے

کبھی خوش بھی کیا ہی جی کسی رند شرابی کا | بھڑا دے مُنہ سے مُنہ ساقی ہمارا اور گلابی کا
زمانہ کی نہ دیکھی جرعہ ریزی درد کچھ تونے | ملایا مثل مینا خاک میں خوں ہر شرابی کا

دیگر

جان سے ہو گئے بدن خالی | جس طرف تونے آنکھ اُٹھا دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری | آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی | ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

قائم ؎

کیوں چھوڑتے ہو دُرد تہ جام میکشو ذرّہ ہے یہ بھی آخر اُسی آفتاب کا

دیگر

ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم کیا کروں یہ رہا نہیں جاتا

دیگر

بہارِ عمر ہے قائم کوئی دم اسے جوں گل پیالی کا ٹ ہنس کر

معلوم ہوتا ہے کہ میر اور مرزا کا عہد وُہ عہد تھا کہ فارسی شاعری نے ہندوستان سے رختِ سفر باندھا اور اُردو شاعری اس جگہ پر قابض ہوئی۔ فارسی کے اساتذہ مثلاً خان آرزو کے دامن تربیت میں پلے تھے۔ یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ اُردو شاعری میں فارسی کا رنگ کیوں غالب آ گیا۔ ولی دکنی کا دیوان دیکھو بھاکا کے انداز جلوہ ریز ہیں۔ جب وُہ دلی آئے تو میر صاحب تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

حضرت شاہ گلشن کو اپنے اشعار سنائے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مضامین فارسی جو بیکار پڑے ہیں اُنکو ریختہ میں کیوں نہیں کھپاتے۔ دیکھو کلام اُردو دکن میں پیدا ہوُا تو بھاکا کے جامے میں تھا۔ جب دار الخلافہ میں پہنچا تو عبا و قبا پہن لی۔ مرزا غالب کو چین نہ آیا جب تک کہ کلاہ پپاخ بھی اس کے سر پر نہ رکھ دی۔

نکتہ۔ حضرت شاہ گلشن۔ خواجہ ناصر عندلیب۔ خواجہ میر درد۔ مرزا مظہر وُہ حضرات ہیں جنکو دُنیا کے تعلقات سے واسطہ نہ تھا اور اپنے مولیٰ کی یاد میں بدل و جان مصروف تھے۔ تاہم چونکہ علمی ذوق فطری تھا۔ اُردو شاعری کے حال پر اُن کی توجہ مبذول ہو کر رہی اور اپنے بزرگوں کی

تربیت کے اثر سے پروان چڑھنا اُس کو نصیب ہوا۔

آخر تذکرہ میں میر صاحب نے ایک فائدہ لکھا ہے۔ اُسی پر ہم اپنا ریویو ختم کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں ریختہ چند قسم ہے۔ امیر صاحب نے اُردو زبان کو اکثر جگہ ریختہ لکھا ہے۔ کہیں کہیں ہندی۔ اُردو کا لفظ اُنکے تذکرہ میں میری نظر سے نہیں گذرا ایک یہ کہ ایک مصرعہ فارسی ہو ایک ہندی مثلاً امیر خسرو ؎

نقدِ دلِ من گرفت و بشکست　　پھر کچھ نہ گڑھا نہ کچھ سنوارا

دوسرے یہ کہ نصف مصرعہ ہندی ہو نصف فارسی مثلاً میر معز فطرت ؎

از زلفِ سیاہ تو بہ دل دھوم پڑی ہے　　در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

تیسرے یہ کہ حرف اور فعل فارسی کے استعمال کئے جائیں یہ قبیح ہے۔

چوتھے یہ کہ فارسی کی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں۔ جو مناسب زبان ترکیب ہو وہ جائز ہے۔ اس کی تمیز با مذاق شاعر کر سکتا ہے۔ اور جو نامناسب ہو نا جائز۔ میرا مذہب بھی یہی ہے۔

پانچویں قسم ایہام ہے۔ یہ اب متروک ہو چکی

چھٹا وہ انداز ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے اور وہ تمام صفات پر حاوی ہے۔ تجنیس ترصیع۔ تشبیہ۔ صفائی گفتگو۔ فصاحت بلاغت ادا بندی خیال وغیرہ سب اس میں ہے۔ میں بھی اس انداز کو پسند کرتا ہوں۔ اس فن میں جو طرز خاص رکھتا ہے وہ اس مضمون کو سمجھ سکتا ہے نہ عوام۔

حسرت شروانی

ابراہیم ابن ابو ایوب

(ایک عرب منجم کی کہانی اور ایک عجیب طلسم کا فسانہ)

کہتے ہیں کہ ایک عرب بادشاہ کئی صدیوں کے قبل غرناطہ میں سلطنت کرتا تھا۔ اُس نے ہمیشہ اپنی جوانی میں اپنا وقت لڑائیوں میں گذارا تھا۔ اور اب جو اُس میں پیری کے آثار نمودار ہُوئے تو ضعفِ پیری کے سبب سے آرام و آسائش کا طالب تھا۔ اور اپنے ہمسائیوں کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا تاکہ اپنے فتوحات کے ثمرات سے فائدہ اُٹھائے اور جو ملک اس نے لوگوں سے چھینے تھے اُن سے لُطف حاصل کرے۔ اتفاقاتِ زمانہ سے اُس بڑھے ہوشیار اور صلح پسند کے مقابل دُوسرے نوجوان حریف بھی تھے جن سے اس کو کام پڑتا تھا بعض جوان شہزادے نام آوری اور جنگ جُوئی کے شوق میں اس سے اپنے باپوں کا بدلا لینے کے ارادہ پر تُلے ہُوئے تھے۔ خود اس کے ملک کے بعض دوردست حصے اور اضلاع جن کی رعایا کے ساتھ اس نے اپنے اقتدار اور استیلا کے زمانہ میں اچھا سلوک نہیں کیا تھا اُس کی تن آسانی کی خواہش دیکھکر اس وقت بلوا اور شورش کرنے اور اس کے پایہ تخت پر حملہ کرنے کے لئے مستعد ہو رہے تھے۔ دشمن اس کو چو طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور چونکہ غرناطہ کے اطراف پہاڑ اور جنگل واقع ہیں جن میں اکثر دشمن آکر چھپ رہتے تو انکا حال ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں لازم تھا کہ بادشاہ ہمیشہ خبردار اور گوش بر آواز رہے۔ کیونکہ کیا خبر تھی کہ دشمن اس پر کس گوشہ

سے چڑھائی یا حملہ کرے اُس نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیدبان مقرر کئے تھے اور برج بنوائے تھے۔ اور ہر درہ اور گھاٹی کے دہانے پر فوج مقرر کی تھی کہ دشمن کی آمد دیکھکر رات ہو تو آگ جلاکر اور دن ہو تو دھواں کرکے اسکو اور شہر کے لوگوں کو آنے والی آفت سے خبردار کردیں۔ مگر یہ سب تدابیر بیکار ہوجاتی تھیں۔ اس کے ہوشیار و چالاک دشمن باوجود ان انتظامات کے کسی ایسی دشوار گذار گھاٹی سے داخل ہوجاتے کہ کسی کو اُس کی خبر نہ ہوتی۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ملک کو لوٹ کر مال و اسباب لئے ہوئے اور لوگوں کو قید کئے ہوئے پھر اُن گھاٹیوں میں غائب ہوجاتے۔ بادشاہ کی پریشانی کی حالت قابلِ تاسف تھی۔ ایسے وقت میں جب بادشاہ اقسام کی تکالیف و پریشانیوں میں مُبتلا تھا۔ ایک عمر رسیدہ عرب منجم و حکیم اس کے دربار میں وارد ہوا جسکی داڑھی اس کی کمر تک پہنچی تھی۔ اگرچہ کمال پیری کے سب آثار اس کے چہرہ سے عیاں تھے مگر وہ پیادہ پا مصر سے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کے پاس بغیر ایک عصا کے کوئی اور حربہ نہیں تھا جس پر بعض نقوش و اشکال کندہ تھے۔ اس کا شہرہ تو اُس کے آگے ہی یہاں پہنچا تھا۔ اس حکیم کا نام ابراہیم ابن ابوایوب تھا اور مشہور یہ تھا کہ وہ حضرت رسالتمآب کا زمانہ دیکھا ہوا تھا اور اس کا باپ ابوایوب حضرت کے اخیر صحابیوں میں سے تھا۔ یہ حکیم بچپن میں عمرو عاص کی فاتح فوج کے ساتھ مصر کو آیا اور سالہا وہیں قیام کرکے مصری قسیسوں کے ساتھ رہکر ان کے علوم اور خصوصاً اُن کے سحر حاصل کئے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے عمر بڑھانے کے راز کو بھی دریافت کیا تھا جسکی وجہ سے اس کی عمر اُس وقت دو سو برس سے زیادہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ علم اسکو اس کی طبعی پیرانہ سالی میں حاصل ہوا تھا۔ اس لئے اگرچہ اس کی عمر بڑھی مگر اسکے

چہرہ کی جُھرّیوں اور سفید بالوں کا علاج نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے اِس عجیب بوڑھے کو بہت عزت سے لیا اور جیسا کہ بوڑھے سلاطین کی عادت ہوتی ہے حکما اور طبیبوں کو اس نے اپنی خاص مہربانی و نوازش کا ممنون کیا۔ اسکو تو بادشاہ اپنے خاص محل میں جانے دینے کو تھا مگر اُس منجم نے ایک غار میں رہنے کو پسند کیا جو شہر غرناطہ کے قریب ایک پہاڑ میں بنا ہوا تھا۔ اور یہ وُہی پہاڑ ہے جس پر اُس کے بعد کے زمانہ میں قصر الحمرا بنایا گیا۔ اِس نے اُس غار کو کسیقدر وسیع کرایا اور اُس میں ایک بلند و وسیع ایوان بنوا کر اس کی چھت میں ایک سوراخ مثل کنوئیں کے اُوپر تک کھدوایا تاکہ اُس میں سے آسمان اور تاروںکو دن کے وقت بھی دیکھ سکے۔ اس غار کی دیواروں پر اُس نے مصری علامات اور نقوش کندہ کرائے اور ستاروں کے اشکال اور اُنکے بُرجوں کی علامات بھی کھدوائیں۔ اس ایوان کو اُس نے بہت سارے آلات سے آراستہ کیا اور سجایا جو اُس کی ہدایتوں کے مطابق غرناطہ کے چابکدست اُستادوں اور کاریگروں نے بنائے تھے مگر جن کے مخفی راز اور اسرار سے بغیر اس منجم کے اور کوئی واقف نہ تھا۔

تھوڑے عرصہ میں یہ منجم بادشاہ کا رازدار بنگیا اور ہر امر میں بادشاہ اُس سے مشورت کرتا تھا۔ ایک بار بادشاہ اپنے ہمسایوں کی شکایت اُس سے کر رہا تھا اور اُن کی یورشوں کی مدافعت کے لئے اپنی ہمیشہ کی خبرداریوں کا افسوس کر رہا تھا جب اُس نے اپنی شکایات کا سلسلہ ختم کیا تو منجم مذکور نے تھوڑی دیر تک سوچکر جواب دیا۔ آے بادشاہ! جان اور آگاہ ہو کہ جب مَیں مصر میں تھا تو مَیں نے ایک عجیب طلسم دیکھا جسکو زمانہ قدیم کی ایک بت پرست قسیسہ نے بنایا تھا۔ شہر بُرما کے قریب ایک

پہاڑ پر جہاں سے وادیٔ نیل پر نظر پڑتی ہے ایک مینڈھے کی مورت بنی ہوئی تھی اور اس کے اوپر ایک مرغ بنا ہوا تھا اور یہ دونوں پیتل کے ڈھلے ہوئے تھے اور ایک محور پر گھوم سکتے تھے۔ جس وقت کوئی غنیم اس ملک پر چڑھائی کرتا تو مینڈھے کا منہ اسی طرف پھر جاتا اور ساتھ ہی مرغ بھی بانگ دیتا تھا جس سے وہاں کی خلقت کو آنے والی آفت کی خبر ہو جاتی تھی اور اس کے رُخ سے بھی مطلع ہو جاتے تھے اور اس کے دفعیہ کا بروقت انتظام کر لیتے تھے۔

بادشاہ نے کہا اللہ اکبر۔ ایسا مینڈھا جو میرے شہر کے اطراف کے پہاڑوں پر نظر رکھے اور ایسا مرغ جو آنے والی آفت سے خبر کر دے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اللہ۔ اللہ جب ایسے ہوشیار محافظ اور دیدبان میرے لئے مقرر ہوں تو میں کیسی میٹھی نیند سوؤں گا۔

ابراہیم منجم تھوڑی دیر ٹھہرا رہا تاکہ بادشاہ کی خوشی کا جوش فرو ہو جائے پھر اس نے کہنا شروع کیا کہ جب عمرؓ نے مصر کو پوری طرح سے فتح کر لیا تو میں نے وہاں کے قبطیوں کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور ان کی بت پرستی کے اصول اور رسوم کو سیکھنا شروع کیا۔ اور جن علوم و فنون مخفیہ میں وہ مشہور ہیں ان کی تلاش و تحصیل میں مصروف ہوا ایک دن میں دریائے نیل کے کنارہ پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھے قبطی سے باتیں کر رہا تھا کہ اس نے ان اہرام مصر کی طرف اشارہ کیا جو صحرا میں پہاڑوں کی طرف تھے اور کہنے لگا۔ ہم سے جو کچھ تو سیکھے گا وہ ان علوم کے آگے ہیچ ہے جو ان اہرام میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ اس وسطی ہرم میں ایک دخمہ ہے جس میں اس بڑے قبطی کی مومیائی کی ہوئی لاش مدفون ہے جس نے ان اہرام

کی تیاری میں کمک دی تھی اور اس کے ساتھ ایک عجیب کتاب مدفون ہے جس میں سحر اور مخفی علوم و فنون کے راز درج ہیں۔ یہ کتاب حضرت آدم کو اُن کے ہبوط کے بعد دیگئی اور نسلاً بعد نسلٍ اُن سے حضرت سلیمان کو پہنچی جس کی مدد سے بیت المقدس کی عمارت کو اُنہوں نے تیار کرایا وُہ کتاب اس قتیس کے ہاتھ کیسے لگی اس کا علم خُدا کو ہے جو سب علوم کا دانا ہے۔

جب مَیں نے اس سے یہ بات سُنی تو میرے دل میں اس کے حاصل کرنے کے شوق کا شعلہ بھڑک اُٹھا۔ مَیں اُس وقت عرب کی فاتح فوج کے بہت سے سپاہیوں اور نیز مصری لوگوں سے کمک لے سکتا تھا۔ مَیں نے ان کی اعانت سے اس کام کو شروع کیا اور اس بڑے ہرم کو سُوراخ کیا اور آخر بڑی محنت سے اس کی ایک پوشیدہ سرنگ تک پہنچا اور زیر زمینی سرنگ میں داخل ہو کر بڑھا۔ یہاں تک کہ اس ہرم کے وسط میں داخل ہُوا اور اس دخمہ تک پہنچا۔ جہاں اس قتیس کی لاش صدہا سال سے رکھی ہُوئی تھی۔ مَیں نے اس مومیائی دار بیرونی غلاف کو توڑ کر اُس کے کفنوں اور بندشوں کو کھول کر آخر کار اُس نایاب اور قیمتی کتاب کو پایا جو اس کے سینہ پر دھری ہُوئی تھی۔ مَیں نے اس کتاب کو اپنے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے لیا اور اس ہرم سے جیسا گیا تھا باہر آیا۔ اور اس مومیائی دار لاش کو اسی اندھیرے اور خاموش دخمہ میں چھوڑ آیا جہاں وُہ قیامت کے دن تک آرام سے رہیگی۔

بادشاہ نے کہا، اَے ابن ابو ایّوب! تو بڑا سیّاح ہے اور دُنیا کے بہت سے عجائبات تو نے دیکھے ہیں لیکن اُس ہرم کے راز سے مجھے کیا

فائدہ اور حضرت سلیمان کی اس علوم کی کتاب سے مجھے کیا نفع -
منجم نے کہا فائدہ یہ ہے - اُس کتاب کے پڑھنے سے مجھے جملہ سحریات سے اطلاع ہے اور اپنے منصوبوں کی تعمیل میں میں جنات سے کمک لے سکتا ہوں - برسلے کے طلسم کے راز سے بھی میں واقف ہوں اور ویسا ہی طلسم تیار کر سکتا ہوں - بلکہ ایک ایسا طلسم بنا سکتا ہوں جو اس سے بھی زیادہ محکم ہو -

بادشاہ نے سُنکر پُکارا اے ابن ابوایوب - اگر ایک طلسم پہاڑوں کی چوٹیوں پر بنجائے تو ہزاروں دیدبانوں کے بُرجوں سے اور سرحد کے نگہبانوں سے بہتر ہے تو میرے لئے ایک ایسا طلسم بنادے اپنا سارا خزانہ تیرے اختیار پر چھوڑ دیتا ہوں -

منجم مذکور نے بادشاہ کی خواہش پُوری کرنے کے لئے فوراً کام شروع کردیا اُس نے بادشاہ کے محل کے اوپر ایک بہت بڑے برج کے بنانے کا حکم دیا جو البایسین پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا - یہ برج اُن پتھروں سے بنایا گیا جو مصر سے منگوائے گئے تھے - اور مشہور ہے کہ اہرام مصر کے کسی خاص ہرم کے یہ پتھر تھے اور برج کے اوپر کے حصہ میں ایک مدوّر کمرہ بنایا جس میں قطب نما کے ہر نقطہ کے سمت میں ایک ایک دریچہ رکھا گیا اور ہر دریچہ کے سامنے ایک میز رکھی گئی جن پر مثل عرصۂ شطرنج کے مصنوعی سوار و پیدل پرے جمائے کھڑے تھے اور اس بادشاہ کی مورت بھی اوپر رکھی گئی تھی جو اس سمت میں حکومت کرتا تھا - یہ سب مورتیں لکڑی سے تراشی ہوئی تھیں - ہر ایک ایسی میز کے لئے ایک چھوٹا سا نیزہ مقرر تھا جو ایک سُوا سے بڑا تھا - اور ان مستوروں پر بعض نقوش و حروف کلدانی

زبان میں کندہ تھے۔ اس کمرہ کا بُرج کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا جس میں ایک فولادی قفل لگا ہوا تھا جس کی کنجی بادشاہ کے پاس رہتی تھی۔

بُرج کے اوپر ایک عرب سوار کی مورت لگی ہوئی تھی جو ایک محور پر گردش کرتی تھی اور جس کے شانہ پر سپر پڑی ہوئی تھی اور ہات میں ایک نیزہ عمودی حالت میں اُٹھا ہوا تھا۔ اُس سوار کا رُخ شہر کی جانب تھا اس طرح پر کر گویا وُہ شہر کا پہرا دے رہا ہو۔ اور جس وقت کسی غنیم یا دشمن کی آمد معلوم ہوتی تھی یہ سوار اسی جانب اپنا مُنہ پھیر دیتا تھا اور نیزہ کو نیچا کر دیتا جیسا کہ وُہ لڑائی کے لئے مستعد ہے۔

جب یہ طلسم تیار ہو گیا جو بادشاہ کی کمال درجہ تمنّا تھی۔ تو جسقدر کہ آگے اُسکو آرام و آرائش کی فکر رہتی تھی۔ اب نہایت اضطراب کے ساتھ کسی دشمن کے حملہ کا منتظر تھا۔ بہرحال اس کی مراد جلد بر آئی۔ ایک دن صُبح کے وقت اُس سنتری نے جو بُرج کا محافظ تھا آکر خبر دی کہ اس سوار کی مُوتّ کا رُخ ابوہریرہ کے پہاڑوں کی طرف پھر گیا ہے اور اس کا نیزہ لوب کی گھاٹی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بادشاہ نے یہ سُنتے ہی حکم دیا کہ طبل اور کرنا بجائے جائیں اور تمام غرناطہ کے لوگ لڑائی کے لئے مستعد ہو جائیں۔ منجم نے کہا "اے بادشاہ اپنے شہر کو اضطراب میں نہ ڈال اور نہ اپنے سپاہیوں کو ہتھیار باندھنے کی زحمت دے کیونکہ ہم کو اُن دشمنوں سے نجات پانے کے لئے فوج کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اپنے درباریوں کو رخصت کر دے۔ تاکہ ہم دونو اُس طلسمی بُرج کے کمرہ میں جائیں۔

بڈھا بادشاہ ابراہیم ابن ابو ایوب کے شانہ پر ہاتھ رکھے ہوئے

اس بُرج کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا - اور پہنچکر اس طلسمی کمرہ کے دروازہ کو کھول کر اس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوب کی گھاٹی کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا ہے منجم نے کہا کہ دشمن اسی جانب کو ہے - اَے بادشاہ اب اس میز کے اسرار کو ملاحظہ کر بادشاہ اس شطرنج نما تختہ کے قریب آیا جس پر چھوٹی چھوٹی لکڑی کی مورتیں سپاہیوں کی شکل میں بنی ہوئی تھیں تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ سب فوج متحرک ہے - گھوڑے کود رہے ہیں اور کاوے لگا رہے ہیں اور سپاہی اپنے ہتھیار ہلا رہے ہیں - اور طبل کرنا کے بجنے اور ہتھیاروں کی جھنکار اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی دھیمی سی آواز آرہی ہے - اور یہ آواز ایسی دھیمی تھی کہ جیسے مکھی کے بھنبھنانے کی آواز کسی خواب آلود شخص کے کان میں پڑے جو دوپہر کو کسی سایہ دار جگہ میں سو رہا ہو -

منجم نے کہا - دیکھ اَے بادشاہ ! یہ ایک ثبوت ہے کہ تیرے دشمن اسوقت میدان میں موجود ہیں - اب وہ غالباً اس پہاڑ کے درہ میں آرہے ہیں جو لوب کی گھاٹی کے قریب ہے اگر تیری مرضی ہو کہ ان میں پریشانی اور خوف پیدا ہو جائے اور بغیر کسی کی جان جانے کے وہ واپس چلے جائیں تو ان مورتوں کو اس طلسمی نیزہ کے کند سرے سے مار اور اگر تیری خواہش کشت و خون کی ہو تو نیزہ کی نوک سے انکو مار - اس بات کے سُنتے ہی بادشاہ کے چہرہ پر سُرخی سی نمودار ہوئی - اس نیزہ کو کانپتے ہوئے بڑے شوق سے ہات میں لیا اور ڈگمگاتی ہوئی چال سے اس میز کی طرف بڑھا تو اس کی سفید داڑھی خوشی کے مارے ہل رہی تھی تب اس نے پکار کر کہا " اَے ابن ابوایوب میرے خیال میں تھوڑا سا خون بہایا جائے تو لطف ہے اس نے بعض کو اس طلسمی نیزہ کی نوک سے چھو دیا -

اور بعض کو اُس کے کنگرے سے جھوڑ دیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پہلا فریق تو فوراً مر کر میز پر گر پڑا اور باقی اپنے آپس میں لڑنے لگے۔ منجم نے بڑی مشکل سے اس ظاہری صلح پسند اور باطنی خونخوار بادشاہ کا ہاتھ روکا جس کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے دشمنوں کا بالکل قلع و قمع کر دے۔ بڑی کوشش سے اُس نے بادشاہ کو اس بُرج سے اُتارا اور مخبروں کو لوب کی گھاٹی کو خبر لانے کے لئے روانہ کیا۔ مخبروں نے تھوڑی دیر میں یہ خبر پہنچائی کہ ایک بڑی عیسائی فوج سیرا کے وسط سے آگے بڑھ کر غرناطہ کے قریب آ پہنچی تھی اور وہاں آپس میں اُن کا فساد ہُوا اور ہتھیار کھینچ کر ایک دُوسرے پر گرے اور بہت خونریزی کے بعد سرحد کے پار واپس گئے

بادشاہ یہ سُنکر مارے خوشی کے اپنے میں نہیں سماتا تھا کیونکہ اُس کو اُس طلسم کی تاثیر کا پُورا ثبوت مل گیا اور کہنے لگا: اب میں آرام سے زندگی بسر کر سکونگا اور اپنے دشمنوں کو قبضہ میں کر لونگا۔ اَے دانشمند ابن ابُو ایُّوب اس نعمت کے صلہ میں میں تم کو کیا دے سکتا ہُوں۔

منجم نے جواب دیا۔ اَے بادشاہ ایک بوڑھے حکیم کی ضرورتیں بہت کم اور بالکل سادی ہوتی ہیں اگر تو مجھے صرف اس قدر عطا فرمائے کہ میں اپنے غار کو ایک زاہد کے گوشہ انزوا کی طرح آراستہ کر سکوں تو میں قناعت کرونگا۔

بادشاہ اس کی مختصر درخواست سُنکر دل میں بہت خوش ہُوا اور کہنے لگا کہ جو لوگ حقیقی حکیم ہوتے ہیں اُن کی ضرورتیں کس قدر مختصر ہوتی ہیں اور اُنکی قناعت کس قدر قابلِ قدر ہوتی ہے۔ یہ کہکر اُس نے اپنے خزانچی کو بلوا کر حکم دیا ابراہیم کو جس قدر رقم کی ضرورت اس کے غار کی تکمیل اور سجانے میں ہو بلا تامل خزانہ شاہی سے ادا کرے۔

اب اس منجم نے حکم دیا کہ متعدد کمرے اس پہاڑ میں کھود دے جائیں جو اس کے

رصدخانہ سے ملے ہوئے ہوں ۔ ان میں اس نے اعلیٰ درجہ کے صفۂ اور تخت بچھوائے اور دیواروں سے دمشق کے نہایت قیمتی ریشمی پردے لٹکانے کا حکم دیا اور کہنے لگا میں ضعیف اور بوڑھا ہوں اب مجھ سے پتھر کے تخت اور فرش پر سویا نہیں جاتا اور ان سرد اور مرطوب دیواروں کے لئے پردے ضروری ہیں

اُس نے پھر کئی حمام بنوائے جن میں اقسام کے عطریات اور خوشبو تیل مہیا کئے گئے تھے ۔ اس کا قول تھا کہ پیری کی سختی کے دفعیہ کے لئے اور جسم کو چُست وچالاک بنانے کے لئے حمام ایک لازمی چیز ہے اور میرا جسم تحصیل علم کی تکلیفوں کو اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا ہے ۔

اُن کمروں میں اُس نے متعدد بلوری اور چاندی کے چراغ چھت سے لٹکائے جن میں خوشبودار تیل جلتا تھا اور جو اُس نسخہ کے مطابق تیار کیا گیا تھا جو اس کو مصر کے اہرام میں ملا تھا ۔ یہ تیل دوانی تھا یعنے جلنے سے کم نہیں ہوتا تھا جس کی روشنی دن کی چھنتی ہوئی روشنی کے مانند تھی ۔ وہ کہتا تھا کہ "آفتاب کی روشنی بوڑھے اشخاص کی آنکھوں کے لئے نہایت تیز اور مضر ہے اور حکماء کے مطالعہ کے لئے ان چراغوں کی روشنی زیادہ تر مناسب ہے ۔ بادشاہ کے خزانچی نے اُس منجم کے آئے دن کی فرمائشوں سے تنگ آکر بادشاہ تک شکایت پہنچائی ۔ بادشاہ نے اپنے وعدہ کا پاس رکھا اور اُس کی شکایت کا کچھ خیال نہیں کیا اور فرمایا "ہم کو صبر کرنا چاہئے ۔ اس شخص نے ان حکماء کے صومعہ اور زاویے کے خیالات کو مصر کے اہرام سے حاصل کیا ہے اور چونکہ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہو اس غار کی آرائش بھی وقت پر ختم ہوگی ۔ بادشاہ کا یہ خیال بہت درست تھا اور چند روز میں وہ سب حجرے آرائش کے سامان سے ہر طرح سے سج گئے وہ حجرے کیا تھے کہ ایک زیر زمینی محل تھا ۔ اس منجم نے اب اُن کی آرائش دیکھکر اپنا اطمینان

ظاہر کیا اور تین روز کامل اُن میں بند رہا اور اپنے علوم کی تحقیقات میں مصروف رہا۔ تین روز بعد پھر خزانچی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ اب صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وُہ ایک چھوٹی سی چیز ہے جو ذہنی زحمات کے درمیان دل کو آرام دینے کے لئے لازم ہے۔

خزانچی نے کہا۔ "اے حکیم مجھے حکم ہے کہ تیری تنہائی کے رفع کرنے کے لئے جس شئے کی ضرورت ہو مہیا کر دوں تو کہہ کہ اب کیا چیز تجھ کو درکار ہے"۔

منجم نے کہا "میں چند ناچنے والی عورتیں چاہتا ہوں" خزانچی نے تعجب سے پُوچھا کیا ناچنے والی عورتیں"؟ تو منجم نے جواب دیا کہ "ہاں۔ ناچنے والی عورتیں۔ مگر وہ خوبصورت حسین اور جوان بھی ہوں۔ کیونکہ نوجوانی وحسن کا دیکھنا فرحت بخش ہے۔ چند عورتیں کافی ہیں۔ کیونکہ میں حکیم ہُوں اور میری خواہشیں سادہ اور سہل الوصُول ہیں"۔ یہاں تو ابراہیم ابن ابُو ایوب حکیمانہ وضع پر اپنا وقت صومعہ میں گذارتا تھا اور وہاں وُہ ظاہری صلح پسند بادشاہ برج میں بیٹھے ہُوئے اپنے دشمنوں کے ساتھ خونخوار لڑائیاں لڑ رہا تھا اور ایک بوڑھے اور دھیمے بادشاہ کے لئے یہ کام نہایت ہی مناسب واقع ہُوا تھا کیونکہ لڑائیوں کا مسئلہ اس کے لئے اس آسانی کے ساتھ طے ہو گیا تھا کہ اپنے کمرہ میں بیٹھے ہُوئے ہزاروں فوج کی جان بےخطر لینا جائے۔ گویا کہ وُہ مکھیاں تھیں۔ ایک مدت تک تو وُہ اپنی دلی خواہشوں کو اس طرح پر پُورا کرتا رہا اور اپنے ہمسایہ بادشاہوں کو طعنہ دیتا اور ان کی توہین کرتا تھا۔ آخر کار وُہ اس کے ظلم سے تنگ آگئے اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس پر چڑھائی کرے وُہ بحر کس کا طلسمی سوار کئی مہینوں تک صلح کی حالت میں رہا اور اپنا نیزہ سیدھا کئے ہوئے کھڑا تھا۔ بوڑھے بادشاہ کو بسبب نہ ہونے کسی مشغلہ کے ایک

قسم کی بےچینی پیدا ہوئی اور خونریزی کے اشتیاق میں بیتابی کے ساتھ اکثر خفا رہتا تھا۔

ایک روز اس طلسمی سوار نے اپنے محور پر گھومنا شروع کیا اور اپنے بھالے کو نیچا کیا اور گاوکشن کے پہاڑوں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ بادشاہ یہ معلوم ہوتے ہی فوراً اس برج پر گیا لیکن اس مینر پر کی طلسمی مورتوں کو دیکھا تو خاموش تھیں اور مطلق حرکت نہیں کرتی تھیں۔ اس سے اس کو سخت تعجب اور تشویش ہوئی اور فوراً اتر کر ایک دستہ سواروں کا پہاڑوں کی طرف روانہ کیا۔ وہ لوگ تین روز کے بعد واپس آئے۔ اور ان کے افسر نے کہا کہ۔ ہم نے ہر گھاٹی کو دیکھا وہاں کسی کا پتہ نہ پایا اور ہماری تلاش میں ایک عیسائی نہایت حسین لڑکی ملی جو ایک چشمہ کے پاس دوپہر کو سو رہی تھی۔ ہم اسکو مقید کر کے اپنے ہمراہ لائے ہیں۔

بادشاہ نے نہایت اشتیاق و بے تابی کے ساتھ پوچھا "نہایت حسین لڑکی۔ وہ کہاں ہے۔ اُس کو میرے حضور میں لے آؤ"۔ اس فرمان کے ساتھ ہی وہ لڑکی حضور میں پیش کی گئی۔ اُس کے جسم پر اسپین کے وہ سب قیمتی زیور تھے جو عربوں کے فتوحات کے زمانہ میں عیسائی عورتیں پہنا کرتی تھیں۔ اس کے بالوں میں سفید چمکتے ہوئے موتی پروئے ہوئے تھے اور اس کی پیشانی پر ایک ٹیکا آویزاں تھا جس کا ہیرا اس کی آنکھوں کے چمک کے ساتھ ہمچشمی کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر تھی جس سے ایک چھوٹا سا چاندی کا ستار لٹکتا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ درخشندہ آنکھوں سے جو روشنی نکلتی تھی۔ بادشاہ کے پژمردہ اور کملائے ہوئے مگر بھڑکنے والے دل پر بجلی کا کام کر رہی تھی۔ اُس کی متوالی چال سے بادشاہ کی حالت بالکل بدل دی

ہوئی جاتی تھی۔ اُس نے اسکو دیکھ کر خوشی سے پکارا "اَے عورتوں کی سرتاج تو کون ہے اور کیسی ہے"؟

لڑکی نے جواب دیا "اَے بادشاہ! مَیں ایک گاتھ شہزادے کی بیٹی ہُوں جو تھوڑے دنوں آگے تک اس ملک میں ریاست کرتا تھا۔ میرے باپ کی ساری فوج اسی پہاڑ میں ایسی ماری گئی جیسا کہ جادو سے کوئی انکو مار گیا ہو۔ میرا باپ غربت میں آوارہ پھر رہا ہے اور مَیں اُسکی بیٹی اِس وقت تیری قید میں ہُوں؟

ابراہیم ابن ابو ایوب جو اس وقت دربار میں حاضر تھا کہنے لگا "اَے بادشاہ ہوشیار رہنا۔ شاید یہ اُن شمالی جادوگرنیوں میں سے ہو جنکا ذکر ہم نے سُنا ہے جو مختلف شکلیں اختیار کرکے ناآزمودہ لوگوں کو دھوکا دیجاتی ہیں۔ مَیں اس کی آنکھوں میں جادو دیکھتا ہُوں اور اُس کی ہر حرکت سے سحر ٹپکتا ہے غالباً یہ وُہی دشمن ہے جس کی طرف وہ طلسمی سوار اشارہ کر رہا تھا"۔

بادشاہ نے کہا۔ "مَیں مانتا ہُوں کہ تو ایک دانشمند بلکہ ایک بڑا زبردست جادوگر ہے لیکن تو عورتوں کی راہ سے واقف نہیں۔ اِس خاص امر میں تو مَیں کسی سے کم نہیں۔ اور اگرچہ سلیمان کی بہت ساری بیبیاں تھیں مَیں اُن کو بھی اس بات میں اپنے اوپر ترجیح نہیں دُونگا اور اس لڑکی کے بارے میں تو مجھے مطلق خوف نہیں۔ اس کی صورت دلرُبا ہے اور میری نظر میں کھُب رہی ہے"۔

منجم نے کہا "سُن اے بادشاہ تجھے میرے طلسمات کے زور سے بہت فتحیں نصیب ہوئیں لیکن مَیں نے کسی فتح کی غارت میں حصہ نہیں پایا۔ پس اس قیدی کو میرے حوالہ کر دے تاکہ میری تنہائی میں وُہ اپنے چاندی کے ستار سے مجھے تسکین بخشے۔ اگر وُہ ساحرہ بھی ہو تو میرے پاس بھی اس سے بڑے سحر ہیں جن سے مَیں اس کے سحر کو باطل کر سکتا ہوں"۔ بادشاہ نے پکار کر کہا۔ "کیا تجھے اَور

بھی عورتیں چاہئیں۔ کیا تیرے پاس اس وقت ناچنے والی عورتیں تیرے دل بہلانے کے لئے کافی نہیں ہیں جو اور بھی چاہتا ہے"۔ اُس نے کہا "ہاں یہ سچ ہے کہ ناچنے والی عورتیں میرے پاس ہیں لیکن مجھے موسیقی سُننے کی خواہش ہے تاکہ میرے دل کو مطالعہ کی تکلیف سے تازہ کرے"۔ بادشاہ نے بیتاب ہوکر کہا "تیری زاہدانہ خواہشوں کو سلام ہے۔ مَیں نے اس لڑکی کو خاص اپنے لئے تجویز کیا ہے۔ مَیں اپنی آسایش اس کی صحبت میں پاتا ہوں جیسا کہ مجنوں کو لیلی کی صحبت سے اور فرہاد کو شیریں کی مُلاقات سے حاصل ہوتی تھی"۔

منجم کے اصرار پر بادشاہ کو اَور ضد ہوئی یہاں تک کہ دونوں میں رخصت ہوتے وقت پُوری ناچاقی ہوگئی تھی۔ منجم تو اپنے صومعہ میں جاکر خلق سے کنارہ کش اور منزوی ہوگیا اور اپنے رنج پر افسوس کرنے لگا۔ لیکن جانے کے قبل بادشاہ کو نصیحت کرتا گیا کہ اس قیدی لڑکی سے ہوشیار رہے۔ لیکن دُنیا میں ایسا بوڑھا عاشق کہاں ہے جو کسی کی نصیحت پر عمل کرے۔ بادشاہ کا دل اُس کی نفسانی خواہشوں کا شکار بنگیا تھا اور اس کی رات دن کی فکر یہی تھی کہ اس گانے والی معشوقہ کی نظروں میں جس طرح سے ہوسکے محبوب واقع ہو۔ یہ سچ ہے کہ وُہ جوان نہیں تھا لیکن دولت رکھتا تھا۔ اور جبکہ عاشق بوڑھا ہو تو نہایت فیاض بھی ہوتا ہے۔ غرناطہ کی منڈیوں میں ممالکِ مشرق کا جو مالِ تجارت تھا سب کو چھان کر عُمدہ سے عُمدہ اشیا طلب کی گئیں۔ ریشمی کپڑے۔ جواہرات۔ زیور۔ عُمدہ عطریات غرض جو کچھ کہ ایشیا یا افریقہ میں قیمتی و نایاب شے ہوتی تھی وہ اس معشوقہ کے لئے مہیّا کی گئی اور ہر قسم کے تماشے اور خوشی کی مجلسیں اس کے خوش کرنے کے لئے ترتیب دی گئیں۔ راگ رنگ۔ ناچ۔ سپاہگری کے کرتب کے جلسے۔ سانڈوں کی لڑائی یہ سب یکے بعد دیگرے ہر روز ہُوا کرتے تھے۔ سارا غرناطہ

ایک مدت تک وہ انہی عید منانے میں مصروف تھا اور شہزادی تھی کہ ان سب باتوں کو معمولی طور پر دیکھا کرتی تھی گویا کہ ہمیشہ ایسی چیزوں کے دیکھنے کی عادی ہے وہ ان سب تماشوں کو اپنی منزلت اور مرتبہ کا خراج سمجھتی تھی - بلکہ وہ بادشاہ کو اسراف و فضول خرچی میں مصروف کر کے اس کی مسرفانہ فیاضی کو ایک معمولی بات خیال کرتی تھی - اس فیاضی اور دلجوئی پر بھی اس کے سخت دل پر اس سٹھیائے ہوئے عاشق کی طرف سے مطلق اثر نہ ہوتا تھا - یہ سچ ہے کہ وہ ہرگز چیں بہ جبیں نہیں ہوتی تھی - مگر تبسم سے بھی کبھی بادشاہ کے دل کو خوش نہیں کرتی تھی اور جب کبھی وہ اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتا وہ اپنا چاندی کا ستار لیکر بجانا شروع کرتی جس کی آواز میں گویا سحر بھرا تھا کیونکہ تھوڑی دیر میں بادشاہ پر غنودگی سی طاری ہو جاتی تھی اور وہ اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور جب جاگ اٹھتا تو اس کی طبیعت نہایت فرحناک رہتی لیکن اس کا جوش عشق فرو ہو جاتا تھا - اس کے مقصود کے لئے یہ بات ناموافق تھی - اس نیند کی حالت میں مزے مزے کے خواب بھی دیکھتا تھا اس کے ہوش و حواس غارت ہو جاتے تھے - وہ تو اسی طرح سے خواب میں رہنے لگا اور سارا غرناطہ اس کی فریفتگی پر ہنستا تھا اور خزانہ پر افسوس کرتا تھا جو ایک راگ کے لئے بیدردی کے ساتھ لٹایا جا رہا تھا - آخر ایک مصیبت اس بادشاہ پر نازل ہو ہی گئی - جس کی آمد سے اس کے طلسم نے اس کو مطلق خبر نہیں دی - یعنی اس کے پایہ تخت میں بلوا اور بغاوت برپا ہوئی اور اس کے محل کو باغیوں نے گھیر لیا اور اسکی اور اس کی معشوقہ کی جان کا قصد کیا - یہ دیکھکر اس کے سینہ میں اس کی قدیم جرات اور سپاہگری کی آگ بھڑک اٹھی اور چند کار آزمودہ سپاہیوں کو لیکر وہ باہر نکل پڑا اور باغیوں کو مار کر بھگا دیا اور بغاوت کے شعلہ کو فرو کر کے

شہر میں پھر امن قائم کیا۔

جب شہر میں امن قائم ہوا تو وہ منجم کے پاس گیا جو اپنے صومعہ میں دروازہ بند کئے ہوئے افسوس کرتا اور غم کھاتا ہوا بیٹھا تھا۔ بادشاہ نے اس سے صلح آمیز طور پر مخاطب ہو کر کہا۔ "اے ابن ابو ایوب۔ تو نے فی الحقیقت سچ کہا تھا کہ اس قیدی معشوقہ سے مجھ کو خطر ہے تو جو آنے والی مصیبتوں کو قبل از وقت دیکھ سکتا ہے۔ اب مجھے بتلا کر اُنکے دفعیہ کے لئے کیا تدبیر کرنی چاہیئے"۔

حکیم نے جواب دیا "اس کافر لڑکی کو اپنے سے دُور کر دے کیونکہ وہی اس کا باعث ہے"

بادشاہ نے کہا۔ "یہ تو ممکن نہیں۔ میری سلطنت جائے مگر اُس کو تو دُور نہیں کر سکتا ہوں"۔

منجم نے کہا۔ "خوف اس کا ہے کہ دونوں بھی نہ رہیں"۔

بادشاہ۔ "اے حکیم! خفا مت ہو۔ اور ایسی سختی کا اظہار بھی نہ کر۔ ایک بادشاہ اور عاشق کے دوہرے غم کا خیال کر اور کوئی تدبیر ایسی بتلا جو مجھے ایسی مصیبتوں سے محفوظ رکھے جو اس وقت مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے عظمت کی پرواہ نہیں نہ اقتدار کی پرواہ ہے۔ صرف آرام و آسائش کا طالب ہوں۔ کاش مجھے کوئی آرام کی جائے پناہ ملجاتی جہاں میں دُنیا سے آسودہ ہو کر رہتا اور اس کے افکارات و نمایشوں اور جھگڑوں سے فارغ البال بسر کرتا اور اپنی بقیہ عمر کو آرام سے گذار دیتا۔ منجم نے اس کی طرف اپنے گوشۂ چشم سے تھوڑی دیر تک دیکھکر کہا۔ "اگر میں تیرے لئے ایسی جائے مہیا کر دوں تو تو مجھے اُس کا صلہ دیگا"۔

بادشاہ۔ "اے حکیم تو خود اس کا انعام مقرر کردے۔ جو کچھ ہو اگر وہ میرے قبضہ اقتدار میں ہوگا تو میں اپنی عمر و جان کی قسم کھاتا ہوں کہ اس کے دینے میں دریغ نہ کرونگا

منجم۔ "اے بادشاہ! تو نے باغ ارم کا ذکر تو ضرور سنا ہوگا جو ملکِ عرب میں تھا"
بادشاہ"۔ ہاں مَیں نے اُس باغ کا ذکر سُنا ہے اور قرآن مجید کے سورۂ فجر میں بھی مذکور ہے۔ اُس کے علاوہ مَیں نے روایاتِ عجیبہ اور حکایاتِ غریبہ اِس کے متعلق کعبہ کے زائرین سے بھی سُنی ہیں لیکن مَیں ان سب کو افسانہ خیال کرتا تھا جیسا کہ سیّاح اور سفرکردہ لوگ اکثر کہا کرتے ہیں"۔

منجّم۔ اَے بادشاہ! سیّاحوں کی باتوں کو جھوٹ مت سمجھ کیونکہ اُن کے پاس اکثر بہت قیمتی اور نایاب معلومات کا ذخیرہ رہتا ہے جو دُنیا کے پرلے سرے سے وُہ اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ لیکن باغ ارم کے متعلق جو کچھ تو نے سُنا ہے وُہ بالکل سچ ہے مَیں نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب میرا قصّہ سُن جو تیرے مطلب سے تعلّق رکھتا ہے۔ میرے بچپن کے زمانہ کا ذکر ہے۔ مَیں ایک بدوی عرب کا لڑکا تھا اپنے باپ کے اُونٹوں کو چرایا کرتا تھا۔ عدن کے صحرا میں ایک اونٹ سب سے جُدا ہو کر کھو گیا۔ مَیں نے چند روز تک اُس کی تلاش کی لیکن بے سُود۔ اس کا پتہ نہ ملا اور مَیں تھک کر ضعف کی حالت میں ایک دن دوپہر کے وقت ایک چھوٹے کنوئیں کے خرما کے درخت کے تلے سو رہا۔ جب میری آنکھ کھُلی تو مَیں ایک شہر کے دروازہ کے پاس تھا۔ مَیں اُس میں داخل ہوا تو وہاں وسیع راستہ اور میدان اور بازارات دیکھے لیکن اُس میں کوئی متنفّس نظر نہ آیا سارا شہر سنسان تھا۔ ایسے ہی ٹہلتے ہُوئے مَیں ایک عالیشان عمارت کے قریب جا نکلا جس کے نزدیک ایک عمدہ خوشنما باغ تھا جس میں حوض۔ فوارہ اور تالاب تھے اور اشجار و میوہ جات کثرت سے تھے لیکن کوئی ان کا دیکھنے والا یا پرستار نہ تھا۔ اِس سنسان حالت کو

دیکھکر میری طبیعت گھبرا گئی او شہر کے باہر نکلا جب پھر کر دیکھا تو نہ شہر کا نشان تھا نہ باغ کا پتہ اور وُہی صحرائے لق و دق مجھے دُور تک نظر آنے لگا۔ اس حوالی میں مجھے ایک بوڑھا درویش ملا جو اس خطہ کے حالات و روایات اور اسرار سے واقف تھا۔ میں نے اس سے وُہ واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا کہ۔ یہ وُہی مشہور باغ ارم ہے جو اس صحرا کے عجائبات سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ باغ کبھی کبھی کسی آوارہ اور گم کردہ راہ کو نظر آجاتا ہے جیسا کہ تو نے دیکھا۔ جس کے دیکھنے سے اس کی طبیعت خوش ہوجاتی ہے اور وُہ باغات و اشجار و میوجات و عمارات عالیہ اس کو محو کر دیتی ہیں اور بعد کو دفعتہً نظر سے غائب ہوجاتی ہیں اور سوائے صحرا کے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اسکی حکایت اس طور پر ہے۔ زمانہ قدیم میں اس مُلک میں قوم عاد آباد تھی اور شدّاد ابن عاد حضرت نوح کا پرپوتا یہاں کا بادشاہ تھا اُس نے اس شہر کی بنا ڈالی اور جب یہ تیار ہوچکا اور اس نے اس کی آرائش دیکھی تو اُس کے دل میں غرور و تکبر نے جا لی اور اُس نے ارادہ کیا کہ اس میں ویسے باغ ہوں اور ویسے ہی قصر تیار کئے جائیں جو اُس بہشت و قصور کے نظیر ہوں جنکا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے۔ لیکن غرور کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ اُس غرور نے اُس پر خدا کا قہر و غضب نازل کرایا اور وُہ اور اس کی رعایا سب صفحۂ دُنیا سے نابُود کر دیئے گئے اور اس کا شہر اور باغ ہمیشہ کے لئے انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہوگئے۔ مگر کبھی کبھی کسی کو نظر آجاتے ہیں تاکہ اُس کے غرور و گناہ کو مخلوق کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھیں"۔

"اے بادشاہ۔ یہ حکایت اور جو عجائبات مَیں نے وہاں دیکھے تھے ہمیشہ

میرے خیال میں موجود رہتے تھے۔ سالہا سال کے بعد جب میں مصر میں تھا اور حضرت سلیمان کی کتاب میرے ہاتھ لگی تو مَیں نے ارادہ کیا کہ پھر جا کر اس باغ ارم کو دیکھوں۔ بہرحال گیا اور اس کو بخوبی اپنے علم کے زور سے دیکھا اور شدّاد کے محل میں چند روز تک مَیں نے قیام بھی کیا اور اس کے بہشت کے مزے بھی لوٹے۔ جو جنات اُس قصر و باغ کے محافظ تھے وُہ میرے سحر کے مطیع تھے اور اُنہوں نے مجھے اس طلسم سے واقف کیا۔ جس کے اثر سے وُہ باغ بنایا گیا تھا اور جس کی وجہ سے وُہ نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اَے بادشاہ۔ مَیں تیرے لئے ویسا ہی باغ اور ویسا ہی قصر تیار کر سکتا ہوں اور اسی شہر غرناطہ کے قریب کے پہاڑ پر اس کو بناؤنگا۔ کیا مَیں ان جملہ مخفی اسرار و سحروں سے واقف نہیں ہوں۔ اور کیا میرے پاس حضرت سلیمان کی وُہ کتاب نہیں"۔

بادشاہ خوشی کے مارے کانپ رہا تھا اور کہا "اَے ابن ابو ایوب۔ بیشک تو بڑا جہاندیدہ شخص ہے اور بہت سی عجیب و غریب باتیں تو نے سیکھی ہیں۔ میرے لئے ایک ایسا بہشت بنادے اور اپنی آدھی سلطنت میں تیری نذر کرتا ہوں"۔

منجم۔ "آہ! اَے بادشاہ تو جانتا ہے کہ مَیں بوڑھا شخص اور حکیم ہوں اور بہت تھوڑے پر قانع ہوں۔ مَیں صرف یہی چاہتا ہوں کہ جب وُہ جادو کا محل تیار ہو جائے تو پہلا باربرداری کا جانور جو اس کے دروازے میں داخل ہو مع اس کے بار کے جو اس پر ہو مجھے بخشدے یہی صلہ میرے لئے کافی ہے"۔

بادشاہ نے اُس کی ایسی مختصر درخواست کو بخوشی منظور کر لیا اور منجم نے

اپنا کام شروع کر دیا۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر جو اس کے زیر زمینی صومعہ کے برابر اُوپر تھا اُس نے ایک بڑا دروازہ بنانے کا حکم دیا جو ایک مستحکم برج میں کھُلتا تھا اس کے باہر ایک پیش بام تھا جس کے طاق نہایت بلند تھے اور اس کی اندر کی جانب نہایت مضبُوط دروازے لگے ہوُئے تھے اس طاق کی چوٹی کے پتھر پر اُس منجم نے ایک بڑی کنجی کی شکل اپنے ہاتھ سے بنائی اور باہر کے طاق پر جو پہلے طاق سے بڑا تھا ایک ہاتھ کی تصویر کھینچی یہ بہت ہی زبردست طلسم تھا جس پر اُس نے کسی نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ پڑھ کر دم کئے جب یہ دروازہ تیار ہوگیا تو وہ دو روز تک اپنے صومعہ میں تنہا بند رہا اور بعض اَوراد کے پڑھنے میں مصروف ہوا تیسرے دن وہ اُس پہاڑ پر چڑھا اور تمام دن اس کی چوٹی پر گذارا بہت رات گئے وہ اُتر کر سیدھا بادشاہ کے محل پر پہنچا اور بادشاہ کے حضور میں عرض کیا "اے بادشاہ شکر ہے کہ میرا کام ختم ہوا۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک نہایت عمدہ اور دلکش قصر تیار کیا گیا ہے جس کا نظیر کبھی انسان کے ہاتھوں نے بنایا نہیں اُس میں عمدہ سجے ہوُئے اور آراستہ ایوان۔ غلام گردش۔ خوش قطع باغات حوض اور فوّارے اور معطّر حمام موجود ہیں۔ مختصر کلام یہ کہ میں نے اس سارے پہاڑ کو بہشت بنا دیا ہے اور مثل باغ ارم اس کو ایک طلسم سے محفوظ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وُہ انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔ وُہی لوگ اس کو دیکھ سکتے ہیں جو اس طلسم کے راز سے واقف ہیں"۔

بادشاہ نے خوشی کے ساتھ کہا "بس کل صبح کو نور کے تڑکے ہم اس پہاڑ پر چڑھینگے اور اُس قصر پر اپنا قبضہ کرینگے"۔ بادشاہ کو مارے خوشی کے شب بھر نیند نہ آئی۔ علی الصّباح آفتاب کی کرنیں ابھی سیرا نوادا کی برف آلود چوٹیوں پر پڑنے نہیں پائی تھیں کہ وُہ گھوڑے پر سوار ہوا اور چند خاص ہمراہیوں کو ساتھ

ہوئے ایک تنگ راستہ سے جو پہاڑ پر جاتا تھا روانہ ہوا۔ وہ گاتو شہزادی
ایک سفید خوبصورت یابو پر سوار اس کے بازو پر جا رہی تھی۔ اس کا
ں جواہرات سے چمک رہا تھا اور اس کے گلے سے وہی چاندی کا ستار
ہوا تھا۔ منجم بادشاہ کی دوسری جانب پا پیادہ جا رہا تھا اور اپنے طلسمی
ما کے سہارے سے چل رہا تھا کیونکہ وہ ہرگز کسی قسم کے جانور پر سوار
ہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ ادھر ادھر اس موعود قصر کے درخشندہ برجوں اور
روں اور اس کے اطراف کے باغات کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر
یکھتا تھا۔ لیکن اسوقت تک کوئی چیز اس کو نظر نہیں آتی تھی۔ منجم نے
ا کہ "اس مقام کے محفوظ رکھنے کا یہی راز ہے۔ کوئی چیز اسکو نظر نہیں
گی جب تک کہ تو اس طلسمی دروازہ کے اندر داخل نہ ہوگا اور اس جائے
قبضہ تجھ کو نہیں دیا جائیگا"۔

جب وہ سب دروازہ کے قریب پہنچے تو منجم نے بادشاہ کی توجہ
طلسمی ہاتھ اور کنجی کی طرف پھیری جو اس طاق کے اوپر کندہ تھی اور کہا
وہ طلسم ہیں جو اس بہشت کے دروازے کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب تک
ہاتھ نیچے آکر اس کنجی کو نہ لیوے نہ تو کوئی انسانی طاقت نہ کسی قسم کا سحر
پہاڑ کے مالک پر غالب آسکیگا"۔

بادشاہ تو حیرت اور سکتہ کے عالم میں اُن طلسمات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک
شہزادی کا یابو آگے بڑھا اور شہزادی کو لیکر دروازہ میں داخل ہو گیا۔
اس برج کے وسط میں پہنچا دیا۔ منجم نے پکار کر کہا۔ "دیکھ اے بادشاہ
میرا موعودہ انعام اور صلہ ہے۔ اور یہی پہلا جانور ہے جو اپنے بوجھ
ساتھ اس طلسمی دروازہ میں داخل ہوا ہے"۔

بادشاہ نے اِس بات کو حکیم کا لطیفہ خیال کر کے تبسّم کیا لیکن جب اُس کو معلوم ہوا کہ حکیم کو اپنا صلہ لینے پر اصرار ہے تو اس کی سفید داڑھی مارے طیش کے ہلنے لگی۔

اُس نے خفگی کے ساتھ کہا "اے ابن ایوب یہ کیا بات ہے۔ تو میرے وعدہ کے معنی کو خوب جانتا ہے کہ پہلا بار برداری کا جانور جو اس دروازہ میں داخل ہو مع اُس کے بار کے تیرا ہے۔ میرے اصطبل میں جا اور قوی ترین خچر کو انتخاب کر کے میرے خزانہ میں سے سب سے زیادہ بیش بہا جواہرات اس پر لادلے۔ میں اسکو مع اس کے بار کے تجھے بخش دونگا لیکن اپنے خیال کو اس معشوقہ کی طرف رجوع مت کر اور اس ارادہ سے باز آ کہ یہ میرے دل کا چین ہے"۔

منجم نے نہایت حقارت آمیز طور سے کہا "مجھے دولت کی کیا ضرورت ہے۔ کیا حضرت سلیمان کی کتاب میرے پاس نہیں۔ جس کے ذریعہ سے مَیں تمام دُنیا کے پوشیدہ خزائن کو اپنے قبضہ میں لا سکتا ہوں۔ یہ شہزادی اب میرا حق ہے اور تو نے شاہی قول ہارا ہے اس لئے اس کو تجھ سے اپنے حق کے طور پر طلب کرتا ہوں"۔ شہزادی اپنے یابو پر بیٹھے ہُوئے ایک حقارت آمیز نظر سے اُنکو دیکھنے لگی اور ان دونوں بوڑھوں کے جھگڑے پر جو حُسن و جوانی پر قبضہ کرنے کے لئے برپا ہوا تھا مُسکراتی تھی بادشاہ کے غضب کا شعلہ بھڑک اُٹھا اور اس کا دل بے قابو ہوگیا اور طیش میں اس نے کہا۔ "اے کمینہ وحشی زادہ! تیرے پاس بہت سحر و علم ہوگا۔ لیکن خیال رکھ کہ میں تیرا آقا ہوں اور اپنے بادشاہ کے ساتھ بے ادبی نہ کر"۔

منجم پر بھی غضب مستولی ہوگیا اور اُس نے کہا "میرا بادشاہ ؟ تو ایسے

شخص کا بادشاہ کیونکر ہو سکتا ہے جس کے قبضہ میں حضرت سلیمان کے طلسمات ہوں۔ خدا حافظ! اے بادشاہ! تو اپنی چھوٹی سی ریاست پر حکمرانی کر لے اور احمقوں کے بہشت میں مغرور رہ اور میں اپنے حکیمانہ صومعہ میں تجھ پر ہنستا رہونگا۔"

یہ کہکر اُس نے شہزادی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنے عصا کو زمین پر مارا اور شہزادی کے ساتھ اس برج کے وسط میں زمین کے اندر سما گیا اور زمین نے اُن دونوں کو ڈھانپ لیا۔ اور جس جائے پر وہ زمین میں دھس گئے وہاں کسی قسم کی دراز یا کشادگی کا اثر نظر نہیں آتا تھا۔

بادشاہ تھوڑی دیر تک حیرت میں محو اور گونگا سا ہو گیا۔ بعدہٗ ہوش میں آکر حکم دیا کہ ایک ہزار مزدور اس جائے کو کھودیں جہاں وہ منجم مع اس معشوقہ کے دھس گئے تھے۔ مزدور اگرچہ بہت دیر زمین کھودا کئے مگر انکے ہتھیاروں کا کوئی اثر اس سخت پتھر پر نہیں ہوا۔ اگر کہیں کھودتے تھے تو وہ مٹی پھر اسی طرح بھر جاتی۔ بادشاہ یہاں سے مایوس ہو کر اُس غار کے دروازہ پر گیا جہاں سے منجم کے زیر زمینی صومعہ اور محل کا راستہ تھا۔ مگر اس کا بھی پتا نہ ملا۔ جہاں غار کا دروازہ تھا اب وہاں ایک سخت پتھر کی چٹان نظر آئی۔ ابراہیم ابن ابوایوب کے غائب ہونے کے ساتھ اُس طلسم کا اثر بھی جاتا رہا جو اس نے بادشاہ کے لئے تیار کیا تھا۔ وہ پیتل کا سوار اپنی جائے پر ساکن کھڑا تھا اور اس کا نیزہ اس طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں وہ منجم پہاڑ میں سما گیا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ بادشاہ کا سب سے زیادہ قوی دشمن اب وہاں موجود ہے۔

اُس پہاڑ میں سے کبھی کبھی موسیقی کی آواز آتی اور ایک عورت کا

گا نا سنائی دیتا ہے۔ ایک دن ایک دہقانی نے بادشاہ کو یہ خبر لادی کہ شب گذشتہ کو اُس کو اس پہاڑ میں ایک دراز نظر آئی اور وُہ اُس میں چلا گیا۔ وہاں سے اسکو وُہ زیرزمینی مکان نظر آیا جہاں اس نے اس منجم کو دیکھا۔ ایک شاندار تخت پر بیٹھے ہُوئے شہزادی کے ستار بجانے پر سر ہلاتا تھا۔ جس سے اس کی فریفتگی ظاہر ہوتی تھی۔

بادشاہ اس مقام پر پہنچا لیکن وُہ دراز بند ہو گئی تھی۔ اور بہتیری کوشش کی کہ اس کا پتہ لگے مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ وُہ طلسم ہاتھ اور کنجی کا ایسا مستحکم تھا کہ انسانی طاقت اُس پر غالب نہیں آسکتی تھی اور پہاڑ کی چوٹی پر جہاں وُہ موعودہ بہشت اور قصر تھا سوائے خشک پتھر کے کچھ بھی وہاں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یا تو وُہ بہشت فی الحقیقت جادو کے اثر سے نظروں سے غائب ہو گیا ہے یا یہ کہ اس منجم کا نظر بند کا عمل تھا اور اسکا من گھڑت افسانہ تھا۔ بہرحال لوگ اس کو اپنی خوش عقیدتی سے منجم کا افسانہ خیال کرتے ہیں۔ بعضوں نے اس جائے کو بادشاہ کی حماقت اور بعضوں نے احمقوں کے بہشت کے نام سے موسُوم کیا ہے۔

بادشاہ کا غم و غصہ اس سے اور بھی زیادہ ہوا کہ اُس کے ہمسایوں کو جنکو اُس نے طعنہ دیئے تھے اور ستار کھا تھا اور اس طلسمی سوار کا مالک ہونے سے فرصت کے ساتھ اُن کی فوجوں کو نیست و نابود کرتا تھا۔ طلسم کے ٹوٹ جانے کی خبر ہوگئی اور انہوں نے چاروں طرف سے اُس کے مُلک کو تسخیر کر لیا اور اس کی بقیہ عمر کو تلخ کر دیا۔

اس غم نے آخر اسکو تمام کیا اور جب وُہ مر گیا اُس کو دفن کر دیا گیا۔ اس واقعہ پر صدہا سال گذر گئے ہیں اور اسی پہاڑ پر اندلس کا مشہور قصر الحمرا

بنایا گیا جو فی الجملہ اس باغ ارم کا نمونہ تھا۔ وُہ دروازہ طلسمی اب تک موجود ہے جو اس ہاتھ اور کنجی کے طلسم کی وجہ سے محفوظ ہے اور قلعہ کا بڑا دروازہ ہے جو باب العدل کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ وُہ بوڑھا منجم اس دروازہ کے نیچے اپنے زیرزمینی محل میں مقیم ہے اور اپنے تخت پر بیٹھا ہوا اس شہزادی کا ستار بجانا سُنا کرتا ہے جو سنتری اس دروازہ کا پہرہ دیتے ہیں بعض اوقات گرمیوں کی راتوں میں گانے اور بجانے کی آواز سُنتے ہیں جس کے اثر سے اُن پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وُہ پہرہ دیتے دیتے سو جاتے ہیں۔ وہاں کی ہوا میں بھی کچھ ایسی خواب آور تاثیر ہے کہ جو لوگ دن کو بھی وہاں جاتے ہیں اُن پر بھی وُہی اثر غنودگی کا طاری ہو جاتا ہے۔ قدیم روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حالت وہاں ہمیشہ کے لئے قائم رہیگی اور وُہ شہزادی اس منجم کی قید میں ہمیشہ رہیگی اور وُہ منجم بھی شہزادی کے جادو اثر ستار کی آواز سے ہمیشہ مست رہیگا اور یہ حالت قیامت تک قائم رہیگی۔ اِلّا یہ کہ وُہ طلسمی ہاتھ اس کنجی کو پکڑ لے اور اُس مسحور پہاڑ کا طلسم ٹوٹ جائے۔

میرزا مہدی خان

کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے

مخزن کی ایک گذشتہ اشاعت کے ذریعے سے میں نے یہ تحریک کی تھی کہ میر انیس کے کلام سے نہایت اعلیٰ اور چوٹی کے مرثیے منتخب کئے جاکر تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے۔ جس کے لغات۔ محاورات۔ روزمرہ۔ اصطلاحات اور تلمیحات کی فٹ نوٹ لکھکر تشریح کی گئی ہو۔ اس میں ایک مضمون بطور مقدمہ شامل کیا جائے۔ جس میں اغراض و اہمیت شہادت کا بیان ہو۔ اور جس سے اصلی مناظر کربلا اور عراق کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔ اور اس کو احتیاط کے ساتھ نہایت تکلف اور اہتمام سے چھپوایا جائے۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ لطف کلام ہر شخص کو علیٰ وجہ الکمال حاصل ہو۔ مثلاً میر صاحب کے ایک بند کے دو شعر ہیں ؎

بھیجا ہماری شان میں خالق نے ھل اتیٰ — کافی سند کے واسطے ہے لفظ قل کفا
زیبا ہمارے تن پہ ہے تشریف انما — ہم کو کیا خدا نے سرافراز لافتا

جب تک کسی شخص نے تفسیر یا کم از کم ترجمۂ قرآن نہ دیکھا ہو۔ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ لہٰذا از بس ضروری ہے کہ فٹ نوٹ کے ذریعہ سے ان آیات کے معنی اور شان نزول بیان کیجائے۔

یا ایک اور بند ہے ؎

کھولے ہوئے پر کہتے تھے شاہین ترازو — تلتے ہوں برابر کہ یہ عادل کا ہے اردو
سن لے جو فروشندہ ہر سنجیدہ و خوشخو — خاسر ہے جو میزان میں ہوا فرق سر مو
اک فصل میں اس جنس کے عقدے بھی کھلینگے

اعمال یوں ہی عقل کی میزاں میں تلینگے

یہ بند علاوہ اپنی ظاہری صنعت و حسن کے یہ معنوی خوبی اور رکھتا ہے۔ کہ اس کے چوتھے مصرع میں ایک آیہ شریفہ کی طرف اشارہ ہے۔ بلکہ "خاسر" اور "میزان" اُسی آیہ کے الفاظ ہیں۔ مگر تاوقتیکہ حاشیے میں اس کی تشریح نہ کیجائے اس معنوی لطافت تک ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔ یا سے

وا دا ہے شہنشاہِ دو عالم کا مددگار　　سردار جہاں۔ فخر عرب۔ جعفرِ طیار
وہ شیفتۂ طرازِ علمِ احمدِ مختار　　آلودہ رہی خون میں جس شیر کی تلوار
ہاتھوں کی عوض حق سے سر فرست لیئے ہیں
اللہ نے پر اُنکو زمرد کے دیئے ہیں

بھلا فرمایئے مذہبی روایات اور تاریخِ اسلام پر جس شخص کی کافی نظر نہیں وہ اس بند کا لطف کیسے اُٹھا سکتا ہے؟ یا سے

بازوے نبی۔ دستِ خدا نفسِ پیمبر　　طیب و زکی طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن و فاتحِ خیبر　　سرتاجِ عجم۔ میرِ عرب۔ حیدرِ صفدر
بہتر کوئی شاہد درِ خیبر سے نہیں ہے
دیکھے اسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے

باتیں تمام سچی ہیں۔ حدیث اور تاریخ نہایت زور سے اس کا ثبوت دے رہے ہیں لیکن ایک شخص کے پاس محض میر صاحب کے مرثیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کو اُن تلمیحات کی مفصل کیفیت کیونکر معلوم ہو؟ یا سے

کانپا کیا روم و عرب اک تیغ دو سر سے　　گنڈی سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
دینداروں کو امن اس نے دیا فتنہ و شر سے　　ضرب اس کی نہ روکی گئی جبرئیل کے پر سے
کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ مٹے گا

پر حشر تک اس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا

بیشک - بیشک - آمنا و صدقنا لیکن یہاں خود بخود سوال پیدا ہو سکتا ہی کہ تیغ دو سر کونسی تلوار کی صفت ہو سکتی ہی - مرحب و عنتر کون تھے؟ جبریل کے پر سے ضرب نہ رُکنے کا کیا مطلب؟ کیوں پڑی اور کب پڑی؟ یا ؎

یوسف کو گرفتاریٔ زنداں سے بچایا　　یعقوب کو تیغ غم ہجراں سے بچایا
چاہی جو مدد نوح کو طوفاں سے بچایا　　اندام خلیل آتش سوزاں سے بچایا

کونین میں ہے آج تلک شور ہمارا
خیبر کا در اُکھڑا تو کھُلا زور ہمارا

اب فرمایئے ان اعتقادی تلمیحات کو - کوئی کیونکر سمجھ سکتا ہے؟ کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب امیرؓ نے دُنیا میں بحسب ظاہر تشریف لانے سے ہزاروں برس پہلے - یوسف - نوح - ابراہیم - علٰی نبینا علیہم السلام کی مدد کیسے فرمائی اور خیبر کا در کس طرح اُکھڑا؟ یا ؎

وہ کونسا لشکر تھا ظفر جس پہ نہ پائی　　کفار نے خندق میں شکست آتے ہی کھائی
لاحد سے اُحد والوں کو قوت جو دکھائی　　اور بدر کی بھی شمس سے روشن ہی صفائی

مشہور ہے فطرس پہ جو احسان کیا ہی
مشکل کو فرشتوں کی بھی آسان کیا ہی

پہلے دونوں شعروں میں تاریخی تلمیحات ہیں اور ٹیپ کے شعر میں اعتقادی پس ان واقعات اور اعتقادیات کی تفصیل بیان کرنا از بس ضروری ہی کہ فرشتوں کی مشکل کس طرح آسان کی - اور "فطرس" پر کیا احسان کیا؟ یا ع

تلوار جنہیں حق نے عطا کی ہی وہ ہم ہیں

بلا تشریح کون جا سکتا ہی کہ کون سی تلوار حق نے کس کو عطا کی؟ اور کس طرح؟ یا

وُہ حکم کہ خورشید کو رفعت ہوئی جس سے

کس کے حکم سے خورشید کو رفعت ہُوئی ؟ اور کیونکر ؟ یا ع

آخر ہے مگر سب سے مقدم ہے محمد

اس کا ثبوت تشریح کے ذریعہ سے دیا جا سکتا ہے -

یہ اور اسی قسم کی ہزارہا تلمیحات وغیرہ کے علاوہ فنِ سپہگری سے متعلق جو اصطلاحات صَرف فرمائی ہیں - اُن کو یا تو اہلِ فن سمجھ سکتے ہیں - یا وہ جنہیں معلوم ہیں ہر خاص و عام اُن کے سمجھنے سے قاصر ہے - مثلاً ع

نیزے کا بند باندھ کے بولا وُہ خود پسند

یہ نیزہ بازوں کی اصطلاح ہی - ہر شخص نہیں جانتا - کہ "بند باندھنا" کسے کہتے ہیں اور کیونکر باندھا کرتے ہیں ؟ یا ع

"کندو گداز تیر نظر پہ بھی کی نظر"

"کندو گداز" تیر اندازوں کی ایک اِصطلاح ہی اور جو شخص "علم تیر" سے ناواقف ہی - خواہ بڑے سے بڑا عالم ہو - اس بندش کا لُطف کیسے اُٹھا سکتا ہی ؟ - غرض صدہا نکات و رموز ہیں - جو تشریح اور حاشیہ چاہتی ہیں اور تشریح ہو جانے سے لُطف سخن بدرجۂ اتم ہو سکتا ہی - انہی اسباب و وجوہ سے مَیں نے یہ تحریک کی تھی میرے نزدیک کسی علم دوست اور معقول شخص کو اس رائے سے اختلاف نہیں ہو سکتا - اس سے نہ صرف میر انیس مرحوم کی جوہر شناسی اور اظہار قدر دانی متصور ہی - بلکہ ادب اُردو میں ایک نہایت ضروری اور قابلِ فخر لائبریری اُڈیشن کا اضافہ ہو سکتا ہے -

ظاہر ہی کہ میرا وہ مضمون کسی تالیف یا تصنیف پر تنقید یا ریویو نہ تھا - بلکہ ایک نیا خیال تھا جو ہوا خواہانِ اُردو کی خدمت میں بطور تحریک عرض کر دیا گیا - مگر مجھ سی

قصور یہ ہوا۔ کہ ضمناً موازنہ دبیر و انیس کے لئے مولوی شبلی کی تعریف کر بیٹھا۔ اور ممدوح نے کلامِ انیس کا جس طرح کیمیاوی امتحان کیا ہے۔ اس کی بُری بھلی داد دے گیا۔ اس پر ہمارے غائبانہ کرم فرما جناب سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی مولف "واقعات انیس" ناراض ہوئے۔ اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔ کہ میرے کرمفرما کو اپنا وقتِ عزیز ضائع کرنا پڑا۔ انہیں غصہ صرف اسلئے ہے کہ میں نے مولوی شبلی کی تو تعریف کی۔ لیکن جناب احسن کی تالیف کی داد نہ دی۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں "کہ دُنیا میں اقتدار پرستی اور وجاہت پسندی کی ہوا ایسی تیز چل رہی ہے کہ انصاف کے پھول پامال ہوئے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کی بابت حضرت اس طرح مدح سرائی فرماتے ہیں۔

"علامہ شبلی! آپ جگ جگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار چاند لگیں....."

خیال فرمائیے کہ جب آپ علامہ شبلی کی بابت جوشِ عقیدت میں ایسی رطب اللسانی فرمائیں اور غریب احسن اور مرحوم اشہری کی تالیف کو نقشِ ثانی و ثالث بنا کر خاموش ہو جائیں تو ہم جیسے بے سواد۔ کم علم۔ اہل قلم کا حوصلہ پست ہو جائے یا نہیں۔ جب ہماری محنت اس طرح خاک میں ملائی جائے تو دوسرے اہل قلم کو بمقابلہ ان شمس العلماؤں کے دُنیا میں کچھ کام کرنے کا حوصلہ کیونکر ہو سکتا ہے..... علامہ شبلی کی تالیف کو آپ نے جوشِ عقیدت کی وجہ سے بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا۔ اور واقعاتِ انیس اور حیاتِ انیس کا نام سُنکر آپنے اپنے دل میں طے کر لیا کہ اونہہ احسن نے کیا لکھا ہوگا اور اشہری نے کیا توپ داغی ہو گی"۔

میں جناب احسن کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک "حیاتِ انیس" اور واقعات

انیس کو میں نے بالاستیعاب نہیں پڑھ لیا۔ "میر انیس اور ہم" لکھنے کو قلم نہیں اُٹھایا۔ اور ان دونوں کتابوں کو میں نقش ثانی وثالث کہہ کر ہی خاموش نہیں ہو گیا۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ ان سے بعض ضروری اور مفید باتیں اور میر صاحب کی تعلیم و تربیت کا حال معلوم ہوا۔ آپ کی یہ طعن کہ علامہ شبلی سے مجھے جوشِ عقیدت ہی۔ سر آنکھوں پر۔ مگر جو ریویو مولانا اشہری مرحوم نے "موازنہ دبیر و انیس" پر "عصر جدید" میں شائع کرایا تھا۔ وُہ بھی جناب کی نظر کیمیا اثر سے گذرا؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشہری مرحوم بھی مولانا شبلی کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے۔ اور میرے لئے تو آپ بھی کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ "واقعاتِ انیس" تو کل چھپی ہی۔ مجھے تو اُس وقت سے روحانی نیاز اور حسنِ ظن حاصل ہی۔ جب آپ کا "ویران مکان" "ناکتخدا لڑکی" اور "داغ جگر" مخزن میں دیکھے تھے۔ اور میری ایک تصنیف کا "مقدمہ" پڑھ کر تو "واقعاتِ انیس" کے لئے چشم براہ تھا۔ جب وُہ چھپی تو بڑے شوق سے پڑھی۔ مگر آپ ہی انصاف فرمایئے گا کہ کیا میں اِن کتابوں پر تقریظ لکھ رہا تھا۔ کہ آپ کی محنت۔ عرق ریزی اور قابلیت کی داد دیتا؟ معاف فرمایئے گا۔ میں نے تو محض بطور دفع دخل ان تالیفات کا ذکر کر دیا تھا۔ ورنہ کچھ ضرورت تو تھی نہیں۔ میرے مضمون کا موضوع موازنہ حیات اور واقعات کے موضوع سے بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وُہ نہ احسن کے فرائض میں داخل تھا۔ نہ اشہری کے اور نہ مولانا شبلی کے۔ ہاں البتہ "منتخبات انیس" مرتب کرنے والے کو وُہ تمام باتیں ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں۔ جو میں اپنے اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے میری بات سمجھنے کی تو پروا نہیں کی۔ محض مولانا شبلی کی تعریف دیکھ کر خفا ہو گئے۔ خدا ٹھنڈے دل

سے کمدہ امعان نظر خالی الذہن ہو کر میرے اس مضمون کو ملاحظہ فرما کر غور فرمائیگا کہ کیا اس کا معقول جواب یہی ہو سکتا ہے۔ جو آپ نے دیا؟

آپ فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے شہروں میں نصف باشندوں کے گھروں میں انیس کا کلام موجود ہے۔ عورتیں اور بچے بھی اس مقدس نام سے ناواقف نہیں۔ بالکل درست۔ لیکن یہ وہی طبقہ ہے۔ جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون میں کلام انیس کو "تحفۃ العوام" کے طور پر پڑھنے والوں کے استعارے میں کیا۔ غالباً آپ بجز اس فرقے کے اور کسی کو کلام انیس کھلانا پسند نہیں فرماتے۔ مگر میرے نزدیک یہ تنگ خیالی ہے۔

آپ تنقید کا حصہ واقعات انیس کے لئے مخصوص فرماتے ہیں۔ ہوگا لیکن میں نے تو تنقید کی تحریک نہیں کی تشریح کی تحریک کی ہے۔ ع

"کیا کہا میں نے آپ کیا سمجھے"

آپ تحریر فرماتے ہیں۔ کہ "خاندان انیس کی معاش کا مدار جب مرثیہ خوانی پر ہے تو مرثیوں کو انکی جائداد کہنا نہایت درست ہے۔ انہوں نے لیا اور قبضہ کر لیا" خدا نہ کرے کہ میرے قلم یا زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکلے جو اس خاندان عالی کی شان سے ادنیٰ ہو۔ لیکن آپکا یہ قول ان بزرگوں اور اُن عوام الناس میں۔ جن کے لئے آپ نے لکھا ہے کہ "سال بھر تک حجامت بناتے اور تارکشی کرتے ہیں" کچھ فرق و امتیاز باقی نہیں رہنے دیتا۔ خاندان انیس کیلئے اگر موجب فخر اور ذریعہ معاش ہو سکتا ہے تو مرثیہ گوئی۔ نہ مرثیہ خوانی۔ جو حجامت بنانے اور تارکشی کرنے والے بھی کر لیتے ہیں۔ اور فی الواقعہ صرف یہی ایک خاندان ہے جو "نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا" کا پورا پورا اور صحیح صحیح مصداق ہے۔ تاریخ بہت کم نظیریں ایسی پیش کر سکتی ہے۔ کہ ایک

گھرانے میں سات آٹھ پُشت تک مسلسل شاعر اور باکمال شاعر پیدا ہوتے چلے گئے ہوں۔

اور جناب احسن کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جناب میر رشید یا جناب میر عارف یا جناب دُولہا صاحب امام اللہ فیوضہم کا مدارِ معاش۔ محض میر انیس کے اُن تحریروں پر (جو بطور میراث ان بزرگوں کے قبضہ میں آئے ہیں) سمجھنا درست نہیں۔ ان بزرگوں کی شخصیت ہی ایسی ارفع و اعلیٰ ہے۔ کہ اچھے سے اچھے ذاکر کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی۔ اسی بات نے میر صاحب کے محفوظ کلام سے انکو بالکل بے نیاز اور مستغنی کر دیا ہے۔ نہ اس استخوان فروشی کا رکیک اور پست خیال ان عالی ظرفوں کے دلوں میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی آ سکتا ہے۔ حضرت! یہ اسی جوہر کے عوض ہیں۔ جس پر آج میں اور آپ اپنی اپنی جگہ فخر کر رہے ہیں۔ اگر آزمائش منظور ہو تو یہی محفوظ کلام کسی بہتر سے بہتر ذاکر کو دے کر۔ پنڈرول۔ رامپور اور حیدر آباد وغیرہ بھیج دیکھئے۔

یہ تو تھا آپ کی بات کا جواب۔ اب میری سُنیئے۔ کہ میر صاحب کے محفوظ کلام کو شائع نہ ہونے دینا۔ قدر دانی نہیں۔ بلکہ سخت ناقدر شناسی اور میر انیس کی رُوح کو صدمہ پہنچانا ہے۔ آپ تو ماشاء اللہ تصنیف و تالیف کی مشقتوں سے خود بھی واقف ہیں۔ ایمان سے فرمائیے گا۔ کبھی کوئی نظم لکھ کر۔ یا کوئی ڈراما تصنیف کر کے۔ ایک سیکنڈ کے لئے آپ کے دل میں یہ خیال آیا ہے کہ اہل ذوق سے اس کی داد نہ لیجائے۔ یا اس کو شائع نہ کیا جائے۔ پس کتنا ظلم ہے اُس شخص پر کہ جس نے اپنی تمام عمر ایک فنِ خاص کو مکمل کرنے اور اوجِ کمال پر پہنچا دینے میں صرف کر دی ہو۔ اور جن لوگوں سے اُمید حوصلہ افزائی ہو وہ اس کی محنت کو یُوں برباد کر دیں۔ دیکھئے میں نے آپ کی تالیف کی آپ کی اُمید و خواہش کے مطابق داد نہ دی تھی۔ آپ کو کس قدر ناگوار ہوا۔ کیا

جناب میر انیس مرحوم و مغفور کی رُوح کو صدمہ نہ ہوتا ہوگا جب وُہ اپنے کلام کو "تاںدُ دیار بلکہ تاں مکان کہ نادی ہنوز آں جاتی" دیکھتے ہونگے۔

حضرت! اب زمانہ بہت ترقی کر گیا ہے۔ دُنیا بہت آگے بڑھ آئی ہے۔ ہر شخص اپنی محنت اور اپنے ریاض کی داد چاہتا ہے۔ ابھی نمائش الہ آباد میں آپ نے ہزاروں حیرت انگیز عجائباتِ روزگار ملاحظہ کئے ہونگے۔ بعض صاحبوں نے ایک ایک کارڈ پر پُوری ایک ایک کتاب نقل کر کے بھیجی تھی۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک کارڈ پر ایک کتاب کا نقل کرنا اتنا عجیب و قابلِ ستائش نہیں۔ جتنا کہ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنا۔ جو انیس کے بے مثال کلام کا ادنیٰ نمونہ ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ مرحوم کے بہترین نمونوں کو نمائش گاہِ عالم میں نہ رکھا جائے۔ یہ انیس کا کلام ہے۔ کسی سنیاسی کی مجہول الکیفیت دوا نہیں۔ جس کے اجزا ظاہر نہ کئے جائیں۔

زمانے کا مقابلہ کرنا دانائی اور دانشمندی کے خلاف ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ میر انیس کے بہترین اور مستند کلام کو اسی التزام کے ساتھ ہوا خواہانِ اُردو کے پیش کیا جائے جو میں اپنے مضمونِ اول میں تحریر کر چکا ہوں۔ اس سے نہ صرف اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔ بلکہ چھپوانے والے کے لئے نہایت نفع رساں تجارت ہوگی۔ قدر دانانِ اُردو اس کی خریداری پر ٹوٹ پڑینگے اہلِ ذوق کو علمی و رُوحانی فیض حاصل ہوگا۔ اور جناب میر انیس کی رُوح کو زیادہ سے زیادہ مسرت اور ثواب۔

آپ صحتِ کتابت کو ناممکن بتاتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہُوں کہ احتیاط اور سعی سے سب کچھ ممکن ہے۔

آپ کہتے ہیں "کھانڈا" بھدا لفظ ہے۔ میر صاحب نے استعمال نہیں کیا ہوگا

مَیں کہتا ہُوں کہ میر صاحب نے سان پر چڑھا کر اسکو برق بنا دیا ہے اور ایسا چُست بیٹھا ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ - اور یُوں بھی لفظ بھدا نہیں ہے - بلکہ اس کے لفظ اور صوت کو سپاہی پن اور میدانِ کارزار سے ایک قدرتی مناسبت معلوم ہوتی ہے - برعکس اس کے "کمتی" ضرور عوام کی زبان کا لفظ ہے - مگر میر صاحب کے مرثیہ میں موجود ہے فرماتے ہیں - ع

کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباس

کون یقین کر سکتا ہے کہ جس شخص کو خدا نے کوثر میں دُھلی ہُوئی زبان عطا فرمائی ہو - اس کی تحریر یا تقریر میں ایسے عامیانہ لفظ آسکتے ہیں - لیکن مطبوعہ مرثیے میں مَیں نے خود دیکھا ہے اور یہ مرثیہ میرے پاس موجُود ہے -

"پیپلا" جانب نوکِ شمشیر کے اس مقام کا نام ہے جس کو عربی میں "مضرب" کہتے ہیں - لیکن میر صاحب نے بعض جگہ اس کو پُوری تلوار کے معنوں میں استعمال فرمایا ہے -

آپ فرماتے ہیں کہ "خندق" اُحد، صفین وغیرہ تلمیحات کی تشریح کی ضرورت نہیں - اس کو تاریخ و جغرافیہ بتا ئینگے - خولی - عمر سعد - شمر وغیرہ کا مسئلہ علم رجال حل کریگا - یعنی اگر کوئی میر صاحب کے مرثیے دیکھنا چاہے تو حدیث تفسیر - تاریخ - جغرافیہ اور کُتب اسماء الرّجال کا پشتارہ اپنے پاس رکھ لے اور جب کوئی تلمیح آئے تو مرثیوں کو بالائے طاق رکھ کر - ان کتابوں میں اسکی کیفیت ٹٹولنے لگے - بات تو ٹھیک ہے مگر ذرا آدمی کا پتہ مرا ہُوا ہونا چاہیئے -

بہرحال آپ کے نزدیک میر صاحب کے مرثیوں کا انتخاب اور اُن کے شاعرانہ و مورخانہ نکتوں اور لطافتوں غرض کل محاسن کلام کی تشریح و تفسیر کرنا قطعاً فضول و عبث ہے - مَیں آپ کی اس رائے سے اتفاق کر لیتا - مگر کیا کیا جائے

اوّل تو علمائے دین نے لُٹیا ڈبوئی۔ پھر سخن سنج حضرات نے ہمارے مذاق بگاڑ دیئے۔ قرآن شریف کلام الٰہی۔ بندوں کو اس میں اِن آن چنیں و چناں اور چون و چرا کرنے کی ضرورت؟ خواہ مخواہ تفسیریں لکھ لکھ کر (معاذ اللہ) قرآن شریف کی ہوا بگاڑ دی۔ بابل۔ مدین۔ وادیٔ ایمن۔ کوہ طور۔ شجر ممنوعہ۔ ناقۂ صالح۔ ارم شداد۔ عاد۔ ثمود۔ ہاروت ماروت۔ فرعون۔ سامری۔ موسیٰ۔ عیسیٰ۔ یوسف۔ نوح۔ داؤد۔ سلیمان۔ غرض کل قصص اور قصہ طلب رموز کی تشریح و تفسیر کر کے (توبہ توبہ) کلام الٰہی کا رُعب کم کر دیا۔ بات گھم گھم رہتی کوئی سمجھتا اور کوئی نہ سمجھتا۔ مگر بز اخفش کی طرح سر سب ہلا دیا کرتے۔

جب کلام خدا کو وہ اپنے ڈھب پر لے آئے۔ تو بندوں کی کب سُنتے تھے۔ جو زیادہ اچھی۔ زیادہ معقول۔ زیادہ مفید۔ زیادہ بکار آمد۔ نظم و نثر کی کتابیں دیکھیں۔ انہی کی شرح کی اور انہی پر حاشیہ لکھ ڈالا۔ حتیٰ کہ سکندر نامہ دیوان حافظ اور گلستان و بوستان سے گزر کر۔ دیوان غالب تک نوبت پہنچی۔ ایک میر انیس باقی رہ گئے تھے۔ سو انکو اس گنہگار نے تاکا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اس تاجدار مملکت سخنوری کے کلام پر حاشیہ نہ لکھا جائے یا اس کی تشریح نہ کیجائے۔ کیونکہ نصف صدی تک میر انیس کے کلام کو سمجھنا مشکل ہوگا۔

میرے نزدیک اگر اس کام کو اسی سپہر فصاحت و بلاغت کے اختر ہائے تاباں یعنی جناب میر رشید یا جناب میر عارف یا جناب دُولہا صاحب دام اللہ فیوضہم پُورا کریں تو عین مناسب ہو۔ بصورت دیگر الحمد للہ کہ ایک آدھ بزرگ ہماری خوش قسمتی سے ایسے موجود ہیں۔ جو کسی طرح ان تینوں بزرگوں سے

کم نہیں بلکہ بسبب اصناف سخن پر حاوی و قادر ہونے کے ترجیح و امتیاز خاص رکھتے ہیں۔ یعنی عالی جناب خان بہادر مولٰنا علی محمد صاحب شادؔ عظیم آبادی رُوحی فداہم۔ اس ضروری کام کے اہل ہیں۔

اس کا مجھے اعتراف ہی۔ کہ میر رشید کو یادگار نفیس لکھنے میں مجھ سے سہو ہوا بلکہ اس کی تصحیح کے لئے مَیں کارپردازانِ مخزن کو بھی لکھ چکا تھا۔

مجھے معلوم ہی کہ میر انیس کا ذکر خیر "انسائیکلو پیڈیا" میں ہی۔ لیکن سوال تو یہ ہی کہ ہم نے کیا تیر مارا؟ یہ تو اہل یورپ کی جوہر شناسی اور نکتہ نوازی ہی۔ وہاں تو "حالی کلب" بھی قایم ہے "رباعیات حالی" بھی ترجمہ ہو گئی ہیں۔ خیام۔ سعدی اور بعض دیگر مشاہیر اسلام کی تصانیف کی انہوں نے بے حد قدر کی ہے۔ ہم نے کیا کیا۔ سچ پوچھئے تو ہم نزدیکان بے بصر اور "انسائیکلو پیڈیا" والے دُوران با خبر ہیں۔

بہر حال مَیں نہایت ضروری سمجھتا ہُوں۔ کہ کلام انیس کا انتخاب تصحیح اور تشریح کے ساتھ نہایت عمدہ چکنے ولایتی کاغذ پر بکمالِ حسن و خوبی چھاپا جائے۔ کیا آپ کلام انیس کی قدر "مسدس حالی" کے برابر بھی نہیں کرتے؟ دیکھئے رعد نے کس اہتمام سے کیسا نظر فریب چھاپا ہے۔ کیا آپ میر انیس کو اُن کے دادا میر حسن کا سا قابلِ قدر نہیں سمجھتے؟ ملاحظہ کیجئے۔ مخزن پریس نے ان کی مثنوی "بدر منیر" اور "گلزار ارم" (جو کہیں نہ ملتی تھی) نہایت تلاش سے بہم پہنچا کر اور ایک لائق اہل قلم سے مقدمہ لکھوا کر کس شان کی چھاپی ہے۔ کیا آپ کلام انیس کو نظیر اکبر آبادی کے ہمرتبہ بھی خیال نہیں فرماتے؟ غور فرمایئے مولوی عبد الغفور صاحب شہباز مرحوم نے مفصل ریویو کے ساتھ کس صحت و صفائی سے طبع کرایا ہے اور دیکھئے سخن فہمی اور عقیدت مندی اس کا نام ہے۔ کہ وہی دیوان

ذوق جو نہایت ذلیل کاغذ پر چار چار آنے کو بکتا پھرتا تھا۔ شمس العلما مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے دیباچہ لکھ کر اور نہایت صحت و صفائی سے چھپوا کر اس کی قدر و قیمت بڑھا دی۔ معاف فرمائیے گا۔ قولاً تو آپ میر انیس کے عقیدت مند اور ارادت کیش معلوم ہوتے ہیں۔ مگر فعلاً یہ مخالفت کیوں ہے دنیا کے علمی احساس و ترقی کو ملاحظہ فرمائیے۔ کہ آپ نے تو میر انیس کے پچاس سال بعد واقعاتِ انیس تالیف فرمائی۔ اور "سرور جہان آبادی" کے پھول ابھی گنگا تک نہ پہنچے تھے۔ کہ "جام سرور" بڑی آب و تاب سے چھپ کر تیار ہو گیا یہ وہ سرور ہیں جو ہمارے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کے رنگ میں شعر کہنا اپنا فخر سمجھتے تھے۔ اور مرتے دم تک اس کسوٹی پر کھرا اترنے کی کوشش کرتے رہے ؎

ایک ہم ہیں کر لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

حضرت! آپ لاکھ غل مچائیں اور کروڑ مخالفت کریں۔ بندہ تو اس اندھی قدردانی کی تائید کرنے والا ہے نہیں۔ میر انیس کو تو دعویٰ ہے کہ "گنگ کو ماہر اندازِ تکلم کر دوں"۔ اور آپ ہیں کہ بولنے والے کی زبان کاٹتے اور سننے والے کے کانوں میں روئی ٹھونستے ہیں۔

میں تو منتخبات انیس کو مع تشریح و تحشیہ چھاپنا اس قدر ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ اس تجویز کو بطور ریزولیوشن شیعہ کانفرنس میں پیش کیا جائے۔ اور اگر یہ غیر ضروری ہے۔ تو "فرہنگِ آصفیہ" "امیر اللغات" "فصیح اللغات" نیز اردو کورس مولوی نذیر احمد صاحب اور مولوی سید احمد دہلوی کی بعض تصنیفات میں جو حاشیے لکھے اور فرہنگیں شامل کی گئی ہیں۔ بدرجہ اولیٰ غیر ضروری اور ترقی اردو میں جو کوششیں کی جا رہی ہیں قطعاً فضول و مہمل۔

آپ اس کام کے پچاس سال میں پورا ہونے کا تخمینہ فرماتے ہیں۔ پس تکلف برطرف کر کے عرض کرتا ہوں - کہ اگر کوئی صاحب بطور ایثارِ نفس میر صاحب کا مستند اور معتبر کلام عنایت کرنے کا حوصلہ اور ہمت فرمائیں - تو کلامِ انیس مع تشریح و حواشی اسی سال میں اپنے قدردانوں کے میزوں پر اور لائبریریوں میں موجود ہو سکتا ہے +

سید علمدار حسین واسطی

بنوڑ - ریاست پٹیالہ

اسلامک فراٹرنٹی مقام ٹوکیو - پایۂ تخت جاپان سے ایک چھوٹا سا ماہوار اخبار انگریزی میں نکلتا ہے جسکا نام اسلامک فراٹرنٹی یعنے "اسلامی برادری" ہے - اس کے اڈیٹر مولوی محمد برکت اللہ صاحب ہیں جو ہندی الاصل ہیں - بھوپال کے رہنے والے ہیں - مگر عرصہ دراز تک انگلینڈ و امریکا میں رہنے کے بعد اب جاپان میں مقیم ہیں - اس اخبار کا مقصد پیروانِ اسلام و دیگر مذاہب کے درمیان اچھے تعلقات قائم کرنا اور محبت اور مواعظ حسنہ کے ذریعے اسلام پھیلانا ہے گذشتہ ماہ کا پرچہ اس اخبار کا دفتر مخزن میں موصول ہوا ہے - اس سے یہ معلوم کر کے ہمیں بہت مسرت ہوئی کہ اس مفید پرچے نے اپنی زندگی کا پہلا سال بخیر و خوبی ختم کیا اور ۱۵- اپریل کی اشاعت سے دوسرے سال میں قدم رکھا - ہم اس کے فاضل ایڈیٹر کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں - جو کام انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہے اور جس کے لئے وہ باعتبار اپنی قابلیت کے موزوں بھی ہیں - بہت دشوار اور کٹھن کام ہے - خدا انہیں ہمت اور استقلال دے کہ وہ اس کام کو جاری رکھ سکیں - مولوی صاحب نے اس مرتبہ یہ لکھا ہے کہ ہر ملک سے برادرانِ اسلام نے اس پرچے کی اشاعت میں انکی حوصلہ افزائی کی ہے مگر ہندوستان سے جہاں سے انہیں زیادہ توقع تھی بہت کم امداد پہنچی ہے - امید ہے کہ اب مولوی صاحب کی یہ شکایت ہمارے ابنائے وطن رفع فرما دینگے - ۱۴- اپریل کو مولوی صاحب نے ایک سوسائٹی بنام اسلامک سوسائٹی جاپان قائم کی ہے - جس کا مقصد رسالوں اور اخباروں کے ذریعہ سے تلقین اسلام ہوگا - ایک اور سوسائٹی ٹوکیو میں بنام ایشیاٹک سوسائٹی جاپان قائم ہے - جس میں بہت سے جاپانی ممبر ہیں اور مذہبی تحقیق کا مقصد بھی اپنے مقاصد میں رکھتی ہے - اس سوسائٹی نے اس نئی اسلامی سوسائٹی کا خوشی سے خیر مقدم کیا ہے - اخبار مذکور میں اس سوسائٹی کی کارروائی درج ہوتی رہیگی - اخبار کی قیمت سالانہ دو شلنگ یعنی ڈیڑھ روپیہ ہے اور درخواستوں کیلئے پتہ یہ ہے:- مولوی برکت اللہ ۴۰ دائی ماچی - آکا ساکا - ٹوکیو جاپان

مجوزہ محمڈن یونیورسٹی

وُہ عمارت جسکی بنیاد علیگڑھ کالج کی تعمیر کے وقت رکھی گئی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مکمل ہونے کو ہے اور پچاس سال کی جانکاہ کوششوں کا ثمرہ اہل اسلام کو ملنے والا ہے۔ نہایت مبارک ہوگا وُہ لمحہ جب کہ شہنشاہ انگلستان اپنے مبارک ہاتھوں سے مسلم یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھینگے اور اس کو وُہ حقوق و اختیارات عطا فرماوینگے جو موجودہ سرکاری یونیورسٹیوں کو حاصل ہیں۔ کچھ کم پچاس سال گذرے ہیں کہ مسلمانانِ ہند جہالت کے قعر عمیق میں گرے ہُوئے تھے۔ حکومت کے چھن جانے کے بعد اُن کی تمام خوبیاں اور نیکیاں ان کو خیرباد کہہ گئیں تھیں اور انکے عادات و مذاق اس قدر بگڑ گئے تھے کہ وُہ اپنے آپ کو روشِ زمانہ کے مطابق بالکل نہ کر سکے۔ مروجہ تعلیم سے انہوں نے سر پھیر لیا اور انگریزی حکومت نے جو ترقی کے ابواب کھولدیئے تھے۔ اُن سے مسلمان نفور رہے۔ دیگر اقوام نے ترقی کے لئے نہایت جدوجہد کی سرکاری مدارس سے پُورا فائدہ اُٹھایا اور سرکاری دفاتر میں اعلیٰ عہدوں پر قبضہ کر لیا علمی دولت سے خوب مالامال ہُوئے۔ تجارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ تمدن کی دوڑ دھوپ میں آگے بڑھ گئے۔

اس اہم کام میں مسٹر بیک۔ مورسین اور نواب محسن الملک نے سرسید کا ہاتھ بٹایا اور قلمے۔ قدمے۔ درمے مسلمانوں کی خدمت کرنے سے اُن کی قوم پر ایک ایسا عظیم الشان احسان کر گئے جسکو آئندہ نسلیں کبھی فراموش نہ کرسکینگی اور جس کی تاریخ اپنے اوراق میں سنہری حرفوں کے ساتھ قائم رکھیگی۔ اپنی

زندگی میں سر سید احمد خاں کو اس مقصد اعلیٰ کی تکمیل کا دیکھنا نصیب نہ ہوا لیکن اُن کے جانشینوں نے اس عزیز و بے لوث کام کو جاری رکھا۔ حتّٰی کہ نوبت بایں جا رسید کہ ہز ہائینس آغا خاں شہنشاہ انگلستان و قیصر ہندوستان حضور پُر نور جارج پنجم سے مسلم یونیورسٹی کے لئے عطاء چارٹر کی درخواست پیش کرنے کی دُھن میں ہیں اور اغلباً اُن کی یہ درخواست حضور شہنشاہ کی طرف سے مقبولیت کا شرف حاصل کریگی۔

سر سید احمد خان مرحوم کا احسان کبھی نہ بھولے گا۔ جنہوں نے تفاوت روز افزوں کو دیکھکر مسلمانوں کو بھی ترقی کی راہ دکھائی اور انہیں تحصیل علوم جدیدہ کی طرف راغب کر کے یونیورسٹی کا اعلیٰ تخیل اُن کے سامنے پیش کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جو بیج سر سید احمد خاں لو گئے تھے وُہ ضرور کسی نہ کسی دن پھلتا لیکن سلسلۂ حوادث کو مدّ نظر رکھکر ہم کو یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ علیگڈھ کالج کو یونیورسٹی بننے تک کم از کم ایک صدی لگتی۔ اقوام کی تاریخ میں صدیاں بمنزلہ سالوں کے ہوتی ہیں اور عظیم الشان تحریکوں کو مکمل ہونے میں کئی کئی صدیاں لگجاتی ہیں۔ لیکن پچاس ہی سالوں میں مسلم یونیورسٹی کا عملی شکل اختیار کر لینا ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس نے مخالفین و موافقین دونوں کو حیرت میں ڈالدیا ہے۔ یہ پُرانا مقولہ ع مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ جس قدر اس تحریک کی کامیابی پر صادق آتا ہے۔ شاید ہی کہیں اور اس قدر موزون بیٹھے۔

اس کامیابی کا سہرا بلا مبالغہ ہز ہائینس آغا خاں کے سر پر بندھیگا۔ مسلمان تو اُن کا شکریہ دیکھیں کب ادا کرتے ہیں اور کس طرح۔ انگریزی قوم کی قدر دانی کو دیکھئے کہ تعلیم کی حمایت میں سر آغا خاں کی سرگرمی کو دیکھکر کیمبرج جیسی مقتدر یونیورسٹی نے انہیں آنریری ڈگری دینے کا عزم کر لیا ہے۔

سر آغاخاں نے (Now or Never) یا اب یا کبھی نہیں (کی ایسی سچی صدا بلند کی۔ کہ مسلمانانِ ہند ایک سرے سے دوسرے سرے تک بیدار ہوگئے اور روپیہ کی آمد کا وہ سلسلہ قائم کر دیا۔ جس کی تعریف میں دوسری اقوام کے اخبارات واہل الرائے بھی رطب اللسان ہیں۔ اس موقع پر ہز ہائی نس نے صرف اُن جماعتوں ہی کی جیبوں کو نہیں ٹٹولا جو کہ تعلیم کی عظمت و ضرورت سے بخوبی واقف تھیں۔ بلکہ مسلمانوں کے ہر فرقے سے جو پیغمبر اسلام کی پیروی کا دعویٰ کرتا ہے۔ خراج علمی وصول کیا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے قیام پر اسلامی ہند متفق اللسان ہے اور گو مخالفین نے اس اتفاق اور یک زبانی کو توڑنے کی کوشش کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اُس کے اجتماعی قوت کو کم دکھانے کی جرأت کی ہے۔ لیکن جو اصحاب عقلِ سلیم رکھتے ہیں اور جن کی آنکھوں کو ناانصافی اور تعصب کے پردوں نے بند نہیں کر دیا وُہ اس امر کو تسلیم کرینگے کہ اس وقت تک مسلمانانِ ہند کے درمیان یونیورسٹی کی تجویز کے متعلق ایک غیر معمولی اتفاق اور یکرنگی موجود ہے۔ اِس لئے اس سکیم پر کسی لمبی غور و بحث کی ضرورت نہیں۔ مگر اُن لوگوں کی پاسِ خاطر سے جن کو نیک نیتی سے اس تجویز کے متعلق بعض شکوک ہیں اور جن کی اصلی رائے یہ ہے کہ یونیورسٹی کے قیام سے مسلمانانِ ہند کو کوئی معتد بہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ذیل کی چند سطور لکھی جاتی ہیں۔

"پیشتر اس کے کہ یونیورسٹی کی تائید میں دلائل سے کام لیا جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اُن اعتراضات کا جواب دیا جائے جو گذشتہ ایام میں بعض مسلمان صاحبان نے پیش کئے۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوؤں کی طرح مسلمانانِ ہند میں بھی باغیانہ خیالات پھیل جائینگے اور

اُن کے دلوں میں بھی سرکار کی جانب سے وُہ نفرت اور حقارت جاگزین ہو جائیگی جو ہندوؤں کے دلوں میں موجود ہے۔ اوّل تو یہ رائے کہ ہندوؤں کے خیالات باغیانہ ہیں بالکل ناانصافانہ رائے ہے۔ یہ کہنا کہ ہندو لوگ من حیث القوم باغی ہیں۔ سراسر انصاف کا خون کرنا ہے۔ خود گورنمنٹ جو کہ اپنی فلاح و بہبود و استحکام کی پوری نگہبان اور محافظ ہے اور جس کی نسبت اُس کی ہستی کا کوئی اور زیادہ خواہشمند نہیں ہو سکتا۔ اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ سوائے چند مستثنیات کے ہندو لوگ گورنمنٹ کی نہایت فرمانبردار رعایا میں شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے دو سالوں میں اس قوم کے معدودے چند افراد مفسدانہ افعال کے مرتکب ہُوئے تھے لیکن ان لوگوں کی وجہ سے ساری قوم پر بغاوت کا الزام لگانا محض تعصب ہے۔ ہندو قوم نے بحیثیت مجموعی مفسد لوگوں کے افعال کو سخت نفرین اور حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جو اشخاص اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرینگے وہ تسلیم کرینگے کہ یہ انارکسٹ فرقہ اپنے بیہودہ خیال یورپ سے لایا اور کسی لحاظ سے بھی ایک عام و مشترک قومی احساس کا اظہار نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان مستثنیات کو جنکو ہندو سوسائٹی نے اپنے ساتھ شریک کرنے سے انکار کیا ہے اور جو واقعی جدید تعلیم کے لئے باعث ننگ و عار ہیں۔ چھوڑ کر اگر باقی ہندو سوسائٹی پر نظر ڈالی جاوے تو ماننا پڑے گا کہ ہندو اقوام باغی نہیں ہیں۔ گورنمنٹ سے پولیٹیکل حقوق و رعایات کی درخواست کرنا بغاوت میں شامل نہیں اور خود گورنمنٹ کا اپنا منشا یہ ہے کہ جُوں جُوں اہل ہند تعلیم کے زیور سے مزیّن ہو کر پولیٹیکل حقوق کو برتنے کی استطاعت پیدا کریں۔ تُوں تُوں پولیٹیکل حقوق اُنکو دیئے جائیں۔ اس لئے یہ کہنا سراسر

غلط ہی کہ مروجہ تعلیم سے بہرہ اندوز ہوکر ہندو اقوام باغی و سرکش ہوگئی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ تعلیم حاصل کرکے کوئی قوم بھی باغی و سرکش نہیں بن سکتی۔ تعلیم کو بغاوت کا پیش خیمہ قرار دینا تعلیم کی حقیقت سے انتہا درجہ کی بے خبری کا اعتراف کرنا ہے اور اُن اسباق سے سہو لینا ہے جن سے کہ اوراقِ تاریخ لبریز ہیں۔ یورپ کی وُہ اقوام جو آجکل ترقی کی شاہراہ پر نہایت مستعدی کے ساتھ قدم انداز ہیں اور جو ایک لحاظ سے تمدنی معراج حاصل کر چکی ہیں۔ تعلیم کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہیں اور اگر ہم ان اقوام کی تاریخ پڑھیں تو ہم کو اس رشتہ لازمی کا جو ترقی و تعلیم کے مابین ہے۔ پتہ لگ جائیگا اور یہ سُنکر ہنسی آئے گی کہ تعلیم بھی کسی قوم کی ترقی میں حارج ہوسکتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے خلاف یہ اعتراض بھی پیش کیا جاتا ہے کہ علاوہ باغی بنانے کے وُہ مسلمانانِ ہند کو اپنی روٹی کمانے سے محروم کر دیگی اور بالعموم کسی حالت میں بھی انکو مکمل مذہبی تعلیم دینے کی کفیل نہیں ہوسکتی۔ اس اعتراض کے پہلے حصہ کے متعلق مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ آجتک تعلیم نے کسی قوم کے افراد کو روٹی کمانے سے محروم نہیں کیا۔ برعکس اس کے تعلیم کے ذریعہ سے وُہ وُہ اختراعات و ایجادات ہوئے جن سے انسانی زندگی کی مصائب بہت حد تک دُور ہوگئیں اور لوگ ایسی اچھی اور عمدہ طرح سے زندگی بسر کرنے لگے جس کی نظیر ازمنہ سابقہ میں نہیں ملتی۔ معترضین سے مَیں یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ جرمنی۔ فرانس۔ امریکہ اور انگلستان جہاں کے باشندے اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کیوں اس قدر دولتمند اور مالامال ہوگئے ہیں اور کیوں وہاں کے باشندگان علم طور پر ہماری نسبت زیادہ آسودہ حال ہیں۔ جب خود

بانیٔ اسلام فرما گئے ہیں "اُطلبوا العلم ولو کان فی الصین" تو سمجھ میں نہیں آتا کہ پیرو مذہبِ اسلام کے پیرو علم پر اتنے اعتراض کر سکتے ہیں۔ دیگر اقوام اگر تعلیم کا مضحکہ اُڑائیں تو خیر۔ کوئی مضائقہ نہیں لیکن مسلمان اگر تعلیم کی مخالفت کریں تو وہ اپنے احکامِ مذہبی کی مخالفت کرینگے۔

اس اعتراض کے دوسرے حصّہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی مکمل مذہبی تعلیم کی اس لئے کفیل نہیں ہو سکتی کہ مذہب اسلام میں اتنے فرقے ہیں اور اُنکے عقائد ایک دوسرے سے اس قدر متناقض ہیں کہ ایک ہی انسٹیٹیوشن میں ان تمام فرقوں کے عقائد کی مکمل تعلیم کا انتظام کرنا مشکل ہے اور نیز خطرہ سے خالی نہیں لیکن علیگڈھ یونیورسٹی کے مدعیان نے یہ دعویٰ کبھی بھی پیش نہیں کیا کہ وُہ عام فرقوں کی مذہبی تعلیم کے کفیل بنینگے۔ جو دعویٰ وُہ پیش کرتے ہیں وُہ مختصراً یہ ہے۔

مروّجہ تعلیم کے نقاد اس امر پر متفق ہیں کہ مذہبی تعلیم کو نصاب تعلیم سے بالکل خارج کر دینا سخت غلطی تھی اور ہے۔ اور اس غلطی کے نتائج وُہ افعالِ ناپسندیدہ ہیں جو پچھلے دو سالوں میں ظہور پذیر ہُوئے۔ اگر شروع ہی سے نصاب تعلیم میں مذہب کو دخل دیا جاتا تو وُہ قابلِ افسوس نتائج نہ پیدا ہوتے جن کا خمیازہ خود گورنمنٹ اور رعایا دونو اُٹھا چکی ہیں۔ تعلیم کے ساتھ مذہب کا شریک کرنا لابد ہے۔ ہندوستان جیسے مُلک میں جہاں کہ مختلف مذاہب کے لوگ سکونت رکھتے ہیں۔ گورنمنٹ سرکاری مدارس میں اس حاجت کو پُورا نہیں کر سکتی بلکہ اگر گورنمنٹ کوشش بھی کرے کہ مذہبی تعلیم کسی نہ کسی صورت میں طالب علموں کو دیجاوے۔ تو خود ہندوستانی لوگ اس کوشش کو اپنی مذہبی آزادی پر ایک گونہ حملہ تصور کرینگے۔ جہاں تک گورنمنٹ کا تعلق ہے مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا محال ہے۔ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔ کیا یہ

بہتر نہ ہوگا کہ بجائے اس کے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم پر عمل جاری کیا جائے لوگ خود اپنے مدارس و کالج قائم کریں اور اپنے اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا بندوبست کریں۔ مسلم یونیورسٹی اس حاجت کو پورا کرنے کی سعی کریگی یہ تو ممکن نہیں کہ تمام فرقوں کے لوگوں کو ان کے اپنے اپنے فرقہ کی پوری پوری تعلیم دیجائے لیکن اتنا ضرور ہوسکتا ہے کہ چند ایسے مسائل کی تعلیم دیجائے جو کہ مذہب کی بیخ ہوں اور جن کو تمام فرقے تسلیم کریں۔ یقیناً مذہب اسلام کے چند ایسے عقائد ہیں جن پر تمام فرقے متفق ہیں۔ فروعات میں اختلاف ہو لیکن بنیادی اصولوں کی تعلیم بآسانی دی جاسکتی ہے۔ ایسا کرنے سے موجودہ طرز تعلیم کا وہ نقص جس پر کہ تمام اہل الرائے انگلی رکھتے ہیں۔ دُور ہو جائیگا اور اسکے علاوہ تعلیم یافتہ کلاس کو وہ مذہبی واقفیت حاصل ہو جاویگی جس سے کہ وہ آج کل بالکل بے بہرہ ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جتنے اعتراضات پیش ہو چکے ہیں۔ اُنکا جواب مختصر طور پر اوپر دیا جا چکا ہے۔ اب میں مسلم یونیورسٹی کے فوائد پر بحث کرتا ہوں۔ بہت حد تک تو یہ بحث مذکورہ بالا اعتراضات کے جواب میں آچکی ہے۔ لیکن چند اور ایسے باقی ہیں جن کا تذکرہ الگ ہونا چاہیئے۔

اوّل۔ مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے سے مسلمانان ہند اس قابل ہو جاوینگے کہ اپنی قومی تعلیم کو اپنے ہاتھوں میں لے لیویں۔ اور اُس کو ان طریقوں پر چلاویں جو کہ اُن کے قومی فلاح و بہبود کے لئے نہایت ہی مفید ہوں۔

کوئی قوم ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھ سکتی جب تک کہ اُس کی تعلیم اس کے اپنے ہاتھوں میں نہ ہو۔ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھوں میں نہیں

اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ خیال سے ہماری تعلیم از حد غیر مکمل اور ناقص ہے ہم کو اپنی تواریخ سے واقفیت نہیں ہے۔ ہم کو اپنے مذہب سے لاعلمی ہے۔ ہم بالکل ناآشنا ہیں اُن قومی بزرگوں اور رہنماؤں سے جنہوں نے ازمنۂ سابقہ میں ہماری ہدایت فرمائی اور جادۂ ترقی پر ہم کو چلایا قومیت کا خیال ہم میں مٹ چکا ہے اور من حیث القوم جو فخر کہ ہمارے افراد کو اپنے اوپر ہونا چاہیے وُہ بالکل مفقود ہے۔ اگر ہم اپنی تعلیم اپنے ہاتھوں میں لیویں۔ تو یہ نقائص رفع ہو جاوینگی اسلامی تاریخ سے ہم کو پوری واقفیت ہوگی اور اس واقفیت کا اثر وُہ فخر قومی ہوگا جو ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ جو قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کا شعار تھا جو روما کی ترقی کے دنوں میں اہل روما کے دلوں میں موجزن ہوتا تھا۔ اور جس سے آج انگلستان کا ہر فرد بشر حب وطن کے نشہ میں سرشار ہے۔

ماضی سے رشتۂ تعلق قائم کر کے اُن اصولوں پر عملدرآمد کرنا ہوگا جو ہماری شان و شوکت کے موجب ہوئے تھے۔ اپنے قومی لیڈروں کے حالات ازبر کرنے سے ہمارے دلوں میں رو ملک کے نقش قوم پر چلنے کا خیال پیدا ہوگا۔ اور اس کا نتیجہ وُہ عروج ہوگا جو انکو حاصل تھا۔ الغرض اپنی تعلیم کا نصاب خود مرتب کرنے سے ہم میں احساس قومی پیدا ہوگا اور وُہ تمام خوبیاں اور نیکیاں شاملِ حال ہو جاوینگی جو ہمارے اسلاف میں تھی۔ یعنی ماضی سے لاعلمی اور ناواقفیت قومی ترقی کے راہ میں سد سکندری تھی اور جب تک کہ اس ماضی کی رشتۂ یگانگت نہ گانٹھ لیا جاوے قومی ترقی امرِ محال ہے۔

دوم۔ قومی یونیورسٹی کے قائم ہو جانے سے ہم ان نقائص کو رفع کر سکینگے جو طرزِ تعلیم کے چہرہ پر بدنما داغ ہیں اور جنکے متعلق مفصل بحث اوپر ہو چکی ہے۔

سوم۔ علیگڈھ یونیورسٹی کے قیام سے ہم سرزمینِ ہندوستان میں مسلمانان

ہند کے لئے ایک ایسا عظیم الشان تعلیمی مرکز بنا دینگے - جہاں مختلف اطراف وجوانب کے مسلمان اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم حاصل کر سکینگے - اور جہاں شائقان علم اپنی علمی پیاس کو بجھانے اور اپنی علمی آرزو کے پورا کرنے کے مکمل سامان میسر پا دینگے علیگڈھ کا دارالعلوم ہم مسلمانان ہند کے لئے برتبہ اندلس کے قرطبہ ہوگا اور اس علمی روایت کو جو کہ ہندوستان میں شومئی طالع سے مسلمان کھو بیٹھے تھے ازسر نو تازہ کریگا - اور آیندہ نسلوں کے لئے مشعل علم کا کام دیگا ٭

ملک برکت علی ایم اے

اُسْوَۂ حَسَنَہ - خواجہ کمال الدین صاحب بی - اے وکیل لاہور نے کچھ عرصہ ہوا ایک نہایت مفید لیکچر نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی کے متعلق علیگڈھ کالج میں دیا تھا - جو اب کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا ہے اور "اُسْوَۂ حَسَنَہ" یعنی نیک نمونہ اس کا نام رکھا گیا ہے - اس لیکچر میں تاریخی اور علمی دلائل سے ایک دلنشین پیرایہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات درحقیقت تمام خوبیوں اور نیکیوں کا سرچشمہ تھی اور انہوں نے دنیا کو نہ صرف بے نظیر نصائح سے مستفیض فرمایا - بلکہ اپنے طرز عمل سے دکھا دیا کہ خدا کے نیک بندوں کی ایسی زندگی ہونی چاہئے - جس حصے میں بے شمار امتحانات اور مصائب کے مقابلہ میں آنحضرت صلعم کے عزم و استقلال کا ذکر ہے وہ بہت موثر ہے اور جو مثال فتح مکہ کے بعد عفو کی آنحضرت نے قائم کی ہے وہ بلاشبہ اسی انسان کامل کا حصہ تھا - خواجہ صاحب کے اس لیکچر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سوانح نبوی کا بنظر غائر مطالعہ کر رہے ہیں - اور جن الفاظ اور عبارات میں انہوں نے حضرت صلعم کی ذات پاک کی طرف اپنی تحریر میں اشارہ کیا ہے - اُن سے محبت نبوی صاف ٹپکتی ہے اور یہ ایک بڑی نعمت ہے جسے خدا نصیب کرے - اس کتاب کی بہت سی کاپیاں تو خواجہ صاحب علیگڈھ کالج کے طلبہ میں مفت تقسیم کر رہے ہیں - لیکن عام شائقین کے لئے اس کی قیمت ۸ر مقرر کیگئی ہے

درخواستیں بنام خواجہ صاحب موصوف احمدیہ بلڈنگس - لاہور کے پتے سے ہونی چاہئیں ٭

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

انقلابِ روزگار

انسانی زندگی اگرچہ بذاتِ خود ایک قسم کا انقلابِ روزگار ہے۔ اور ہر شخص کو اپنی عمر میں قسمت کے اونچ نیچ سے سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن ملکہ نورجہاں کی زندگی انقلابِ روزگار کا ایک ایسا نمونہ ہے کہ ہم اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے اس سے بہتر واقعہ نہیں دیکھتے۔ لہٰذا اسی کی زبانی اس کی زندگی کے واقعات کو بیان کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

شوقِ دنیا نگری

چرخِ کہن تھا درپئے آزارِ خانداں　　بے کارواں تھا قافلہ سالارِ خانداں
وقفِ خزاں ہوا تھا چمن زارِ خانداں　　ٹھنڈی ہوئی تھی گرمیٔ بازارِ خانداں
تقدیر لائی ہند میں گھر سے نکال کے
قسمت نے تنگ کر دیا غربت میں ڈال کے

ایران میں وہ قدر وہ عزت سپاہ میں　　سب قدر و منزلت کے تھے جلوے نگاہ میں
کرسی نشیں تھے جو کبھی دربارِ شاہ میں　　اب پھر رہے تھے ہائے وہ آوارہ راہ میں
افسوس جو کہ حاکمِ اہلِ جہاں رہیں
اک عمر دشتِ غم میں وہ بے خانماں رہیں

گلزارِ حسن کی وہ طرحدار نازنیں　　ہاں فخر جس پہ کرتی تھی طہران کی زمیں
اور تھی شکم میں جس کے نہاں مجھ سی مہ جبیں　　افسوس ایک دم اسے آرام ہی نہیں
دشتِ بلا و رنج میں نخچیرِ غم تھی وہ
آنکھوں میں غم کی شکل تھی تصویرِ غم تھی وہ

[illegible]

یادِ ظہیر

بزم اردو لاہور میں مولینا ظہیر دہلوی کے ماتم میں ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مندرجہ ذیل نظم پڑھی گئی :-

مکانِ دہر ہے عبرت کی جا مکینوں کو — کہ پیش اس میں ہے پستی بلند بینوں کو
عیاں ہے چار طرف انقلاب کا نقشہ — بدل رہے ہیں مکاں روز و شب مکینوں کو
نفس کی آمد و شد سے عیاں ہے گویا ہم — مکانِ عمر کے طے کر رہے ہیں زینوں کو
ہوا یہ سانس کی ہے زندگی کا دارومدار — یہ بادبان چلاتے ہیں ان سفینوں کو
ملا ہے کنجِ لحد میں کچھ اس قدر آرام — کہ چھوڑ چھوڑ کے آتے ہیں نشینوں کو
سُلا رہی ہے حسینوں کو موت مرقد میں — چھُپا رہی ہے یہ جنگل میں کن دفینوں کو
پڑا ہے سر پہ غضب بوجھ سینکڑوں من کا — عجب اُٹھانے پڑے ناز نازنینوں کو
سفر ہے دُور کا اور جو میں آنکی ہے آرام — اُٹھاؤ کاندھے پہ ان پالکی نشینوں کو
یہ رازِ دہر حجابِ نظر ہے کچھ ایسا — نہ جس کی کُنہ نظر آئی دُور بینوں کو

نہ بیچ جانِ سخن کے بلند بینوں کو — یہ آسمان پہ لے جاتے ہیں زمینوں کو
سخن کے لعل و گہر دیتے ہیں زمانے کو — کرید کر دلِ صد چاک کے دفینوں کو
مزا مجازی میں انکے حقیقتوں کا ہے — نظر یہ پاک ہی آتے ہیں پاک بینوں کو
یہ جانتے ہیں کہ ہے مارِ آستیں دُنیا — یہ جھاڑ دیتے ہیں دُنیا پہ آستینوں کو
خلش نہ جائیگی سینوں سے تا ابد جبکی — ملا ہے دردِ ازل سے وہ ان حزینوں کو
یہاں نہ قدرِ سخن ہو تو کیوں ظہیر پھر — کلام جائیں سُنانے لحد گزینوں کو

مراد ماتمِ استادِ ذوق ہے اے دل
جو رو رہے ہیں یہاں انکے جانشینوں کو

[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

[illegible] [illegible]

کہا میں نے کہ ظالم کیا سلوک اُن سے کیا تو نے ۔ بنی ہے جان پر انکے یہاں اندوہ حرماں میں
مرے دل میں چُبھے جاتے ہیں نشتر انکے نالوں کے ۔ خلش انکی نہیں ہوتی ہے کیوں تیری رگِ جاں میں
یہ مانا میں نے تو واقف نہیں عشق و محبت سے ۔ کسی کے لئے ترس تو ہوگا اگر ہے نوعِ انساں میں
کبھی تو نے بھی دیکھا ہے غم بیتابیِ غربت ۔ کبھی یاد آئی ہے صبحِ وطن شامِ غریباں میں
محبت کی مصیبت میرے بھی دل نے اُٹھائی ہے ۔ خبر ہے مجھ کو کیا بے چینیاں ہیں رنجِ ہجراں میں
انہیں گر اُڑ کر جائیں بھی یہ اپنے نشیمن پر ۔ نہ مر جائیں کہیں ظالم قفس کے تنگ زنداں میں
مری تقریر سُن کر یہ جواب اُس نے دیا مجھ کو ۔ کہ ہے دُنیا میں راحت آشنا رنج فراواں میں
بہاریں باغِ عالم میں کہاں ہیں یہ اک کہانی ہے ۔ وہی دو دن کی رونق کیا دھرا ہے باغ و بستاں میں
ہمیشہ ہم نے عیش و وصل کے طالب کو دیکھا ہے ۔ بلائے ہجر میں رنج و الم میں یاس و حرماں میں
چمن میں عارضی یہ بلبلوں کا آشیانہ ہے ۔ قیامِ دائمی کس چیز کو ہے بزمِ امکاں میں
قفس سے پھر یکایک شور اُٹھا اُنکے نالوں کا ۔ بھلا کیا صبر آئے عاشقوں کو رنجِ ہجراں میں
یہ نالہ سُن کے پھر میں نے رہائی کی سفارش کی ۔ ملایا اُس نے اپنے دل سے اک آواز زنداں میں

ترس کھا کر اسیرانِ قفس کے شور و شیون پر
کہا صیاد نے پھیرو چھری ان سب کی گردن پر

کلامِ عزیز

ہو گو دُنیا میں پریشاں خاطر ایسا کم کہیں ۔ ایک مدت ہو گئی ہے دل کہیں ہے ہم کہیں
کر علاج اپنا تجھے کیا ہو گیا ہے چارہ گر ۔ جینے دیتا ہے کسیکو بھی بھلا یہ غم کہیں
یا الٰہی خیریت رکھنا دلِ بیمار کی ۔ کچھ تو ہے جو ہو رہا ہے دیر سے ماتم کہیں

عاقبت منزلِ ما وادیٔ خاموشان است — حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز
سُنکے کہنے لگا اقبال بجا فرمایا — شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصافِ ضروری تو ہیں موجود مگر — ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں اُستاد کوئی

کیا ترس کھایا ہے

چلا جاتا تھا میں مدہوش یادِ رُوئے خنداں میں — گذر یوں ناگہاں میرا ہوا صحنِ گلستاں میں
نگاہیں سطحِ فرش تھیں اور نظر کچھ بھی نہ آتا تھا — یہ حیرت تھی مجھے یادِ رُخِ آئینہ ساماں میں
نسیمِ صبح نے شوخی سے یہ آکر کہا مجھ سے — کہاں ہیں آپ صحنِ باغ میں یا دشتِ ویراں میں
بہار آئی ہے گل ہنستے ہیں غنچے مسکراتے ہیں — تبسم کی ادا ہے سبزۂ صحنِ گلستاں میں
جوانانِ چمن کے حُسن پر ہر ایک مائل ہے — نظر نرگس کی ہے ناظر کا دل ہے عشق پیچاں میں
یہاں تو کوئی رو دے بھی تو سب ہنس پڑتے ہیں کہ — نشاط افزا اثر ہے گریۂ ابرِ بہاراں میں
کہا میں نے کہ یہ تو خیر جو کچھ ہے سو ہے دیکھا — مجھے دلچسپیاں ہیں نغمۂ مرغِ خوش الحاں میں
صدا آتی نہیں کیوں بلبلوں کے چہچہانے کی — نظر آتے نہیں مرغانِ گلشن کیوں گلستاں میں
سُنا اتنے میں آوازِ حزیں میں نالہ [illegible] — کہیں گلشن سے باہر دور جنگل میں بیاباں میں
چلا گھبرا کے میں گلزار سے جنگل کی جانب کو — بڑھا اک اور غم میرے دلِ اندوہ ساماں میں
مرے کانوں میں آئے صاف نالے مرغِ گلشن کے — نکل کر باغ سے کچھ دور جب آیا بیاباں میں
وہاں دیکھا نرالی شکل کا اک آدمی میں نے — قفس لٹکے ہوئے آئے نظر شاخِ مغیلاں میں

قطعہ

ذیل میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا کا وہ قطعہ درج کیا جاتا ہے جو انہوں نے لاہور کی انجمن کے سالانہ جلسہ میں پڑھا تھا اور جس پر انہیں بہت داد ملی تھی ۔ اب یہ قطعہ انہوں نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ اشاعت کے لئے ہمیں عنایت کیا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب اس زمانہ میں بوجوہات اس قدر کم گو ہو گئے ہیں کہ ان کا کلام جس مقدار میں بھی حاصل ہو مغتنم ہے :-

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے ۔۔۔ عامل روزہ ہے تو اور نہ پابند نماز
تو بھی ہے شیوۂ ارباب ریا میں کامل ۔۔۔ دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکر حجاز
جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے ۔۔۔ تیرا انداز تملق بھی سراپا اعجاز
کبھی ایراں کے لئے ہو جو دعا کا جلسہ ۔۔۔ عذر تیرا ہے کہ ہو میری طبیعت ناساز
ختم تقریر تری مدحت سرکار پہ ہے ۔۔۔ فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز
در حکام بھی ہے تجھ کو مقام محمود ۔۔۔ پالسی بھی تری پیچیدہ تر از زلف ایاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے ۔۔۔ پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
نظر آجاتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن ۔۔۔ اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز
دست پرور ترے ملک کے اخبار بھی ہیں ۔۔۔ چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے ۔۔۔ تری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی ۔۔۔ تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز
غم صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں ۔۔۔ پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغ پرواز

شدّت سے بھوک کے بھی ہوئی ہچکیاں تھی میں کہتی یہ اپنا حال کسے بے زباں تھی میں
اس دل کا حال دیکھنے والا کوئی نہ تھا
عالم میں سارے غیر تھے اپنا کوئی نہ تھا
اس وقت گرچہ مجھ سے مقدّر نفور تھا اس وقت بد میں گو ہوا میرا ظہور تھا
اور چرخ پیر درپئے ایذا ضرور تھا لیکن جبیں پہ افسر شاہی کا نور تھا
میں تھی زمیں پہ چرخ پہ تھا چودھویں کا چاند
وہ آسماں کا چاند تھا میں تھی زمیں کا چاند
اللہ کو میرے حال پہ جب رحم آگیا اک قافلے کا شب کو وہاں سے گذر ہوا
جس دم اُنھوں نے دیکھا مجھے دشت میں پڑا سردار قافلہ نے زمیں سے اُٹھا لیا
اب صبح کی سپیدی نمودار ہوگئی
اور میں وہیں وفور محبّت سے سوگئی
کھولی جو میں نے آنکھ تو نقشہ ہی اور تھا دیکھا جو میں نے اب وہ تماشا ہی اور تھا
اب شاہد امید کا جلوا ہی اور تھا وہ دن ہی اور تھے یہ زمانہ ہی اور تھا
مہرالنسا کا نام جہانگیر کے لئے
فرحت کا مژدہ ہوگیا دلگیر کے لئے
شہزادہ میرے حسن کا دیوانہ بنگیا شمع شعاع رخ کا وہ پروانہ بنگیا
جام شراب عشق سے مستانہ بنگیا پہلے جو دل تھا کعبہ وہ بتخانہ بنگیا
اکبر کو سارا حال جو معلوم ہوگیا
نقشہ یہ حسن و عشق کا معدوم ہوگیا
فوراً ہی مجھ کو شیر افگن خاں کو دیدیا اور اس کو ایک صوبے کا حاکم دیا بنا
دربار اکبری سے بھی یوں کر دیا جدا قسمت میں جو لکھا تھا نمودار ہوگیا

اس طرح شاہزادے سے میں دُور ہو گئی
بلبل عروسِ باغ سے مہجور ہو گئی

لیکن چراغِ عشق کا شعلہ بجھا نہ تھا دِل سے ابھی وہ داغِ تمنا مٹا نہ تھا
جوشِ جنونِ عشق ابھی تک گھٹا نہ تھا دل اس کا اب بھی میری طرف سے ہٹا نہ تھا

وُہ آگ تھی جگر میں کہ دِل بیقرار تھا
ہر داغِ عشق رشکِ رُخِ لالہ زار تھا

تاجِ شہی فلک نے جواب سر پہ رکھ دیا ہندوستاں کا اس کو شہنشہ بنا دیا
پہلو میں جو خیال رقابت کا تھا چھپا ظاہر اب ایسے وقت میں اس کا اثر ہوا

اکبر کے بعد بیٹھا جہانگیر تخت پر
چھائی پھر آفتوں کی گھٹا میرے بخت پر

کیونکر نہ غم سے میرا کلیجا فگار ہو اب کس طرح نہ آنکھ مری اشکبار ہو
ہائے وُہ شیر آرزوؤں کا شکار ہو اِک صاحبِ کمال یُوں مجھ پر نثار ہو

بیوہ ہُوئی میں ہائے جہانگیر کے سبب
ذِلت اُٹھائی عاشقِ دلگیر کے سبب

تھا فرطِ غم نے گو مجھے رنجور کر دیا اور دل ہی سے خیالِ خوشی دُور کر دیا
گو مہرِ دل کو غم نے تھا بے نُور کر دیا پر انقلابِ دہر نے مجبور کر دیا

مہر النسا سے ملکہ نورجہاں بنی
آخر کو بیگم شہِ ہندوستاں بنی

اب وقت آگیا میرے اَوجِ کمال کا گلشن تھا اب بہار پہ میرے خیال کا
نورِ جہاں میں نور تھا مہرِ جمال کا مشتاق شہ تھا حسنِ رُخِ بے مثال کا

ناز آفریں تھی میں وُہ مری ناز اُٹھاتا تھا

ہر ہر قدم پہ شوق سے آنکھیں بچھاتا تھا

وہ نورِ دیں کا تھا تو میں تھی جہاں کا نور   تھا میرے نورِ حسن میں حسنِ بتاں کا نور
بے نور ہو گیا تھا مہِ آسماں کا نور   چمکا جو دہر میں مہِ ہندوستاں کا نور
نورِ جہاں جو میں تھی تو وہ نورِ دیں ہوا
دیدہ نشیں جو میں تھی تو وہ دلنشیں ہوا

عاشق تھا مجھ پہ دل سے جہانگیر بادشہ   تیغِ نگاہِ ناز کا نخچیر بادشہ
پابندِ پیچِ زلفِ گرہ گیر بادشہ   ہاں بنگیا تھا عشق کی تصویر بادشہ
ہونیکو گرچہ بیگمِ شاہِ زماں تھی میں
دربار میں مگر شہِ ہندوستاں تھی میں

رعبِ جلال میرا امارت کے دل میں تھا   شوقِ اطاعت اہلِ اطاعت کے دل میں تھا
اک فخر میرے دم سے حکومت کے دل میں تھا   ہیبت سی میری خوف مہابت کے دل میں تھا
جب تک رہی میں ہند میں جلوہ طرازِ تخت
ہر دم جھکا رہا سرِ عجز و نیازِ تخت

عاشق تھا مجھ پہ عیش مسرت نثار تھی   نورِ جہاں کے نام پہ قسمت نثار تھی
شانِ شہنشہی پہ حکومت نثار تھی   میرے قدم پہ شاہدِ دولت نثار تھی
تاجِ شہی تھا سر پہ تو تھا تخت زیرِ پا
رعبِ جلال نے تھا کیا بخت زیرِ پا

اطوارِ بادشاہی کی تھی دھوم ہند میں   غیرت دہِ سما تھا ہر اک بوم ہند میں
جب ظلمِ ناروا ہی تھا معدوم ہند میں   پھر کون سنتا نالۂ مظلوم ہند میں
عالم تمام شاد تھا غمگیں کوئی نہ تھا
سب اپنے اپنے دیں پہ تھے بے دیں کوئی نہ تھا

حاصل تجھے عیش کے مجھی سامان بڑے بڑے   ہوتے تھے پورے سینکڑوں ارماں بڑے بڑے
رشکِ چمن ہوئے تھے بیاباں بڑے بڑے   ڈرتے تھے تجھ سے حاکمِ دوراں بڑے بڑے

تقدیر سے مگر مجھے آرام کب ملا
شامِ خوشی میں بھی غمِ فردا کا غم رہا

ہر گردشِ فلک بہ سرِ انتقام ہے   ہر شامِ عیش صبحِ الم کا پیام ہے
فانی ہر ایک چیز یہاں لاکلام ہے   کہتے ہیں جسکو باقی وہ اللہ کا نام ہے

لازم فنا ہے عالمِ ایجاد کے لئے
ویرانگی ہے خانۂ آباد کے لئے

عیش و نشاط راحت و آرامِ روزگار   باغ و بہار و صحبتِ ساقیٔ گلعذار
راز و نیاز و عشق و محبت۔ وصالِ یار   تخت و حکومت و گہر و دُرِّ شاہوار

سب چھٹ گئے جو مجھ سے جہانگیر چھُٹ گیا
اک دم میں ہائے عیش کا سامان لٹ گیا

افسوس اپنا داغِ تمنا نہیں رہا   دل میں سوائے حسرتِ فردا نہیں رہا
وہ جس سے زندگی کا مزا تھا نہیں رہا   عالم وہ تیرا گلشنِ دنیا نہیں رہا

لاکھ آئے گر بہار مگر مجھ کو اس سے کیا
غنچے کھلیں ہزار مگر مجھ کو اس سے کیا

نظارہ تیرا سیر کے قابل نہیں رہا   چرخِ شہی کا وہ مہِ کامل نہیں رہا
افسوس میرا رونقِ محفل نہیں رہا   کیونکر میں روؤں ہائے کہ وہ دل نہیں رہا

کشتیٔ صبر موجۂ آبِ رواں میں ہے
میں اس جہاں میں ہوں مرا دل اس جہاں میں ہے

حسرت نہیں ہے دل میں کوئی آرزو نہیں   وہ پھول ہوں کہ نام کو بھی جس میں بو نہیں

ہائے وہ دستِ شوق جو زیبِ گلو نہیں — یہ کیا ستم ہے میں ہوں زمانے میں تو نہیں

تیرے بغیر مجھ کو ہے اب بارِ زندگی

بے لطف ہیچ ہے ہوتی ہے بے یار زندگی

سُن! اے مرے انیس سناتی ہوں میں تجھے — کچھ دردِ دل کا حال بتاتی ہوں میں تجھے

دلِ زخم خوردہ اپنا دکھاتی ہوں میں تجھے — رو رو کے دیر قبر پر رُلاتی ہوں میں تجھے

تو سو رہا ہے چین سے تجھ کو خبر نہیں

آرام مجھ کو دہر میں شام و سحر نہیں

جب سے گیا ہے تو کبھی بدلا نہیں لباس — رہتی ہے تیرے بعد طبیعت بہت اُداس

مونس ہیں میرے حسرت و اندوہ و رنج و یاس — لیکن ابھی تک ایک یہ باقی ہے دل میں آس

شاید کہ اپنے پاس مجھے بھی بلائے تو

یا میرا حال دیکھنے کو آپ آئے تو

چڑھتا ہے آفتاب مگر مجھ کو اس سے کیا — روشن ہے ماہتاب مگر مجھ کو اس سے کیا

پیتے ہیں سب شراب مگر مجھ کو اس سے کیا — ہو نغمۂ رباب مگر مجھ کو اس سے کیا

افسوس جب کہ تو نہیں جلوہ طرازِ بزم

پھر ہیچ ہیں مرے لئے سب سوز و سازِ بزم

میں مبتلائے رنج و غمِ روزگار ہوں — فرقت میں رات دن میں تری بیقرار ہوں

اور انتظار میں نگہِ انتظار ہوں — جس پر خزاں ہو گئی میں وہ بہار ہوں

تیرے بغیر مجھ کو کوئی پوچھتا نہیں

جز دیدِ یار ہائے کچھ اب سوجھتا نہیں

ویران تیرے بعد ہوا میرا باغِ دل — اور آرزوئے مرگ میں پنہاں ہے داغِ دل

ٹھنڈا کیا ہے یاس نے میرا چراغِ دل — ملتا نہیں ہے اب تو کہیں بھی سراغِ دل

کچھ بھی نہیں جہان میں جب اس میں تو نہیں
راحت نہیں ہے عیش نہیں آرزو نہیں

میں وہ چمن ہوں جس میں کوئی باغباں نہیں — نا مہرباں ہیں سارے کوئی مہرباں نہیں
کب فرطِ غم سے چشم سے آنسو رواں نہیں — کس سے کہوں میں حال کوئی رازداں نہیں
دشمن ہیں جب جہان میں کوئی آشنا نہیں
اک تو رفیقِ دل تھا کوئی دوسرا نہیں

کب تک فراق و ہجر کے صدمے اٹھاؤں میں — کب تک تمہاری یاد میں آنسو بہاؤں میں
سوزِ غمِ فراق کو کب تک چھپاؤں میں — جی چاہتا ہے حال ابھی اور سناؤں میں
پر ڈر ہے سن کے تو نہ کہیں بیقرار ہو
آزردہ تیری روح نہ زیرِ مزار ہو

جب یوں غمِ فراق میں عرصہ بسر ہوا — پھر میرے آہ و نالہ کا ظاہر اثر ہوا
اشکِ نشاط زیبِ دہ چشمِ تر ہوا — آخر نہالِ شوق مرا بارور ہوا
امیدِ وصل میں مجھے حاصل ہوا وصال
وہ بات ہو گئی جسے سمجھی تھی میں محال

حسرت تھی مر کے اسکے ہی پہلو میں رہتی میں — پابند اسکے ہی غمِ گیسو میں رہتی میں
بلبل صفت تصورِ گلرو میں رہتی میں — اے کاش اس کے سایۂ ابرو میں رہتی میں
افسوس بعد مرگ بھی مہجور ہی رہی
اس کی نگاہِ لطف سے میں دور ہی رہی

کیونکر نہ میری قبر ہو عالم میں یادگار — گلشن ہے کوئی یاں نہ کوئی باغ و سبزہ زار
ہر وقت پاس قبر پہ روتی ہے زار زار — زائر فقط ہے ایک مری حسرتِ مزار
اے بیکسی مزارِ شہنشہ پہ جائیو

اس طرح حال دل مرا رو کر سنائیو

اک ٹوٹی پھوٹی قبر کے اندر پڑی ہوں میں بیکس ہوں بیقرار ہوں مضطر پڑی ہوں میں
کب بس سے تجھ کو چھوڑ کے دلبر پڑی ہوں میں مجبور ہوں میں کیا کروں مر کر پڑی ہوں میں

افسوس تیرے سایہ تربت سے دور ہوں
راحت ہی مجھ سے دور میں راحت سے دور ہوں

رادی ہی میرے حال پہ ہر وقت اشکبار روتا مری مزار پہ ہے ابر نوبہار
ہر سو اُڑاتی پھرتی ہے باد صبا غبار مشغول شغل نالہ میں ہے عندلیب زار

ویرانگی کا نقشہ ہے گویا کھنچا ہوا
کانٹوں سے فرش خار ہی ہر سو بچھا ہوا

اک شمع لا کے قبر پہ میری جلائے کون دو پھول میرے واسطے لا کر چڑھائے کون
پڑھنے کو فاتحہ مری تربت پہ آئے کون یاں آ کے دشت خار میں تکلیف اُٹھائے کون

کیونکر نہ بیکسی کے سبب یادگار ہوں
عالم میں کشتۂ ستم روزگار ہوں

میری ہی داستاں ہی جو ہے داستان شوق گویا مری زبان ہی اس ہم زبان شوق
آہ و فغاں ہی میری ہی جو ہے فغان شوق ہی میرا ہی بیان سراسر بیان شوق

پڑھ کر اسے نہ کس لئے دل بیقرار ہو
اک سوگوار دل کا جو اس میں غبار ہو

محمد عبدالعزیز شوق دینانگری

تازہ غزلیں

(از جناب محشر لکھنوی)

آنے والی اک ضرورت کیلئے بیٹھے رہے چارہ گر بیمار کو شب بھر لئے بیٹھے رہے

دل یہ کہتا تھا اب آتا ہے اب آتا ہے کوئی — شام سے تا صبح بند آنکھیں کئے بیٹھے رہے
دورِ ساغر محفلِ ساقی میں چلتا ہی رہا — ہم بھی اپنے دل کو کچھ تسکیں دیئے بیٹھے رہے
جاں نثاروں پر ہے ضبطِ غصہ بھی طرفہ ستم — اس سے کیا حاصل کہ تم دل میں لئے بیٹھے رہے
ہجر میں شورِ فغاں ہے باعثِ افشائے راز — دل پہ رکھے ہاتھ اتنے کے لئے بیٹھے رہے
ایک ہم ہیں اس ادا کو دیکھ کر بیخود ہوئے — ایک تم ہو بادہ گلگوں پیئے بیٹھے رہے
محشر الیوں کے دماغ و دل کی قدرت پر نثار — محفل ہے دلدار میں جو مئے پئے بیٹھے رہے

(از جناب احمد علی شوق۔ قدوائی لکھنؤی)

وہ خوش کہ ہے جگر کو نظر میں لئے ہوئے — یہ خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
آتا ہوا عدم سے تو بزمِ وجود میں — آئے ہیں وہ عدم کو کمر میں لئے ہوئے
زلفوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر — بیٹھے رہو گے درد کو سر میں لئے ہوئے
کہتے ہیں وہ حیا سے پسینے میں ڈوب کر — ہر کوئی مجھکو دیدۂ تر میں لئے ہوئے
وسعت ہمارے عشقِ جنوں زا کی دیکھنا — دنیا کے حسن کو ہے یہ سر میں لئے ہوئے
بو تم نے دی نسیم کو۔ اور وہ ہے کوچہ گرد — ہم کو ملی تھی راہگذر میں لئے ہوئے
کیا شوق لیں یہ چرخِ تنک ظرف کو ہے کبر — ایک اشرفی ہے جیبِ سحر میں لئے ہوئے

(از جناب محمد سعید الدین صاحب۔ ایم اے)

اب تو کچھ شیخ جی بھی پینے لگے — مردہ دل مست ہو کے جینے لگے
کعبہ و دیر تک یہ کیوں ہے دوِش — دل سے جب عرش تک ہیں زینے لگے
ساغر و مے سے احتراز رہا — منہ نہ میرے کبھی کمینے لگے
نام زندہ ہے قیس و وامق کا — کشتۂ ناز مر کے جینے لگے
تو نے اشعار یہ لکھے ہیں سعید — یا ترے ہاتھ کچھ خزینے لگے

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقام خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا قیمت مع محصولڈاک (۱۲ر)

رسوم دہلی (مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ قیمت مع محصولڈاک - ۱۲ر

اقبال دلہن (مصنفہ مولوی حاجی بشیرالدین احمد خانصاحب قسم اول ۱۲ر قسم دوم - ۸ر

خواب ہستی مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن (۱۲ر)

ابو مسلم خراسانی رسالہ ہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف کو مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمایش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت ۱۲ر

مکتوبات آزاد - اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ باتصویر ۶ر

کلام نیرنگ - سید غلام بھیک نیرنگ بی اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۹ر

انتخاب مخزن - مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب - قیمت علاوہ محصولڈاک عہ

درد جانستان مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی زبان میں دلی کا سچا قصہ ۸ر

دربار نمبر دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا - ۶ر

مثنویات حسن مثنوی بینظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کر دی گئی ہے ۱۲ر

سیر تبت انگریزی کتاب کا ترجمہ ایران تا تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰ر

مرقع خوشخطی فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں کے فائدے اور شائقین خط کیواسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھ کر خط کے تمام نکات باسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اس کے اہتمام میں ملحوظ رکھا ہے - یہ خوبی ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اس وقت تک موجود نہیں ۵ر

درخواستیں بنام مینجر مخزن - لاہور آنی چاہئیں۔

برادرِ مرحوم کی یادگار

ہماری دونوں ٹوپیاں "محسن الملک پیٹینٹ" و "وقار الملک پیٹینٹ" جیسی ہمہ صفت موصوف تھیں ویسی ہی پبلک نے اس کی قدر کی۔ جس کے لئے ہم جس قدر مشکور ہوں تھوڑا ہے۔ مگر اسی قطع وضع کی ذرا کم قیمت ٹوپیوں کی بہت مانگ تھی۔ اس لئے ہم نے مرحوم بھائی مولوی عبد الرشید چشتی بی۔ اے جن کی یادگار میں ہم نے دوکان کا نام رکھا ہے اور جن کو ترکی ٹوپی نہایت عزیز تھی ایک ٹوپی

"رشید پیٹینٹ"

اٹلی سے خاص آرڈر پر بنوائی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہر ایک مسلمان کے سر پر ترکی ٹوپی نظر آئے۔ اس لئے ہم نے باوجود اس قدر خوش وضع ہونے اس کی قیمت نہایت تھوڑی رکھی ہے۔

قیمت رشید پیٹینٹ

۱- چھوٹی دیوار اوپر سے نیچے تک قریبًا برابر اسنہری چمڑہ و ریشم کا معہ پھندنا ؏

۲- ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ نقلی بیٹن ۔۔ ۔۔ ۔۔ عہ

(عبد الحمید چشتی) عبد الرشید زبردر جنرل مرچنٹ

انارکلی ۔ لاہور

آبحیاتِ خضر کا پتہ مل گیا

جس کو کہ ہیں وید ملت

عرب میں اکسیر البدن اور اطبا کی اصطلاح میں اکسیر اعظم کہتے ہیں

اطبائے سلف و خلف کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں روح الکل ایک غلاف کے اندر ملفوف ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماہر علم ان اجزائے ارضی و غلاف کو دور کرکے روح کو حاصل کرے تو وہ روح جس مرض میں دیا جاوے مرض کیسی دیرینہ کہنہ لاعلاج ہو وہ روح کو طاقت دیکر مرض کو نکال دیتا ہے ایسی اکسیر دوائیں ہر ایک کو معلوم نہیں ہوتیں بلکہ بعض خاص لوگوں کو جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتے ہیں تو ان پر ان بوٹیوں کا راز افشا کر دیتے ہیں جن میں روح الکل زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم اور خضر علیہ السلام اور بڑے بڑے سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی چیزوں کے متلاشی رہے۔ حکیم میکائیل۔ حکیم ہرمس۔ ڈاکٹر لونگ نے ایسے جواہر کو آبحیات لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں روح کو تبدیل ہیئت کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ سرایت کرکے جسم سے مرض کو باہر نکال دیتا ہے +

اکسیر البدن دوائی کا خاصہ ہے کہ مرض کو جسم سے داخل ہوتے ہی خارج کر دیتا ہے اور مزاج کو فطرتی حالت پر پہنچانا اس کا پہلا فرض ہے۔ **یہی وجہ ہے** کہ یہ اکسیر اعظم ہر قسم کی مختلف لاعلاج بیماریوں میں تیر بہدف کا کام دیتی ہے۔ اس لئے عام لوگ اس قالب ماہیت یا روح الکل کو **آبحیات** کہتے ہیں۔ بعد تجربہ مندرجہ ذیل عوارض میں یہ موثر و مفید ثابت ہوئی ہے +

فوائد مصدقہ آبحیات خضری

تپ محرقہ۔ تپ صفراوی۔ تپ پرسوت۔ تپ دق و سل کے لئے بے مثل دوا ہے۔ ہیضہ۔ اسہال۔ پیچش میں بے نظیر ہے سرسام۔ دردِ سر۔ درد شکم۔ درد پہلو۔ نمونیا۔ ذات الجنب۔ سردی۔ طپش دل۔ سوزش وغیرہ میں سریع الاثر ہے۔ ناسور بدھ کا زخم۔ کان کا درد۔ مسوڑوں سے خون آنا۔ پھوڑے پھنسیاں۔ پٹھوں کا اکڑاؤ۔ بواسیر۔ بھگندر۔ تالو کا سوراخ۔ دانت کا درد۔ درد قولنج۔ درد کمر۔ قبض۔ درد نقرس۔ متلی۔ چھپاکی۔ زخموں میں کیڑے پڑنا۔ کثرت تشنگی۔ تشنج۔ بےخوابی۔ کھانسی خشک و تر۔ زکام۔ کنٹھ مالا۔ پستان کا ورم۔ درد دل۔ آگ سے جلنا وغیرہ وغیرہ میں مفید ہے

قیمت

فی شیشی ایک روپیہ (عہ) محصولڈاک ۳/
۳ شیشی تین روپے (سے) محصولڈاک معاف
۶ شیشی پانچ روپے (صہ) بغیر محصولڈاک

ہزاروں سرٹیفکٹ میں سے بطور نمونہ چند سند ملاحظہ فرمائیے

پتہ: مینیجر شفاخانہ حاذق الحرمین الشریفین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما۔ لاہور

پانچ لاکھ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈالدیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی گنا جاتا تھا آج ان سطروں کو پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شرکت غیرے مالک مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کیواسطے **روح حیات** کا مجسم اشتہار بنگیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی مرحوم کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سُنئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنجاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب کرنل [illegible] صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ظلہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور دوسرے لوگوں نے **روح حیات** کو طاقت میں بے بدل بتایا ہے روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر پٹھوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کرکے اعصاب کی سستی کو ایسی بجلی کی آگ سی چالاک اور چوکنا کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ توپیں بھی ماریں تو بھی چت ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچرر معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفیکیٹوں اور موجودہ امتداد مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو نتیجہ نہ نکالے کہ روح اسوقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت حائل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کرکے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھتے ہیں۔ **روح حیات** تریاق کا تیر بہدف دوا ہے۔ بلکہ اعصاب کی ایک افزا غذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ چہرے میں رونق ابداری حاصل ہوتی ہے استعمال سے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائینگے۔ جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپیہ ۸ آٹھ آنے۔

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیاگر پرپرائٹر شفاخانہ عام لاہور سے طلب کرو

شائقین کتب

(ملاحظہ فرمائیں)

سنگلاخ کتابوں کا حل - مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کرسکا اور نہ کوئی انشاءاللہ حل کرسکتا ہے یعنی پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے۔

حل قصائد خاقانی ۔ کورس منشی فاضل ایم۔ اے حصہ اول ؎۱۲ اور حصہ دوم زیر طبع ہے یہ قصہ اس لئے کہ ہم کو چوروں سے پناہ نہیں جو گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مرد میدان ہے تو دوسرا حصہ حل کرے۔ مشکل قصائد میں نے حل کر دے آسان باقی ہیں

حل کلیات - اردو مرزا غالب دہلوی مرحوم ۔ " " " " ۱۰؍

حل قصائد خاقانی کورس منشی عالم ۔ ... ... ۹؍

حل نکات مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف .. ۱۲؍

شوکت التجدید میرے کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جسکی منتظر ہے پیشگی قیمت آرہی ہے زیر طبع ہے۔ پیشگی ؎۲ اور بعد طبع ... ... ۴؍

اعلان عام جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں میری جانب رجوع لائیں۔ جیسا کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیجکر آزمالیں۔

جو صاحب کسی کتاب اردو - فارسی - عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں۔ اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہوتا غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے۔

مجدد السنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھی

قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ

(١/١) قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کا معجزہ جو قریبًا ہر ایک مسلمان
(٢/١٢) کو معلوم ہے لیکن اس کا یہ نیا معجزہ صنعت تحریر ہے۔ چنانچہ
(٣/١٣) حمائل شریف اعجاز صنعت جس کا یہ اشتہار ہے اس کے ۴۸۸ صفحات
(٤/٨) ہیں اور ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں پس چھٹی یعنی درمیانی سطر سے
(٥/٢) اوپر اور نیچے پانچ پانچ سطریں ہیں اور صنعت تحریر یہ ہے
(٦) کہ اس حمائل شریف کے تمام صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر
(٥/٢) اوپر والی پانچوں سطروں کا نیچے والی پانچوں سطروں سے مقابلہ ہے یعنی
(٤/٨) ہر صفحہ میں جن جن حروف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں۔ انہیں
(٤/٩) حروف سے نیچے والی سطریں شروع ہوتی ہیں اور درمیانی چھٹی سطر کا مقابلہ
(٢/١٠) کے صفحہ کی درمیانی چھٹی سطر سے ہے۔ پس آپ سوچ سکتے ہیں کہ سارے قرآن
(١/١١) شریف میں ایسی صنعتی تحریر کا ہونا معجزہ قرآن نہیں تو اور کیا ہے؟

نوٹ: اس صفحہ اشتہار میں بھی اسی صنعت تحریر کا نمونہ دکھایا گیا ہے چنانچہ ہر ایک سطر کے شروع میں حرف مقابلہ والی سطر دیکھ کر دیکھو۔

قیمت مجلد حمائل ایک روپیہ آٹھ آنہ ملنے کا پتہ مولوی حکیم غلام محی الدین کلمی (؟) لاہور

[illegible]

[illegible]

جون ۱۹۱۱ء

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بی اے

جلد (۲۱) نمبر (۳)



مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہواری مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام منیجر جنرل شیخ محمد اکرام صاحب اور منشی فضل الٰہی صاحب پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ معہ محصول ڈاک للعمہ نمبر دوم عما فی پرچہ سالانہ عین

مخزن

لندن میں مسجد

لندن میں مسجد بنانے کا خیال کچھ نیا خیال نہیں ہے۔ جب سے مسلمانوں کے تعلقات انگلستان کے ساتھ بڑھنے لگے اور تحصیل علوم و فنون و تجارت و صنعت وغیرہ کے لئے مسلمان نوجوان انگلستان جانے لگے ہیں۔ یہ خیال دلوں میں بارہا پیدا ہوا ہے اور ایک دو مرتبہ باقاعدہ تجویز کی صورت میں بھی آج سے پہلے پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس مرتبہ ایسے باثر اور مقتدر اصحاب نے اس تجویز کو پیش کیا ہے اور مسجد کے بنانے والوں کی جماعت ایسے جوش اور ہمت سے اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے مستعد ہوئی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آرزو کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور لندن میں آخر ایک عالیشان مسجد تعمیر ہو کر مسلمانوں کے لئے خیر و برکت اور فلاح دارین کا موجب ہوگی۔

لندن اس وقت دنیا کی تجارت کا مرکز اور علم و ہنر کا منبع ہے۔ اطراف عالم سے اقوام عالم کے افراد اس مرکز کی طرف کھنچے

آتے ہیں ؎

آنچہ در جملہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصارے و یہود

یہ شعر لنڈن کے حال پر ایسا صادق آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی سو سال پہلے ہی کی شان میں کہا گیا تھا - اور اکثر مذاہب نے وہاں کے امن و آزادی اور مذہبی رواداری سے فائدہ اُٹھا کر اپنے معبد اس میں بنائے ہیں۔ مذہب عیسوی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرقہ ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی خاص عبادت گاہ اس عظیم الشان شہر میں نہ بنائی ہو - یہود گو تعداً میں تھوڑے ہیں - مگر باہمت اور متمول ہیں اور اتحاد قومی رکھتے ہیں - انکی اپنی عبادت گاہیں توکئی ہیں - عام مذہب وہاں کا پراٹسٹنٹ عیسائی ہے اور پراٹسٹنٹوں کے گرجا گھروں کی سر بفلک عمارتیں اور اُن کی آرائش اور اُن کی آمدنیاں تو خیر ہم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی مشکل سے آتی ہیں - اُن کی تقلید کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا - پس مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہے کہ توحید کے نام کو روشن کرنے کے لئے دُوسری عبادت گاہوں کے پہلو بہ پہلو ایک مسجد بھی بنائیں جو اگر اعلیٰ سے اعلیٰ کلیسائی عمارات کا مقابلہ نہ کر سکے - تو کم از کم اسلامی دُنیا کی بزرگی اور پایہ تخت انگلستان کی شان کے مناسب تو ہو -

تعمیر مسجد کے ثواب کے متعلق کچھ لکھنا بالکل غیر ضروری ہے اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ (تحقیق بناتا ہے مسجدیں خُدا کی جو کوئی مانتا ہے خدا کو اور روز قیامت کو اور جو نماز پڑھتا ہے) صاف اور صریح حکم ہے - گویا مومن کی ضروری صفات بیان کر دی گئی ہیں اور

لکھا ہے کہ جو یہ صفات رکھتا ہے اس پر مساجد کو بنانے اور آباد رکھنے میں شریک ہونا فرض ہے۔ ہمارے ملک میں مساجد کی کثیر تعداد بتا رہی ہے کہ مسلمان اس ثواب کے کس درجہ معترف ہیں۔ جب یہاں باوجود ضرورت نسبتاً کم ہونے کے ہزاروں لاکھوں روپے مسلمان مساجد پر صرف کرتے رہتے ہیں اور گلی گلی محلہ محلہ مسجد بناتے ہیں تو ایسی صورت میں کہ ایک اتنی بڑی آبادی میں جس میں پچاس ساٹھ لاکھ نفوس آباد ہوں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ایک بھی عبادت گاہ موجود نہ ہو۔ ایک مسجد مہیا کر دینا ایک ایسا بڑا فرض مذہبی ہے کہ اس کے ادا کرنے کے لئے ہر مسلمان کو آمادہ ہونا چاہیئے۔

اگر لندن ایسا مقام ہوتا جہاں زمین معمولی قیمت پر مل سکتی اور عمارت کا خرچ غیر معمولی نہ ہوتا تو عجب نہیں کہ آج تک وہاں کئی مسجدیں بن جاتیں۔ کئی مسلمان تاجدار۔ کئی شاہزادے اور بہت سے خوش خیال اُمرا اہل اسلام میں سے وہاں جا چکے ہیں اور کس کا جی نہیں چاہتا کہ ایسے بڑے شہر میں ایسی نیک یادگار چھوڑ آئے۔ مگر لندن میں کوئی موزون اور موقر عبادت گاہ بنانے کے لئے لاکھوں روپے درکار ہیں۔ اور اسی لئے کسی فرد واحد کی ہمت نہیں پڑی۔ کہ وہاں مسجد بنادے اور یہ مبارک تجویز قوم مسلمانان کی مجموعی توجہ اور کوشش کی منتظر اور محتاج ہے۔ جو کمیٹی اب اس مطلب کے لئے قائم ہوئی ہے اُس نے پندرہ لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا ہے۔ مگر ہمیں یہ بھی کافی نہیں نظر آتا اور عجب نہیں کہ بیس لاکھ سے کم میں سب ضروریات مہیا نہ ہو سکیں لیکن ایک ایسی بڑی قوم کے لئے جو دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس میں اب بھی ہزاروں خوشحال لوگ موجود ہیں۔ یہ رقم ایسی نہیں ہے جسے

سُن کر وہ ڈر جائیں اور ہمت ہار بیٹھیں - بڑے چندے تو بڑے چندے - چھوٹے چندوں سے بھی یہ رقم جمع ہو جانی ناممکن نہیں بشرطیکہ معزز افرادِ قوم ہر جگہ اس خدمت کو اپنے ذمہ لیں اور جمع کرنے کی سعی کریں -

لندن کی منتظمہ کمیٹی کی طرف سے ایک چٹھی ان لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہے جنہوں نے مسجد کی جنرل کمیٹی کا ممبر ہونا منظور کیا ہے - اس کا ترجمہ ہم آج ناظرینِ مخزن کی اطلاع کے لئے شائع کرتے ہیں جو صاحبان براہِ راست اس پتہ پر جو چٹھی مذکورہ میں دیا ہوا ہے اپنے عطیئے لندن روانہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں - لیکن ناظرینِ مخزن میں سے اُن اصحاب کی سہولت کے لئے جو اس مبارک اور شاندار تجویز کی امداد کے لئے اپنا چندہ ہماری معرفت روانہ کرنا چاہیں - ہم یہ ذمہ داری لینے کو بھی تیار ہیں اور اس مطلب کے لئے دفتر مخزن میں ایک رجسٹر جامع مسجد لندن کے چندہ کے لئے کھول دینگے - جو چندہ مخزن کی معرفت روانہ ہونے کے لئے موصول ہوگا - اس کا مخزن میں اعلان کر دیا جائیگا اس تدبیر سے ان لوگوں کو بالخصوص آسانی ہوگی جو بہت بڑی رقوم نہیں دے سکتے - مگر اپنے محدود وسائل کے موافق اس کارِ ثواب میں شریک ہوکر داخلِ حسنات ہونا چاہتے ہیں - اگر اس ذریعہ سے کوئی معتدبہ خدمت مسجد کمیٹی کی ہم سے بن پڑی تو ہم اسے عین سعادت سمجھیں گے اور اگر قلیل امداد بھی ہو سکی تو بھی اس نسبت سے شاملِ ثواب ہونگے -

چٹھی جو گذشتہ ہفتے میں لندن سے پہنچی ہے حسب ذیل ہے :-

مسجد لنڈن فنڈ

مُربیان:- اعلیحضرت سلطان المعظم سُلطان محمد خامس خلد اللہ ملکہٗ۔ فرمانروائے دولت عثمانیہ۔
اعلیحضرت سلطان احمد شاہ خلد اللہ دولتہٗ۔ شاہ کجکلاہ ایران۔

عہدہ داران

اعزازی پریسیڈنٹ:-
جناب شیخ الاسلام استانبول
جناب اخوند خراسانی مجتہد اعلیٰ نجف
جناب آغا سید محمد طباطبائی مجتہد اعلیٰ طہران

پریسیڈنٹ:-
ہز ہائی نس آغا خاں جی۔سی۔آئی۔ای

چیئرمین:-
رائٹ آنریبل سید امیر علی۔پی۔سی سی۔آئی۔ای۔ایل ایل ڈی۔

سکرٹریان:-
عمر الدین۔عبد اللطیف صاحب۔
میجر سید حسن بلگرامی صاحب۔
پروفیسر ٹی۔ڈبلیو آرنلڈ صاحب

خزانچی:-
عبد علی عتیق صاحب۔

ڈیر مسٹر عبد القادر:-

اگر کمیٹی مسجد لنڈن فنڈ کی جانب سے شکریہ قبول فرمائیے کہ آپ نے جنرل کمیٹی کا ممبر ہونا منظور کیا ہے۔ اور لندن میں اسلامی عبادت گاہ بنانے کی نیک تجویز کے پورا کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کمیٹی نہیں چاہتی کہ اُن بیشمار اور دُور تک اثر کرنے والے فوائد کا مفصل ذکر کرے جو برٹش امپائر کے سب سے بڑے شہر میں ایک مسجد کے موجود ہونے سے پیدا ہونگے۔ اِتنا کہدینا کافی ہے کہ مسلمانان مقیم انگلستان کی رُوحانی ضروریات کو پورا کرنے اور مختلف ممالک کے مسلمان بھائیوں کو یکجا جمع کرکے اُن میں برادرانہ خیالات کو ترقی دینے کے علاوہ ایک بڑا مطلب اس سے یہ نکلیگا کہ پُرانے تعصبات کے

زائل کرنے اور اہل برطانیہ اور پیروانِ اسلام کی باہمی ہمدردی اور اتحاد کا رابطہ مضبوط کرنے میں یہ تجویز مدد دیگی۔

اُن مسلمان نوجوانوں کے لئے جو تحصیل علم کے لئے انگلستان میں آئے ہیں۔ یہ مسجد مجوزہ مسلم یونیورسٹی ہند کی ایک مفید معاون ہوگی۔ کیونکہ اس کی بدولت وُہ نہ صرف نیک مسلمان بنینگے۔ بلکہ وفادار اور معقول شہرداران ملک۔

کمیٹی کا یہ ارادہ ہے کہ اگر انہیں اسلامی دُنیا سے کافی مدد ملی اور خاص کر اُن لوگوں نے جنہیں خدا نے دولت دُنیا سے حصّہ وافر دیا ہے۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی تو وُہ لنڈن میں ایسی مسجد بنائینگے جو شانِ اسلام کے شایان ہو۔ اور اس سلطنت کے عظمت کے متناسب ہو جسکے مرکز میں اس کی بناڈالنے کی تجویز ہے۔ یہ بھی قصد ہے کہ مسجد کے ساتھ ایک کتب خانہ اور ایک کمرہ اخبار بینی کے لئے بنایا جائے اور ہفتہ وار لکچروں اور وعظ کا سلسلہ جاری ہو۔ تاکہ مسجد اسلامی تحریک اور اسلامی تربیت کا منبع بن جائے۔ اور اس طرح یہ مسجد مسلمان طلبہ کو اُن ترغیبوں اور تحریصوں سے بچانے کا ذریعہ ہو جو اکثر اُن کے اخلاق کو نقصان پہنچاتی ہیں اور اُن کی زندگی کی اخلاقی بنیاد کو مضبوط کردے۔

کمیٹی نے یہ اندازہ کیا ہے۔ کہ زمین اور عمارت کے لئے انہیں نہایت متوسط درجہ کے تخمینہ سے ساٹھ ستر ہزار پونڈ اور مستقل آمدنی حاصل کرنے کے لئے اور اخراجات مسجد کے بہم پہنچانے کے لئے کم از کم تیس۳۰ ہزار پونڈ درکار ہونگے۔ یعنی کل ایک لاکھ پونڈ یا پندرہ لاکھ

روپیہ چاہیے۔ مگر کمیٹی کا یہ عقیدہ ہے کہ بلحاظ اس مقصد کی عظمت اور اہمیت کے یہ رقم کچھ بڑی نہیں۔ اور یقین ہے کہ مسلمان جوش سے اس کام میں مدد دینگے۔ چونکہ مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے اوّلین فرائض میں ہے۔

اعلیٰحضرت سلطان المعظم اور اعلیٰحضرت شاہ ایران نے اپنی عنایت خسروانہ سے اس فنڈ کا مربی ہونا منظور فرماکر خود بخود عطیے بھیجنے سے اپنی ہمدردی عملاً ظاہر فرمائی ہے۔ اسلامی دنیا کے ان دو بڑے فرمانرواؤں کی ہمدردی ہمیں حوصلہ دلاتی ہے کہ تمام اکابر اسلام ہماری اپیل کے جواب میں جوش اور دریا دلی سے کام لینگے۔ مگر کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ اگر یہ مجوزہ مسجد کبھی اس شان کی بن سکتی ہے جو برٹش امپائر کے مرکز کے شایان ہے تو اسی صورت میں کہ بیشتر حصّہ اس کے مصارف کا مسلمانان ہند سے دستیاب ہو۔ کیونکہ وہی اس کے وجود سے سب سے زیادہ فوائد روحانی۔ تعلیمی اور تمدنی حاصل کرینگے۔

بنک آف انگلینڈ نے مہربانی کرکے یہ منظور کرلیا ہے کہ اس فنڈ کے لئے جو عطیات آئیں۔ انہیں جمع کرتا رہے۔ چک یا ہنڈی بنام چیف کیشیر۔ بنک آف انگلینڈ۔ لنڈن۔ ای۔ سی ہونی چاہیے۔ اور اس کے ساتھ یہ تحریر ہونا چاہیے کہ ٹرسٹیان لنڈن مسجد فنڈ کے حساب میں یہ رقم جمع کی جائے۔

ٹرسٹی صاحبان کے اسماء ذیل میں درج ہیں:-

رائٹ آنریبل - لارڈ ایمپتھل - جی - سی - ایس - آئی - جی - سی - آئی - ای

رائٹ آنریبل لارڈ راتھچائیلڈ۔ پی - سی - جی - سی - وی - او -

ہز ہائی نس آغاخاں - جی - سی - آئی - ای -

مرزا عباس علی بیگ (انڈیا کونسل)

مسٹر جی فکری بے (کونسل جنرل عثمانی)

ہز ایکسلنسی صادق السلطنتہ (سفیر ایران)

رائٹ آنریبل سید امیر علی - پی - سی - سی - آئی - ای -

آخر میں یہ بھی ہدایت ہے کہ جو صاحبان رقوم بنک میں براہ راست بھیجیں وہ اسکی اطلاع کمیٹی کے چیرمین یعنی رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کو جن کا پتہ (ریفارم کلب - پال مال - لندن) ہے - ضرور دیدیں -

ایڈیٹر

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام جو اہمیت مسلمانوں کے لئے رکھتی ہے وہ تو ظاہر ہے مگر باعتبار اپنی حیرت انگیز ترقی کے اسلام کا ایک ایسا مذہب ہے کہ اس کے ابتدائی حالات اور اسکے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارنامے اور اصحاب نبوی کے سوانح عام شائقین کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں - اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ منشی غلام قادر صاحب فصیح نے جو پنجاب کی اخباری دنیا میں مشہور آدمی ہیں - تاریخ اسلام کے دلچسپ واقعات مسلسل طور پر شائع کرنے سے ایک نہایت مفید اور قابل قدر کام شروع کیا ہے - یہ واقعات رسالوں کی صورت میں جن میں سے ہر ایک رسالہ ۴۸ صفحہ کا ہے چھپ رہے ہیں اور ہر مہینے میں دو ایسے رسالے نکلتے ہیں - اوراق کے ہندسوں کا سلسلہ ایسا رکھا گیا ہے کہ ناظرین بعد کو ان رسالوں کو مجلد کراتے وقت کتاب مرتب کر سکیں - واقعات مستند احتیاط کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کیجاتی ہے - اور زبان عام فہم اور سلیس اردو ہے - جو ضرور مقبول ہوگی - ہر باب بجائے خود مکمل اور دلکش ہے اور ایسا ہے کہ اس سے مبتدی اور منتہی دونوں محفوظ ہو سکتے ہیں - تاریخ اسلام کے متعلق ایسی عام پسند کتاب شاید اس سے پہلے اردو میں تیار نہیں ہوئی - جناب فصیح نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم ان کے مضامین کا کوئی اقتباس نمونہ کے طور پر مخزن میں شائع کریں اور انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں اقتباس درج کیا جائیگا - قیمت پیشگی سالانہ چار روپیہ ششماہی دو روپیہ اور سہ ماہی ایک روپیہ مقرر کیگئی ہے اور منشی غلام قادر صاحب فصیح اڈیٹر تاریخ اسلام - شہر سیالکوٹ سے خط و کتابت ہونی چاہیئے -

چاند کا دُوسرا رُخ

مُندرجہ ذیل عالمانہ مضمون جناب مولینا علی حیدر صاحب طباطبائی کے تبحر علمی کا نمونہ ہے۔ اس مضمون سے چاند کے دُوسرے رُخ پر جو روشنی پڑتی ہے وُہ نہایت قدر کے قابل ہے۔ مُدت سے مخزن آپ کے فیضِ قلم سے محروم تھا یقین ہے وقتاً فوقتاً آپ اپنے اوقاتِ فرصت کا کچھ حصّہ ہمیں عنایت فرماتے رہینگے :-

اس عنوان سے کسی کا مضمون رسالۂ مخزن میں شائع ہوچکا ہے مگر وُہ تشنہ رہ گیا تھا۔ چاند کے دُوسرے رُخ کے متعلق جو باتیں ہمیں معلوم ہُوئی ہیں یہ ہیں کہ اس کے دُوسرے رُخ کا نور بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور ہلال و بدر کی شکلیں اُس میں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جس زمانہ میں چاند یہاں غائب رہتا ہے وُہ زمانہ دُوسرے رُخ کے کمالِ نور کا اور بدر ہونے کا ہے اور جس زمانہ میں چاند ہم لوگوں کو بدر معلوم ہوتا ہے وُہ زمانہ دُوسرے رُخ کی انتہائی تاریکی کا اور محاق کا زمانہ ہے۔ کمال کے بعد جس دن چاند دب کر نکلتا ہے اُسی دن دُوسرے رُخ کے ہلال ہونے کا ہے۔ جتنا ٹکڑا ادھر کے رُخ کا روشن ہوتا جاتا ہے اُتنا ہی ٹکڑا دُوسرے رُخ کا تاریک ہوتا ہے اور جتنا ٹکڑا چاند کا ہمیں بے نور دکھائی دیتا ہے اُتنا ہی ٹکڑا اُدھر کے رُخ کا روشن ہوتا ہے۔ چاند کا ادھر والا رُخ جب روشن ہوتا ہے تو اہلِ زمیں اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن دُوسرے رُخ کی روشنی سے کسی سیارہ کو کچھ فائدہ نورِ شبہائے تاریک میں نہیں پہنچ سکتا۔ چاند اس قدر

چھوٹا ہے کہ زُہرہ یا مریخ کے معمورہ میں بغیر دُوربین کے دکھائی بھی نہ دیتا ہوگا جس طرح سیارات کے چاند ہم لوگوں کو دُوربین کے بغیر نہیں دکھائی دیتے۔ اور دکھائی نہ دینا دلیل ہے اِس بات کی کہ اس کے انعکاس سے ملا اثیر میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے وُہ دُوری مسافت کے سبب سے کسی سیارہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی موجیں راہ میں مٹ کر رہ جاتی ہیں۔ غرض کہ چاند کے دُوسرے رُخ کی چاندنی کسی زمین کو نہیں پاتی جس میں کھیت کرے۔ اُس چاندنی سے لُطف اُٹھانے والا عالم میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ چاند کے اِدھر والے رُخ پر زمین کے روز روشن کا انعکاس جسے زمین تاب صاحب تشریح الافلاک فرماتے ہیں ایسا قوی ہوتا ہے کہ چاندنی سے چالیس گُنی زیادہ اس میں روشنی ہوتی ہے مگر آفتاب کی روشنی سے یہ روشنی بھی اس قدر کم ہے کہ زمانہ محاق میں چاند پر زمین تاب بہت قوت سے پڑتی ہے پھر بھی چاند دکھائی نہیں دیتا۔ اس زمین تاب سے دُوسرا رُخ چاند کا ہمیشہ کے لئے محروم ہے۔ وہاں کی راتوں میں یہ چاندنی کبھی نہیں چھٹکتی۔ یورپ کے مہندسوں کی پیمائش کے بموجب چاند زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس قربت کے سبب سے اتنا بڑا معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب آفتاب کے جرم کے اس کا جرم بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن زمین چاند سے چالیس گنی بڑی ہے۔ چاند کے اس رُخ پر سے کوئی زمین کو دیکھے تو اُسے ایک ایسا عظیم الشان جرم دکھائی دیگا جو آفتاب سے چالیس گنا تقریباً بڑا معلوم ہوگا۔ یہ منظر دُوسرے رُخ پر چاند کے دکھائی نہیں دے سکتا۔ یورپ کے اہل رصد کی تحقیق یہ ہے کہ چاند پر کُرہ بخار نہیں ہے۔ اور اس سبب سے وہاں کسی ذی روح

کا ہونا ممکن نہیں اس سے دُوسرے رُخ کا بھی حال ظاہر ہے کہ وُہ بھی ویران وغیر آباد ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک رُخ پر طبقہ بخار ہو اور ایک طرف نہ ہو۔
مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ چاند کا دُوسرا رُخ ہمیشہ سے چھپا ہُوا ہے۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ تمام سیارات اور آفتاب تو علی نفسہٖ حرکت کریں اور ہمیشہ کروٹیں بدلتے رہیں اور اپنے اپنے مدار پر لنڈھکتے ہوُئے جائیں اور چاند اس وصف سے مُستثنیٰ ہو۔ مادہ کے خواص پر جن حکمائے فرنگ نے غور کیا ہے اُنہوں نے تو ہر ایک جوہر فرد میں حرکت علی نفسہٖ پائی ہے۔ پھر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ چاند میں یہ حرکت نہ ہو۔ یہ حرکت چاند میں بھی تھی اور ضرور تھی۔ زمین کی کشش نے بتدریج اس حرکت کو موقوف کر دیا۔ اِس بات کو بوجہ بصیرت سمجھنے کے لئے خیال کرو کہ چاند کی کشش زمین پر کیا اثر رکھتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں جس جس سمندر کے سمت الراس پر چاند آتا جاتا ہے وہاں کا پانی بانسوں بلند ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ دائمی ہے کہ ہر وقت چاند تو اپنی طرف زمین کو کھینچنا چاہتا ہے اور زمین اپنے رُخ پر چلنا چاہتی ہے۔ اس کی کشش میں اور اس کے زور میں تعارض ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ حکمائے وقت نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ ٹرام چل رہی ہے اور بار بار اس میں بریک لگایا جاتا ہے کہ سمندر کا جزر و مد بھی بریک کا لگنا اور کھلنا ہے۔ اس کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ زمین کی گردش دھیمی ہوتی جائے۔ یعنی رات دن کا زمانہ چوبیس ساعت سے زیادہ ہو جائے۔ گو سیکڑوں برس میں بھی زیادتی بقدر محسوس نہیں پائی گئی لیکن امتداد زمانہ کی تقسیم لاتقف عند حد کا حکم رکھتی ہے اور یہ مسئلہ حکمۃ قدیمہ کا حکمۃ جدیدہ میں بھی مسلمات سے ہے۔
محققین فن جدید کیمیا کا یہ قول قابل ذکر ہے کہ جسم جن جواہر سے مرکب

ہے اُن میں کا ایک ایک ریزہ دُوسرے ریزہ کو نہ مسافت معیّنہ سے زیادہ قریب آنے دیتا ہے نہ دُور جانے دیتا ہے۔ اس فاصلہ کے امتداد کو ان ریزوں کی جسامت کے ساتھ وُہی نسبت ہے جو نسبت کرہ وسیّاروں کی جسامت کو اُن کے درمیان کی مسافت کے ساتھ ہے۔ مثلاً جس طرح زمین کے تیس قطر بھر چاند اور زمین کے درمیان کا فاصلہ ہے اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ ہر ریزہ کے پچیس۲۵ تیس قطر بھر مثلاً دُوسرے ریزہ کی اس سے دُوری ہے۔ مبنی وُہی قدما کا مسئلہ ہے کہ ہر بُعدِ ممتد کی تقسیم لاتقف عند حد کا حکم رکھتی ہے۔ غرضکہ چاند باوجود اس کے کہ زمین سے بہت چھوٹا ہے گردش زمین کی مزاحمت کر رہا ہے۔ اسی پر حکمائے وقت نے یہ قیاس کیا ہے کہ چاند کی گردش کو زمین نے اس قوّت سے روکا کہ بتدریج وُہ گردش موقوف ہی ہو گئی اور چاند کا دُوسرا رُخ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھپ گیا۔ کسی زمانہ میں چاند میں بھی سمندر تھا اور زمین کی کشش سے اس میں ایسا شدید جزر و مد پیدا ہوتا تھا جو چاند کی گردش یومیہ کی سخت مزاحمت کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گردش موقوف ہو گئی۔ گو یہ محض قیاس ہے اور تمثیل کے سوا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ لیکن تمام حکمائے فرنگ اس قیاس کی تائید کرتے ہیں۔

یہاں چاند کے بیان میں ضمناً ان ریزوں کی جسامت اور ان کے درمیان کے فاصلہ کا ذکر بھی آگیا ہے جن سے اجسام کی ترکیب کے اکثر حکمائے عصر قائل ہیں۔ لیکن یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بے دیکھے ہوئے اُن ریزوں کی مقدار کیونکر معلوم کر لی۔ اور اُن فاصلوں کی پیمائش پر کیونکر قدرت حاصل ہوئی۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ وِلسن نے جو فنِ کیمیا کا محقق

ہے۔ ایک شیشہ میں سے ہوا خالی کر کے اس میں بھاپ بھر دی اور بھاپ کو تول بھی لیا۔ پھر اُس میں بجلی دوڑائی۔ بجلی دوڑاتے ہی بھاپ کہرہ بننے لگی اور شیشہ کے اوپر وار صاف کھلی ہوئی جگہ دکھائی دینے لگی اور جگہ رفتہ رفتہ زیادہ کھلنے لگی۔ لکیر کا سرکنا صاف معلوم ہوتا تھا۔ اس سے وِلسن نے یہ استدلال کیا کہ بھاپ کے جو ریزے کہرہ بنتے جاتے ہیں وہ اسی سرعت سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ جس سرعت سے لکیر سرکتی جاتی ہے اور فن طبعیات میں یہ مقرر ہو چکا ہے کہ جس کی جسامت معلوم ہو اس کی سرعت کا استخراج ہو سکتا ہے اور جس کی سرعت معلوم ہو جائے اس کی جسامت بھی اس ضابطہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ غرض کہ اس طریقہ سے کہرہ کے ہر ریزہ کا حجم اور وزن اور شمار بھی سب کا معلوم ہو گیا۔ اور شیشہ کے اندر جتنی جگہ ہے وہ تو معلوم ہی ہے جتنے اجزا ہیں اُن کا حجم بھی حساب سے معلوم ہو گیا اس سے فاصلہ کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ دو ریزوں کے درمیان اس قدر دُوری ہو گی ÷

علی حیدر طباطبائی

تمدّن } اردو علم ادب کے رسالوں میں رسالہ **تمدّن** کے اجرا سے ایک اور دلچسپ اضافہ ہوا ہے۔ یہ رسالہ دہلی سے نکلا ہے اور اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالراشد الخیری دہلوی ہیں۔ جنکی تحریر اور طرز تحریر سے ناظرین مخزن مدت سے آشنا ہیں۔ آج کل رسالہ عصمت کی ایڈیٹری بھی مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ جسے وہ نہایت عمدگی سے نباہ رہے ہیں۔ اس طرح امید ہے کہ باغ ادب اردو کا یہ نیا پودا اُنکے ہاتھوں میں خاطر خواہ ترقی کریگا اور سرسبز ہوگا۔ مولوی صاحب نے تمدن کے پہلے نمبر میں اصلاح تمدن اپنا خاص مقصد قرار دیا ہے اور یہ بہت ضروری اور اہم مقصد ہے اگر وہ اس رسالہ کے ذریعہ سے اسے پورا کر سکیں۔

روزنامچہ نواب سربلند جنگ بہادر

ہم نواب سربلند جنگ بہادر حاجی مولوی محمد حمید اللہ خان صاحب چیف جسٹس حیدرآباد دکن کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے اپنی ڈائری کا جو وُہ اپنے زمانہ تعلیم انگلستان میں لکھتے رہے تھے ۔ اُردو ترجمہ ہمیں عنایت کیا ہے اور اس کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ روزنامچہ کئی اعتبار سے دلچسپ ہے۔ اول تو اس سے معلوم ہوگا کہ آج سے پچیس برس پیشتر ہندوستانی طلبہ انگلستان میں کس طرح رہتے تھے اور اب کس امر میں تفاوت ہے اور کس چیز میں وُہی حالات قائم ہیں۔ دوم اس سے سرسید احمد خاں مرحوم اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کے اس وقت کے حالات و تعلقات کی کیفیت جا بجا ظاہر ہوگی۔ جس سے ہر مسلمان کو گہری دلچسپی ہے۔ آج روزنامچہ کا ایک حصہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ دیگر حصص انشاءاللہ بعد میں وقتاً فوقتاً ہدیہ ناظرین ہونگے :۔

یکم جنوری ۱۸۸۴ء | اس سال بھی میں انگلستان میں موجود ہوں۔ اور میری صحت سال گذشتہ سے بہت بہتر ہے ۔

کیمبرج میں تعطیلات ہیں۔ اس لئے میں برائٹن میں مقیم ہوں۔ علی الصباح میں پبلک لائبریری میں گیا۔ جو پویلین کے قریب واقع ہے اور وہاں جاکر ایک تاریخ کی کتاب میں غدر کا حال پڑھا۔ کیونکہ میں کالون صاحب کی نسبت کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جو اُس وقت آگرہ کے گورنر تھے۔ آج سخت برف باری ہوئی۔ شام کو پک صاحب کے خاندان کے لوگوں سے ملنے گیا۔ یہ ڈائری

خریدی اور چند خطوط لکھ کر سو گیا۔

۲۔ جنوری | آج پھر لائبریری گیا۔ اور ڈی آر بلے کی یادداشت کا کچھ حصہ پڑھا اور اس سے بہت حظ اُٹھایا۔ جانسن کی گفتگو میں مجھ کو بہت مزا آیا۔ مَیں اس کتاب کو اور پڑھونگا۔ اور اگر ممکن ہوا تو ایولین کا بھی مطالعہ کرونگا کیونکہ جس کتاب میں جانسن اور برک کو مزا آیا۔ وہ ضرور اول درجہ کی ہوگی۔ کل سے مَیں کام کرونگا اور تعلیم پر ایک مضمون لکھونگا۔ کیونکہ مَیں نے اخبار ہندوستان میں اس مضمون کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ امید ہے کہ میں اس مضمون کو دلچسپ کر دوں۔ کاش ہربرٹ سپنسر کی کتاب یا اس مضمون کا کوئی حصہ جسکو میں نے پیشتر شروع کیا تھا میرے پاس ہوتا! آج کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ اس لئے میں کئی دفعہ ہواخوری کو نکلا۔ میں نے ڈبلیو ای منی سے دریافت کیا ہے کہ وہ اور مسز ایم کل مکان پر ملینگے یا نہیں۔ اور مجھ کو ملاقات کی اجازت دینگے۔

۳۔ جنوری | آج ہندوستان کی ڈاک ملی۔ مکان پر سب بخیریت ہیں نیشنل انڈین اسوسیشن کے جلسہ کا کارڈ جو ۱۰۔ ماہ حال کو ہونے والا ہے وصول ہوا امید ہے کہ مَیں شامل ہو سکونگا۔

آج تقریباً گیارہ بجے مسٹر ڈبلیو۔ ای۔ منی میرے پاس آئے اور ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسز منی علیل ہیں۔ اس لئے آج شام کو مَیں اُن کے ہاں نہیں جاؤنگا۔ آج صُبح کو مَیں مضمون متذکرہ بالا لکھتا رہا۔ اور بعد ازاں لائبریری جا کر کل والی کتاب پڑھی۔ کل سے زیادہ وہ کچھ دلچسپ ثابت ہوئی۔ یہ ڈائری بڑی طویل ہے اور میں جس طرح ہوگا اس کو جلد ختم کرنے کی کوشش کرونگا۔ اب میں موسم کے حالات صرف

کبھی کبھی لکھا کرونگا۔

۴۔جنوری | والد اور سید صاحب کو خط لکھے۔ لائبریری جاکر ڈایری کا کچھ حصہ پڑھا۔ خاندان بک سے ملاقات کی۔ وہاں معلوم ہوا کہ تھیوڈور بک (پرنسپل علیگڈھ کالج) کچھ علیل ہیں۔ اس لئے سید احمد خاں انکو اپنے مکان پر لے آئے ہیں اس خبر کے آخری حصہ کو سنکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

۵۔جنوری | مضمون "تعلیم" کو صاف کیا اور اس کا نام "تعلیم پر خیالات پریشان" رکھا۔ میں نے صرف تمہید ختم کی ہے۔ اس مضمون کے پانچ باب ہونگے۔ اور ہر باب تمہید کے برابر یعنی چار فلسکیپ صفحوں کا ہوگا۔ آج ایسا خراب موسم تھا کہ تھوڑی دور تک چہل قدمی کر سکا۔ کانراڈ بک آج شام کو میرے پاس آئے

۷۔جنوری | آج صبح کو پھر لائبریری گیا۔ اور دوسری جلد ختم کرکے تیسری کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس ڈائری کو پڑھنے سے میرا اصلی مقصد یہ ہے کہ جانسن اور تھریلز کی بابت کل حالات دریافت کروں۔ پیازی جس کی شادی آخر کار مسٹر تھریل سے ہوئی۔ جانسن مس برنی وغیرہ اور دیگر دوستوں میں جھگڑا ڈالنے کی بانی مبانی تھی۔ اور آخرکار اس عورت سے تھریل نے شادی کی

۸۔جنوری | آج بڑا خراب دن ہے۔ میں پانچ بجے کی گاڑی سے لندن روانہ ہوا۔ اور برائٹن اور اس کے موسم کو پیچھے چھوڑا۔ ساڑھے چھ بجے وکٹوریہ اسٹیشن پر پہنچا۔ اور ۲۳ نمبر کے مکان واقع بڈفورڈ پلیس میں جہاں تیاگوراجہ نے میرے لئے کمرہ لے رکھا تھا مقیم ہوا۔ میں لندن کے اس حصہ سے سخت متنفر ہوں۔ لیکن چونکہ ان کے کھانے میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اس لئے میں بمجبوری تکالیف برداشت کرکے یہاں رہتا ہوں۔ میں تھکا ہوا تھا اس لئے باہر نہ نکلا۔ صرف ایک ہوٹل میں جو قریب ہی واقع

تھا - کھانا کھانے گیا -

۹ - جنوری | سہ پہر کو میں کلیسا میں گیا - اور وہاں چند دوستوں سے ملاقات کی - سینیسن کی چھٹی میز پر پڑی ہوئی ملی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ شہر سے باہر جانیوالا ہے - کلب میں لنچ اور ایک نئے کھلے ہوئے رسٹورانٹ موسومہ لیٹیس واقع سٹرینڈ میں کھانا کھایا -

۱۲ - جنوری | کیپٹن ایسٹ وک کے ہمراہ لنچ کھایا - اس کے مکان پر اس کے بہت سے دوست اور بھانجیاں بھتیجیاں تھیں وہ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آیا - اور کہا کہ جب کبھی شہر میں آؤ تو میرے ہاں ضرور آنا - اسکا مکان بہت وسیع اور خوب سجا ہوا ہے - وہ لبرل خیالات کا آدمی ہے اور البرٹ بل سے متفق نہیں ہے - لنکنز ان میں میں نے کھانا کھایا -

۱۳ - جنوری | میں مڈل مورز سے ملنے گیا - اور بعد ازاں کینیز سے ملاقات کرنے کے لئے بذریعہ ریل ایلنگ پہنچا - اور انکے ساتھ کھانا کھانے کے لئے ٹھہر رہا -

۱۴ - جنوری | انر ٹمپل میں آج پولک کا قانون ٹارٹ پر لکچر تھا اسے سننے گیا - مجھے اُن کے لکچر بہت پسند ہیں - مکان پر واپس آکر کپڑے بدلے اور خاندان بیک سے ملنے گیا - آج کی پارٹی میں کیمبرج کے بہت سے اشخاص تھے - اور ان میں دونوں مس مارسین بھی تھیں - یہ شام بہت لُطف سے کٹی - وہ سب سر ہوئے کہ رات کو یہیں رہو - مگر میں نے عُذر کیا اور ۱۲ بجے کے قریب واپس آیا -

۱۵ - جنوری | ناشتہ کے بعد میں اور تہا گو راجہ کلیسا گئے اور چار بجے تک وہیں رہے - بعد ازاں کنوور بہادر جی ساکن مروی سے ملنے گئے جو

کورٹ ہوٹل کی انز میں مقیم ہیں۔ انکے ساتھ چار۔ پی اور پھر سب مل کر لنکن ان گئے۔ سات بجے کھانا ختم ہوا۔ اور ہم سب اپنے اپنے گھروں پر واپس آئے۔ انڈین اسوسی ایشن کے جلسہ کا بلاوا تھا۔ مگر مجھے سخت زکام تھا۔ اس لئے اپنے مکان ہی پر رہا۔ اور کتاب ریئل پروپرٹی مولفہ ولیم کو پڑھتا رہا۔

۱۶۔جنوری ۳۔ بجے اسٹیشن کنگز کروس پر پہنچا۔ مگر کیمبرج کی گاڑی اسی وقت روانہ ہو چکی تھی۔ اس لئے راستہ میں کچھ خریدتا ہوا کلیسیا آیا۔ پانچ بجے پھر اسٹیشن گیا۔ اور ساڑھے چھ پر کیمبرج پہنچ گیا۔ اتفاقاً او گلوی سے کالج کے دروازہ پر ملاقات ہوگئی۔ اور بوس کو اس کے کمرہ میں دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔ کیونکہ وہ گلاسگو کی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے لئے چلا گیا تھا۔ میں نے اپنا سامان کھولا اور سونے سے پہلے ریئل پروپرٹی کا ایک باب ختم کیا۔

۱۷۔جنوری تمام دن اپنے کمرہ ہی میں رہا۔ اور کچھ دیر یونین میں صرف کیا کتابوں کو قاعدہ سے جمایا۔ اور دوسرے اسباب کو ترتیب سے رکھا۔ کچھ کھانے پینے کا سامان منگوایا۔ معلوم ہوا کہ میری آرام کرسی کا ایک پایہ ٹوٹ گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اسے کس نے اور کیونکر توڑا۔ محافظ سے دریافت کرنا فضول ہے۔ بل سٹر وڈ سے اسے درست کرنے کو کہا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم تعلیم کے لئے گئے۔ ابھی بہت کم لوگ واپس آئے ہیں۔

۱۸۔جنوری ہندوستان خط لکھے اور اخبار پڑھے۔ ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ بنی اللہ نے مجھے مسٹر ولفرڈ بلنٹ کی ایک چٹھی دی۔ اس نے اسکو غلطی سے کھول لیا تھا۔ یہ چٹھی مسٹر بی نے میرے والد سے کلکتہ میں مل کر لکھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ میں ہندوستان آ کر خوش ہوا۔ اور

میرا شکریہ ادا کیا تھا کہ میں نے اس کی ملاقات اپنے والد سے کرادی۔ ہفتہ آئندہ میں والد اس کی نسبت ضرور تحریر کرینگے۔ میں ریٹل پرو پرٹی بڑے غور و خوض سے پڑھ رہا ہوں لیکن ابھی تک اسکو بخوبی نہیں سمجھا۔ ہم محنت کرنی چاہیئے۔

۱۹۔ جنوری | آج میں نے خاصہ کام کیا اور پھر ٹہلتا ہوا یونین پہنچا۔ جب میں چار بجے واپس آیا تو دیکھا کہ میرا محافظ آرام سے میری کرسی پر آتش دان کے سامنے دراز ہے۔ اور خراٹے لے رہا ہے۔ میں چپکے سے واپس چلا گیا۔ گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اب مجھے اپنی کرسی کے ٹوٹنے کا سبب معلوم ہوا۔ ان نوکروں کا تم کیا کر سکتے ہو جو کسی طرح نہیں دبتے اگر انہیں برا بھلا کہو تو شرارتوں سے تمہارا ناک میں دم کردیں۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ ان کی باتوں سے اغماض کرو۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے جاکر دیکھا تو تمام چیزیں باترتیب لگی ہوئی تھیں۔ میں پڑھنے میں مشغول ہوگیا اور تعلیم کے بعد بلیرڈ کھیلا۔

۲۰۔ جنوری | کام کیا اور تھوڑی دور چہل قدمی کی۔ واریکر سے ملنے گیا۔ لیکن وہ کیمبرج میں واپس نہ آئے تھے۔ اس لئے انکے مکان پر اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ تعلیم کے بعد شیرن کے ہمراہ کافی پی۔

۲۱۔ جنوری | تقریباً تمام دن پڑھتا رہا۔ والنٹیروں کی وردی تیار کرانے کو دی۔ امید ہے کہ یہ وردی بہت جلد تیار ہو جائیگی۔ ابھی تک میری کھانسی اچھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے کاڈ لیور آئل (مچھلی کا تیل) پینا شروع کردیا ہے۔

اس وقت تک دن میں ایک دفعہ تعلیم ہوتی ہے۔ بہت سے

طلبا آج واپس آگئے ہیں اور باقی عنقریب آجائینگے۔

۲۲ - جنوری | گولیاں اور مشک جو والد نے میرے لئے بھیجا آج وصول ہوا چندروز کے بعد سے میں گولیاں حسب ہدایت کھانی شروع کرونگا۔ چونکہ میں اس ٹرم کے لئے مجلس کا سکرٹری مقرر ہوا ہوں۔ اس لئے میں نے گوور کو چٹھی لکھی اور اس نے دریافت کیا کہ آیا وہ آئندہ اتوار کو مجلس کا جلسہ اپنے کمرہ میں کرینگے۔ جواب وصول ہونے کے بعد ممبروں کے نام خط روانہ کرونگا۔ آج سنگھ سے ملکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ چند روز کے لئے یہاں آگئے ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ کل میرے ساتھ ناشتہ کرنا۔

۲۳ - جنوری | سنگھ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ مجھ کو خیال تھا کہ پروفیسر سیلی لکچر دینگے۔ مگر لٹریری اسکول جاکر معلوم ہوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ وہ شاید آئندہ مُد سے لکچر شروع کریں۔ داس کے پاس گیا اور اس سے ذکر کیا کہ مجلس کا جلسہ یکشنبہ آئندہ کو ساڑھے سات بجے شروع ہوگا۔

آج گھر سے خط آئے۔ میرے والد نے لکھا ہے کہ وہ مسٹر ولفرڈ بلنٹ اور لیڈی این سے ملے۔ اور یہ لوگ علیگڈھ میں اُنکے ہاں مقیم ہیں۔ عم بزرگوار سید احمد خانصاحب نے لکھا ہے کہ وہ کالج کے لئے چندہ وصول کرنے پنجاب جانیوالے ہیں۔ میرے خیال میں آجکل وہ کہیں لکچر دے رہے ہونگے وہ کیسے جوش سے لکچر دیتے ہیں۔ اس کہنے کا ان پر بالکل اثر نہیں ہوتا کہ آپ اپنی صحت کی خبر لیجئے۔ کالج کی خاطر وہ تمام تکالیف کو بطیب خاطر برداشت کرتے ہیں۔ خدا اُن کی عمر میں برکت دے۔ اور خدا کرے کہ میں واپس جاکر انہیں قوی و توانا پاؤں۔ آمین۔

۲۴ - جنوری | نو سے دس تک پروفیسر کیمنی کے لکچر دربارہ کنٹریکٹ میں اور

۱۲ سے ایک تک سجوک کے لکچر دربارہ پولیٹکل فیلوسفی میں شریک رہا - کینی کے لکچر میں لوگوں کا ہجوم تھا - مجھے اس کا لکچر بہت پسند آیا - سجوک کے ہاں بہت لوگ نہ تھے - لیکن اس کا مضمون یعنی فلسفہ اخلاق کا خیال کیا جائے تو آدمیوں کی تعداد خاصی تھی - پہلے ٹرم کی نسبت اس مرتبہ عورتیں کم ہیں کھانے کے بعد ٹہلنے نکلا - انڈین اسوسیئشن جرنل کے اڈیٹر کے پاس اپنا چندہ مبلغ دس شلنگ روانہ کیا - قانون کنٹریکٹ مولفہ اینسن خریدنا چاہتا تھا - لیکن کہیں نہ ملا - اگرچہ کئی کتب فروشوں کے ہاں تلاش کیا -

۲۵ - جنوری | کننگھم کے لکچر میں گیا - ایم - اے - اور کالج کو کین صاحب کی کتاب روانہ کی - ٹیپ کے ہمراہ کافی پی - اور مختلف مضامین پر باتیں کرتا رہا -

۲۶ - جنوری | حسب معمول کینی اور سجوک کے لکچروں میں شامل ہوا - آج شام کو سات بجے ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے عہدہ داروں کا انتخاب تھا - سکرٹری کی رپورٹ بہت عمدہ تھی - نتیجہ یہ ہوا کہ تن جو گذشتہ ٹرم میں وائس پریسیڈنٹ تھا - پریسیڈنٹ مقرر نہ ہوا - بلکہ وائس سکرٹری کے عہدہ سے بڑھ کر صدر نشین ہوگیا - تن اپنے عہدہ پر رہتا مگر اس نے انکار کیا اور اس لئے سٹن وائس پریسیڈنٹ ہوگیا - ولیم اور محمد حمید اللہ کے نام عہدہ سکرٹری کے لئے پیش ہوئے - آخرالذکر کو اگرچہ معلوم تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا - لیکن اس نے انکار نہ کیا - کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عہدہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے -

اس کے ۱۴ ووٹ اور ولیم کے ۲۰ ووٹ ہوئے - ٹینزلی راؤنڈ اور میں ممبر مقرر ہوئے - ساڑھے نو بجے میں سسن پر وِتھرو کے ہاں گیا - وہاں

براؤننگ اور چند لوگوں سے ملاقات ہوئی ۔ یہاں ان میں چند لیڈیاں بھی تھیں ان میں سے مس میتھو سے وہاں پہلے بھی مل چکا تھا ۔ او ۔ بی نے کہا کہ ہر اتوار کو مجھ سے ملنے آیا کرو ۔ کیونکہ اس روز میں کالج ہی میں رہتا ہوں اور سب سے ملتا ہوں ۔ گیارہ بجے کے بعد میں واپس آیا ۔ اوامی سے ملا اور اسی کے مکان پر شیپلے اور کارل کے فرزند سے ملاقات ہوئی ۔ بارہ بجے سو رہا ۔

۲۷ ۔ جنوری | پیمبروک کالج کے طالبعلم نکلس کے ہمراہ چہل قدمی کی ۔ شام کو لیڈی ولسن سے ملنے گیا ۔ یہاں چند گرٹونینز سے ملاقات ہوئی ۔ ان میں سے دو سے میں پہلے بھی مل چکا تھا ۔ تعلیم کے بعد گوور کے کمرہ واقع ڈاؤننگ میں اجلاس مجلس میں گیا ۔ میں نے عبدالواحد اور رام داس کا تعارف کرایا ۔

۲۸ ۔ جنوری | کننگھم کے لکچر میں شامل ہوا ۔ آج شام کو چند احباب کو کافی کی دعوت دی ۔ مختلف مضامین پر باتیں ہوتی رہیں ۔ ٹرنٹی کالج کے ایک طالب علم نے ذکر کیا کہ ہندوستان کے کسی شاہزادہ نے ٹرنٹی کالج کے داخلہ کا امتحان پاس کرلیا ہے ۔ اور آیندہ اکتوبر میں یہاں آکر رہیگا ۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شاہزادہ راجہ دلیپ سنگھ کا فرزند ہے میرے خیال میں وہ اب ایٹن میں ہے ۔

۲۹ ۔ جنوری | کینی کے لکچر میں گیا اور پھر سجوک کی کلاس میں شریک ہوا ۔ شیئرز کے ہمراہ چہل قدمی کی ۔ آج شب کو یونین میں اسپیچ دینی چاہتا ہوں ۔ اس لئے پیشتر سے نوٹ لکھنے بیٹھ گیا ۔ لیکن لکھنے میں مزاحمت ہوئی ۔ ختم نہ کرسکا ۔ اور اس لئے اس ٹرم میں بھی اپنی پہلی اسپیچ نہ دے سکا ۔

۳۰ - جنوری | اسلی کے لیکچر میں شریک ہوا - تعلیم کے بعد شیلے - انگلینڈ - بارکر - ولیم اور پاول سے ملاقات کی - کتب فروش نے کنٹریکٹ مولفہ این سن کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا ہے اور میں کل سے بڑے غور کے ساتھ اسے پڑھونگا -

آج صبح میں نے انشینیٹ لا مولفہ مین کا کچھ حصہ پڑھا - بڑی عمدہ کتاب ہے -
میں نے عرضی درباره ترقی ہال پر بوس کے دستخط لئے - اس معاملہ میں ہم بہت زور سے شورش کر رہے ہیں - امید ہے کہ اس مرتبہ عرضی پر بہت دستخط ہو جائینگے - اگر تمام طلبا مقامی کے دستخط ہو گئے تو ضرور کامیابی ہوگی -

۳۱ - جنوری | سجوک کے لکچر میں شریک ہوا - چونکہ زمین نرم تھی اس لئے واس کے ساتھ بلیرڈ کھیلا - چند احبا کو کافی کی دعوت دی - کنور سرجی نے آکر مجھ سے کہا کہ بک کی چٹھی آئی ہے اور انہوں نے تمہیں سلام لکھا ہے - لوگوں کے جانے کے بعد میں نے چاہا کہ کچھ کام کروں - لیکن نیند آگئی اور میں کرسی پر پڑا ہوا سو گیا - اور جاگا تو اس وقت جب بہت رات آگئی تھی ٭

تحفۃ النساء

امرت سر کی لیڈی ڈاکٹر ح - س حسن صاحبہ نے ایک کتاب دو اڑہائی سو صفحہ کی بہ نام تحفۃ النسا شائع کی ہے - جس میں زنانہ امراض انکے علامات اور معالجے - بچوں کی پیدائش اور نگہداشت کے متعلق طبی ہدایات اور حفظان صحت کے طریقے درج کئے ہیں - یہ کتاب ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے اور امید ہے کہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی - اور مفید ثابت ہوگی -

بھاشا میں جواہرات

بھاشا کی قدر و قیمت سے جس قدر مسلمان غافل ہیں۔ اُن سے بڑھ کر ہنود غافل ہیں۔ حالانکہ وُہ اس کو بھارت ماتا کی زبان بتاتے ہیں۔ اب ان کی ماتا بھاشا نہیں ہی۔ بلکہ وُہ اُردو ماتا کی گود میں آ گئے۔ سوتیلی ماتا بھی آخر ماتا ہی ہوتی ہے۔

بھاشا نہایت پیاری بولی ہے۔ کیونکہ اس کی ماتا سنسکرت ہی۔ جو قدیم مستقل زبان ہی اور نہ صرف بھاشا کی بلکہ کئی زبانوں کی ماخذ ہے اور دُنیا کی نہایت پُرانی زبانوں میں ہے۔ بھاشا میں بڑے بڑے نیچرل اور سوشیل شعرا گذرے ہیں مگر ان کا کلام گمنامی کے ویرانے میں مدفون ہو گیا تھا۔ اب اس زمانہ کے جوہریوں نے خاک بیزی کر کے انکی تالیف و تصنیف کے بے بہا جواہر نکالے اور آویزۂ گوشِ ناظرین بنائے۔ مہاراج تلسی داس مؤلفہ کتاب رامائن بھاشا کے ممتاز شعرا میں سے ہیں۔ انکا کلام ایسا ہی چُست اور مضبوط و مربوط ہے جیسا فارسی میں مولانا نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کا اور عربی میں متنبی کا۔ قلّ و دلّ اور بالکل ٹھوس اور گٹھا ہوا کلام۔ درز اور حشو نام کو نہیں۔ روی ایسی سچی کہ سُبحان اللہ۔ افسوس ہی کہ ہمارے اُردو شعرا کو بھاشا کی شاعری کا مذاق نہیں۔ اکثر شعراء تو خیر سے خود شاعری کی ماہیت ہی نہیں سمجھتے۔ اُردو شاعری کی حالت عام طور پر ابتک طفلانہ ہے اب ذرا کایا پلٹ چلی ہی۔ اور سوشیل شعرا گہوارے میں ہوں ہاں کرنے لگے

ہیں مگر ہونہار لہذا جلد بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی اُمید ہے۔

ہم ذیل میں تلسی داس جی کی کتاب رامائن میں سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی (ٹیکا) شرح بھی۔ کیونکہ سلمان تو رامائن سے اشعار کی فصاحت و بلاغت و نزاکت کیا سمجھینگے۔ ہزاروں پنڈت نہیں سمجھتے جن کی نسبت بیاس جی فرماتے ہیں کہ مورکھ (جاہل) برہمن سے بیل اچھا جو کھیتی وغیرہ کے کام میں آتا ہے۔

مہاراج رامچندر جی بن میں براج رہے ہیں۔ بہار آ رہی ہے گھٹا چھائی ہے برسات کا موسم ہے تلسی داس جی اس سمے کا سین دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

منگل روپ بھئے بن تب تیں کینہ نواس رہانت جب تیں

شرح جب سے رامچندر جی نے باس لیا (قیام کیا) بن منگل روپ بنگیا۔ رونق آگئی پھول پھلواری پر جوبن آگیا۔

برکھا کال میگھ نبھ چھائی گرجت لاگت پرم سہائی

شرح برسات کے دن آگئے۔ بادل آسمان پر گرجتے ہوئے بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔

(دوہا) لچھمن دیکھو مورگن ناچت بارد پیکھ
گرہی برت رت پر کھو جن بشن بھگت کنھ دیکھ

شرح اے لچھمن (رامچندر جی دے بھائی) دیکھو تو بادلوں میں پانی کی لہر دیکھ کر موروں کے جھنڈ ناچ رہے ہیں جیسے کوئی خدا پرست گرہستی (بال بچوں والا) بھگتوں (عارفوں) کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

گھن گھمنڈ نبھ گرجت گھورا پریا ہن ڈرپت من مورا

شرح بادل اُمڈ اُمڈ کر آسمان میں گھور گرج رہے ہیں۔ میرا دل اپنی محبوبہ (جانکی جی) کے بغیر ڈر رہا ہے۔ جانکی جی کو راون ہر لے گیا تھا۔ انہیں کی تلاش میں آپ جنگلوں اور بنوں میں پھرتے ہیں۔

دامنی دمک رہی گھن ماہیں کھل کی پریت یتھا تھر ناہیں

شرح بجلی بادلوں میں چمک چمک کر رہ جاتی ہے جیسے بیوقوف بدذات کی محبت قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔

برکھیں جلد بھوم نیرائی تھا نوہیں بدھ ودیا پائی

شرح بادل زمین کے قریب آ آکر اس طرح رہتے ہیں۔ جیسے علم پڑھ کر سچے علما نیو جاتے ہیں یعنی منکسر اور فروتن بن جاتے ہیں (جس طرح بادل پانی سے بھرپور رہتے ہیں۔ اسی طرح علما علم سے معمور رہتے ہیں۔ کتنی بلیغ اور عمدہ تنظیر ہے)

بُند اگھات سہیں گر کیسے کھل کے بچن سنت سہیں جیسے

شرح پہاڑ مینہ کی بوندوں کی چوٹ اس طرح سہ رہے ہیں۔ جیسے اچھے لوگ جاہلوں کی سخت کلامی سہتے ہیں۔ یعنی جس طرح اچھے صابر شاکر لوگوں کو جاہلوں کی گالی گلوچ سے اذیت نہیں ہوتی پہاڑوں کو بھی بوندوں کی چوٹوں سے اذیت نہیں پہنچتی (کیا اخلاقی تشبیہ ہے)

چھدر ندی بھر چلی اُتر آئی جس تھوڑے دھن کھل بورائی

شرح چھوٹی چھوٹی ندیاں پانی سے بھر بھر کر آپے سے باہر ہو ہو کر چل رہی ہیں۔ جیسے کوئی اوچھا کمظرف آدمی تھوڑا سا روپیہ پا کر باولا ہو جاتا ہے یعنی اُچھلنے کودنے لگتا ہے۔ بلاغت یہ ہے کہ ندی کا پانی

اس کا اپنا نہیں۔ برسات میں اِدھر اُدھر سے آگیا ہے۔

بھوم پرت بھا ڈابر پانی — جم جیو ہی مایا لپٹانی

شرح۔ زمین پر مینہ کا صاف اور پاک پانی گِر کر یوں گندلا اور ناپاک ہو رہا ہے جیسے رُوح دُنیا کی آلائشوں میں لپٹ کر مکدّر ہو جاتی ہی۔ سبحان اللہ کوئی شعر اخلاقی نتیجے سے خالی نہیں۔

سرتا سرجل ندہ نیں جبائی — ہوے اچل جم زہری پائی

شرح۔ ندیوں نالیوں کا پانی سمُندر میں جا کر یوں گم ہو رہا ہے جیسے عارف لوگ خدا کو پا کر خدا ہی میں گم ہو جاتے ہیں اُہو ہو ہو۔ شوکت

اے خضر راہِ دوست میں کھویا گیا ہوں میں — اپنے کو ڈھونڈھتا ہوں بتا دے سراغ مجھے

سمٹ سمٹ جل بھرہیں تلاوا — جم سدگن سجّن پہنہ آوا

شرح۔ پانی سمٹ سمٹ کر تالابوں میں اس طرح آ رہا ہے جیسے نیک آدمیوں کے پاس اچھّی خصلتیں خود چلی آتی ہیں۔ واہ

تُلسی داس جی کے کلام میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ برسات کا نیچرل سماں بھی لاجواب۔ پھر ہر شعر میں اخلاقی چھینٹا۔ جدھر سے چکھو میٹھا۔ کیسا مبالغہ۔ اور ایک لفظ خلافِ واقعہ نہیں۔ شاعری اِسے کہتے ہیں ہمارے اُردو شعراء غور کریں اور سبق لیں۔

(مجدّدِ السنۂ مشرقیہ) احمد حسن شوکت۔

(میرٹھ)

تاریخ اسلام کا ایک سین

ہمارا ناول[a] اُس پُرآشوب زمانہ سے شروع ہوتا ہے، جب سے اسلامی تاریخ کا نہایت گاڑھا سواد جمع ہونا شروع ہوا ہے۔

زمانہ کا وُہ دور جسے خیرالقرون کا باوقعت لقب خیرالناس (جناب رسُول اللہ صلعم) کی زبانِ پاک سے عطا ہوا تھا، ختم ہو رہا ہے، اور وہ تاروں بھری رات بھی آخر ہونے کو آئی۔ جس کے سیّاروں نے آفتاب رسالت سے چمک دمک پائی تھی، پچھلی رات کا تارا یعنی عبداللہ ابن زبیر بھی اپنی آخری چمک دکھا کر خاموش ہوا چاہتا ہے، اسلام کا سچا حامی، جان نثار، اور شریعت اسلام کا صحیح متبع اسوقت بجز اس کی جماعت کے اور کوئی اس ارضِ مقدس میں نظر نہیں آتا، مگر وُہ اُن مدعیان خلافت کے مقابلہ میں ایک ذرّہ بیمقدار ہے، جن کی بیداد نے حرم نبی، اور جگر گوشۂ رسُول پر وُہ ناروا مظالم روا رکھے، جس کا امتحان دشتِ کربلا میں غربت نینوا یا ایک خستہ حالی سید اور اس کے پیاروں اور لاڈلوں کی قیمتی اور انمول جانوں پر ابھی ابھی ہو چکا ہے، جس واقعہ نے ظلم وستم کی ڈھاک بٹھا دی ہے۔

بانیانِ ستم کو یہ فتنہ محشر بپا کرکے بھی اپنے کئے پر پچھتاوا نہ تھا، بلکہ روز وہ جور وجفا کا ایک نیا شگوفہ کھلانے کے درپے رہا کرتے تھے۔ کہ فلک ان کے درپے ہُوا۔ یزید کو داعئ اجل نے مسندِ امارت سے

[a] دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس ناول کا ایک حصّہ مخزن میں طبع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد آور ترجمہ کرنیکا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اب تیار شدہ مسودہ انشاءاللہ تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد پہنچتا رہے گا۔ (مترجم)

تاریک گوشۂ لحد میں پہنچایا۔ جس کے بعد اُس کا بیٹا معاویہ اورنگ نشیں ہوا، مگر اس کے حصّہ میں یہ منصب چند ہی روز کے لئے آیا تھا۔ لہٰذا چند روز حکومت وسلطنت کا مزہ لیکر یزید کے پاس وُہ بھی جا پہنچا۔ اس کے بعد امارت کو ایک گرگِ کہن (مروان ابن الحکم) نے جو شام میں اس پر دانت ہی جمائے بیٹھا تھا، اور گھور گھور کے اِدھر دیکھ رہا تھا، جا دبوچا، اور اپنا ہاتھ بیعت طلبی کے لئے دراز کیا، اس پیر پُرتزویر کو اپنی اس آرزو میں بزور شیخوخیت وسفارش شان تقدس کامیابی ہُوئی۔ بیعت ہو جانے کے بعد اُسے یہ ڈر ہوا، کہ مبادا خالد ابن یزید مدعی خلافت بنکر مخالفت کے لئے نہ اُٹھ کھڑا ہو، بطور پیش بندی اس نے اُم خالد سے نکاح کر لیا، اور اس چال سے اس نے خود خالد اور اس کے تائیدی گروہ کو رام کیا، مگر اس اہتمام پر بھی اُسے ۹ ماہ سے زیادہ سلطنت راس نہ آئی۔ کیونکہ اس کا بیٹا عبدالملک شام میں بالاتفاق امیر مان لیا گیا، اور اس کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی۔

عبدالملک ابن مروان کا زمانہ حکومت خاصہ رہا، اور ایک حد تک حکومت بنی اُمیّہ کی بنیادوں کا استحکام اسی کے عہد سے شروع ہوا، یہ سب واقعات ۶۵ھ کے آخر تک کے ہیں اس کے بعد کوفہ والوں میں ایک نئی قسم کا جوش پیدا ہوا، یعنی وُہ لوگ جنہوں نے جناب سید الشہدا سے عہدشکنی کی تھی، اُنہوں نے اپنی غداری سے نادم ہوکر ابن زیاد اور اس کے گروہ سے شہدائے کربلا کے خونِ ناحق کے قصاص کا مطالبہ کیا، رفتہ رفتہ اس خیال کا ایک گروہ جمع ہو گیا، جس نے مختار ابن عبید نامی ایک شخص کو اپنا سردار بنایا، اور توابین کے لقب سے اپنے کو نامزد کیا، یہ گروہ مجاہدین علاوہ قصاص طلبی کے عبداللہ ابن زبیر کے لئے

تبلیغ بیعت بھی کرتا تھا، جن دونوں باتوں کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا تھا، کہ اُموییں سے اور اِن سے رن پڑتا، آخرکار ان سے اور اُمویین سے معرکہ آرائی کی نوبت آئی۔ دونوں طرف سے خوب تلوار چلی، توابین جنہیں قصاص میں مارنا چاہتے تھے وُہ اس معرکہ میں قصاص لینے والی تلوار کے گھاٹ چڑھے۔

جب اِس جنگ و جدل کا خاتمہ ہُوا، تو اصُول سے چونکہ میدان توابین کے ہاتھ رہا تھا، جس سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اُن کی تبلیغ بیعت کا رُخ بھی بدل گیا، یعنی اس مرحلۂ ثانی میں وُہ بجائے عبداللہ ابن زبیر کے محمد ابن حنیفہ کے لئے تبلیغ بیعت کرنے لگے۔

محمد ابن حنیفہ کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ اُن پر ناموس جناب باری کا نزول ہوتا ہے اور ایک تابوت بھی توابین نے تیار کیا تھا جس کی نسبت وُہ اس شان کا اعتقاد رکھتے تھے جو یہود تابوت سکینہ کی نسبت رکھتے تھے۔ غرضکہ ان تدابیر سے عراق میں مختار کا اثر پُورے طور سے مان لیا گیا تھا جو ان اختراعات میں اُس کا اصل مطمح نظر تھا، اور اب گویا خلافت اسلام کی تین حسب ذیل تقسیمیں ہوگئی تھیں، شام و مصر میں عبدالملک ابن مروان کا سکہ رواں تھا۔ حجاز میں عبداللہ ابن زبیر کو جمہور نے امیر تسلیم کیا تھا، اور عراق میں مختار کی حکومت تھی، مختار ابن عبید کے اس نقض بیعت سے عبداللہ ابن زبیر کو طیش آیا، اور اُنہوں نے اپنے بھائی مصعب کو تھوڑی فوج دیکر مختار کو اُن کے انحراف کی سزا دینے کے لئے عراق کی طرف روانہ کیا، جہاں معرکہ کا اختتام اس امر پر ہُوا کہ مختار مصعب کے ہاتھ سے قتل ہُوا، اور عراق پر بھی امیر حجاز کا تسلط ہوگیا، لیکن اس تازہ فتح کے بعد مصعب اور اس کے جانباز سپاہیوں کو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا

کہ شامیوں کا ایک جرار لشکر مقابلہ کے لئے آتا ہوا نظر آیا، جسے عبدالملک ابن مروان نے امیر حجاز کی حاصل شدہ قوت کو بجبر واپس لینے کے لئے روانہ کیا تھا جس سے مصعب کے لشکر نے شکست کھائی، مصعب مارا گیا، اور فوجِ شام نے عراق پر پورا قبضہ و تسلط کر لیا،

اس مہم کے خاطر خواہ سر ہو جانے کے بعد عبدالملک کو حجاز کا خیال پیدا ہوا، کہ وہاں جو کانٹا ہے، اور سلطنت کی آنکھ میں جس کی کھٹک اگر اب نہیں، تو کبھی نہ کبھی ضرور کھٹکیگا، دُور کیا جائے چنانچہ بمشورۂ امرار دولت ایک فوجِ گراں صوبۂ حجاز کے تاخت و تاراج کرنے کو روانہ کی گئی - اِس لشکر نے پہلے مدینہ پر قبضہ کیا، پھر وہاں سے وہی لشکر حجاج ثقفی کی زیر کمان مکہ کو روانہ ہوا، جہاں پہنچتے ہی اُس نے شہرِ مکہ کو اپنے محاصرہ میں لیلیا، اور عبداللہ ابن زبیر کو اطاعت کا پیغام بھیجکر بلا بھیجا، مگر وہاں سے صریح انکاری جواب ملا، یہ جواب سُنکر محاصرین شہر کے اندر داخل ہوئے - جہاں عبداللہ ابن زبیر یکہ و تنہا اُن کے ہاتھ آئے - کیونکہ اُن کے اعیان و انصار پہلے ہی کچھ سامان خور و نوش نہ ہونے اور کچھ جان کے خوف سے ان سے علیحدہ ہو گئے تھے *

خ - ن - عالی

سفارش

دنیاوی رنگ میں ہی نہیں مذہبی اور روحانی رنگ میں بھی شفاعت یا سفارش کی ضرورت یا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ سیاسی قوانین میں صراحتاً شفاعت یا سفارش تسلیم نہیں کی گئی مگر پھر بھی قانونی رنگ میں اسکی ہستی پائی جاتی ہے۔ کبھی صراحتاً اور کبھی کنایتاً کبھی شاہی درگذر کی صورت میں اور کبھی سلطانی رحم کے رنگ میں۔

انصاف اور رحم دونوں کا مقابلہ یا مزاحمت کسی نہ کسی رنگ میں ہوتی رہتی ہے اگرچہ سیاسی قوانین میں انصاف کی بابت اس قدر تاکید در تاکید کیجاتی ہے کہ رحم کی ہستی بالکل ہی معدوم ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی انصاف کی طبیعت میں رحم کی ضرورت کا احساس کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے۔ باوجود ایک سیاسی قانون کی شدت کے کوئی نہ کوئی صورت درگذر کی پائی ہی جاتی ہے۔ تعزیرات ہند میں مستثنیات کا ہونا اور ضابطہ فوجداری کی دفعات میں ۵۶۲ دفعہ کا پایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اگرچہ انگریزی انصاف یا انگریزی سیاست میں رحم کو نزدیک ہی نہیں آنے دیا۔ مگر پھر بھی مستثنیات اور دفعہ ۵۶۲ کو رحم کی ہستی کا اخیر را اعتراف کرنا ہی پڑا۔

اگرچہ یہ کہا جائے گا کہ اُن میں جو کچھ شرطیں اور قیود جائز رکھی گئی ہیں۔ اُن کے ہوتے انصاف کے فرائض میں کوئی کمی نہیں آتی مگر با ایں ہمہ رحم کی ہستی جلوہ نما ضرور ہوتی ہے اور یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ

رحم کی ہستی بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہی رہتی ہے۔

اخلاقی اور سوشیل قوانین میں بھی رحم اور رحمدلی کی ضرورت کا اکثر صورتوں میں اعتراف کیا گیا ہے۔ اخلاقی قوانین اور سوسائٹی کے قواعد کے رُو سے درگذر اور عفو ایک خاص خصوصیت رکھتا ہے اور ان دونوں قوانین میں اس ضرورت کا پورے زور سے اعتراف کیا گیا ہے جسے مذہبی رنگ میں دس گنا مکافات کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے اور بہت کچھ تعریف کی گئی ہے۔

اگرچہ مختلف قوانین اور شرائع میں اس قسم کے عملیات کا نام سفارش یا شفاعت نہ رکھا گیا ہو مگر نتیجہ یہ کہا جائیگا کہ دُوسرے الفاظ میں اُنکا مفہوم سفارش یا شفاعت ہی ہے۔

شفاعت یا سفارش کیا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے؟

"کسی ضرورت کسی حاجت۔ کسی تکلیف۔ کسی مزاحمت۔ کسی مالایطاق حالت کے پیش آنے پر کسی ایسے شخص سے امداد چاہنا جو اس کے متعلق کچھ کر یا کرا سکتا ہو اور جس کے حدود اختیارات میں براہِ راست یا بعض وسائل وہ کام یا وُہ صورت ہو۔ یا ایک تبلیغ۔ اس بحث میں یہ سوالات خصوصیت سے قابلِ بحث ہیں۔

الف۔ سفارش یا سفارشوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ب۔ یہ عمل انسانی فطرت یا قوانینِ قدرت کے مطابق ہے۔

ج۔ اس کے بغیر گذارہ نہیں۔

د۔ سفارش کرنا یا سفارش کیا جانا کہاں تک درست ہے۔

ہ۔ کیا اغراضِ انصاف کے یہ عمل منافی ہے؟

و۔ رحمدلی کی کہاں تک ضرورت ہے اور اس کا صحیح طریقہ۔
ز۔ تمدن سے سفارش یا سفارشوں کا کہاں تک تعلق ہے۔
ح۔ امورِ سیاسی کے اعتبار سے اس کی ضرورت یا حقیقت۔
ط۔ سفارش یا سفارشوں کا اثر۔

یہ کہنا کہ سفارش یا سفارشوں کی ضرورت نہیں پڑتی اور زمانہ اس سے خالی رہ سکتا ہے یا خالی ہے۔ میری رائے میں ایک ایسا خیال ہے جو ہمارے عقل سے دُور اور ضروریات سے باہر ہے۔

صحیح جواب یہ ہے کہ

معادی اور معاشرتی دونوں رنگوں میں شفاعت یا سفارش کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سے چارہ نہیں۔ دُعا مذہبی رنگ میں ایک شفاعت یا سفارش ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض لوگ دُعا کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لیکن ان کا معاشرتی رنگ میں سفارش کرنا یا سفارش کرانا بھی ایک دُعا ہی ہے۔

ایک مریض کا طبیب کے پاس جانا اور معالجہ کی خواہش کرنا بھی ایک دُعا اور ایک سفارش ہی ہے۔ ایک مظلوم کا جج کے پاس انصاف کی خواہش لیجانا بجائے خود ایک سفارش ہے۔

میری رائے میں یہ عمل انسانی فطرت اور قانون قدرت کے عین مطابق ہے۔ فطرت اور قانونِ قدرت اس کی تائید اور اثبات الاحت ہیں ہر انسان فطرتاً چاہتا ہے کہ ضرورت کے وقت کوئی اس کی امداد پر کھڑا ہو اور اس کے واسطے ایک ذریعہ اور وسیلہ ثابت ہو۔ اگر انسان ایسی ضرورت کے وقت کوئی حامی اور ہمدرد نہیں پاتا تو اُن طاقتوں سے طلب امداد کرتا ہے جو آنکھوں سے اوجھل۔ ور دسترس سے باہر ہیں۔ کیا کوئی

شخص بھی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ زندگی میں انسان دوسروں کی امداد اور ہمدردی کا محتاج ہوتا ہے۔

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ انسان جب کسی دوسری مخلوق کو کسی آفت اور مصیبت میں گرفتار دیکھتا ہے تو فوراً اس کے دل و دماغ میں ایک ہمدردی کی رُوح متحرک ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کے اختیارات سے ایسی مدد کرنا باہر ہو لیکن اس پر دوسرے کی مصیبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

اگر انسان فطرتاً طلب امداد یا سفارش کرنے اور کرانے پر مجبور نہ ہوتا تو خود اس کے اپنے دل میں اس قسم کے خیالات ہجوم نہ کرتے۔ جب کسی انسان کے مقابلہ میں کوئی دُوسرا شخص کسی ضرورت کے وقت مددگار ثابت ہوتا ہے تو وُہ اس پر خوش ہوتا اور ناز کرتا ہے۔ اگر یہ فطرتی خاصہ نہیں تو ایسی خوشی اور مسرت نہ ہوتی۔

انسانوں پر ہی موقوف نہیں جب حیوان بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا اور کوئی اس کی امداد کرتا ہے تو وہ دِل سے مرہونِ احسان ہوتا ہے۔ اُس شیر کی کہانی یاد کرو جس نے پاؤں میں سے کانٹا نکالنے کی وجہ سے ایک شاہی معتوب کی جان بخشی کی تھی۔

قانونِ قدرت۔ بلاکسی مُزد اور قیمت یا معاوضہ کے جو ساری مخلوق کے واسطے عناصر ضروریہ کا تہیہ کرتا ہے۔ یہ ثبوت اس بات کا ہے کہ ہمیں بھی ایک دُوسرے کے ساتھ بہ مروت پیش آنا چاہیئے اور یہ صُورت دُوسرے الفاظ میں از خود سفارش کا حکم رکھتی ہے۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ معاد اور معاش دونوں میں بغیر سفارش و شفاعت کے کبھی گزارہ واقعی مشکل ہو جاتا ہے سفارش کا مفہوم دُوسرے الفاظ

میں وسیلہ بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دُنیا میں وسائل کی ازحد ضرورت ہے۔
مطلب اس کا دوسرے رنگ میں یہی ہے کہ بعض امور کے پیش آنے پر
شفاعت سفارش یا وسیلہ کی ضرورت لازمی ہوتی ہے یا اس سے گریز نہیں
ایک حکیم کا قول ہے کہ
"دُنیا میں کوئی شے بذاتہ بُری نہیں ۔ مگر استعمال قبیح سے بُری ہو جاتی ہے۔
اگرچہ عام طور پر اس سے اتفاق نہ کیا جائے لیکن بعض حالات میں یہ ماننا
ہی پڑتا ہے کہ
"یہ استدلال کسی حد تک درست اور صحیح ہے۔
سفارش ایک ایسی صورت ہے جسکی بعض اوقات سخت ضرورت پڑتی ہے اور
بہ ناچاری اُس کی ضرورت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے بُرے استعمال
اور محدود مفہوم نے اس کی نوعیت اور اس کی صحت میں بہت کچھ فرق
کر دیا ہے ۔
"سفارش کرنا درست۔
"اور سفارش کیا جانا بھی صحیح۔
لیکن نہ ہر حالت میں اور نہ ہر وقت۔ اس کے واسطے صحیح اصول اور صحیح
استعمال کی ضرورت ہے۔ اس میں ضرورت ہے کہ امور ذیل پر غور کیا جائے۔
الف۔ اصل واقعہ زیر سفارش۔
ب۔ سفارش کرانے والے کی حالت اور ضرورت کا وزن۔
ج۔ جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے اس کے اختیارات حدود اختیارات
اور اس کی پوزیشن اور ذمہ واری کا وزن کرنا۔
د۔ جسکے مخالف سفارش کی جاتی ہے اس کے حقوق اور مطالبات کا دیکھنا

اور وزن کرنا۔

۵ - اپنی حقیقت اور وقعت کا موازنہ۔

یہ پانچ باتیں ہیں جو سفارش کرنے کے وقت ذہن نشین ہونی چاہئیں اگر ان شرائط اور ان مقدمات کے خلاف کوئی سفارش کی جاتی ہے تو وہ ایک ایسی حرکت ہے کہ جس پر سفارش کرنے والے کو ضرورتاً افسوس کرنا زیبا ہے۔ اور یہی عمل ہے کہ جس سے سفارش کا دائرہ بہت کچھ تنگ ہو جاتا ہے اور سفارش کی وقعت اور تمیز میں اکثر دفعہ بہت کچھ شک و شبہ کیا جاتا ہے۔ میری رائے میں اگر بہ پابندی ہائے بالا کوئی سفارش کی جائے تو وہ اغراض انصاف کے منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ جس قدر صورتیں اغراض انصاف کے منافی ہو سکتی ہیں اُن کا بہت کچھ حصہ صور اور شرائط بالا میں پہلے ہی سے ملحوظ رکھ لیا جاتا ہے۔

رحمدلی کی اکثر اوقات ضرورت ہے اور اس کا صحیح طریقہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انصاف کا دائرہ ایسا تنگ نہ خیال کیا جائے کہ اس میں رحمدلی سما ہی نہیں سکتی۔ انصاف اور رحمدلی میں ایسی مغائرت نہیں ہے کہ جیسے عموماً لوگوں کے ذہن نشین ہے۔ انصاف کا مفہوم یہ ہے کہ حق حقدار کو ملے اور رحم کا مفہوم یہ ہے کہ حقوق میں فرق نہ لا کر ایک شخص کے ساتھ ایک خاص رعایت کی جائے۔ اِن دونوں کیفیتوں میں کوئی مغائرت نہیں ہے۔

ایک نوعمر نوجوان شخص کو زیر دفعہ ۵۶۲ ضابطہ فوجداری باوجود چوری کرنے کے بھی ضمانت پر چھوڑ دینا درحقیقت انصاف کُشی نہیں ہے۔ بلکہ انصاف کرنے کے بعد اُسے دائرہ رحم میں لا کر مہلت مزید دینا ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو گالی نکالتا ہے اور وہ شخص باوجود اس کے معاف کرتا ہے

دراصل یہ انصاف کشی نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی سزا ہے۔ جب زید بکر کو اس کے مجرم یا ملزم ثابت ہونے پر معافی دیتا ہے تو دراصل وہ اخلاقی رنگ میں بکر کو ندامت دلاتا ہے جو ایک سخت سزا ہے۔ یہ کہنا کہ ایک شخص ایسے باپ کا لڑکا ہے جس نے اپنی زندگی میں مخلوق کی بہت کچھ خدمات کی تھیں اُس کے حق میں کچھ رعایات کی ضرورت ہے انصاف کشی نہیں ہے بلکہ انصاف پسندی ہے۔

تمدن یا تمدنی امور سے سفارش یا سفارشوں کا بہت کچھ تعلق ہے میری رائے میں سفارش تمدن کا ایک ایسا جزو ہے جس سے کبھی نہ کبھی واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ تمدن کا مفہوم ایک دوسرے سے مل جُل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے کی حالت میں سفارش اور درگذر معافی کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ ہر ذی رُوح متمدنی رنگ میں صدہا معاملات میں روز ایک دوسرے سے سفارش کرتا اور کراتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سوائے اس کے گذارا ہی نہیں۔

امور سیاسی کے اعتبار سے گو ججوں اور منصفوں کو بعض حالات میں اس کی ضرورت نہ ہو لیکن شاہوں کو تو ایسی ضرورتیں پڑتی ہیں جب شاہی مراحم پر بعض لوگ اپنے تئیں چھوڑ دیتے ہیں تو اس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں سفارش ہے۔ قانون سیاسی جس کی بعض صورتوں میں مخالفت کرتا ہے۔ جب کبھی کوئی جج ایک خورد سال ملزم کو کسی قسم کی سہولت دیتا ہو تو وہ بھی ایک قسم کی سفارش ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں نقصوں کے رفع کرنے کی صورت ہو سکتی ہے مگر سفارش کرتے وقت ان امور پر کامل غور کر لیا جائے۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

سفارش یا سفارشوں کا اثر قبول کرنے کی حالتوں میں ہمیشہ امور ذیل کا لحاظ ہونا چاہیے۔

(۱) حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ سفارش کا موقعہ ہی نہ آئے۔

(۲) اگر سفارش کرانی ہو تو اس شخص کے پاس جو سفارش کرتا ہو تمام امور صحیحہ کا بیان کیا جائے۔ بالکل فریب آمیز الفاظ میں بات چیت نہ کیجائے۔

(۳) دوسرے فریق کے حقوق واقعی کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ جس پر اس سفارش کی زد پڑے گی۔

(۴) سفارش کرنے والے کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ جس شخص کے پاس وہ سفارش کرنا چاہتا ہے اس کے ساتھ اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔

(۵) اور اس شخص کی اپنی ذمہ واری امر سفارش کے متعلق کیسی ہے اور کیا کچھ وسعت رکھتی ہے۔

(۶) کیا سفارش کا منظور کرنا خود سفارش قبول کرنے والے کے واسطے باعتبار حالات مضر تو نہیں ہے؟

(۷) سفارش کرنے والے کے حدود اختیارات کہاں تک ہیں۔

(۸) سفارش کرانے والے کو یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہو کہ سفارش کرنے یا کرلنے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ دوسرا شخص ضرور سفارش کے ماننے پر مجبور ہی کیا جائیگا۔ کیونکہ یہ اس شخص کا اپنا اختیار ہے۔

(۹) سفارش کرنے والا صرف سفارش کر دینے کا ذمہ دار ہے نہ کہ حسب سفارش کرا دینے کا بھی۔ یہ بھی ایک مشکل ہے کہ لوگ سفارش کرانے کے ساتھ ہی یہ بھی سوچ لیتے ہیں کہ جو شخص سفارش کرتا ہے

اس کا یہ بھی کام یا یہ بھی فرض ہے کہ وہ سفارش کے لائق کام بھی کرادے یہ ایک ایسا خیال ہے جو کسی صورت میں بھی موزون نہیں کہا جاسکتا اکثر صورتوں میں سفارش صرف ایک تبلیغ ہے نہ کہ جبر اور اکراہ۔

جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے اُس کے بھی کچھ فرائض ہیں۔

الف۔ یہ کہ سفارش اور سفارش لانے والے اور فریق چہارم یا اصل واقعہ کی نوعیت پر غور کرے۔

ب۔ اپنی پوزیشن اور اپنے اعتبار پر بحث کرے۔

ج۔ انصاف اور رحمدلی میں موازنہ کرے۔

بعض وقت لوگ سفارش کراتے ہیں اور جب اس کے مطابق نتیجہ نہیں نکلتا تو جس کی معرفت سفارش کرائی تھی اس کے کوسنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ خواہ مخواہ کی بدبختی سے اس کی بدگوئی میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں بجائے خود یہ سوچنا چاہیے کہ کیا سفارش کرنے والے کا یہ حق ہے کہ ایک تیسرے شخص کو ساتھ ہی مجبور بھی کرے۔ اگر زید بکر کے پاس خالد کی بابت کوئی سفارش کرے تو زید کا یہ فرض نہیں ہے کہ بکر کو اس کے ماننے کے واسطے مجبور بھی کرے۔ البتہ زید کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ سفارش منظور کرنے کی جرأت رکھتا ہے تو خالد کو وعدہ دے ورنہ صاف کہدے۔ اگر خالد کے ساتھ وعدہ ہولیا ہے تو پھر اس کا ایفا بھی لازمی ہے اب ماننا نہ ماننا بکر کے اختیار میں ہے اور بکر کو نہ ماننے کی صورت میں سوائے اس کے کہ اس نے کسی ذاتی خصومت اور کاوش دلی کی وجہ سے انکار کیا ہو۔ کوسنا اور برا کہنا آداب خلق

سے بعید ہے۔

بکر کا بھی یہ فرض ہے کہ

زید سے صاف صاف کہدے۔ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو بہتر ورنہ انکار۔ عدالتی معاملات کی صورت میں ہمیشہ سفارشوں کا دائرہ تنگ ہونا چاہیئے اور جن کے پاس سفارشیں ہوں ان کا فرض اعلیٰ رہے کہ حقوق کے متعلق انصاف سے کام لیں۔ کیونکہ وہی اس کے ذمہ وار ہیں۔

سفارشوں کے اقسام حسب ذیل ہو سکتے ہیں:-

الف۔ اخلاقی سفارشیں۔

ب۔ سوشل سفارشیں۔

ج۔ وہ سفارشیں جن میں کسی دوسرے کے حقوق پر زد نہیں پڑتی۔

د۔ وہ سفارشیں جن میں دوسروں کے حقوق پر زد پڑتی ہے۔

ھ۔ مالی سفارشیں۔

و۔ قولی سفارشیں۔

ز۔ معادی سفارشیں۔

ح۔ معاشرتی سفارشیں۔

سفارش کرنے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بصورت نہ پورا ہونے کسی سفارش کے اس کے ساتھ جس کے پاس سفارش کی تھی کسی خصومت کی بنیاد نہ ڈالیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے کیا وہ اپنی زندگی میں سب قسم کی سفارشیں ان ہی لیا کرتے ہیں۔ کوئی شخص دنیا میں ہر دل عزیز نہیں رہ سکتا۔ ہاں اور نہ دونوں ایسی طاقتیں ہیں، جن پر انسانی تمدن کا بہت کچھ مدار ہے۔ اِن دونوں سے وقت پر کام لینا چاہیئے نہ کہ

ہاں سے ہی کام چلتا ہے اور نہ نہ سے۔

اگرچہ بعض وقت بعض سفارشیں تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات اُن سے حق رسی بھی ہوتی ہے۔ اور ہمدردی کا بھی گونہ ثواب ملتا ہے۔ اگر اخلاقی رنگ میں سفارشوں کی بنیاد رکھی جائے تو میری رائے میں اُن کا کرنا نہ کرنا۔ اعراض یا انکار کرنا چنداں مضر نہیں ہے۔

اور اس میں تمدّنی ضروریات کا اپنے رنگ میں مہیا اور ایفا ہوتا ہے۔ سفارش اور التجا میں فرق ہے۔ دونوں کی آمیزش بعض اوقات ایک بُرا اثر پیدا کرتی ہے۔ اور اس میں درجہ اور حد شناسی کی ضرورت ہے۔

(ایاز حد خود بشناس)

سُلطان احمد (بہاولپور)

ساجن موہنی یا تسخیر شوہر } ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے کچھ اوپر اسی صفحے ہیں جن میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی اہلیہ صاحبہ نے مولوی صاحب موصوف کی صلاح و اصلاح سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں میاں بیوی کے باہمی طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے اور مزید احتیاط کے طور پر اس خیال سے کہ یہ کتاب مبتدیوں کے ہاتھوں میں جائے گی۔ اخیر میں ایک فرہنگ کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ ہے۔ اور دفتر فرہنگ آصفیہ۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔

مشاہیرِ عرب

یوں تو شاید ہی کوئی فن ایسا ہوگا جس کو اہل عرب نے درجۂ کمال کو نہ پہنچا دیا ہو۔ مگر اس مضمون میں مختصر طور پر مَیں چند نامور عربوں کے نام لکھتا ہوں جنہوں نے زمانۂ گذشتہ میں بعض علوم وفنون میں کمال حاصل کیا ہے۔

علمِ کیمیا ابو موسیٰ جعفر کوفی موجودہ علم کیمیا کا ماہر تھا اس کے بعد اوروں نے بھی اس علم کو حاصل کیا جن کی جدّت۔ محنت اور رسائی ذہن نے حال کے کیمیا دانوں کو حیرت میں ڈالدیا ہے۔ علمِ طب اور علم جرّاحی اُس زمانہ میں بیحد ترقی کر چکے تھے۔

علمِ ادویہ اہل عرب نے علمِ ادویہ ایجاد کیا اور شفاخانے بنائے۔ ہر شہر میں دواخانے جاری کئے جن کو دار الشفا کہتے تھے اور جن کا خرچ سلطنت کے ذمہ ہوتا تھا۔ علم نباتات کی تعلیم کے واسطے باقاعدہ باغات بغداد اور دُوسرے مقامات میں بنائے گئے تھے جہاں اس علم کے بڑے بڑے ماہر لوگ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور اس علم کے متعلق بحثیں کرتے تھے۔

علمِ جُغرافیہ وسیاحت نویں صدی کے شروع میں جغرافیہ اور سیاحت کے متعلق کتابیں لکھی گئیں مسلم ابن حمیر۔ جعفر ابن احمد المزروی۔ ابن فضلان مسعودی ابن ہوکل۔ البیرونی۔ یاقوت۔ البقری۔ المقدسی۔ اور ادریسی عرب میں بڑے جغرافیہ دان گذرے ہیں۔

البیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا۔ ہندوؤں میں رہا۔ اُن کی زبان سیکھی۔ اُن کا فلسفہ اور ادب حاصل کیا۔ اُن کے عادات۔ اطوار۔ قانون مذہب

وغیرہ سیکھے۔ اُن کے عجیب عجیب عقاید دریافت کیے اور مُلک کی جغرافیائی اور طبعی حالت معلوم کی اور ان تمام تحقیقات کو ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا جس میں جابجا ہومر۔ افلاطون اور دوسرے یونانی مصنفوں اور فلاسفروں کے حوالے دیئے ہیں۔ ہندوستان کے حالات کے علاوہ اس نے علم نجوم۔ علم ریاضی۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ طب اور کیمیا پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ بیرونی کے کچھ عرصہ بعد ایک مشہور عالم اور سیّاح ناصر خسرو پیدا ہوا۔ وُہ عرصہ تک مرو میں رہا۔ یہاں سے سنہ ۴۳۶ھ میں سیاحت کو روانہ ہوا۔ نیشاپور۔ تبریز۔ حلب وغیرہ میں سفر کرتا ہوا دمشق میں آیا۔ بیروت اور بیت المقدس گیا پھر مصر میں آیا۔ مصر سے مقاماتِ مقدّسہ کی سیر کی۔ پھر مصر میں گیا اور وہاں سے بلخ کو واپس چلا گیا۔ اس کے سفر نامہ سے زیادہ دلچسپ کتاب سیاحت کے متعلق آجتک شاید ہی لکھی گئی ہو۔

علمِ تاریخ اس زمانہ میں علمِ قدامت اور سوانح عمری بھی علم تاریخ میں داخل سمجھی جاتی تھی۔ اس دلچسپ شاخ کے حاصل کرنے کے واسطے بھی بڑے بڑے دماغ خرچ کیے گئے۔ بلاذری جس کا انتقال سنہ ۲۷۹ھ (۸۹۲ء) میں ہوا ہے بغداد میں پیدا ہوا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ اور کتابیں لکھتا رہا اور اس کی تاریخ فتوح البلدان بڑے پایہ کی کتاب ہے۔

ہمدانی نے (جو تیسری ہجری کے اخیر اور چوتھی صدی کے شروع میں تصنیف کی دنیا میں آیا تھا) جنوبی عرب کی ایک صحیح اور معتبر تاریخ لکھی ہے جس میں اس حصّہ ملک کی مختلف اقوام کے حالات اور ان کی بربادی و تباہی کے قصّے درج ہیں اور یمن کے حالات اور یمن کا جغرافیہ بھی شامل ہے۔ مسعودی، طبری۔ اور ابن الاثیر کی تصانیف دیکھنے سے اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیتوں کا

پتہ چلتا ہے۔ یہ لوگ متاخرین (ابوالفدا ۔ ابن خلدون وغیرہ) کی طرح جہاں آتے بڑے مورخ تھے۔ وہاں بڑے جامع العلوم۔ فلاسفر۔ ماہر ریاضی اور جغرافیہ دان بھی تھے۔ مسعودی بغداد کا باشندہ تھا مگر نسلاً شمالی عرب تھا۔ اس نے جوانی میں سیاحت کی اور اسلامی دُنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا۔ اوّل ہندوستان میں آیا۔ ملتان اور منصورہ گیا۔ پھر ایران اور کرمان کا سفر کیا۔ پھر دوبارہ ہندوستان آیا۔ کمبوجہ اور دکن میں بہت دنوں تک رہا۔ لنکا گیا۔ وہاں سے کمبا لو گیا شاید چین کا بھی سفر کیا۔ وسطی ایشیا کی سیاحت کی اور بحر کاسپین تک پہنچا اپنی سیاحت کے اخیر میں وُہ کچھ عرصہ تک تبرزبیں رہا۔ پھر بصرہ میں رہا۔ وہاں اُس نے اپنی پہلی تصنیف مروج الذہب شائع کی۔ پھر قاہرہ چلا گیا۔ یہاں کتاب التنبیہ اور پھر مرأۃ الزمان چھپوائی۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ جس کی اب صرف چند جلدیں پائی جاتی ہیں۔ مروج الذہب میں اُس نے اپنی زندگی کے بڑے بڑے تجربے لکھے ہیں اور اس پیرایہ میں بیان کئے ہیں کہ ناظرین کو علمی فائدہ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی بے اِنتہا حاصل ہوتی ہے۔

طبری (ابوجعفر محمد ابن جریر) بھی بڑا قابل مورخ تھا۔ بغداد میں ۹۲۲ء میں وفات پائی۔ اُس نے اپنی تصنیف ۳۰۲ھ / ۹۱۴ء میں پبلک میں پیش کی۔

ابن الاثیر ملقب بہ عزالدین عراق میں جزیرہ بنی عمر کا باشندہ تھا مگر موصل کے نواح میں اکثر رہتا تھا۔ ایک گاؤں میں اس کا خوبصورت مکان تھا جہاں بڑے بڑے علما کا مجمع رہتا تھا۔ اس کی جامع تاریخ الکامل کا زیادہ حصہ اس گاؤں میں لکھا گیا تھا۔ یہ تاریخ ۱۲۳۱ء میں ختم ہُوئی اور یورپ کی بڑی بڑی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نے موصل کے اتابکوں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔

علم ہیئت

ماشاء اللہ اور احمد بن محمد النہارندی خلیفہ منصور کے زمانہ میں پُرانے ستارہ شناس تھے۔ خلیفہ مامون کے عہدِ حکومت میں سند ابن علی۔ یحییٰ ابن ابی منصور اور خالد بن عبدالملک بڑے مشہور ماہر علم ہیئت گذرے ہیں۔ ان لوگوں نے رات دن کی برابری۔ چاند سورج کے گرہن اور مدار ستاروں کے متعلق بڑی تحقیق کی اور آسمانی عجائبات کے معلوم کرنے میں ایسا غور و فکر کیا ہے کہ دُنیا حیرت میں ہے۔

محمد ابن موسٰی الخوارزمی نے خلیفہ مامون کے حکم سے سدھنت کا ترجمہ کیا۔ جس پر اُس نے بہت اچھے اچھے نوٹ اور نئے نئے معلومات درج کئے ہیں۔

ابومعشر نے عجائباتِ فلکیہ کو خاص طور سے مُلاحظہ کیا اور انکو معلوم کیا۔ اسکا نقشہ علمِ نجوم کی تحصیل کے واسطے بڑی مدد کا ذریعہ ہے۔

موسٰی ابن شاکر خلیفہ رشید کے زمانہ میں بڑا انجینئر گذرا ہے مگر اس کے بیٹوں نے جو خلیفہ مامون مستعصم اور واثق کے عہد میں تھے۔ علم ہیئت پر توجہ کی اور آفتاب اور دیگر ستاروں کی گردش کے متعلق حیرت انگیز معلومات اور تحقیقات بہم پہنچائیں۔ زمین کی جسامت معلوم کی۔ منطق البروج کا دائرہ کی صورت میں ہونا تحقیق کیا اور دن رات کی برابری کے متعلق بھی بہتری معلومات حاصل کیں۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی جسکی صورت ایک نلکی کی سی تھی۔ النیظری اور محمد بن عیسیٰ ابوعبداللہ نے بھی موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں کی پیروی کی اور وہی علم حاصل کیا۔ البطانی بھی ایک مشہور عالم علم ہیئت تھا۔ اس کی نقشوں اور فہرستوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ابوالوفار خراسان میں ۹۳۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ عراق میں رہ کر اُس

وہیں فن ریاضی اور علم ہیئت میں مہارت حاصل کی۔ ابن یونس بھی بڑا ہیئت داں اور ماہر فن ریاضی تھا۔ سنہ ۱۰۰۹ء میں فوت ہوا۔ اس کے معلومات و تحقیقات کو ابن الندمی (جس نے قاہرہ میں سنہ ۱۰۳۸ء میں انتقال کیا) اور حسن ابن ہیثم نے بھی جاری رکھا۔ وہ معالج چشم بھی بہت بڑا تھا۔ اسپین میں پیدا ہوا تھا لیکن مصر میں اکثر رہا۔ وہ اپنے علاج چشم کی تصانیف کے سبب سے یورپ میں بہت مشہور رہے۔ اس کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

ابن شاعر اور عمر خیام بھی فن ریاضی و ہیئت میں کامل تھے۔

فلسفہ اہل عرب نے علم الٰہیات اور فلسفہ کو بھی ویسے ہی شوق اور جوش کے ساتھ حاصل کیا جیسے علم ہیئت حاصل کیا تھا۔ فارابی اور بوعلی سینا عرب میں بڑے مشہور فلسفی گذرے ہیں۔ ابونصر فارابی اہل عرب میں ارسطوئے ثانی مانا جاتا ہے۔ یہ ابن سینا کا اُستاد تھا۔ یہ بات مان لی گئی ہے کہ ابن سینا دُنیا کے بڑے بڑے عالی خیال فلاسفروں میں سے تھا۔

شاعری عرب کے بیشمار شاعروں میں سے انتخاب کرنا بہت مشکل کام ہے ہم صرف چند نام شاعرانہ قابلیت کے لحاظ سے درج کرتے ہیں۔

ابونواس جو خلیفہ امین کے زمانہ میں تھا۔ امرأ القیس کے ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے جو اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔

متنبی اور ابو تمام حبیب ابونواس کے بعد کے شاعر ہیں۔ ابن خلکان ابو تمام کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ شاعر اپنے تمام ہمعصر شعرا سے صفائی بیان اور شاعرانہ اعلیٰ لیاقت میں سبقت لے گیا ہے"۔ البحتری اس کا ہمعصر تھا۔ اس نے بھی ابو تمام کی طرح حماسہ لکھی ہے۔ لیکن متنبی کی شہرت نے اکثر متقدمین شعرا کی شہرت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ النامی بھی مشہور شاعر تھا اس نے حلب میں [illegible] میں انتقال کیا۔

الجزائر کی عربی

الجزائر اور تونس دو اسلامی ممالک برّاعظم افریقہ کے شمالی ساحل پر فرانس کے زیر حکومت ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں بمصداق اَلنَّاسُ عَلٰے دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ انگریزی طریق بود و باش رائج ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہاں بھی نئی روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ اور لوگ یوروپین طرز معاشرت اور خورونوش کے دلدادہ ہوتے جاتے ہیں۔ خصوصًا وہ جنہوں نے یوروپ میں تعلیم پائی ہے۔ الجزائر کی زبان وُہی ہے جو مراکش میں بولی جاتی ہے اور جسکا نمونہ مخزن میں اس سے قبل ہدیہ ناظرین ہوچکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مراکش ابتک بفضلہ اسلامی سلطنت ہے وہاں یوروپ کی تہذیب کا اثر زبان پر بہت کم ہوا ہے۔ الجزائر میں نئی ضرورتیں پیش آنے کی وجہ سے کچھ تو نئے الفاظ زبان میں داخل ہوگئے ہیں اور کچھ پرانے عربی الفاظ نئے معنوں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ الجزائر کے باشندوں کی گفتگو (مع اس کے اردو ترجمہ کے) درج ذیل کیجاتی ہے۔ امید ہے کہ عربی دان ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگی:۔

خالد۔ مساء الخیر[۵۱] یا سیدی واش انت۔	**خالد**۔ تسلیم۔ مزاج شریف۔
ولید۔ بخیر۔ یسلمّک[۵۲]۔ اھلاً وسھلاً۔ سند کرسی	**ولید**۔ سب خیریت ہے۔ آپکی دعا سے آئیے آئیے۔ یہ کرسی لیجئے۔

۵۱ یہ شام کا سلام ہے۔ جس طرح صباح الخیر صبح کا سلام ہے۔ ۵۲ لفظی معنی خدا آپکو سلامت رکھے۔ کوئی خوشخبری سنتے ہیں تو بھی کہتے ہیں اللہ یسلمک۔ کرکی تحدیث کرتا ہے کہتے ہیں اللہ یکثر خیرک۔

عربی	اردو
اقعد وداسك - واش حال اهلك ؟	یہاں تشریف رکھئے - گھر میں سب اچھے ہیں ؟
خالد - اهلی بخیر من غیر بابا - علیہ الحمّہ -	**خالد** - سب اچھی طرح ہیں - سوائے والد کے کہ انکو بخار آگیا ہے -
ولید - لاباس - یبرا غدوة انشاء الله - تشرب الدّخان -	**ولید** - کچھ اندیشہ کی بات نہیں - کل تک اچھے ہو جائینگے - انشاءاللہ - آپ چرٹ پیتے ہیں ؟
خالد - قلیل ماتشرب[1] - الدخان یضرنی فی صدری - اناتکیف مرتین فی النھار - بعدالماکل -	**خالد** - بہت کم - میرے سینہ کیلئے تمبا کو مضر ہے - دن بھر میں صرف دو دفعہ پیتا ہوں - بعد کھانے کے -
ولید - تعمل ملیح - ماتکثی شی الدّخان یاولد ! ابرم لی قارّو او عمّرلی سبسی وجب عافیہ[2] وقل للخدیم یفرّش الطابلہ وحطی العشاء -	**ولید** - یہ آپ اچھا کرتے ہیں - دھواں نگلنا بھی نہیں چاہئے - لڑکے ! مجھے ایک سگرٹ بنا کر دے یا میرا پائپ بھر لا اور آگ لے آ - اور خدمتگار سے کہہ کر کھانے کی میز لگائے اور کھانا لائے -

[1] عربی قدیم (اور مصر و شام میں اب بھی) اس موقع پر اشرب متکلم کا استعمال کیا جائیگا - دیار مغرب یعنی مراکش الجزائر تونس و طرابلس غرب وغیرہ میں جو قواعد میں ترمیم ہوگئی ہے وہ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوگی -

مضارع قدیم

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
غائب	یشرب	تشرب	یشربون	یشربن
حاضر	تشرب	تشربین	تشربون	تشربن
متکلم	اشرب	اشرب	نشرب	نشرب

مضارع دیار مغرب

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
غائب	یشرب	تشرب	یشربو	یشربو
حاضر	تشرب	تشربی	تشربو	تشربو
متکلم	نشرب	نشرب	نشربو	نشربو

[2] [illegible] اصطلاح میں عافیہ کہتے ہیں کیونکہ اسے آتش دوزخ مراد ہے -

خالد - الحال مندّی۔
ولید - صبّت الشّتاء۔ والرعد تکلم فی اللیل۔ ماخلانی نوم نرقد والتبروری صبّ البارح
خالد - صبّت خشین بالزّاف وکسّرلی الزجاج کامل۔
ولید - صبّ الثلج بالزاف فی بلیدۃ الجبال راہم[1] مغطّین بالثلج
خالد - حین تشرق الشمسُ یذوب الثلج والجلید۔ لکن الشتوۃ الملجیہ تکون باردۃ۔
ولید - نحب خیر البرد متاع زمان الشتاء وانّی خائف من السخانہ متاع الصیف۔

خالد - آجکل موسم مرطوب ہے۔
ولید - آج رات کو بارش ہوئی ہے اور گرج ایسی تھی کہ مجھے نیند نہیں آئی کل اولے پڑے تھے۔
خالد - اولے بہت بڑے بڑے تھے میرے یہاں تو (کواڑوں کے) آئنے ٹوٹ گئے۔
ولید - بلیدہ میں برف اتنی پڑی ہے کہ پہاڑ سب ڈھک گئے ہیں
خالد - جہاں سورج نکلا برف[2] سب گل جائے گی۔ لیکن اب کی دفعہ جاڑا ضرور سخت پڑے گا۔
ولید - میں تو جاڑے کے موسم میں بڑی پسند کرتا ہوں۔ گرمی سے البتہ مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے۔

[1] عربی قدیم میں فعل ہونا " مستقل نہیں ہے۔ اگر میں خوش ہوں کہنا ہو تو کہیں گے "اُنا فرحان" ہوں کے واسطے کوئی لفظ نہیں۔ دیار مغرب میں یہ کمی اس طرح پوری کی گئی ہے۔

دانی - میں ہوں۔	دانا - ہم ہیں۔
دالک - تو ہے۔	داکم - تم ہو۔
داہ - وہ ہے۔	داہم - وہ ہیں۔

داھا یا داھی - وہ (عورت) ہے۔

[2] ثلج وہ برف ہے جو آسمان سے برستی ہے۔ جلید وہ جو زمین پر پانی کے منجمد ہونے سے بنتی ہے۔ اردو میں دونوں کو برف کہتے ہیں۔

الد- الربيع والخريف
يعجبونى بالزاف -
ليد- يا ولد - العشاء واجد
جب الخبز السخون والكيان
والخذمى وَالتباسى والفوط
استعجل-
ليد- قبل ماتتعشوا تحب
شئ تشرب حاجه اشرب
التاى والا قهوة
الد- نحب نشرب القهوة-
ليد- يا ولد ! زوج فناجل القهوة
لد- ذالوقت نجيبهم حلوين
وَالآمرين-
ليد- واحد حلوة والاخرى بلاسكر
الد- علاش ضربو المدفع-
ليد- سفينه برّانيه سلّمت-

الد- اش اجات تعمل-
ليد- يمكن جابت باش تعبّى الماّ والفحم-
الد- الشقف متاع مصر بساؤ اليوم
يلزمني نكتب باحد البرية-

خالد- موسم بہار وخزاں مجھے
دونوں بہت پسند ہیں-
ولید- لڑکے ! کھانا تیار ہوا ہے تازی
روٹی اور گلاس اور چھریاں
اور رکابیاں اور تولیہ جلدی
لگاؤ-
ولید- کھانے سے پہلے
آپ کچھ پئیں گے - چائے
یا کافی ؟
خالد- میں کافی پسند کرتا ہوں-
ولید- لڑکے دو پیالی کافی لاؤ-
لڑکا - ابھی لاتا ہوں- شکر ڈال کر لاؤں
یا بلا شکر-
ولید- ایک میٹھی دوسری بلا شکر-
خالد- یہ توپ کیسی چلی ؟
ولید- کسی بیرونی جہاز نے سلامی
کی توپ سر کی ہوگی-
خالد- وہ یہاں کیا کرنے آئیگا-
ولید- ممکن ہے پانی اور کوئلہ لینے آیا ہو-
خالد- (خوب یاد آیا) آج مصر کا جہاز جائیگا
ہے اور مجھے ایک خط لکھنا ضروری ہے-

ولید- خاول- راهی قریب السبعة
خالد- اعطنی حبر و کاغط-
ولید- ماعلیه ..... ماتبطا شی
فی الساعة اعمل العلوان
علی الغلاف-
خالد- یا ولد- تعرف شیٔ
فاین البوسطة الکبیرة؟
اشتر واحد الطابع والصقه
علی الجیریه وارمها فی البوسطه
واذاکان البوسطه غلقت
تدّی الجریه بیدك للمشقف
ولد- فهمت-
ولید- هیّا نتعشّوا-
خالد- ماعلیه-
ولید- اش عندنا ناکلوا فی العشاً-
خدیم- عندنا الشّربه- والحوت
واللّحم المشوی- والخُضرة-
خالد- کان شی صاید فی هذا الحومة
ولید- ماشی بالزاف- لکن فی
جهة الجبال یکون الارانب والحجلان
والسمّانات والحتیان فی العیون

ولید- جلدی کیجئے- سات بجنے والے ہیں
خالد- مجھے دوات اور کاغذ درکار ہے-
ولید- بہت خوب ..... اب دیر نہ
کیجئے- لفافہ پر پتہ فوراً
لکھ دیجئے-
خالد- لڑکے! تو جانتا ہے بڑا
ڈاکخانہ کہاں ہے؟ ایک ٹکٹ
خرید کر لفافہ پر چپکا دینا اور
ڈاک میں ڈال دینا اور اگر ڈاکخانہ
بند ہو گیا ہو تو لفافہ کو خود
جہاز پر لیجانا-
لڑکا- میں سمجھ گیا-
ولید- آئے اب کھانا کھائیں-
خالد- بہتر ہے-
ولید- کھانا کیا کیا ہے-
خدمتگار- شوربہ ہے اور مچھلی اور بُھنا
ہوا گوشت اور ترکاری-
خالد- کیا اسطرف کچھ شکار ملتا ہے-
ولید- بہت تو نہیں مگر پہاڑ کی طرف
کچھ ملتا ہے- خرگوش اور تیتر اور بٹیریا
اور چشموں میں مچھلیاں-

خالد۔ صیادۃ الشبک خیر من صیادۃ القصبہ والقیادۃ قبل ما تشرق الشمس۔

ولید۔ لما الریح قوی۔ الزواوش یبقو مختبئین یا ولد جیب قازوز[۵]۔

خالد۔ ھذہ الدجاجہ بنینہ بالزاف

ولید۔ ذو کل شویہ۔ خذ السّلاصنہ

ولید۔ یا ولد جیب الحلاوات و الفاکھہ والقہوۃ۔

ولید۔ راک ناکل شویہ۔

خالد۔ کلیت اکثر منک۔

خالد۔ قداش ملّی ما تعشیت عشا مجال ھذا۔

ولید۔ راک تتمسخر علیّ۔

خالد۔ مچھلی کا شکار بنسی سے بہتر جال سے ہوتا ہے اور شکار دن نکلنے سے پہلے شروع کرنا چاہیے۔

ولید۔ جب ہوا تیز ہوتی ہے تو جانور سب چھپ جاتے ہیں۔ لڑکے لیمنیڈ لاؤ۔

خالد۔ یہ مرغی خوب پکی ہے۔

ولید۔ کچھ تو اور کھائیے۔ سلاد لیجئے۔

ولید۔ لڑکے مٹھائی اور میوہ اور قہوہ لاؤ۔

ولید۔ آپ تو کچھ کھاتے ہی نہیں۔

خالد۔ میں نے آپ سے زیادہ کھایا ہے۔

خالد۔ بہت عرصہ کے بعد ایسا عمدہ کھانا کھانے میں آیا ہے۔

ولید۔ یہ آپ میری ہنسی اڑاتے ہیں۔

المترجم محمد احمد

---

[۵] یہ کا ماخذ فرنچ لفظ (Gazeuse) ہے۔ یعنی گیس والا پانی

ادبِ اُردو اور اُس کا فلسفہ

بیس برس سے مشہور ہے کہ ادب اردو کو ترقی ہو رہی ہے مگر یہ محض عقیدہ تھا کیونکہ ترقی ہونے اور ترقی دینے میں فرق ہے۔ ترقی ہونے کا مفہوم آزادانہ وسعت اور ترقی دینے کے یہ معنے ہیں کہ باقاعدہ ترقی کی کوشش کی جائے پہلی صورت البتہ صادق آرہی تھی۔ کیونکہ ملک میں تجارتی اغراض سے ہزاروں پرچوں اور لاکھوں کتابوں کے شائع ہونے سے (جن میں زیادہ تعداد ناولوں تاریخوں سوانح عمریوں۔ غرض جھوٹے یا سچے قصوں اور بے نتیجہ اشعار کی ہے) سوائے ایک بیقاعدہ وسعت کے اور کوئی ادبی ترقی نہیں۔ اگر کسی باغ کے خوشنما درخت یوں ہی چھوڑ دیئے جائیں۔ تو وہ باغ باغ نہ رہے گا بلکہ جنگل ہو جائیگا اور اس کی یہ ترقی معکوس ہو گی۔ مہندی کی کانٹ چھانٹ اور سبزہ کی کتر بیونت ہم کو یہ بتاتی ہے کہ باقاعدہ ترقی میں اصلاح جزو اعظم ہے اور بے قاعدہ وسعت اور باقاعدہ ترقی کے خلاف ہے۔ ۲۵- لاکھ اشعار دس ہزار ناول۔ دوسو تاریخیں اور سو داستانیں چند سال کے اندر ملک میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ شعرا مورخ مترجم ایڈیٹر داستان نویس اپنے اپنے دفتروں کو لئے ہوئے بازار اردو میں آ گئے اور ادب اردو کی ترقی کا بازار گرم معلوم ہوا۔ حالانکہ آم گھانس کی منڈی اور ان کے ہاٹ کو گرم بازاری نہیں کہتے (باستثنائے چند شعرا نے مذاقِ نظم کو بگاڑا۔ کیونکہ تخئیل قدیم والوں نے خیالات خراب کئے اور نئی روشنی والوں نے فن شاعری میں داغ لگایا۔ نہ اُن کو شاعری کا فلسفہ معلوم نہ اُنکو اصول علم

کا علم۔ مورخوں۔ مترجموں نے زمانہ کے موافق دلچسپی پیدا کر کے اپنے تجارتی اغراض پورے کئے۔ اور اکثر ناول نویسوں نے تو ناول کے نام تک کو خاک میں ملا دیا۔ اسوقت ہزار او بیجنل ناولوں میں ایک بھی اپنے حدوں سے درست ہوتا تو ترقی اردو کا ایک رُکن ہوتا۔ نہ عبارت میں اثر ہے نہ معنی خیز الفاظ ہیں۔ نہ الفاظ کا صرف برمحل ہے۔ سو ناولوں میں سو جملے بھی ایسے نہ ہونگے جن کے الفاظ کو کوئی ادیب بدل نہ سکے۔ غرض یہ کہ محض کثرت کتب سے کوئی کتبخانہ با وقعت نہیں ہوسکتا۔ تو اُردو کے کتبخانہ میں معمولی کتابونکی تعداد بڑھائی گئی اور اس سے ادب کو کوئی نفع نہ پہنچا ہمیشہ ہر امر میں کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب ارادہ فعل پر مقدم ہو۔ اور فعل میں تدبیری مادہ ارادے کے مناسب ہو۔ اب تمام ہندوستان کے مشہور مصنفوں کے خیالات دریافت کیجئے تو بہت کم مصنف ایسے نکلینگے جنہوں نے ترقی ادب کی نیت سے کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہو۔ صرف یہ خیال کیا کہ اس وقت ہندوستان میں کونسا مذاق پسند کیا جاتا ہے۔ تاریخ یا ناول کا یا سوانحعمری کا اسی کے موافق ترجمہ کیا یا تصنیف کی۔ محض اس غرض سے کہ عام پسند ہو کر جلد فروخت ہو جائے اور عبارت بھی اسی طرز کو جو عام پسند ہو تا اکثر مشہور مصنفین عام مذاق کے تابع رہے اور نیت یہ کہ مالی نفع اپنی ذات کو پہنچے اگرچہ میں اس خیال کو مذموم نہیں کہتا ہوں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ایسے مصنفین ادیب ہیں نہ ترقی ادب اُن کا مقصود اصلی ہے۔ اب رہا فعل تدبیری یعنی عملی کوشش اور غیر مشہور مصنفین۔ البتہ ان میں سے بعض حضرات نے ادب کو ترقی دینے کی عملی فکریں کیں مگر اُن کا فعل ایسے اہم ارادے سے انگڑ نہ کھا سکا۔ چھاپا یا دم ہے ویسا ہی عمل بھی بڑے پیمانہ پر ہونا چاہئے۔ چند سالوں

اور بعض غیر مشہور مصنفوں کی ادبی ادبی سائنسوں نے اتنے بڑے قالب میں جان نہیں پڑ سکتی - ترقیٔ ادب کے لئے ان بیچاروں کے ارادے تو بہت بڑھے چڑھے ہیں مگر انکی کوشش قلیل المقدار ہیں - ہر ایک ادبی ترقی کے لئے ہر مصنف کو اپنی تصنیف میں دو کام کرنا چاہئے - ایک بلحاظ معانی و مضامین دوسرا باعتبار عبارت - مضامین وُہ ہونے چاہئیں جو اس وقت اردو میں نہیں ہیں یا کم ہیں - کیونکہ کوئی زبان ترقی یاب نہیں کہی جاسکتی جب تک کہ وُہ علمی زبان نہ بن جائے - اور علم سے میری مراد واقعات کا علم نہیں - کیونکہ واقعات کا علم جسے تاریخ کہتے ہیں اہل علم کی اصطلاح میں فن کہلاتا ہے اور کہانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا خواہ وہ سچی ہی کیوں نہ ہو - علوم وہ ہیں جو حواس باطنی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ معقولات کہلاتے ہیں - غرضکہ مضامین تو فلسفیانہ ہونے چاہئیں اور عام مذاق کی اتباع نہ ہو - بلکہ اس کے بدلنے کی کوشش کیجائے اور عبارت تصنیف ایسی ہو کہ ساری کتاب کا کوئی لفظ تو کیا کوئی حرف بھی نہ گھٹ سکے نہ بڑھ سکے نہ بدل سکے - مثال میں ایک نثر کی کتاب پیش کرتا ہوں ایک نظم کی کیونکہ ادب کے یہی دو حصّے ہیں - نثر میں تعزیرات ہند اور نظم میں دیوان غالب ادب اُردو کے لئے سبق آموز ہے - غرض یہ کہ ویسے مضامین اور ایسی عبارت جن تصنیف میں ہو اُن کی کثرت سے ادب کو ترقی ہوسکتی ہے ورنہ ہرگز نہیں -

غالباً انہی ضرورتوں کے لحاظ سے اُردو کانفرنس اور انجمنیں قائم ہوئی ہیں جن میں لائق - معزز اور روشن خیال ممبر ہیں - اگر اس کانفرنس نے اُس قاعدہ کے موافق اصول سے کام کیا تو تھوڑے عرصہ میں اردو ادب کی تعمیر تیار ہوگئی ہے - اب رہی رنگ آمیزی اور آرائش و زیبائش یہ قیامت تک ہوتی رہیگی اور ہوتی رہے - اگرچہ اُن اصول کا اتباع حکمت بلقمان [illegible]

مکمل کر دینے کے لئے قلمبند کرتا ہوں۔

ہر ایک ادب تین چیزوں سے مرکب ہو کر مکمل ہوتا ہی الفاظ۔ قواعد۔ علوم ادبیہ۔

الفاظ کی پانچ قسمیں ہیں۔ لغات۔ محاورات۔ روزمرہ۔ امثال۔ اصطلاحات۔

قواعد میں دو شاخیں ہیں صرف و نحو۔

علوم ادبیہ میں کئی علوم ہیں۔ معانی و بیان و صنائع بدائع وغیرہ۔

ان سب کی خانہ پُری کی جائے جو نہیں ہیں وہ لائے جائیں اور جو کم ہیں وہ پُورے کئے جائیں اور اُن کی تدوین کا طریقہ یہ ہے کہ ایک رسالہ شائع کیا جائے جسکے تین جزو ہوں۔ ایک حصہ میں الفاظ اور اُنکے معانی اور مخارج اور محل استعمال وغیرہ مع نظائر۔ دوسرے جزو میں قواعد صرف و نحو۔ تیسرے حصہ میں علوم ادبیہ اور ایک ضمیمہ کبھی کبھی ایسا بھی لگا دیا جائے جس میں توسیع الفاظ اور وضع اصطلاحات علمیہ کا حصہ ہو۔ مگر ساتھ اس کے یہ بھی ضرورت ہے کہ اوّل ہر نمبر کا پروف ہندوستان بھر کے مسلم الثبوت ادیبوں کے پاس بھیجکر بعد رفع اختلاف دستخط لے لئے جائیں۔ اسکے بعد ملک میں پیش کیا جائے۔ اوّل تو سب اسکی پیروی کرینگے اور اگر کسی نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی تو وہ ٹکسال باہر ہے۔

علاوہ اس رسالہ کے اس کانفرنس کے انتظام سے یہ امر بھی متعلق بلکہ ضروری ہی کہ وہ علوم اور مضامین اردو میں لکھے جائیں جنکی علمی بلاغت کی وجہ سے بظاہر ہماری موجودہ زبان متحمل نہیں ہوسکتی اور بڑے بڑے مصنفین کو یہ خیال پیدا کر رہا ہی کہ اردو ذخیرہ ابھی مشکل۔ بلیغ اور نازک علوم کا ظرف نہیں رکھتا حالانکہ غور اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ جس قدر کم ہمتی کیجاتی ہی اور عام مذاق کی پابندی کے منافع نے مغلوب کرکے علمی زبان کو بند کر دیا ہی۔ اُس قدر کمزور تو یہ زبان ہرگز نہیں ہی بلکہ بعض خاص مضامین کے دیکھنے اور لکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ لکھنے والا ادیب

ہونا چاہئے۔ ہر ایک مشکل سے مشکل مسئلہ کو اردو میں لکھ سکتا ہے اب رہی اصطلاحات تو اس کا علاج یہ ہے کہ جب تک اردو میں اصطلاحات وضع ہوں اس وقت تک جو مضامین ایسے لکھے جائیں ان کے شروع ہونے سے پہلے ایک فرہنگ ان اصطلاحات کی جو اس مضمون میں آئے ہیں علیحدہ کر دیجائے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کا کم ہمتانی مذاق علمی مذاق سے بدلجائے گا۔ لہذا بکثرت ایسی کتابیں جو مختلف علوم وفنون کی ہوں اور جن کا لٹریچر عمدہ ہو جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں شائع کیجائیں کیونکہ زبان اردو اس وقت ایک طالب علم کی حیثیت سے ہے اگر اسے علامہ بنانا ہے تو اردو کانفرنس کے فاضل اور خوشحال ممبر اس کی تعلیم کسی ایک علم یا مذاق پر موقوف و محدود نہ رکھینگے۔ بلکہ اگر اس کے ممبر مغربی مذاق رکھتے ہیں تو مشرقی مذاق کو نہ بھولیں اور اگر مشرقی مذاق کی طرف اپنا طبعی میلان ہے تو مغربی مذاق کو بھی نہ چھوڑیں۔ میرے خیال میں یوروپ کی بڑی زبانیں عربی و سنسکرت کی شاگردی سے پہلے علامہ نہ تھیں تو اردو کو عربی و انگریزی دونوں میں خذ ما صفا و دع ما کدر پر عمل کرنا چاہئے اور ایسے لوگوں سے کام لینا چاہئے جو حسب ذیل صفات رکھتے ہوں۔

(۱) اہل زبان ہوں (نہ کہ محض زباندان) (۲) اہل نظم (۳) ایسی نثر لکھنے والے جنکی عبارت جامع مانع ناقابل اصلاح اور با اثر ہو (۴) اپنے مافی الضمیر کو کماحقہ کسی خاص دلکش طرز میں ظاہر بلکہ آئینہ کر سکتے ہوں (۵) تمام علوم مشرقی و مغربی سے واقف ہوں (۶) ان سب زبانوں کو جانتے ہوں جنکے الفاظ سے اردو مرکب ہے (۷) ایسا ذہین اور قوی الفکر کہ مروجہ زبان میں سے قواعد پیدا کر کے مدون کر سکے (۸) اصول لغت سے واقف ہو (۹) محاورات و امثال کا محل استعمال جانتا ہو (۱۰) فصاحت کا حس صحیح رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص ان سب صفات سے موصوف نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے مگر چند آدمی مل سکتے ہیں۔ میری غرض اس کے شمار سے یہ ہے کہ اردو کانفرنس کے تمام عملی کارکنوں سے اگر ان صفات میں سے ایک صفت بھی چھوٹ گئی تو اتنا ہی حصہ ترقی ادب کا باقی رہ جائے گا +

ابو العلا سعید احمد ناطق لکھنوی
سکرٹری مجلس الحکما

تہذیب الاخلاق

سرسید مرحوم کے زمانے میں جو خدمت علمی اور اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق نے کی وہ محتاج بیان نہیں۔ انکے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی بارہا کوشش ہوئی مگر ناکام رہی۔ حال میں اخبار وکیل الحیئی امرتسر نے زیر ایڈیٹری مولوی عبداللہ عمادی صاحب ایک رسالہ اس نام کا شائع کرنا شروع کیا ہے۔ جس کے مقاصد وہی ہیں جو تہذیب الاخلاق کے تھے اس میں مذہب کے متعلق بعض محققانہ مضامین شائع ہو رہے ہیں اور اس کے فاضل ایڈیٹر اچھی معلومات اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا اور علم دوست مسلمانوں میں مقبول ہو جائیگا۔ اسکا رنگ الندوہ سے بھی ملتا جلتا ہے اور وہی تقطیع ہے۔ قیمت سالانہ عام خریداروں کے لئے تین روپیہ اور خریداران وکیل سے دو روپیہ ۸ آنہ رکھی گئی ہے۔

شکوہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی یہ نظم بھی مثل اُس قطعہ کے جو مخزن بابت مئی میں طبع ہوا ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ اور اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے خریدنے کے لئے لوگوں نے بڑھ بڑھ کر بولیاں دیں۔ اور بالآخر انجمن کا مال قرار پائی۔ اور کئی صاحبوں نے اُسی وقت اسکی نقلیں اشاعت کے لئے لیں۔ یہ نظم گو انجمن کے جلسہ کی رپورٹ کے ہمراہ شائع ہونیوالی ہے اور پنجاب ریویو کی ایک تازہ اشاعت میں بھی چھپ گئی ہے تاہم کلام اقبال کی خوبی اور نظم کی چُستی متقاضی ہیں کہ باوجود اور جگہ شائع ہو جانے کے اسے ہدیہ ناظرینِ مخزن کیا جائے۔ خصوصاً اِس لئے کہ ناظرینِ مخزن کی ایک کثیر تعداد ایسی ہو گی جسے اور رسالوں تک دسترس نہیں:-

کیوں زیاں کار بنوں سُود فراموش رہوں　　فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں　　ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز میری تابِ سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم　　قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم　　نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم   پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرط انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم   بُوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم

ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ اُمّت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر   کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر   مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر

تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی   اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یُونانی بھی   اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی

پر ترے نام پہ تلوار اُٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں   کبھی خشکی میں لڑے اور کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں   کبھی افریقہ کے تپتے ہُوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے   اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے   سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے

قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بُت فروشی کے عوض بُت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے   پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اُکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے　　　تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے

زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے؟　　　شہر قیصر کا جو تھا اسکو کیا سر کس نے؟

توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟　　　کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے؟

کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟

کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟　　　اور تیرے لیے زحمت کش پیکار ہوئی؟

کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟　　　کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی

کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟

منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے؟

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز　　　قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے　　　مے توحید کو لیکر صفت جام پھرے

کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے　　　اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے　　　نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے　　　تیرے قرآں کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں! تو بھی تو دلدار نہیں!

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں انکے خزانے معمور نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنیکا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے رسوائی ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنیکا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا!
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا!
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

کہیں ممکن ہو کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب انہیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لیکر

درد لیلی بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — امتِ احمدِ مرسل بھی وہی تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسولِ عربی کو چھوڑا؟ — بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟ — رسمِ سلمان و اویسِ قرنی کو چھوڑا؟
آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں!
زندگی مثلِ بلالِ حبشی رکھتے ہیں!!

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی — جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی — اور پابندیٔ آئینِ وفا بھی نہ سہی
کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

سرِ فاراں پہ کیا دین کو کامل تونے — اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تونے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تونے — پھونک دی گرمیٔ رخسار سے محفل تونے
آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا   قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا   گھر یہ اُجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا

اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے   سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے   تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ھو بیٹھے

پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز   لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز   تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طُور مضطر ہے اسی آگ سے جلنے کیلئے

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے   مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے   یعنی ہم دیر نشینوں کو مُسلماں کر دے

جوئے خُوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدہ سینۂ ما

بُوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن   کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن   اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم ابتک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم ابتک

قُمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں   پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قید موسم سے طبیعت رہی آزاد اسکی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اسکی

لطف مرنے میں ہی باقی نہ مزا جینے میں کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بے تاب ہیں جوہر مرے آئینے میں کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اقبال

جوشِ گل

وہ موسم ہے کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں یہ عالم ہے کہ جیسے رنگ تصویروں میں بھرتے ہیں
ہے خوابیدہ جو سبزہ آئنہ خانہ میں شبنم کے نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گذرتے ہیں
پرِ طوطی پہ ہوتا ہے دمِ طاؤس کا دھوکا ہوا سے اڑ کے برگِ گل جو سبزہ پر بکھرتے ہیں
ملا ہے سبزۂ نوخیز کو کیا رنگِ زنگاری ہوا لگنے سے جسکی۔ زخم دل لالہ کے بھرتے ہیں
شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں مدہوش کرتی ہیں کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اترتے ہیں
نزاکت سے ادا سے جھوم کر کہتی ہے شاخِ گل یونہیں اک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہہ رہی ہے چہرۂ گل کی - ادھر دیکھو
یونہیں محفل میں ہنس دیتی ہیں ہم اُن کو جو ہنستے ہیں

چمن کی مرحلے شاخیں ارتشی کرتی ہیں گلبازی
گلوں کی آئنہ داری پہ طاؤس کٹتے ہیں

گماں ہوتا ہے کی لشکر کشی بادِ بہاری نے
زرہ پوش آب ہوجاتا ہے جب بادل گرجتے ہیں

دمِ صبحِ بہاری ہے رُخِ خور پر نقاب افگن
کسی آئنہ پر تارِ نفس جیسے بکھرتے ہیں

وہیں جاکر ٹھہرے گا کاروانِ لالہ و گل بھی
نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جاکر ٹھہرتے ہیں

نہالانِ چمن کرلینگے قبضہ ساری عالم پر
وہاں سے یہ نہیں ہٹتے جہاں تک پاؤں رکھتے ہیں

زمیں پر جال پھیلایا ہے گیسوئے لفِ سنبل نے
عنادل اِن دنوں آتے ہوئے گلشن میں ڈرتے ہیں

جوابِ جشنِ جم ہے گرمیِ ہنگامۂ گلشن
کرے کرشمے سی تخت پری کے اُترتے ہیں

عنادل مل چکے ہیں خاک میں جو - کیا خبر اُنکو
کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

علی حیدر طباطبائی

نوحہ سرور

یہ نوحہ منشی درگا سہائے صاحب سرور جہاں آبادی کے انتقال پر لکھا گیا

آنکھوں کو کیوں ہے بارشِ خونِ جگر پسند
ہونٹوں کو کیوں ہے نالۂ شورش اثر پسند
غم تجھ کو کیوں ہے اے دلِ شوریدہ سر پسند
دنیا سے آج کس کو ہے عزمِ سفر پسند
جاتا ہے آج منزلِ ہستی سے آہ کون
نظروں میں کر چلا یہ زمانہ سیاہ کون

خاموش کیوں ہے بزمِ سخن آہ! کیا ہوا
ہندوستاں ہے وارِ محن - آہ کیا ہوا!
پہنا یہ کس نے آج کفن آہ! کیا ہوا
یہ نالہائے تاب شکن - آہ کیا ہوا!
کشتی تباہ کیوں ہے دلِ دردمند کی

دُنیا سے کس نے آہ یہ رحلت پسند کی

کیوں بیقرار اے دلِ خونیں جگر ہے تو — کیوں اشکبار اے مژۂ چشمِ تر ہے تو
اے صبر! کیا ہوا تجھے کیوں نوحہ گر ہے تو — اے داغ! کس کے غم میں چراغِ سحر ہے تو
یہ کون! ہائے محفلِ ہستی سے اُٹھ گیا
خیمہ یہ کس کا منزلِ ہستی سے اُٹھ گیا

اے بیکسی یہ سانحہ جانگزا ہے کیا — یہ ہائے ہائے نالۂ خونیں نوا ہے کیا
اے درد! اُٹھ کے دیکھ یہ آہ و بکا ہے کیا — لب پر یہ جوشِ نالۂ حسرت فزا ہے کیا
تسکینِ قلب ہے۔ نہ شکیبِ جگر ہے تو
اے صبر! کس کے سوگ میں وحشت اثر ہے تو

تو او سرورِ مصرِ معانی کدھر گیا — ہمراہ تیرے دفترِ علم و ہنر گیا
دُنیا سے آہ! کیا تیرا رختِ سفر گیا — پہلو سے صبرِ دل تو شکیبِ جگر گیا
وہ مہرِ آسمانِ فصاحت کہاں ہے آج
وُہ آفتابِ اوجِ بلاغت کہاں ہے آج

خاموش کیوں ہے طوطیِ شکر فشاں چہک — باغِ سخن کے بلبلِ رنگیں بیاں چہک
آ! ایک بار بزمِ احبّا میں ہاں چہک — رُوح القدس سے خلد میں ہے ہمزباں چہک
مُدّت ہوئی کہ تیرے ترانے سُنے نہیں
خوابِ عدم کے آہ فسانے سُنے نہیں

او جانیوالے! پھر کے ادھر دیکھ لے ذرا — آنکھوں سے رنگِ خونِ جگر دیکھ لے ذرا
اپنی گلی میں خاک بسر دیکھ لے ذرا — اِک بار تو اُٹھا کے نظر دیکھ لے ذرا
ہم کب سے آہ! خاک اُڑاتے ہیں راہ میں
اور سو رہا زمیں کی ہے تو خوابگاہ میں

نقشِ حیات تیرا زمانہ مٹا چکا رنگِ نشاطِ بزمِ شبانہ مٹا چکا
رنگیں نوائیوں کا ترانہ مٹا چکا جادو نگاریوں کا فسانہ مٹا چکا
باقی ہوا میں اب نہیں تیرا غبار بھی
اُڑتے نہیں ہیں آگ سے تیرے شرار بھی

پہلو میں اُٹھ کے درد نے میرے چٹکیاں سی لیں یہ اُلٹی اُلٹی سانس دلِ ناتواں نے لی
میں خود ستم زدہ ہوں مرا امتحاں نہ لے یہ انتقام اے ستمِ آسماں نہ لے
میرے جگر پہ آہ! نہ یہ غم کا داغ دے
سو داغ دے مگر نہ یہ ماتم کا داغ دے

داغوں پہ اے فلک ہیں یہ تو نے تازہ داغ نیرنگیوں نے تیرے کھلائے ہیں سبز باغ
پھیروں سے تیری ہی ظالم کسے فراغ تو نے جلا جلا کے بجھائے بہت چراغ
تیرے ستم غضب کے۔ جفائیں بلا کی ہیں
گردش میں تیری آہ! ادائیں قضا کی ہیں

آزاد[1] کا ذکا[2] کا ابھی غم گیا نہ تھا ہم سوگوار تھے کہ یہ ماتم گیا نہ تھا
سینے سے جوشِ نالۂ پیہم گیا نہ تھا دل سے بخارِ آہ! شررِ دم گیا نہ تھا
منجدھار میں پڑی ہوئی کشتی سکوں کی تھی
آنکھوں سے آہ! نہر رواں موجِ خوں کی تھی

شیرازۂ خیال تر اب کہاں تیرا جاتا کدھر ہے توسنِ عمرِ رواں ترا
جائیگا جیتے جی نہ غمِ جانستاں ترا برسوں رُلائیگا المِ خونچکاں ترا
جب تیری یاد آئے گی احباب روئینگے
آنکھوں سے سیلِ بارشِ خوناب روئینگے

[1] مولوی محمد حسین صاحب۔ [2] مولوی ذکاءاللہ صاحب سے مراد ہے ۱۲

غمخانۂ آرزو کا یہ دار المحن ہی حیف — انجام کار دہر کا دو گز کفن ہی حیف
ہی سازِ نالہ جس میں یہ وہ انجمن ہی حیف — قبضہ خزاں کا جس میں ہی یہ وہ چمن ہی حیف

وہ پھول ہی یہ جس میں شمیمِ وفا نہیں
وہ داغ ہے کہ کس کے جگر پر لگا نہیں

کر صبر نالہ کش دلِ آشفتہ سر نہ ہو — اَے بیکسی ہے غم کی بھی حد نوحہ گر نہ ہو
اَے صبر مجھ غریب سے وحشت اثر نہ ہو — اَے موج گیر لجۂ خونِ جگر نہ ہو

عبرت سرا ہے دہر۔ یہ رونے سے فائدہ
اَے دل! تڑپ نہ۔ جان کے کھونے سے فائدہ

بالک رام شاد (از پٹیالہ)

چلمن

چلمن! بجا ہی یہ کہ تو رکھتی زباں نہیں — پردے میں تیرے شوخیِ حُسن بیاں نہیں
اس پر بھی تو نے ہم سے کئی آہ! جو قرار — پورے وہ قول کے تھے کہ بھولی نہ زینہار
ٹھہرا نہ آج تک کوئی وعدہ تیرا غلط — تو اور آہ! خوئے فریب و وفا غلط
دامن میں تیرے عیب ہر اک کا چھپا رہا — کس کس کا تیرے پردے میں پردہ ڈھکا رہا
گو خلق کی نگاہ میں رتبہ ترا نہ ہو — گو پردہ پوشیوں کا تری حق ادا نہ ہو
شکوہ نہیں کرے جو مذمت کوئی تری — پوچھے ہمارے دل سے حقیقت کوئی تری
تصویر آہ! تو ہے نشاط و ملال کی — تمثال ہی دو رنگیٔ بزمِ خیال کی

یعنی تری سرشت میں شانِ کرم بھی ہی
اور اس پہ یہ ستم ہی کہ طرزِ ستم بھی ہی

تو رہنمائے شوق ہی پردے میں گم ہو گیا مشتاقِ دید پر ترا احسان یہ کم ہو گیا
پردے میں تیرے حسن کسی کا نظر پڑا بے پردہ کوئی شاہدِ رعنا نظر پڑا
ارماں نظر کے تو نے نکالے نہ آہ! کب رخنے نقابِ حسن میں ڈالے نہ آہ! کب
تیری ہی اوٹ میں کسی مہوش نے جھانک کر کی التفات کی کسی عاشق پہ اک نظر

دریاں کو کچھ ہوئیں بھی اگر بدگمانیاں
پردے میں تیرے ہی پسِ پردہ رہیں نہاں

دامن میں چھپ کے تیرے ہی اے جرم پوش آہ! رندِ سیاہ کار نے کیا کیا کیے گناہ
اس تیری پردہ پوشی سے پہنچا ضرر تجھے پردے کا تیرے راز کھلا خلق پر نہ کچھ
پردے میں آہ! تیرے ہی اے شوخ فتنہ گر! خنجر کو پھیر کر کسی بیکس کے حلق پر

سفاک آہ! کر کے کوئی وار چل دیا
پہلو میں آہ! چھوڑ کے تلوار چل دیا

چلمن! ہے سادہ لوح غرض تو بھی کس قدر ہے دشمن اور دوست پہ یکساں تری نظر
تجھ کو دماغ آہ! کہاں امتیاز کا پردہ اٹھا نہ رخ سے کبھی تیرے راز کا
گو سادگی کو دخل ہے تیری سرشت میں گو تجھ کو امتیاز نہیں خوب و زشت میں
شکوہ ترا نہیں کہ تو پھر بھی ہے مغتنم تیرے نگاہِ شوق پہ احسان نہیں ہیں کم
ہرچند بے وفا یہ حسینانِ دہر ہیں خلوت پسند پردہ نشینانِ دہر ہیں
پردے ہیں آہ! گرچہ تری حاجبِ نظر دستِ درازِ شوق کا تجھ تک نہیں گزر

ہم پھر بھی مہوشوں کی جھلک دیکھ لیتے ہیں
پریوں کا حسن زیرِ فلک دیکھ لیتے ہیں

شاکر میرٹھی

تازہ غزلیں

(از سید علی حیدر زیدی صاحب)

غنی ہو دل مرا میں صاحبِ تمول ہوں
مدام راہ روِ جادۂ توکل ہوں

کسی کی چشم کا مخمور ہوں مگر سب کو
گمان ہے کہ میں سرمستِ ساغرِ مُل ہوں

میں بے بلائے خدا کے بھی گھر نہ جاؤں گا
طلب کرو تو میں حاضر بلا تامل ہوں

کسی کو چاہا نہ عاشق مزاج ہو کر بھی
فدائے گل نہ ہوا جو کبھی وہ بلبل ہوں

خدائے پاک کا ہر شخص کو وسیلہ ہے
کبھی نہ چاہیئے کہنا کہ بے توسل ہوں

جو بڑھتا جاتا ہے سن عمر گھٹتی جاتی ہے
ترقیوں میں بھی میں برسرِ تنزل ہوں

مثالِ شمعِ سحر ہوں بس اب کوئی دم میں
جو تم رہو گے یونہیں بے خبر تو میں گل ہوں

ہوں ایک مستِ مئے الفتِ علی حیدر
میں جان و دل سے فدائے سوارِ دُلدل ہوں

(از جناب نظم صاحب)

چلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفے کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود و بودِ سرابِ جہاں کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو نہیں کیا اگر نہیں نہ سہی

کب اپنے حال کی تجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال سے میرے خبر نہیں نہ سہی

نسیمِ صبح نہ آئے تو خوابِ مرگ تو آئے
سُن اے فلک شبِ غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے یارے
مجھے تحملِ دردِ جگر نہیں نہ سہی

چٹک رہی ہیں جو کلیاں تو پھول ہنستے ہیں
غرض کہ کیجئے نالے اثر نہیں نہ سہی

لحاظِ خاطرِ زاہد ضرور ہے ساقی
اُدھر تو دے کوئی ساغر اِدھر نہیں نہ سہی

اجل ہے سر پر سوار اور سامنے رُخِ یار
قدم تو اب نہیں ہٹنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل میں
ظفر نصیب ہیں تیغ و سپر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہو اور میں ہوں اور دلِ بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ شب جائیں
دماغ تو ہے وہی تاجِ زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہلِ توکل کو سوکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اُگل رہا ہے نظم
جہان میں گر کوئی صاحبِ نظر نہیں نہ سہی

۱

ہاف ٹون عکسی تصاویر

(شائقین جلد منگوائیں)

علمی اور ادبی دنیا کے جن مشاہیر کی تصویریں وقتاً فوقتاً رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر صاحبان علٰحدہ علٰحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی کچھ کچھ زائد کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ جواب برائے فروخت پیش کی جاتی ہیں۔ قیمتیں حسب ذیل ہیں:-

۱۔ حضرت داغ دہلوی مرحوم قیمت ۳ر

۲۔ شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی ۳ر

۳۔ پروفیسر عربیبری (معہ نمونہ دستخط انگریزی و تحریر فارسی) ۳ر

۴۔ گروپ (میر مہدی مجروح مرحوم و منشی امیر اللہ تسلیم و احسان و آسی) ۳ر

۵۔ منشی وانک بشن پرشاد صاحب طالب بنارسی ۳ر

۶۔ حضرت جلال لکھنوی (مرحوم) ۳ر

تصاویر مصر و روم

ہز ہائی نس عباس حلمی پاشا (خدیو مصر) ۳ر

والی مصر کے تین مہمان (جلال النبی بے شیخ میر حسین بیدودی و شیخ عبد القادر) ۳ر

جامع سلطان احمد (استانبول) ۳ر

ان تینوں تصویروں کی فقط چند کاپیاں موجود ہیں۔

چشمہ سلطان قیصر ولیم (استانبول) ۱ر

قصر یلدیز (جس میں جلوس سلطانی کی بھی تصویر ہے) ۱ر

غلطہ کا بڑا پل (استانبول) ۱ر

خزینہ ہمایوں کا دروازہ ۱ر

کارخانہ ابریشم (بروصہ) ۱ر

درویشان طریقت مولانا روم ۲ر

متفرق

دلسیسی لینم کا تنی کا چرخہ (بچوں کے لئے) ۱ر

قصر مصنوعات زنانہ (نمائش لندن) ۱ر

برادر مرحوم کی یادگار

ہماری دونوں ٹوپیاں "محسن الملک پیٹنٹ"، "وقار الملک پیٹنٹ" جیسی ہمہ صفت موصوف تھیں ویسی ہی پبلک نے اس کی قدر کی۔ جس کے لئے ہم جس قدر مشکور ہوں تھوڑا ہے۔ مگر اسی قطع وضع کی ذرا کم قیمت ٹوپیوں کی بہت مانگ تھی۔ اس لئے ہم نے مرحوم بھائی مولوی عبدالرشید چشتی بی اے جن کی یادگار میں ہم نے دوکان کا نام رکھا ہے اور جن کو ترکی ٹوپی نہایت عزیز تھی ایک ٹوپی

"رشید پیٹنٹ"

اٹلی سے خاص آرڈر پر بنوائی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہر ایک مسلمان کے سر پر ترکی ٹوپی نظر آئے۔ اس لئے ہم نے باوجود اس قدر خوش وضع ہونے اس کی قیمت نہایت تھوڑی رکھی ہے۔

قیمت رشید پیٹنٹ

۱۔ چھوٹی دیوار اوپر سے نیچے تک قریباً برابر استرہی چمڑہ وریشم کا مع پھندنا ؏

۲۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نقلی پیٹنٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ؏

(عبدالحمید چشتی) عبدالرشید زبردر جنرل مرچنٹ

انارکلی لاہور

پانچ لاکھ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا آدمی گنا جاتا تھا۔ آج ان سلاطین کی طرح والیوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شرکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک نمونہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر سیری صاحب تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بد نصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور ثمر طیبہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سنئے روح کیا چیز ہے۔ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنجاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب کرنل [illegible] صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ و گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے بدل بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک پیدا کر کے ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو آہنی بجلی کی لاگ سے چالاک اور چونکہ کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ [illegible] بھی ماریں تو بھی جیت ہو کر بے آب ہو جائیں گی۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لیکچرر معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ استعمال مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہوشمند یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اس وقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت حائل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھتے ہیں۔ روح حیات تریاق کا حکم رکھنے والی دوا ہے۔ بلکہ اعصاب کی ایک طاقت افزا غذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ چہرے میں رونق ابھارتی حاصل ہوتی ہے استعمال سے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے بارہ آنے ہے۔

حکیم محمد شریف ڈاکٹر کیمیا گر پرائیویٹ شفاخانہ عام لاہور سے طلب کرو

شائقین کتب

(ملاحظہ فرمائیں)

سنگلاخ کتابوں کا حل - مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کرسکا اور نہ کوئی انشاءاللہ حل کرسکتا ہے یعنی پتھروں کو پانی کرکے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے۔

حل قصائد خاقانی بغلہ کورس منشی فاضل ایم اے حصہ اوّل ۱ روپیہ ۱۲ آنہ حصہ دوم زیر طبع ہے مگر قصہ اس لئے کہ ہم کو چوروں سے پناہ نہیں جو گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مرد میدان ہے تو دوسرا حصہ حل کرے۔ نمشکل قصائد میں نے حل کردے آسان باقی ہیں

حل کلیات - اردو مرزا غالب دہلوی مرحوم - " " " " " ۱۰ر

حل قصائد خاقانی کورس منشی عالم - " " " " ۹ر

حل نکات مولانا مرزا عبدالقادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف .. ۱۲ر

شوکت التجدید میرے کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جس کی منتظر ہے پیشگی قیمت آرہی ہے زیر طبع ہے۔ پیشگی ہے اور بعد طبع " " " " " ۲ر ۴ر

اعلان عام جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں میری جانب رجوع لائیں۔ جیسا کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی۔ کلام بھیجکر آزمالیں۔

جو صاحب کسی کتاب اردو - فارسی - عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں۔ اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہوتا غلطیوں کو مجھ ہی خوب جانتا ہے۔

مجدد وسنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھ

۱۲؍ مشہور عالم ۱۲؍



اصلی راسکوپ سٹم واچ

یہ دیسی پرانی چال کی اصلی راسکوپ سٹم جیبی گھڑی ہے جسکی پائداری کی نسبت ضرب المثل ہے کہ "دادا خریدے اور پوتا برتے" اور جو باقاعدہ یاد رکھنے سے مدت العمر تک گھڑی ساز کا منہ نہیں دیکھتی - اسپر اسکی خوبصورتی اور نازکی کی سچائی سونے پر سہاگہ ہے۔ جب سے یہ گھڑی ہندوستان میں آئی کوئی بھی سوداگر آجتک پانچ روپیہ سے کم قیمت پر فروخت نہیں کر سکا - لیکن ہمیں تو پچاس ہزار گھڑیاں بڑے خاص آرڈر سے ولایت سے منگوائیں - اور کوڑیوں کے مناقع پر فروخت کرنا شروع کردیں - یہی وجہ ہے کہ اسکی دھوم مچ گئی اور غیر ملکوں تک جانے لگی جہاں ایک گھڑی گئی اسکو دیکھکر صدہا گھڑیاں منگائیں اکثر اصحاب نے زیادہ تعداد میں برائے فروخت منگا کر اچھا فائدہ اُٹھایا - ہزارہا سرٹیفکٹ ہمارے دفتر میں اس کے موجود ہیں اسکی نقل ولایت کے دیگر کارخانوں نے ہلکی گھڑیاں بہت بنائیں جنکو اکثر بھولے بھالے خریدار دو چار آنہ کی کفایت دیکر خرید کر پچھتاتے ہیں - اسی لئے ہم نے شرط کر دی ہے کہ اگر ناپسند ہو یا کوئی نقص معلوم ہو تو اسی روز واپس کر دو اور قیمت معہ خرچہ کے لے لو - اس سے زیادہ کوئی صورت اطمینان کی نہیں ہو سکتی دو یا زیادہ خریدنے سے محصول ڈاک معاف اور زینت چھ گھڑی لینے سے علاوہ معافی محصول ایک گھڑی زائد دینگے ۔

ملنے کا پتہ برج باسی لال ویش ناولٹی ایجنسی نمبر ۱۹۵ بلدیو بلڈنگس شہر جھانسی

طبِ یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب رئیسِ اعظم دہلی نے

جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطرافِ ہند میں اس کارِ اہم کے لئے سب کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں۔ درحقیقت یہ ہے کہ طبِ یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ انہی کی ذات سے ہیں۔ انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک احساسِ فرض کے ساتھ دل میں اس فنِ شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس مہتم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ **ہندوستانی دواخانہ** انکے احساسِ فرض کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک تجارتی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طبِ یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اس کے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طریقِ ساخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر مطب میں رہتے ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آتے تھے۔ بالکل اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں۔ صحت و تندرستی ایک جوہر بے بہا ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس جوہر کا گذرگاہ۔ اس لئے تمام اہلِ وطن کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی اور ویدک ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام سے بنتی ہیں۔ فائدہ اٹھانے کا اور اس کے ساتھ اس کارِ خیر کی مدد کا موقعہ ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسنِ معاملہ کے بہت تھوڑے عرصہ میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔

خط کا ٹھیک پتہ **منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی**۔ تار کا کافی پتہ **میڈیسنز**

جملہ حقوق محفوظ



مخزن

اُردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مدراس بنگلور

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◑ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام منشی ... پریس میں چھپا اور شیخ فضل الٰہی پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ ... محصول ڈاک ... فی پرچہ ... آنے

مخزنِ حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم

باتصاویر طبع ثانی

"خانصاحب" حکیم و ڈاکٹر غلام جیلانی "شمس الاطباء"
سابق ڈاکٹر سفارت خانہ دولتِ عظمیٰ برطانیہ مقام سیستان و ممبر مجلس حفظ الصحۃ
بنام ہمایوں اعلیحضرت شہنشاہ ایران و ممتحن جماعت حکیم حاذق متعلقہ اسلامیہ کالج لاہور وغیرہ

بلا جلد للعہ	کی نسبت	مجلد للعہ ۸ر

جناب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب سیکرٹری مدرسۃ العلوم علیگڈھ فرماتے ہیں کہ:

"**مخزنِ حکمت**" غالباً اس زمانے میں سب سے پہلی کتاب ہے جو اس حسن و خوبی کے ساتھ فنِ طب میں تصنیف ہوئی ہے جس میں ڈاکٹری اور یونانی دونوں تحقیقاتوں سے ایسی خوبی کے ساتھ کام لیا گیا ہے اور عام فہم اُردو زبان میں سر سے لیکر پاؤں تک کے تمام اعضاے اندرونی و بیرونی کی تشریح اور تمام بیماریوں کی حقیقت اور اُن کے مختلف معالجات اور احتیاطوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کو خود بھی بیماریوں سے سابقہ رہتا ہے اور وہ لوگ جو بال بچوں اور کنبے و قبیلے کے لوگ ہیں اور جن کو اپنے عیال کی تیمارداری میں بسا اوقات معروف رہنا پڑتا ہے اور بارہا ایسا اتفاق بھی اُن کو پیش آتا ہے کہ طبیب یا ڈاکٹر کے بروقت میسر آنے میں دقت ہوتی ہے اُنکے واسطے یہ کتاب ضرور ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔ اگر اس قسم کے حاجتمند لوگ اس کتاب کو اپنے گھر میں رکھیں تو ضرورت کے وقت اس سے بہت کچھ مدد حاصل کر سکتے ہیں اور باایں ہمہ حسن و خوبی قیمت اس قدر کم ہے کہ وہ بھی اس زمانے کے عجائبات سے سمجھنی چاہئے۔"

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی پروفیسر ایم اے او کالج علیگڈھ فرماتے ہیں کہ:

"**مخزنِ حکمت**" کا میں نے مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بہت اچھی کتاب ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا توں توں اس کی قدر زیادہ بڑھتی جائیگی۔ اس کتاب میں ڈاکٹری و طبِ یونانی کو ملانے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے اور تمام امراض کے انگریزی، عربی اور ہندوستانی نام اور ڈاکٹری و یونانی علاج دئے گئے ہیں۔ ایسی کتاب ہر ایک بال بچوں والے گھر میں روزمرہ کی معمولی بیماریوں کا علاج کرنے کے واسطے بہت مفید ہوگی۔

یورپ کی مختلف زبانوں میں اس قسم کی متعدد کتابیں موجود ہیں۔ لیکن جہاں تک میرا علم ہے اُردو زبان میں یہ اس قسم کی پہلی کتاب لکھی گئی ہے۔ جس میں یورپ کی طبی تصانیف سے فائدہ اُٹھانے کے علاوہ قابل مصنف نے خود بھی بہت کچھ اضافہ کیا ہے جس کے لئے میں ان کو مبارکباد دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ مخزنِ حکمت ہندوستان میں نہایت مقبول ہوگی۔"

۱۳۲۴

حجم کتاب ایکہزار تین سو چوبیس صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت کتاب بلا جلد چار روپے مجلد چار روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- کتبخانہ جناب شمس الاطباء (گمٹی بازار) **لاہور**

مخزن

مجوزہ محمدن یونیورسٹی

ذیل کا مضمون ایک لکچر سے اقتباس ہے جو لاہور کے ایک جلسہ میں ہز ہائی نس سر آغا خاں کے ڈیپوٹیشن کے پنجاب میں آنے کی تیاری کے زمانہ میں دیا گیا تھا لکچر کا بیشتر حصہ زبانی تھا جو بعد میں قلمبند نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہ وہ حصہ ہے جس میں یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدائی حالت کا تاریخی ذکر ہے۔ اس لئے اسے اوراقِ مخزن میں جگہ دی جاتی ہے:۔

زبانِ خلق کو اگر بجا طور پر نقارۂ خدا کہا گیا ہے تو مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی ہندوستان میں قائم کرنے کا مبارک خواب جو علیگڈھ کالج کے نامور بانی اور مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچے خیر خواہ اور رہبر سر سید مرحوم نے آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر دیکھا تھا۔ یقیناً عملی صورت اختیار کرنے کو ہے۔ اسوقت ہر کہ ومہ کی زبان پر یہ الفاظ ہیں کہ اب یونیورسٹی قائم ہوئی سمجھو۔ اور اگر خدا کو منظور ہے تو یہ الفاظ عنقریب واقعات ہو جائینگے۔ اسباب وعلل کا سلسلہ بھی اس تجویز کی کامیابی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ہز ہائی نس سر آغا خاں جیسے مقتدر شخص کا اس جوش سے محمدن یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے اٹھنا اور ہندوستان بھر کا دورہ کرنا اور ہر فردِ قوم کے آگے قوم کے لئے دستِ سوال دراز کرنا کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے اور صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ

اُس مقلب القلوب نے جس کے ہاتھ میں تمام عالم کے دلوں کی باگ ہے - یہ بات سر آغا خاں بالقابہ کے دل میں بے سبب نہیں ڈالی - بلکہ کوئی اہم نتیجہ اس سے پیدا ہونے والا ہے - نہ صرف مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک بزرگ قوم جو شاہی نژاد ہونیکے علاوہ وجاہت اور دولت میں والیانِ ملک کا ہم رتبہ ہے - اِس طرح گدایانِ قوم کی جماعت کی سرگروہی اختیار کرے - بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخِ عالم میں اِس قسم کی مثالیں کمیاب ہیں - پس ایسے سوال کا رد کرنا کسی بامروّت شخص کے اختیار میں نہیں -

اِس لئے یہ تو ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ سر آغا خاں کا وفد انشاء اللہ ہر مقام پر وہاں کے باشندوں کی توفیق کے مطابق کامیاب ہوگا - اور جس رفتار سے اکابرِ قوم عطیئے دے رہے ہیں یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ بیس لاکھ روپیہ جو اس وقت سر آغا خاں نے جمع کرنا تجویز کیا ہے - جمع ہو جائیگا - بلکہ اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو غیر ممکن نہیں - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے - کہ یہ رقم بمقابلہ اُس مقصد اعظم کے جو مسلمانانِ ہند کے پیش نظر ہے قلیل ہے - جن لوگوں نے ہز ہائی نس کا وُہ اڈریس دیکھا ہے - جو صاحب ممدوح نے گذشتہ دہلی دربار کے موقع پر جلاسِ کانفرنس منعقدہ دہلی میں بحیثیت صدر جلسہ پڑھا تھا - انہیں یاد ہوگا کہ اس وقت انہوں نے یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے ایک کروڑ روپیہ کا اندازہ لگایا تھا - اب صرف بیس لاکھ کا مطالبہ کرنے سے یہ مقصود ہے - کہ اتنی رقم موجود ہو جائے - جو اس امر کی ضمانت ہو کہ یونیورسٹی بننے کی اجازت اگر مل جائے تو آغازِ کار میں روپیہ نہ ہونے کی رکاوٹ پیدا نہ ہو - اور ہمیں یہ منصب حاصل ہو کہ اپنی اس ہمت کی بنا پر کہ ہم نے تھوڑے سے عرصہ میں اس قدر رقم بہم پہنچا لی ہے - ہم سُرخروئی کے ساتھ اپنے شہنشاہ قیصرِ ہند ہز مجسٹی جارج پنجم کے حضور میں یونیورسٹی کے چارٹر کی درخواست کر سکیں - ورنہ جو عظیم الشان کام شروع ہونے کو ہے - اُس کے لئے جتنا سرمایہ ہو کم ہے - یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور اُنکے خزانے اور سرمائے اس امر کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ

میں دولت علم کسی قوم کو بغیر پانی کی طرح روپیہ بہائے حاصل نہیں ہوتی۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایک مرتبہ تحصیل علم کے لئے چاندی صرف کرکے ترقی یافتہ قومیں اپنی علوم کی بدولت دونوں ہاتھوں سے سونا سمیٹتی ہیں اور جو خرچ ہوتا ہے۔ اُس سے بدرجہا زیادہ نفع اٹھاتی ہیں۔ لیکن پہلے دل کھول کر روپیہ لگاتی ہیں۔ اور ہم اگر چاہیں کہ ترقی میں ان کے برابر پہنچ جائیں تو ہمیں بھی فیاضی سے کام لینا ہوگا۔

گو ہمارے کان یونیورسٹی کے لفظ سے ایک عرصہ سے آشنا ہیں اور اب ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام بھی ایک ممکن العمل خیال نظر آرہا ہے۔ تاہم عجیب بات ہے کہ مسلمان جو ایک زمانہ میں قرطبہ اور بغداد کی یونیورسٹیوں کے بانی تھے اور جو مشعل علم لیکر یورپ میں پہنچے تھے۔ آج یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یونیورسٹی کیا چیز ہے۔ اور مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ عام اس سے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ یونیورسٹی کے صحیح مفہوم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یونیورسٹیاں ہندوستان میں نئی چیز ہیں جو انگریزی عملداری میں وجود میں آئی ہیں اور دوسری یہ کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ایسے نمونہ پر بنی ہیں کہ وہ مقصدِ اصلی جو بیشتر ممالک یورپ میں یونیورسٹی کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ اُن سے پورا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا کام امتحان لیکر سند دینا ہے اور تعلیم و تعلّم کالجوں اور دیگر درسگاہوں کے سپرد ہے۔ جن پر پہلے یونیورسٹیوں کی کوئی نگرانی نہیں ہوتی تھی اور اب نئے ایکٹ یونیورسٹی ہائے ہند کے بعد کسی قدر نگرانی یونیورسٹیوں کی طرف سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اس سے یونیورسٹیوں کی اس صفت میں فرق نہیں آتا کہ اس ملک میں وہ فقط امتحان لینے والی جماعتیں ہیں۔ مگر یورپ کی یونیورسٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یونیورسٹیاں پڑھنے والوں یا پڑھانے والوں کی جماعتیں تھیں اور اب تک بہت سی قدیم یونیورسٹیوں میں وہی شان باقی ہے۔

لفظ یونیورسٹی لغت کے اعتبار سے لاطینی زبان کے ایک لفظ یونیورسیٹاس سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں کُل بمقابل جُزو۔ اور جماعت۔ گروہ۔ کمپنی۔ یا ایسوسی ایشن۔ اسی اشتقاق کی وجہ سے لفظ کلیہ عربی زبان میں اسکا ہم معنی سمجھا جاتا ہے جماعت یا کمپنی کے معنوں میں لفظ یونیورسیٹاس اہلِ روما کے قوانین میں مستعمل تھا اور اصطلاحی طور پر کسی ایسی جماعت کے لئے جو کسی خاص اور مسلسل مقصد کے لئے قائم ہو مستعمل ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یورپ کی تاریخ کے قرونِ وُسطیٰ میں علمی درسگاہوں کے لئے کام آنے لگا جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ معلموں کی کُل جماعت یا متعلمین کی کل سوسائٹی۔ یا دونو۔ جسے مجموعی طور پر کچھ حقوق و اختیارات حاصل ہوں۔ اور جو اپنے انتظام کیلئے آپ قواعد مرتب کر سکے۔ گو رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے مفہوم میں یہ داخل ہو گیا کہ علوم کی تمام ضروری شاخیں یونیورسٹی میں پڑھائی جاویں اور آج کل سب بڑی بڑی یونیورسٹیاں سب بڑے بڑے علوم میں درس دیتی ہیں۔ لیکن بارھویں صدی عیسوی میں جب یہ لفظ پہلے پہل یورپ میں تعلیم گاہوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ تو یہ کوئی ضروری شرط نہیں تھی۔ پیرس کی یونیورسٹی فرانس میں اور کیمبرج اور اکسفورڈ کی یونیورسٹیاں انگلستان میں پہلے صرف ایک صیغے کی تعلیم گاہیں تھیں یعنی فقط آرٹس فیکلٹی رکھتی تھیں اور سلرنو اور مونٹ پیلیئر میں صرف طبّیہ فیکلٹی تھی۔ بعض اصحاب کیمبرج اور اکسفورڈ کی موجودہ حالت سے استدلال کرتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کے وجود کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس میں متعدد کالج ہوں جنکے مجموعہ کا نام یونیورسٹی رکھا جائے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کالجوں کا تعدد یونیورسٹی کی لازمی صفت نہیں۔ جرمنی میں بہت سی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جنکے ماتحت کوئی کالج نہیں۔ اور خود اکسفورڈ اور کیمبرج میں یونیورسٹیاں پہلے موجود تھیں اور کالج فیاض لوگوں کے ذاتی عطیوں سے بعد میں قائم ہوئے ہیں[1]

[1] یہ حالات امپیریل ڈکشنری میں درج ہیں اور وہاں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدا اور اُنکی ترقی کے حالات بجائے خود دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمارے لئے بہت کچھ سبق آموز ہیں اور اُنکی ترقی کی دشوار گزار منزل میں راہبر کا کام دے سکتے ہیں۔ اِس لئے کسی قدر اور بسط کے ساتھ اُن کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یونیورسٹیاں جس حالت میں ہمیں اب نظر آ رہی ہیں۔ قائم ہونے کے وقت اُن کی یہ صورت نہیں تھی۔ بتدریج بڑھتے بڑھتے اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں۔ علما کا یہ طبعی میلان کہ علمی مشاغل میں ایک دوسرے کی مدد سے فائدہ اُٹھائیں اور مل کر علمی مشکلات کو حل کریں۔ اوّل اوّل ان جماعتوں کے قیام کا باعث ہوا۔ پہلے تو کلیسا ایسی جماعتوں کے وجود سے خوش نہ تھا۔ مگر پھر یہ سمجھ کر انہیں ہاتھ میں لینا انہیں مخالف بنانے سے زیادہ مفید ہے۔ کلیسا نے اُن کے وجود کو تسلیم کرنا شروع کیا اور ایسی جماعتیں یا پاپائے روما کے فرمانِ خاص یا بادشاہ کے حکم سے قائم ہونے لگیں۔ یا تسلیم کی گئیں۔ چنانچہ شاہ فرڈرک ثانی نے نیپلز یونیورسٹی کی بُنیاد ڈالی۔ پوپ گریگوری نہم نے ٹولوس کی یونیورسٹی قائم کی۔ اور پوپ انوسنٹ چہارم نے خود روما میں یونیورسٹی بنائی۔ بولونا کی یونیورسٹی حقیقت میں چار یونیورسٹیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک لومبارڈ لوگوں کے لئے۔ دُوسری ٹسکنی کے باشندوں کے لئے۔ تیسری شمالی کوہستان کی دُوسری طرف کے ساکنوں کیواسطے اور چوتھی اہل روما کے لئے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چاروں یونیورسٹیاں مختص القوم یونیورسٹیاں تھیں اور اُس وقت لفظ یونیورسٹی کا مفہوم ہر ایسی جماعت تھی جو باقاعدہ تعلیم کے مقصد سے قائم ہو۔ اُسی زمانہ میں پیرس کی یونیورسٹی میں یہی نمونہ قومی تقسیم کا موجود تھا۔ فرانسیسی زبان کے بولنے والے ایک جماعت تھے۔ نارمنڈی کے علاقہ کے لوگ دُوسری جماعت۔ پکارڈین لوگ تیسری جماعت اور انگلش چوتھی۔ گو انگلش حصّہ کا نام بعد میں جرمن رکھا گیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی یونیورسٹیاں کچھ بولونا اور کچھ پیرس کے نمونہ پر مبنی تھیں۔ بولونا اصل میں متعلّمین کی جماعت تھی۔ اور پیرس معلّمین

کی۔ مقدم الذکر میں سب انتظام طلبہ کے ہاتھ میں تھا۔ دو اعلیٰ عہدہ دار جنہیں ریکٹر کہتے تھے۔ طالب علموں کے انتخاب سے مقرر ہوتے تھے۔ جنہیں اگر کبھی کسی جوابدہی کا موقعہ پڑے تو طالب علم ہی اُن سے جواب طلب کر سکتے تھے۔ یہ طلبہ عموماً پختہ عمر کے ہوتے تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ برعکس اس کے پیرس میں جہاں معلّمین کے اتحاد کا نام یونیورسٹی تھا۔ طلبہ عموماً کم عمر ہوتے تھے اور انتظام اساتذہ کے ہاتھ ہوتا تھا اور طلبہ ہر طرح اساتذہ کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے۔ یہ یونیورسٹی درحقیقت یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں کا منبع ہے۔ نوٹرڈیم کے گرجا کے ساتھ ایک مدرسہ تھا جو اس یونیورسٹی کی ابتدا ہی۔ بعض کے نزدیک سنہ ۱۱۴۰ء میں اور بعض کے نزدیک سنہ ۱۱۷۰ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس جماعت کو خاص خاص حقوق دیئے گئے تھے۔ گو سب ایک وقت میں نہیں ملے اور متواتر جدوجہد سے حاصل کئے گئے۔ ایک حق یہ تھا کہ جو لوگ یونیورسٹی کے زیرِ سایہ تھے وُہ بعض ٹکسوں اور محصولوں اور دیوانی عدالتوں کے اختیارِ سماعت سے مستثنیٰ تھے اور جب کسی یونیورسٹی والے کے برخلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو وُہ یہ حق رکھتا تھا کہ جس شہر میں یونیورسٹی ہے اس میں مقدمہ منتقل کرائے اور خود یونیورسٹی کے حکام اُس کے مقدمہ کو سُنیں۔ اس کے علاوہ بعض اَور چھوٹی چھوٹی رعائتیں اور حقوق یونیورسٹی سے متعلق تھے[۱]۔

اکسفورڈ اور کیمبرج میں جو طریق کالجوں کا بعد میں مروّج ہوا۔ وُہ بھی پہلے پیرس ہی سے شروع ہوا۔ کئی مخیّر آدمی کارِ ثواب سمجھکر چاہتے تھے کہ غریب طلبہ کے رہنے کے لئے کوئی جگہ بنا دیں۔ تاکہ انہیں دورانِ تعلیم میں رہنے کی جگہ ڈھونڈھنے اور کرایہ کی زیرباری اُٹھانے کی تکلیف نہ ہو۔ اس طرح متعدد مکانات بن گئے۔ جن میں سے ہر ایک میں ایک خاص تعداد طلبہ کی ایک مستند عالم کی نگرانی میں رہنے لگی۔ نگران عالم کو ماسٹر کہتے تھے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج میں یہی عمارتیں جُدا جُدا کالج قرار پائیں۔ جن کا

[۱] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا۔

اندرونی انتظام بالکل اُنکے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اور اپنے اپنے طلبہ کی تعلیم کی نگرانی کالج ہی کرتے ہیں البتہ ہر مضمون کے لئے یونیورسٹی کیطرف سے اعلیٰ درجہ کے اُستاد مقرر ہیں جنکے لکچروں سے سب کالجوں کے طلبہ یکساں مستفید ہو سکتے ہیں۔ اور امتحانات اور سندات کا انتظام یونیورسٹی کے ہاتھوں میں ہے۔ مگر سکاٹلینڈ میں بعض یونیورسٹیاں مثل سینٹ اینڈریوز کے ایسی ہیں جن کے کالج ڈگریاں عطا کرنے کے لئے خود اپنے طلبہ کا امتحان لیتے ہیں۔ اور یونیورسٹی پڑھائی کا انتظام کرتی ہے۔

ممالک یورپ میں جرمنی وہ مُلک ہے جس میں یونیورسٹیاں فرانس اٹلی اور انگلستان کے بعد قائم ہوئی ہیں اور وُہ بہت سی باتوں میں فرانس کی یونیورسٹیوں سے اور بہت سی باتوں میں سکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں سے مشابہ ہیں۔ وُہ پڑھانے والی جماعتیں ہیں اور اُن کے پروفیسر وُہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے فن میں مہارتِ خاص رکھتے ہیں اور مدتوں ایک فن کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں۔ ان کی بڑی رقوم پروفیسروں کی تنخواہوں کے لئے مخصوص کی ہوئی ہیں جنکی آمد سے پروفیسر تنخواہیں پاتے ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو اُنکے لکچروں سے مستفید ہونیکے واسطے بہت کم فیس دینی پڑتی ہے۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں کے فرائض کے متعلق جدید خیال یہ ہے کہ صرف طلبہ کو پڑھانا انکا کام نہیں ہے۔ بلکہ اُس مضمون میں جس کے وُہ پروفیسر ہیں کوئی نئی تحقیقات کرنا اور اسکی معلومات میں کچھ مفید اضافہ کرنا انکا خاص فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور اس خیال کی وجہ سے طلبہ کو سبق دینا اُن سے کم درجہ کے اساتذہ سے متعلق کیا جا رہا ہے تاکہ انہیں زیادہ وقت علمی تحقیقات اور جدید معلومات کیلئے مل سکے۔

پُرانی یونیورسٹیوں کے سوا انگلستان میں بہت سی نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں۔ جن میں سے اکثر ایک ایک کالج والی ہیں۔ یعنی پہلے ایک کالج تھا جو ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے۔ ان میں علومِ قدیمہ کی طرف کم توجہ ہے اور سائنس اور دیگر علومِ جدیدہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ یہ عام لوگوں کے لئے مفید تر ہیں۔ اب قدیم یونیورسٹیاں یا تو طبقۂ اُمرا کے لئے مخصوص ہوتی جاتی ہیں۔ یا اُن لوگوں کے لئے جو ملازمت کے بعض صیغوں کے لئے پُرانی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو کارآمد پاتے ہیں۔

محمدن یونیورسٹی کی تجویز کے متعلق بہت سی شکوک وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر کا جواب مندرجہ بالا تاریخی حالات میں موجود ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ مختص القوم یونیورسٹی بنانے کے نظائر نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یونیورسٹیاں پہلے مختص القوم تھیں اور اب تک بعض ہیں با عتبار مقصد یہ خصوصیت باقی ہے۔ گو دوسری قوم کے لوگوں کو اُن میں داخل ہونیکی اجازت ہے اور یہ بات مجوزہ محمدن یونیورسٹی میں بھی موجود ہوگی۔ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علیگڈھ میں تا حال فقط ایک کالج ہے۔ اسے یونیورسٹی کا رتبہ کیونکر حاصل ہوگا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسوقت انگلستان میں کئی یونیورسٹیاں ہیں جو فقط ایک ہی کالج رکھتی ہیں۔ اور کالجوں کا یونیورسٹی سے ملحق ہونا یونیورسٹی کی ہستی کے لئے کوئی لازمی صفت نہیں ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ علیگڈھ کالج جب تک صرف آرٹس کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے یونیورسٹی کا لقب کیونکر دے سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بانیانِ یونیورسٹی عزم تو یہ رکھتے ہیں کہ علیگڈھ علوم و فنونِ مختلفہ کا مرکز بنجائے۔ مگر جب تک وُہ اس منتہائے خیال کو نہ پہنچ سکیں۔ اس سے پہلے بھی کسی ایک یا دو صیغوں کی تکمیل ہی اسے یونیورسٹی بنا دینے کے لئے کافی ہوگی۔ اصل چیز جس کے مسلمان آرزومند ہیں اور جس کا ہر دُور اندیش شخص کو آرزومند ہونا چاہئے۔ یہ ہے کہ اپنی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں ہو۔ شمس العلما مولینا شبلی نعمانی نے اس مطلب کو کس خوبی اور برجستگی سے اپنی نظم کے مطلع میں ادا کیا ہے۔ جو انہوں نے ۲۵۔ ماہ فروری کو لاہور کے اُس عظیم الشان جلسہ میں پڑھی تھی۔ جس میں علاوہ ریاست بہاولپور سے ایک گرانبہا عطیہ کی اُمید کے اہل پنجاب کیطرف سے اڑھائی لاکھ روپیہ کے وعدے یونیورسٹی فنڈ کے لئے ایک نشست میں ہوگئے تھے۔ وُہ فرماتے ہیں:۔

ہمیں یک لفظ از یونیورسٹی مُدعا باشد   کہ ایں سر رشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

عبدالقادر

ہوا میں اُڑنا

سلسلہ کے لئے دیکھو "مخزن" بابت اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء جلد ۲۰ نمبر ۱

سنہ ۱۷۸۵ء میں بلانشارڈ اور ڈاکٹر جان جفریس نے بوسٹن سے بیلون میں بیٹھ کر دوفر سے فرانس کی جانب گزرنے کی جُرأت کی اور بمشکل ڈوبتے ڈوبتے بچے

اسی سال ایک انگریز لیڈی مسز سیج نے ۲۹ جُون کو بیلون میں اُڑ کر اپنی جُرأت کے جوہر دکھائے - یہی پہلی انگریز لیڈی تھی جس نے پرواز میں اپنے ابنائے وطن پر سبقت کی۔

اسی سال بیلون سے پہلا مُہلک حادثہ ظہور پذیر ہوا - یعنی روزیار اور ایک نوجوان رُومان لانی نے ایک ہیڈروجنی بیلون کے ذریعہ فرانس سے انگلش چینل کو عبور کر کے انگلستان پہنچنے کا قصد کیا - حسبِ ضرورت قوّتِ صعود کے بڑھانے گھٹانے کے لئے ایک چھوٹا بیلون نیچے لٹکایا گیا تھا - جب "بیلون" بلند ہوا تو اُوپر کی ہوا لطیف ہونے کی وجہ سے بیلون پر دباؤ کم ہوگیا اور ہیڈروجن کی قوتِ تمدّد سے "بیلون" پھٹ گیا - یا جیسے "بعض کا قول ہے کہ "بیلون" کسی بے احتیاطی سے جل گیا اور یہ دونوں ساحلِ فرانس کے قریب تین ہزار فٹ کی بلندی سے چٹانوں پر گر کر پاش پاش ہوگئے

اس حادثہ سے لوگوں پر ایک سنسنی ضرور پھیل گئی - مگر اُنہوں نے ہوا میں اُڑنے کا خیال ترک نہیں کیا بلکہ اس کے بعد بھی سیکڑوں ہزاروں آدمی "بیلون" میں اُڑا کئے اور ہر زمانہ کے ماہرین اُن نقائص کی اصلاح کی جانب زیادہ تر توجہ دیتے رہے جن کی وجہ سے اس قسم کے حادثے ہوا کرتے تھے چنانچہ "بیلون" کا

کبڑا گیس کی قوّتِ تمدُّد کا مقابلہ نہ کرسکنے کی وجہ سے بیلون پر باریک رسّیوں کا جال بُننا شروع کیا گیا۔ گیس کی کوئی حد معیّن نہیں تھی بہت سی اُلٹ پلٹ کے بعد اس کی مناسب مقدار "بیلون" کے اعتبار سے مقرر کی گئی۔ اسی طرح صابورہ[۱] کی بھی مقدار معیّن کی گئی۔ چنانچہ گلیچر جو فرانس میں مشہور پرواز کنندہ ہے اس کی یہ رائے ہے کہ اگر بیلون کی وسعت نو ہزار ۹۰۰۰ مکعب فٹ ہو تو اس میں صرف ایک ثلث یعنی تین ہزار مکعب فٹ گیس اور چھ سو ۶۰۰ پونڈ صابورہ بھرا جائے۔ اس طرح صرف "بیلون" کے پھٹنے کا بچاؤ ہو گیا اور اُوپر چڑھتے جانے کی تجویز نکل آئی۔ لیکن "بیلون سوار" کا اُترنا اس کے مطلق اختیار میں نہ تھا اور بیلون تنہے جہاز کی طرح یا تو سیدھے اُوپر چڑھتے جاتے یا ہوا کے تموّج سے اِدھر اُدھر منڈلاتے پھرتے اور کہیں کے کہیں نکل جاتے تھے اس لئے تھوڑی تھوڑی بلندی تک اڑنے کی صورت میں اُترنے اور بیلون کو قابو میں رکھنے کے لئے اس سے ایک لمبی رسّی باندھنا تجویز ہوا جس سے "بیلون" تموّجِ ہوا میں ڈگمگانے سے محفوظ رہتا تھا اور اُترنا چاہتے تو نیچے سے پتنگ کی طرح رسّی کو کھینچ لیتے تھے۔ اس کی ابتدا سنہ ۱۷۹۴ء کی جنگ فرانس و جرمنی سے پائی جاتی ہے جس میں فرنچ جنرل جارڈوں کی ماتحت "بیلون پارٹی" نے ہوائی تموّج سے "بیلون" کو روکنے کے لئے یہی تجویز اختیار کی تھی۔ چنانچہ فوجی غبارے جو جنگی اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُن میں اب بھی بعض وقت یہی ہوتا ہے کہ ایک دراز رسّی[۲] کا ایک سرا "بیلون" سے اور دُوسرا سرا ایک آلہ سے باندھ دیتے ہیں جس سے رسّی حسبِ ضرورت بآسانی کھولی اور لپیٹی جاسکتی ہے۔

سلہ وہ ریت مٹی وغیرہ جو اس غرض سے بیلون میں رکھی جاتی ہے کہ ضرورت کے وقت اسکو پھینک پھینک کر بیلون کو ہلکا کر دیا جائے ۱۲ سلہ۲ عموماً اس رسّی میں ٹیلیفون کا تار ہوتا ہے جس کے ذریعہ بیلون سوار اپنے چشم دید حالات کی اطلاع دیتا رہتا ہے ۱۲

زیادہ بلندی تک اُڑنے میں یہ تجویز کام نہیں دیتی تھی۔ اس لئے ایسی صُورت
میں اُترنے کے لئے "پیراشوٹ" یعنی ایک قسم کی چھتری ایجاد کی گئی۔ جو ایک
رسّی کے ذریعہ "بیلون" سے بندھی رہتی تھی جب اُترنا مقصود ہوتا وُہ رسّی کاٹ دیجاتی
"اور بیلون سوار" چھتری کو لیکر کُود پڑتا۔ چھتری کھُل جاتی اور اُس میں ہوا بھر کر آہستہ
آہستہ زمین پر اُتر آتا۔ چنانچہ اسکا استعمال ۱۷۹۷ء سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض صُورتوں میں یہ تجویز بھی ناکافی ثابت ہوئی اور اس میں بڑی خرابی
یہ تھی کہ بعض وقت "بیلون" سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا اس لئے اُترنے کے لئے ایک
آلہ ایجاد کیا گیا یعنی بیلون میں اُوپر کی جانب ایک ڈھکنا لگانا تجویز ہوا جو ڈوری
کھینچنے پر کھُلتا اور خود بخود بند ہو جاتا تھا۔ جب اُترنا مقصُود ہوتا یہ ڈوری کھینچے
سے ڈھکنا کھُل جاتا اور ہلکی گیس اس میں سے خارج ہو کر "بیلون" بھاری ہو جاتا اور
طبعاً سر در نشیب ہونے لگتا۔ لیکن ڈھکنا کھولنے میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری
درکار ہوتی ہے کیونکہ اگر وُہ زیادہ کھُلا رہے اور گیس کی کثیر مقدار خارج ہو جائے
تو "بیلون" اپنی مساوی الحجم ہوا سے زیادہ بھاری ہو جانے کی وجہ اوپر پھینکے
ہُوئے پتھر کی طرح اس زور سے زمین پر گرے کہ اُسکے دھماکے سے بیٹھنے والے
کو سخت ضرر پہنچے۔

ہیڈروجن گیس چُونکہ بڑی دقّت سے فراہم ہوتی تھی اِس لئے بنظرِ سہُولت
اِس کے عوض "کول گیس" بھرنا تجویز ہوا اور سب سے پہلے پروفیسر گرین (انگریز) نے
اس کی رائے دی۔

ہم "بیلون" کی اِن مختصر اصطلاحات کا ذکر کرنے کے بعد پھر اُس کے تاریخی پہلو
کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کے خیالات "بیلون" کی جانب زیادہ تر
منعطف ہو گئے اور اُس سے مفید کام لینے کی دھُن ہو گئی تو جنگی اغراض کے لئے

اس کا استعمال مفید سمجھا گیا اور دشمن کی نقل وحرکت اور دوسری کُل ایسی باتیں جو نظر سے اوجھل ہوں۔ بیلون کے ذریعہ بلندی سے دیکھ لینے کا خیال پیدا ہو گیا اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی اور بہت سے فوائد حاصل ہُوئے چنانچہ جنگ فلورس واقع ۱۷۹۴ء میں جنرل جارڈن کی فتح "بیلون" پارٹی ہی کی وجہ سے ہُوئی جو آسمان میں منڈلاتے ہُوئے جرمنی فوج کا معائنہ کر لیتی اور اس کی نقل و حرکت کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتی رہتی تھی۔ اہل جرمن جو اس سے محض لاعلم تھے نہایت متحیر تھے کہ ہماری حالت کا غنیم کو کس طرح پتہ لگ جاتا ہے اس کے بعد سے موڈن علاقہ فرانس میں بیلون کی تعلیم کے لئے خاص طور پر ایک مدرسہ قائم کر کے فوجیوں کو اس کی تعلیم ہونے لگی اور فرانس کی فوج میں کئی بیلون تیار کئے گئے اور اکثر جنگ کے موقعوں پر اس سے بڑا کام نکلا چنانچہ ۱۸۵۹ء جنگ فرانس و اٹالی میں فرنچ فوج نے بیلون سے بہت فائدہ اُٹھایا رفتہ رفتہ دوسری سلطنتوں میں بھی اس کا رواج ہوتا گیا چنانچہ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء تک کی مقامی جنگوں میں امریکہ کے صیغۂ جنگ نے لاموٹن اور لو اور دوسرے ماہرین فن کے ماتحت ایک "بیلون" پارٹی مقرر کی تھی جس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہُوئے۔ سب سے پہلے جنرل لو نے ہی چھ سو فٹ کی بلندی سے ایک برقی پیام بھیجا۔ جس کے بعد سے اکثر برقی پیامات ہی کا رواج ہوتا گیا۔ ورنہ پہلے "بیلون سوار" چشم دید حالات و واقعات کاغذ پر لکھکر کسی وزنی شے سے وُہ کاغذ باندھ کر نیچے پھینک دیا کرتا یا اُترنے کے بعد وُہ کل کاغذات پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی بعض موقعوں پر یہی طریقہ جاری ہے۔

کچھ عرصہ بعد چند وجوہات اور بعض حادثات کی وجہ سے فرانس میں بھی "بیلون"

کو بیکار چیز سمجھ کر اُس کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا مگر ۷۱۔۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و جرمنی کے موقع پر مارشل لیبوف سے پھر "بیلونی لشکر" تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ اسی طرح اہل جرمنی نے بھی اپنی گورنمنٹ سے درخواست کی اور "بیلون پارٹی" مقرر کیگئی۔ لیکن غیر ماہر اشخاص کے زیر نگرانی اس کا انتظام ہونے سے کوئی معتدبہ نتائج نہیں ہوا اور یہ صیغہ پھر نکال دیا گیا۔ جب "جرمنی" فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا اُس وقت "بیلون" کی اہمیت اس طرح ثابت ہوئی کہ اس نازک موقع پر اہل فرانس نے اُن مقامات کی تلاش کے لئے جو ہنوز دشمن کے قبضہ میں نہیں گئے تھے "بیلون" سے کام لینا چاہا مگر کچھ عرصہ سے اس کا استعمال متروک ہو جانے سے اس مقصد کے مفید کوئی "بیلون" شہر بھر میں دستیاب نہیں ہوا تو فوراً خاص طور پر ریشمی کپڑے کے ستر "بیلون" سات سات ہزار مکعب فٹ وسیع تیار کر کے السی کا تیل اور سفیدہ پکا کر اُن پر پالش کر دی گئی اور باقی کل باتیں معمولی بیلونوں کی سی تھیں۔ سب سے پہلا "بیلون" ۲۳ جولائی کو ۲۷۲ خطوط و کاغذات اور چند پالتو کبوتر ساتھ لے کر چلا اور وفر میں جا اُترا اور وہاں سے کبوتروں کے ذریعہ ضروری حالات سے پائے تخت کو اطلاع دی گئی۔ اسی طرح نامہ بر کبوتر ہر بیلون کا ضروری جزو رہے جن کے ذریعہ وقتاً فوقتاً "بیلون سوار" ضروری اطلاعیں بھیجتے رہتے تھے۔ غرض اس کے بعد اُس تاریخ سے آخر محاصرہ یعنی ۲۸ کانون ثانی ۱۸۷۱ء تک ۶۱ "بیلون" اُڑائے گئے جن میں سے ۵۴ صرف صیغۂ ڈاک نے روانہ کئے تھے جن کے ذریعہ تخمیناً پچیس لاکھ خطوط دو سو اسّی من وزنی بھیجے گئے تھے۔

انہی "بیلونوں" میں سے "ورسنٹلن" نامی ایک بیلون جرمنی فوج کے پڑاؤ سے ڈھائی تین ہزار بلندی سے گزر رہا تھا تو غنیم نے اُس پر گولیاں چلائیں اور مسافر جن

”بیلون“ نے جھٹ ”بیلون“ کو اونچا کر کے اپنے آپ کو دشمن کی زد سے بچا لیا
اِن کُل ”بیلونوں“ میں سے بعض تو فرانس کی حدود سے پار نکل گئے۔ ایک بیلون دشمن کی
فوج میں جا اترا اور تین بالکل بے پتہ رہے۔ اس جنگ کے ختم پر عموماً کل دول یورپ اور
خصوصاً جرمنی نے بیلون کی اہمیت تسلیم کر کے اُس کی جانب معقول توجہ دی اور ”بیلون“
صیغہ جنگ کا ایسا لازمی جُز ہو گیا کہ جس سلطنت میں ”بیلون پارٹی“ نہ ہو اُس کا صیغہ
جنگ ناقص خیال کیا گیا۔ اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ ”بیلون اس قدر روز افزوں ترقی
کرتے اور مفید ثابت ہوتے گئے کہ بہت جلد انہیں ”ہوائی غباروں“ سے ”ہوائی جہازوں“
کا لقب ملا اور یہ اُمید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی کہ جنگی جہازات کی طرح یہ ”ہوائی جہاز“
بھی مُلک کی حمایت اور غنیم پر آگ برسانے میں قابل قدر مدد دیں گے چنانچہ اس وقت
تک اس میں کس حد تک ترقی ہو گئی ہے۔ ہم اس کا ذکر بعد میں کرینگے۔

”بیلون“ سے سیر و تفریح اور جنگی فوائد کے علاوہ علمی تحقیقات میں بھی بہت
مدد ملی ہے۔ سنہ ۱۸۰۳ء سے قبل علمی تحقیقات کے لئے ”بیلون“ میں اُڑنے کا پتہ نہیں لگتا ہے
پہلے اسی سال ایک روسی علمی سوسائٹی کی تحریک پر رابرٹسن بعض علمی مسائل کی تحقیق
کے لئے اوّلاً بمقام ہمبرگ اور سنہ ۱۸۰۴ء میں دوبارہ سہ بارہ بمقام پیٹرسبرگ غبارہ میں
بیٹھکر اُڑا۔ یہ بعض مرتبہ ۲۳۵۲۲ فٹ بلندی تک پہنچ گیا تھا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب
نہیں ہوا۔

اسی سال فرانس کی ایک علمی سوسائٹی کی تحریک پر بعض علمی مسائل خصوصاً بلند مقامات
کی جاذبیت وغیرہ امور کی تحقیق کے لئے گاے لوساک (Gaylussac) نے
بمقام پیرس دو تین بار ”بیلون“ کے ذریعہ بلند پروازی کی چنانچہ پہلی مرتبہ یہ تیرہ ہزار
فٹ اور دوبارہ تئیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچا اور کئی تجربات حاصل کئے۔ ”مقیاس الحرارت“
(تھرمامیٹر) جو اس وقت پیرس میں ۸۲ درجہ تھا۔ تئیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچنے تک

بتدریج اُترتے اُترتے ۱۰ درجہ تک اُتر گیا۔ جس سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ تقریباً ہر تین سو فٹ بلندی پر ایک ایک درجہ حرارت کم ہوتی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے یہ دیکھا کہ اُوپر پہنچنے کے بعد زمین بھی مقعر معلوم ہونے لگتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو مقعر قبوں (ایک آسمان اور دُوسری زمین) کے درمیان معلق ہیں۔ اُس کو آسمان کا نیلا نیلا رنگ گہرا سیاہ نظر آنے لگا۔ دَم گھُٹنے اور حلق خشک ہونے لگا۔ نبض بہت تیز چلنے لگی۔ شدتِ سردی سے اعضا شل ہونے شروع ہو گئے۔ زور سے چلانے پر بھی بالکل موہوم اور خفیف آواز سُنائی دیتی تھی۔ یہی سب سے پہلے اتنی اونچائی کی ہوا کسی قدر جمع کر لایا تھا۔ جس کے بھی ٹھیک وہی اجزائے اصلی ثابت ہُوئے جو زمین سے متصل ہُوا کے ہیں۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں کارلو بروسکی فلکی جو پہلا اٹالین پرواز کنندہ تھا بمقام نیپلز علاقہ اٹالی گائیلساک سے بھی زیادہ بلندی پر پہنچ گیا تھا لیکن بیلون کے پھٹ جانے سے زمین پر گر پڑا اور تعجب خیز بات یہ کہ بال بال بچ گیا۔ اس کے بعد سے سنہ ۱۸۵۰ء تک کسی شخص کے علمی اغراض کے لئے ہُوا میں اُڑنے کا پتہ نہیں چلتا۔

سنہ ۱۸۵۰ء میں بکسیو نے بمقام پیرس اور سنہ ۱۸۵۲ء میں گرین نے بمقام لندن پھر بھی تحقیقاتِ علمی کی غرض سے پرواز کی اور پہلا اُنیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچکر کسی حادثہ کی وجہ سے اُتر آنے پر مجبور ہو گیا اور دُوسرے نے حسب مراد بلندی پر پہنچکر ٹھیک وہی تجربات حاصل کئے جو گائیلساک نے کئے تھے۔

سنہ ۱۸۶۲ و ۶۳ء میں گلیشر ڈ جو اس سے پہلے تخمیناً چار سو مرتبہ ہُوا میں اُڑا تھا تقریباً سات میل بُلندی تک پہنچ گیا۔ ساڑھے پانچ میل بلند ہونے کے بعد سے اس کے

ہاتھ پیر شل ہونے لگے۔ حتیٰ کہ بیلون کے ڈھکنے کی رسّی کھینچنے کے ناقابل ہو گئے۔ گرمی آنے کی غرض سے ہاتھوں پر برانڈی ڈالی گئی۔ پھر بھی کچھ نہ ہوا آخر دانتوں سے رسّی کھینچی۔ اس نے پہلے سفر میں درجۂ حرارت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کی تفصیلی کیفیت تحقیق کی۔ دُوسرے سفر میں ہوائی گرم مَوجوں میں جا پہنچا اور طبقہ وار اُنکے درجات حرارت کی کمی وبیشی اس کی رفتار وغیرہ کل امور دریافت کئے۔

علم ہیئت کے متعلق بھی بہت سی مزید تحقیقات اور بعض خاص موقت امُور مثلاً کسُوف وخسوف وغیرہ کی دریافت میں "بیلون" سے بہت کام لئے گئے۔ حاصل یہ کہ "بیلون" کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جو بیشمار علمی تحقیقات ہوئیں اور بہت سے فوائد حاصل ہوئے اُن کی پُوری پُوری تفصیل کیجائے تو ایک دفتر ہو جائے۔

ہر زمانہ میں "بیلون" کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ماہرین فن کے حوصلے بھی بڑھتے گئے اور بڑے بڑے سفر کرنے کی جرأت ہونے لگی۔ چنانچہ ہم چند مشہور پرواز کنندہ اشخاص کے مشہور سفروں کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی اولوالعزمی اور ہوا میں اُڑنے کے مقصد میں بتدریج کامیابی حاصل کرنے کا پتہ چل سکتا ہے۔ فلا ماریون "جو بیلون" کی رفتار کے سکون و تکان کا محقق مانا گیا ہے اور جس نے اپنے کسی ہوائی سفر میں سب سے پہلے یہ تحقیق کی تھی کہ اگرچہ "بیلون" ہوائی تموج سے ہر لحظہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں فٹ اوپر چڑھتا اور نیچے اُترتا تھا۔ پھر بھی اس کی رفتار ایسی بے تکان تھی کہ پانی سے لبریز گلاس تک چھلکنے نہ پاتا تھا۔ اپنے ایک سفر میں ۲۰ میل کا دھاوا مارا تھا۔

۲۶۔ جولائی ۱۸۰۵ء کو ایک لیڈی مسز گریہام رات کے وقت تن تنہا اپنے "بیلون" میں جس کا نام اُسی کے نام پر رکھا گیا تھا۔ سوار ہو کر بہت عرصہ تک ہوا میں اُڑتی رہی۔ لیکن صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس قدر بلندی پر پہنچی اور کتنی مسافت طے کی۔

چنداں ارزاں نہیں مگر ایک اور عتبار سے یہ نہایت کم قیمت حاصل ہوئی ہے کیونکہ کچھ زمانہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا کہ "بیلون" کے تجربات میں پچیس۲۵ آدمی سے زیادہ ہلاک نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے مقابل قطب شمالی کی تحقیق میں ساڑھے سات سو جانیں تلف ہو چکی ہیں۔

اب وُہ دِن دُور نہیں کہ "ہُوا میں اُڑنا" بھی سطح آب پر تیرنے کی طرح ایک معمولی بات سمجھا جائیگا اور "ہُوائی جہاز" یا گاڑیاں بھی برّی و بحری ذرائع آمدورفت "ریل" اور "جہاز" کی طرح مستقل اور عام سواری کے کام آئینگی۔ چنانچہ یورپ و امریکہ میں اس وقت "ہُوا میں اُڑنا" مستقل فن تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے۔ ہُوائی جہازوں اور گاڑیوں کی تجارت شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ حال کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جہازوں کی مانند رُوس و جاپان وغیرہ نے برلن پایہ تخت جرمن کو ہُوائی جہازوں کی فرمائشیں کی ہیں۔ جرمن میں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء میں اس فن کی تعلیم کے لئے باضابطہ مدرسہ قائم کیا گیا اور دُوسرے علوم و فنون کی طرح اس کے لئے نصاب تعلیم۔ مدّت اور طریقۂ تعلیم وغیرہ اُمور بالکل باقاعدہ طور پر جاری کئے گئے۔ فرانس میں گو خاص مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا البتّہ انجمنوں۔ کلبوں۔ فوجی چھاونیوں میں اس فن کی باضابطہ تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ جہاں شوقین لوگ گیس کی فراہمی ہُوائی مشینوں کے کل پُرزوں کی شناخت اور ساخت۔ ان کا جوڑنا اور استعمال کرنا وغیرہ سب چلکوں میں امتحانات پاس کر کے ہر سال سندات حاصل کرتے رہتے ہیں اور اس کا شوق کچھ ایسا روز افزوں ترقی پذیر اور عام ہوتا جا رہا ہے کہ آئے دن ہُوائی گاڑیوں کی دَوڑ ہوتی ہے۔ منچلے سیاح شرط لگا کر بڑی بڑی مسافتیں طے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ متعلمین تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کی غرض سے بڑے بڑے دھاوے مارتے ہیں۔

اب تک تو ہم یورپ و امریکہ کی ہُوا کھاتے رہے اب خاص ہمارے مُلک میں ہمارے عنوان سے متعلق جو کارروائی ہُوئی ہے۔ اس کا بھی مختصر حال ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ ہندوستان میں فوجی "بیلونوں" کے علاوہ اکثر مقامات پر تماشا کے طور پر بہت سے بیلون اُڑائے گئے ہیں۔ اور اِس وقت "غبارہ" اور "غبارہ میں بیٹھ کر اُڑنے" کے نام سے اکثر لوگوں کے کان آشنا ہو گئے ہیں۔ تخمیناً پچاس سال قبل "بیلون" کا پتہ یہاں نہیں چلتا۔ پہلے پہل سنہ ۱۸۶۷ء میں ایک انگریز نے بمقام بمبئی بیلون میں بیٹھکر اور اہلِ ہند کو بغیر پر کے ہُوا میں اُڑنے کا تماشہ دکھا کر محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ اِتفاق سے یہ "بیلون" تقریباً چھ ہزار فٹ بلند ہو کر یکایک پھٹ گیا اور "بیلون سوار" سمندر میں گر پڑا۔ احتیاطاً پہلے سے سمندر میں کشتیاں۔ جہازات پھیلا دیئے گئے تھے جن کی وجہ سے وُہ غرق ہونے سے بچ گیا۔

سنہ ۱۸۸۸ء میں ایک بنگالی نوجوان رام چندر چیٹرجی نے اوّل کلکتہ اور بعد لاہور الہ آباد وغیرہ مقامات پر "بیلون" کے ذریعہ بلند پرواز کی۔ غالباً یہی سب سے پہلا ہندوستانی ہے جس نے اپنے اہلِ ملک کے لئے نظیر قائم کر دی۔ اور انہیں اس قسم کی جُرأت دکھانے کا سبق دیا۔ اس کے بعد سے تو ہندوستان کے اور مشہور مقامات پر ہُوا میں اُڑنے کا نظارہ بیسیوں مرتبہ دیکھا گیا ہو گا۔

خاص حیدر آباد دکن میں تو اس کا وجود سنہ ۱۲۹۸ھ یا سنہ ۱۲۹۹ھ سے پایا جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی سال میں سالار جنگ اوّل کے عہد میں باغ عام سے ایک "بیلون" اُڑایا گیا تھا۔ یہ "بیلون" ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر راز دار خاں[1] کی پہاڑی پر گرا اور شوقین تماشائیوں نے اطراف و جوانب سے دوڑ دوڑ کر اس کو جا گھیرا اور غربائے

[1] بلدۂ حیدر آباد سے قریب شمالی مغربی گوشہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے چونکہ یہ جس گاؤں کے حدود میں واقع ہے وہ گاؤں کسی زمانہ میں راز دار خان مہدی المخاطب بہ قزول نواز خاں کو سرکار نظام سے جاگیر میں دیا گیا تھا۔ اسی یہ پہاڑی اس وقت سے انہی کے نام سے مشہور ہے ۱۲

اپنی بندوقوں سے "بیلون" کو چاند ماری کا ٹارگٹ بنا دیا۔ خیر گذری کہ "بیلون" خالی تھا اور کوئی اس میں سوار نہ تھا۔

اس کے دوسرے تیسرے سال اسی مقام سے دو یورپین "بیلون" میں بیٹھ کر اُڑے اور شہر سے مشرقی جانب چار میل کے فاصلہ پر سرورنگر کے قریب صحیح سالم اُترے۔ اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں ایک اٹالین لیڈی مس وآنکل بیلون میں پانچ ہزار فٹ بلند اُڑ کر چھتری (پیرا شوٹ) کے ذریعہ نیچے اُتر آئی۔ اسی کے دو چار روز بعد پھر دوبارہ اُڑی اور پہلے سے زیادہ بلندی پر پہنچ کر شہر سے مغربی و شمالی جانب چھ میل پر اُتری۔ اس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ حیدر آباد میں ہوا میں اُڑنے کا نظارہ دیکھا گیا ہے مگر افسوس کہ اس وقت صرف حیدر آباد ہی نہیں۔ بلکہ کل ہندوستان میں ان کارگذاریوں کا قریباً کل حصہ یورپینوں ہی کے ہاتھ رہا۔ بعض فوجی سپاہیوں کے علاوہ اہل ملک سے شاذ و نادر ہی کسی شخص نے اس قسم کی بلند پروازی کی جرات کی ہے۔

۱۹۰۷ء میں ہز مجسٹی سراج الملۃ والدین امیر کابل نے سیاحتِ ہند کے وقت ایک مقام پر بنفسِ نفیس ایک فوجی "بیلون" میں بیٹھنے کی جرات دکھائی۔ چونکہ "بیلون" میں اُڑنے کے لئے مہارت ضروری ہے اور غیر عادی شخص نہیں اُڑ سکتا لہٰذا تھوڑی بلندی پر پہنچنے کے بعد بیلون اُتار لیا گیا۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک پنجابی شخص نے بمقام کلکتہ اپنے بنائے ہوئے "بیلون" میں ہوا میں اُڑنے کا کرتب دکھایا۔ عجب نہیں جو یہی سب سے پہلا "بیلون" ہو جو ہندوستانیوں کے ہاتھوں تیار ہوا ہو۔ کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ اہل یورپ نے تو اس مقصد میں اسقدر عروج حاصل کر لیا ہے کہ آسمان کے تارے بن رہے ہیں اور ہم نے ابھی اس کی ابجد خوانی شروع کی ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے اہل ملک بھی اس مقصد میں کافی توجہ کے ساتھ کامیابی حاصل کر کے اپنے ملک کے قدیم "اُڑن کھٹولوں" کو صحیح ثابت کر دکھائیں۔

— سید شہاب الدین مہدی (از حیدر آباد)

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

سلطنت کا انقلاب۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ہندوستان میں مسلمان حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے۔ اور اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ کسی وقت کسی ایک حکمران کے ہاتھ سے کسی خاص شخص یا اشخاص پر ظلم ہو جانا ممکن ہے اور ایسا کبھی خود اپنی قوم کی حکومت میں بھی ہو جاتا ہے مگر بحالتِ مجموعی مسلمان حاکموں کا برتاؤ ملک کی ہندو جماعت کے ساتھ مشفقانہ اور محبت آمیز تھا اور اُن فسانوں میں اکثر مبالغہ ہے جو عام طور پر مسلمانوں کے ظلم کی نسبت زبان زد ہیں۔ لیکن پھر بھی حاکم و محکوم کا تفاوت بہت بڑا تفاوت ہے۔ اب زمانہ نسبتاً بہت ترقی کر گیا ہے اور حاکم و محکوم کے فرائض زیادہ واضح اور مشتہر ہو گئے ہیں اور انگریز حکام رعایا سے بیجا تواضع کے آرزومند نہیں ہیں۔ مگر آج بھی انگریز قوم کا ایک ادنیٰ سپاہی دیسی حکام، معززین اور نیز تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایک خاص رُعب داب رکھتا ہے اور خواہ دیسی رُتبہ میں اس سے بہت اعلیٰ ہو۔ مگر صاحب لوگ بوجہ حکمران قوم میں ہونے کے ضرور زیادہ التفات حاصل کرتے ہیں۔ یہ فاتحیت و مفتوحیت کا قدرتی اثر ہے اور یہی ڈھلتی چھاؤں کبھی قدیم ہندیوں کے مقابلہ میں آریاؤں پر اور آریاؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر سایہ ڈال چکی ہے اور اُسوقت اسی طرح مسلمان کا مسلمان ہونا ہندو جنٹلمین کی نظر میں اس کو اپنے سے کسی قدر زیادہ معزز بناتا تھا اور نیز ساتھ ہی یہ احساس بھی ضرور ہوتا ہوگا کہ جو اعزاز آج اُنکو حاصل ہے کبھی ہمیں حاصل تھا۔ اس کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا اور

فاتحین فاتح بننے کی قوت کھو بیٹھے۔ زمانے کو نہ کسی سے خاص عناد ہے اور نہ کسی کی خاص رعایت۔ فاتحین عزت کے منصب سے معزول ہوئے اور جنہیں استحقاق ثابت ہوا خالی اسامیوں پر لائے گئے ۔ اس وقت ہندوؤں کو ضرور خیال آنا چاہیئے تھا اور آیا ہوگا کہ جو لوگ ہمارا تخت چھین کر ہم سے بڑھ بڑھ کر چلتے تھے۔ آج وُہ بھی پیچھے ہو کر ہمارے برابر آ گئے اور پہلے جو حکومت کی وجہ سے اُن کی ہر ادا ہم سے بہتر نظر آتی تھی۔ اب وقت ہے کہ ہم سب باتوں میں اُن سے بہتر اور برتر ہو کر دکھائیں۔ کیونکہ پہلے اُن کا پاس کرنا پڑتا تھا اور اب برابر کی دَوڑ ہے۔ غرض پہلے اگرچہ میرے عقیدہ میں ہندو مسلمانوں کے اندر کوئی قومی عناد نہیں تھا اور نہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی حکومت سے کوئی وجہ شکایت موجود تھی۔ مگر پہلے فاتح اور مفتوح کی نسبت موجود ہونے اور پھر اُس کے جاتے رہنے پر اس احساس کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا چنانچہ ہوا اور ہندوؤں نے اپنی قوم کو مسلمانوں سے بڑھانے اور بڑھا ہوا ثابت کرنے کے لئے حسب ضرورت قابلیتوں کو حاصل کرنے اور اپنی فطری قابلیتوں کو دکھانے اور اپنے اطوار و عادات کو زمانے کے مناسب بنانے کی اور اپنی قوم کو اس کام کے لئے اُکسانے اور بڑھانے کی کوششیں شروع کیں اور اسوقت ضرور تھا کہ وُہ مسلمانوں کی نسبت اپنی قوم سے زیادہ ہمدردی کرتے اور جس مفاد تک دونوں پہنچ سکتے ہوں جھپٹ کر پہلے اپنے ہمقوم کو اُس تک پہنچاتے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا کیا اور یُوں بے اختیار وُہ قومی خود غرضی پیدا ہوگئی جو آج عداوت کا تناور درخت بن رہی ہے۔ لیکن اگر صرف یہی احساس ہوتا اور دیگر واقعات جو آیندہ پیش آئے نہ پیش آتے تو چونکہ کوئی عناد نہ تھا اور اُدھر مسلمان تازہ صدمہ اُٹھا کر ایسے مضمحل ہو رہے تھے کہ انہیں برسوں تک زمانے کی رفتار پر چلنے

کا خیال نہیں آیا۔ چہ جائیکہ ہندوؤں سے بڑھنے کی کوشش کرتے اِس لئے ممکن تھا کہ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی فوقیت کی یاد اور اُس کی تلافی کی تحریک باقی نہ رہتی اور دو ملکی بھائیوں کے ایک حالت میں ہونے سے ایک کو دُوسرے سے ہمدردی ہو جاتی مگر ہندوستان کے نئے دَور نے دُوسرا سبب پیدا کر دیا جو اب تک قائم ہے۔

عقیدہ قومیّت۔ دُوسرا سبب یہ ہُوا کہ انگریز ہندوستان میں ایسے وقت آئے کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کو جس درجہ تک ہندوؤں نے اپنے زمانے میں اور مسلمانوں نے اپنے زمانے میں پہنچایا تھا اس وقت دونوں اپنے اس سرمایہ کو کھو بیٹھے تھے اور ہندوستان جہالت اور وحشت کا شکار ہو رہا تھا اُدھر انگریز آئے تو اس شان سے آئے کہ اُنکے فنونِ جنگ۔ اُنکی حکمتِ عملی۔ اُن کا آئینِ ملکداری۔ اُن کی صنعتیں اور اُنکے علوم۔ غرض ہر ادا سے ہندوستانی حیران رہ گئے۔ کیونکہ سب باتیں اُن کی سمجھ میں فوق العادت تھیں اور وُہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کبھی ڈرتے تھے کہ یہ کوئی بلا ہیں اور کبھی تعریف کرتے تھے کہ آدمیت ہر تو انہی میں ہے۔ اس حیرت و استعجاب نے دل میں تجسس پیدا کیا اور انگریزوں کے ایسے کمالات اور ایسی کامیابی و اقبالمندی کی وجہ تلاش کرنے لگے۔ مگر آہ۔ جہالت بُری چیز ہے۔ دماغ کام نہیں دیتا اور بالخصوص قومی جہالت انسان کو صدیوں تک برباد رکھتی ہے۔ اور دو چار دس روشنی میں آئیں بھی تو اُنکے دماغ ایسے سلیم نہیں ہو سکتے جس قدر کسی ترقی یافتہ قوم اور اُس کے علما کے ہونے چاہئیں چنانچہ انگریزوں کی نسبت بہت سے استدلال قائم ہوئے اور اکثر میں دھوکا کھایا۔ سمجھا گیا کہ اُنکے علوم و فنون حاصل کرنے چاہئیں اور درست سمجھا۔ مگر غلطی

یہ ہُوئی کہ صرف انگریزی زبان سیکھ کر اسی کو قابلیت کا معراج گردان لیا گیا اور زبان میں جس قدر علوم تھے اُن کی طرف توجہ نہ کرنے کے باوجود اپنے تئیں عالم باکمال سمجھنے لگے۔ سمجھا گیا کہ اُنکے اطوار قابلِ تعریف ہیں اور حاصل کرنے چاہئیں اور بیجا سمجھا۔ گو نادانی سے اطوار میں سے نشست و برخاست اور لباس اور مکان میں اُنکی نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا اور انگریزوں کی شکل بنا کر سمجھ لیا کہ اُن کے کمالات قبضہ میں آ گئے۔ سمجھا گیا کہ پابندئ اوقات اُن لوگوں کی ترقی کا گر ہے اور واقع میں ہے۔ مگر قباحت یہ ہُوئی کہ حاضری اور ڈنر کا وقت اور فُٹ بال اور ٹینس کا وقت چھوٹنے نہ پائے۔ پابندئ اوقات کا یہی مقصود گردان لیا گیا۔ غرض جہالت وُہ باعث تھا جس نے انگریزوں کی فوقیت ثابت ہونے کے بعد فوقیت تک پہنچنے کا صحیح رستہ دیکھنے نہ دیا اور پکی سڑک چھوڑ کر ادھر اُدھر کی پگ ڈنڈیوں کی خاک اُڑانے لگے۔ اِسی جہالت میں جب دیکھا کہ پہلے بادشاہوں کے زمانے میں دیسیوں کو صُوبوں کا حاکم بنا دیتے تھے اور وُہ بھی اس شان سے کہ خزانہ بھی اسی کے پاس ہے اور فوج کا سپہ سالار بھی وُہی ہے اور عدالتی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں۔ اور اب صُوبوں کے پُرانے حکمران یکے بعد دیگرے موقوف ہوتے جاتے ہیں اور نہ صرف وُہ بلکہ قسمتوں کے کمشنر اور ضلعوں کے کلکٹر بھی دیسی نہیں بنائے جاتے اور ہر اسامی پر ولایت سے عُہدہ دار بُلایا جاتا ہے اور اس کے علاوہ انتظامی عدالتی اور فوجی تمام کاروبار میں مشورہ صرف اپنے ہمقوموں سے لیا جاتا ہے تو اس وقت ملک والے یہ کہاں سمجھ سکتے تھے کہ انکے اصُولِ ملکداری ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ اِس لئے حکومت اور مشورہ کے لائق نہیں ہو سکتے۔ خیال یہ کیا گیا کہ ان لوگوں کی قومی ہمدردی ہے جس سے اپنی قوم کے سوا غیروں کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ بلکہ اَوروں کے حقوق بھی اپنوں ہی کو دیتے ہیں اور فوقیت حاصل کرنی ہو تو یہی وصف پیدا کرنا چاہئے۔

ہمدردی کے غلط معنی۔ اسوقت اس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزوں میں قومی ہمدردی ہے یا نہیں اور ہے تو کس حد تک۔ ہمارے مُلک میں جو علت و معلول کا سلسلہ کام کر رہا ہے اُس میں اپنی عقلی رفتار کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہم نے اُنکے افعال سے اُنکی اخلاقی حالت کو جانچا اور سمجھے کہ قومی ہمدردی ہی وُہ اصول ہے جس نے سات سمندر پار ہندوستان جیسے برِ اعظم کو اُنکے پاؤں میں ڈالدیا۔ چنانچہ اس وقت ہندو مُسلمان دونوں قوموں کے ذرا سمجھ دار افراد میں قومی احساس پیدا ہوا اور چونکہ دماغ سلیم نہیں تھا قومی ہمدردی کے معنے یہ لئے گئے کہ جہانتک ہوسکے اپنوں کو بڑھاؤ اور غیروں کو پامال کرو۔ چنانچہ کوئی عدالت کی کُرسی پر ہے تو سمجھتا ہے کہ اہل مقدمات میں گو ہمقوم کا حق نہ ہو جب بھی ڈگری دیجائے اور غیر اس کے حق سے محروم کر دیا جائے تو قوم پروری کا اعلیٰ کارنامہ ہوگا۔ اور کوئی انتظامی اختیارات رکھتا ہے تو غیر قوم کے مُلازموں کو برطرف کرنے اور ہمقوم کو ملازم رکھنے کی تدبیر کرنی کار ثواب جانتا ہے اور دل میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ ممتحن ہے تو غیروں کے نمبر کاٹنے اور اپنوں کو غلط لکھنے پر پاس کر دینے کو ہمدردی جانتا ہے۔ اور اہل الرائے ہے تو فسادات اور بلووں کے وقت مظلوموں کو غیر ہونے کے جرم پر سزا دلوانے اور ظالموں کو اپنا جان کر بری کروانے کی تدبیریں سوچتا ہے اور اسی کو نجات سمجھتا ہے۔ غرض ہمدردی کا یہ اصول قرار پایا اور کچھ تو ایک طرف چل پڑنے سے رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے اور رستہ زیادہ سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگتا ہے اور کچھ دونوں فرقوں کے ایسے سلوک سے باہمدگر شکایت پیدا ہونے اور ظاہر کیجانے لگی۔ جس سے عداوت کا رنگ آگیا۔ اور اب وُہ زمانہ آیا کہ اس غلط ہمدردی نے دُوسروں کے افعال پر گرفت کرنے اور اپنے افعال سے نقصان پہنچانے کے آگے ترقی کی! اور شکایتوں سے

۱۸۵۹ء میں مسٹر جان ویز امریکن تین چار آدمیوں سمیت سینٹ لوئی سے ہنڈرسن کو چلا اور تقریباً فی منٹ ایک میل کے حساب سے ۱۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ میں گیارہ سو پچاس میل طے کئے۔ تیز پروازی کے اعتبار سے یہ واقعہ بھی زیادہ قابلِ ذکر ہے کہ اسی سال لاموٹین اور جنرل لو نے چار گھنٹوں میں تین سو میل کے قریب مسافت طے کی۔

پروفیسر گرین انگریز جو فنِ "بیلون" کا بڑا عالم گذرا ہے اُس نے گویا اپنی زندگی ہی "ہوا میں اڑنے" کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ ۲۶ سال کے عرصہ میں تقریباً ایک ہزار چار سو مرتبہ ہوا میں اُڑا ہے۔ تین مرتبہ سمندر پار اُترا۔ سمندر میں گرا اور بال بال بچ گیا۔ اس کا مشہور سفر ۱۸۳۶ء کا ہے۔ جس میں یہ ہالینڈ اور دو ہمراہیوں کے ساتھ ایک بڑے "بیلون" میں بیٹھکر اور کئی ہفتہ کا زادِ راہ ساتھ لیکر لنڈن سے ویلبرگ کو روانہ ہوا جو پانسو میل کی مسافت تھی جس کو اس نے اٹھارہ گھنٹوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کیا۔

اِس قدر بڑے بڑے دعاوے مارنے یا طُول طویل ہوائی سفروں کے باوجود پھر بھی اس وقت تک "بیلون" کے ذریعہ صرف سیدھا اُوپر چڑھنا یا اُترنا تو اختیاری تھا لیکن اس کی افقی حرکت تموّجِ ہوا کے بالکل تابع تھی اس لئے اگلے زمانہ کے بادبانی جہازات کی طرح اِن ہوائی جہازوں سے بھی صرف بادِ موافق کی صُورت میں کام نکل جاتا تھا۔ چنانچہ محاصرہ پیرس کے وقت جو تجربات ہوئے تھے اُن سے گلیچرڈ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "بیلون" سے مستقل ہوائی سواری کا کام ہرگز نہیں نکل سکتا۔ لیکن دُوسرے ماہرینِ فن اس کے مخالف رہے اور ہر زمانہ میں لگاتار یہی کوشش جاری رہی کہ نقائص دُور کئے جائیں اور کسی تدبیر سے ایک مکمل اور قابلِ اطمینان ہوائی سواری بنائی جائے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ اس مقصد کے لئے جس قدر کوشش کی گئی اُس کا اکثر حصہ جنگی اغراض پر مبنی تھا۔ سلطنتوں کی حمایت و

اعانت بھی زیادہ تر اسی لحاظ سے ہوئی اور کامیابی کا سہرا بھی اسی صیغہ کے سر رہا۔
چنانچہ سب سے پہلے توجی بیلون ہی ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئے بعض آلات
واوزار ایزاد کرنے سے وُہ اس قابل ہو گئے کہ معمولی ہوا میں اُن کے ذریعہ ہر طرف
گھوم سکتے اور جہاں چاہتے اُتر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ بڑا نقص باقی رہا کہ زور
کی ہوا میں یا ہوا کے رُخ پر نہیں جا سکتے تھے۔ اِس لئے ماہرینِ فن کی توجہ بدستور
اس کی جانب مبذول رہی اور وُہ حرکت کے اختیاری اور تیز بنانے گیس وغیرہ کے
کھڑاگ کو ترک کر دینے کی فکر میں برابر منہمک رہے اور مختلف تجاویز سوچی گئیں مسٹر
ہارگریو اہل اسٹریلیا نے ایک ہوائی مشین پتنگ کے اصول پر بنائی اور ہوا سے
برقی قوت کا کام لیا۔ گو اس نے چھوٹی چھوٹی متعدد مشینیں تیار کیں۔ جو ہوا میں
اُڑتی رہتی تھیں لیکن اُن کے چھوٹے پن کے باعث سواری کا خیال نہ کر سکا۔
بعض نے کشتی نما غبارے بنائے۔ جن میں ایک یا کئی بادبان اور ہوا کاٹنے کے
لئے چرخیاں اور پنکھے لگائے تھے۔ اوّل اوّل یہ ایک چھوٹی سی دستی مشین تھی جسکو سوار
ہاتھوں سے چلاتا اور جس رُخ پر چاہتا رکھ سکتا تھا۔ اس کو حرکت دینے سے چرخیاں
اور پنکھے جو پون چکی کے پنکھوں سے مشابہ ہوتے تھے۔ ہوا کو کاٹتے جاتے
اور یہ ہوائی کشتی اُسی رُخ پر ٹھیک۔ اسی طرح بڑھتی جاتی جس طرح آبی کشتیاں دستی
بلیوں یا چرخیوں کے ذریعہ سطح آب پر چلنے لگتی ہیں۔ پہلی تجویز کی بہ نسبت آخرالذکر
تجویز رفتہ رفتہ اس حد تک کامیاب ثابت ہوئی کہ مختصر پیمانہ اور محدود بلندی پر سوفین
لوگ سطح سمندر پر تفریحاً ہوا میں اُڑنے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے پہلے انگلستان کے
مشہور اخبار گریفک میں مختلف شکل وہئیت کی ان ہوائی کشتیوں کے فوٹو شائع
ہوئے تھے جن میں ایک ایک دو دو آدمی بیٹھ کر سمندر پر پرندوں کے مانند جو سما
میں منڈلا رہے تھے۔

جس طرح آبی کشتیوں اور بادبانی جہازوں کو ہاتھوں سے کھینے یا بادِ موافق کی امداد سے چلانے کے عوض سائنس کی مدد سے رفتہ رفتہ دخانی یا برقی طاقت سے کام لیکر دخانی جہازات اور موٹر بوٹ کی ایجاد کی بدولت ملّاحوں کے ڈنڑ، مونڈھوں اور بادِ موافق کے بارِ احسان سے سبکدوشی حاصل کر لی گئی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد ان ہوائی کشتیوں کے چلانے میں بھی برقی قوّت سے کام لیا جانا تجویز ہوا اور اس طرح بادِ مخالف کے اندیشہ سے رہائی نصیب ہو گئی "ہوا میں اُڑنے" کے مقصد میں جو اس وقت خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گئی ہے اُس کا سنگِ بنیاد یہی تجویز تھی جس میں اور قدیم "بیلونوں" میں علّتِ غائی کے اعتبار سے تو کوئی فرق نہیں لیکن قوائے آلیہ اور اصُولِ پرواز میں بہت فرق ہے۔ موجُودہ زمانہ کی کامیاب مشینیں بھی دو قسم کی ہیں۔ بعض تو "بیلون" کی طرح اپنی مساوی الحجم ہوا سے ہلکی ہیں۔ اور بعض بھاری۔ اوّل کی پرواز موازنہ سیّالات کے ضوابط پر مبنی ہے اور دُوسروں کی اُڑان پرندوں کے اصُولِ پرواز اور قواعدِ حرکت پر (دیکھو فقرہ ۷) چونکہ ہمارا مضمون بہت طویل ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اس کے متعلق صرف مختصر حالات اور ترقیات کا ذِکر کرتے ہیں۔

جب اس ایجاد سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ تیز ہوا میں تاب لانے یا ہوا کے رُخ پر اُڑنے کے لئے پرواز کرنے والی چیز کا اس لطیف سیّال سے بھاری ہونا ضروری ہے تو ہوا سے بھاری کشتیاں یا گاڑیاں بنائی گئیں اور پرندوں کے اصُولِ پرواز اختیار کئے گئے۔ کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ کُل پرندے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لیکر بڑے سے بڑے پرندے یکسر سب اپنی مساوی الحجم ہوا سے بھاری ہیں۔ سب سے پہلے لالی ینتھل نے اس قسم کی ہوائی گاڑی ایجاد کر کے تیز ہوا کے رُخ پر سفر کیا۔ اس نے چند روز بعد لوگوں

کے اصرار پر پھر دوبارہ پرواز کی اور کسی خلل کی وجہ سے اپنے آپ کو اس ایجاد پر قربان کر دیا
پروفیسر لینگلی نے ایک بڑا اسٹیم انجن لگا کر ہوا سے بہت بھاری گاڑی تیار کی
جس کے پر کا پھیلاؤ ۱۴ فٹ تھا۔ رفتہ رفتہ اور لوگوں نے بھی کئی ایک گاڑیاں
بنائیں اور اُن کے ذریعہ شوقین لوگ چھوٹے چھوٹے سفر کرنے لگے۔ ہوائی مشینیں
مختلف شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ ظاہری شکل و ہیئت پر نظر کرتے۔ بعض ہیئت
مجموعی تیتری اور بعض پرند وغیرہ اور مچھلی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ بعض میں گاڑی کی طرح
پہیئے ہوتے ہیں اور بعض میں پرندوں کی طرح پر ہیں۔ بعض میں کشتی کی طرح سکان
اور بادبان لگے ہوئے ہیں۔ لیکن سب کی روح یا جان برقی قوت ہے۔ جس کے ذریعہ
اس کے مصنوعی پر یا دوسرے کل پرزے حرکت کرتے ہیں اور یہ مصنوعی پرندہ اپنے
سوار کو لئے اڑتا پھرتا ہے اور سوار کے اس قدر قابو میں ہے کہ پروں یا اوزاروں
کی حرکت کو کم و زیادہ کرکے جدھر چاہو اس کو موڑ سکتے اور نصف میل کی بلندی
سے ہر طرف چار میل کے اندر جہاں چاہو اُتر سکتے ہو۔

گدھ اور بعض شکاری پرندوں اور گرہ باز کبوتر سے قطع نظر جبکہ انہیں صرف منڈلانے
کے سوا راست قطع مسافت مقصود نہیں ہوتی دوسرے پرندے اکثر اوقات چالیس
پچاس فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ لیکن پرندہ ذرا سا جانور ہے جس کو درختوں وغیرہ
سے ٹکرانے کا اندیشہ نہیں۔ اس کے برخلاف اس مصنوعی پرندے یا ہوائی گاڑی
کو اس قسم کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا ہے۔ اس لئے اس کی پرواز اکثر ہزار دو ہزار فٹ
بلندی سے ہوتی ہے اور بوقت ضرورت اس سے بھی زیادہ اونچی اڑ سکتی ہے۔ اور
اس کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کی تیز پری کے مقابلہ میں کسی تیز پر پرندہ کو بھی شاید
مشکل سے کامیابی ہو۔ چنانچہ اُمید کی جاتی ہے کہ عمدہ ہوائی گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ
جا سکیگی۔ غرض کہ اس سے سابق اُڑنے والی کل مشینوں میں اس وقت کی ہوائی مشینیں

ہر طرح مکمل ہیں۔ اور ان سے آئے دن سہولت و اطمینان سے بڑے بڑے سفر طے ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک فرنچ شخص موسیو بلریو ۲۵۔ جولائی ۱۹۰۹ء کو اپنی ہوائی مشین (مونوپلین) کے ذریعہ انگلش چینل کو عبور کر کے انگلستان پہنچا اور اس نے فاتح ہوا کا لقب حاصل کیا ہے۔ اگرچہ جو رستہ بلریو نے طے کیا ہے اس سے تقریباً سوا سو برس قبل پروفیسر بلانشارڈ نے بھی پہلے پہل طے کیا تھا۔ لیکن اس میں اور اس میں بہت بڑا فرق یہ تھا کہ اس وقت بلانشارڈ کا مرکب ہوائی بالکل بے قابو اور اس کا منزل مقصود پر پہنچ جانا اتفاقی تھا۔ اس کے برخلاف بلیریو کا ہوائی توسن گویا سدھا سدھایا اور ہر طرح سوار کے قابو میں تھا۔

انہی دنوں اخبار "ڈیلی میل" لنڈن کی جانب سے ایک انعامی اشتہار شائع ہوا تھا کہ جو شخص ہوائی کشتی یا گاڑی کے ذریعہ ۲۴ گھنٹہ میں لنڈن سے مانچسٹر پہنچے۔ اُسکو دس ہزار پونڈ انعام دیا جائیگا۔ یہ انعام حاصل کرنے کے لئے بہت سے لوگوں نے کوشش کی لیکن مسٹر رائٹ نے اپنی ہوائی گاڑی میں بیٹھکر ایک ہزار فٹ بلندی سے فی گھنٹہ چالیس میل رفتار سے نہایت کامیابی کے ساتھ منزل مقصود پر پہنچکر انعام حاصل کر لیا۔

حاصل یہ کہ اس وقت کی ہوائی گاڑی یا دوسری مشینوں اور اگلے زمانہ کے بیلونوں میں ٹھیک وہی نسبت ثابت ہو رہی ہے جو قدیم زمانہ کے بادبانی جہازوں اور آجکل کے نوایجاد اسٹیمروں میں ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اب "بیلون" کا استعمال متروک ہو رہا ہے اور ہوائی گاڑیاں یا کشتیاں روز بروز اس قدر رواج پاتی جا رہی ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں ان کے بنانے کے کارخانے بھی جاری ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ اگرچہ فی الحال عمدہ ہوائی گاڑی پر تقریباً تیس ہزار روپیہ لاگت آتی ہے۔ لیکن بہت جلد اس کی قیمت اس حد تک گھٹ سکے گی جو متوسط درجہ کے لوگ بھی اس میں

بیٹھ کر لطف پرواز اُٹھا سکینگے۔

جس طرح بیلون میں کامیابی ہوتے ہی اُس سے جنگی اغراض کے لئے کام لینے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اسی طرح ہوائی کشتی یا گاڑی کی ایجاد کے ساتھ ہی اُس کو جنگی اغراض کے لئے مکمل بنانے کا خیال پیدا ہو گیا۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ اس مقصد میں عموماً جنگی اغراض ہی کے لئے یہ سب کوششیں ہوئیں جو بار ور ثابت ہوئی گئیں گویا یہ ایجاد محض جنگجوئی ہی کی غرض سے ہوئی ہے جس کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہی کہ گورنمنٹ امریکہ نے یہ قانون پاس کر دیا تھا کہ ہوائی کشتی۔ گاڑی۔ بیلون یا کسی قسم کی ہوائی مشین کے ذریعہ بارود کا استعمال نہ کیا جائے اور شاید اسی قانون کی تائید میں کل دول سے باہمی معاہدہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ مگر جرمنی۔ فرانس برطانیہ کلاں۔ جاپان وغیرہ نے اس قسم کا معاہدہ کرنے سے مخالفت ظاہر کی۔ دراصل اگر یہ قانون عام طور پر پاس ہو جاتا تو جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان میں بہت سے لوگ جو اس ایجاد کی تکمیل اور ترقی میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں۔ اس سے بہت کم دلچسپی لیتے اور عجب نہیں جو یہ ایجاد اب سے بہت بعد میں مکمل ہوتی۔ غرضکہ شوقین لوگوں کے شوق۔ جنگی اغراض کے حامی افراد کی سرگرمی اور سلطنتوں کی حمایت سے "ہوا میں اُڑنے" کی کوششیں بہت جلد بار ور ہوئیں اور اس وقت اس حد تک ترقی کر گئی ہیں کہ آج بہت بڑی بڑی گاڑیاں اور ہوائی جہازات تیار ہو چکے ہیں جس میں کئی کئی آدمی بیٹھ کر ہوائی سفر کر سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور مشہور اور کامیاب مشینوں کا ہم یہاں مختصر ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر لیدم نے جو ہوائی مشین تیار کی ہے۔ یہ اکتالیس فٹ لمبی اور (۵۷۰) پونڈ وزنی ہے۔ اس کے پروں کا پھیلاؤ ۴۲ فٹ ہی۔ اس میں آٹھ سلنڈر والی مشین ہی جس میں سو گھوڑوں کی طاقت ہی۔ اس میں سات فٹ قطر یعنی بائیس فٹ

دور کا ایک چکر لگا ہوا ہے جو برقی قوت سے ایک منٹ میں (۱۲۰۰) مرتبہ گھومتا ہے۔
مسٹر رائٹ (امریکن) کی ہوائی مشین (۵۲۸) فٹ وسیع اور (۹۶۸) پونڈ وزنی ہے جس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہئے اور دو سکان ایک داہنے بائیں مڑنے کے لئے اور دوسرا اوپر نیچے چڑھنے اُترنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔

وِلا ڈی پاری نامی مشین الومینیم اور لکڑی کی بنائی گئی ہے جو (۱۱۷) فٹ طویل، فٹ اونچی ہے جس میں (۲۱۱۹۲) مکعب فٹ گیس کی گنجائش اور (۷۰) گھوڑوں کی طاقت ہے۔

انگریزی ڈرِجِبل جو ہوائی جنگی جہاز ہے وہ چمڑے کا بنا ہوا ہے جس میں نیچے اوپر چمڑے کی آٹھ تہیں ہیں اور اوپر کینوس منڈھی ہوئی ہے جس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی پرواز کے لئے کسی مدت کا تعین نہیں ہے۔ جس قدر عرصہ چاہو ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے فوجی مقاصد کے لئے بہت مفید مانا گیا ہے۔
لا ربلق کے ہوائی جنگی جہاز میں (۱۲۷۰۰) مکعب فٹ گیس کی گنجائش تھی۔ چار آدمی بیٹھ سکتے تھے اس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہیے تھے اور ۸۵ گھوڑوں کی طاقت تھی یہ جہاز ۲۵۔ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو کسی حادثہ سے تباہ ہو گیا۔
کوڈی انگلش، ایک ٹن یعنی ۲۸ من وزنی ہے جس میں دو سکان ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔ یہ جہاز ۸۔ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو آلڈرشاٹ سے اُڑا اور ۶۳ منٹ میں چالیس میل طے کیا۔
فارمن (فرینچ) کا جہاز بھی نہایت مشہور ہے جس نے اکتوبر سنہ ۱۹۰۹ء میں (۱۸۰) کیلومیٹر طے کیا تھا۔ اور ۲۷۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو لنڈن سے مانچسٹر پہنچا۔
کونٹ زیپلن کا ایجاد کردہ جہاز سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے جس میں پچیس چھبیس آدمی معہ ضروری سامانِ رسد کے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کو سلطنت

جرمنی نے سات لاکھ پچاس ہزار میں موجد سے خرید لیا ہے۔

زیلپن نے اسی نمونہ کا ایک اور جنگی جہاز (۴۴۵) فٹ لمبا اور صرف ۲½ فٹ چوڑا تیار کیا ہے جسکی رفتار بہت تیز ہے۔ چنانچہ مئی سنہ ۱۹۰۹ء میں اس نے بہت بڑا طول طویل ہوائی سفر کیا اور چالیس گھنٹے میں نوسو چالیس میل کا چکر لگایا۔

حال ہی میں مسٹر ریمنڈ فلپس ٹیکنیکل انجنیر لورپول نے ایک ہوائی تارپیڈو ایجاد کیا ہے جسکی نسبت انہیں یہ دعویٰ ہے کہ اس سے لندن کے کسی مقام سے سو میل کے اندر بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں مسمار کر دے سکتے ہیں۔ چنانچہ موجد نے ۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۰ء کو لندن کے میدان میں جہاں تیس پینتیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اس کا اس طرح تجربہ کر دکھایا کہ مجمع کے بیچ میں ایک اونچے مقام پر وُہ کھڑا رہا۔ روبرو میز پر ایک چھوٹی سی مشین اور اس سے پچاس فٹ کے فاصلہ پر چوبیس فٹ لمبا پانچ فٹ چوڑا ایک ہوائی جہاز رکھا ہوا تھا۔ جس میں تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مسٹر فلپس نے اس مشین کا ایک بٹن دبایا جس سے جہاز زمین سے کچھ اونچا ہو کر اُن کے سر پر آگیا۔ دُوسرا بٹن دبانے پر وُہ بلند ہونا شروع ہوا۔ ایک اور بٹن دباتے ہی ہوائی جہاز میں خود بخود روشنی ہو گئی۔ چار سو فٹ بلندی پر پہنچنے کے بعد مسٹر موصُوف نے ایک اور بٹن دبایا اور فوراً کاغذ کے مصنُوعی گولے حاضرین کے سروں پر اس قدر جلد جلد گرنے شروع ہوئے کہ ۵ منٹ کے قلیل عرصہ میں کُل حاضرین پر گولہ باری ہو گئی۔

حاصل یہ کہ کئی اگلے زمانہ کی کامیاب تجویزیں انقلابِ زمانہ سے ملیامیٹ ہو کر دھری اور بہت سی تجویزوں اور تحریکات کی طرح ہوا میں اُڑنے کی جدید تحریک بھی سینکڑوں برس کی لگاتار کوششوں سے بتدریج ترقی کرتے کرتے بڑی حد تک مکمل اور بارور ہو چکی ہے اور شوقین لوگ نہایت سہولت و کامیابی کے ساتھ بے کھٹکے میلوں ہوا میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ گو مدت کے لحاظ سے تو اس مقصد میں کامیابی

رنجش پیدا ہونے کے باعث افعال سے بڑھکر نیتوں پر حملہ کیا جانے لگا اور مسلمان گائے ذبح کرتا ہے تو اس کو مذہبی حکم سمجھنے کی بجائے فریاد ہونے لگی۔ کہ ہم کو ستانے کے لئے ایسا ہوتا ہے۔ اور ہندو چھوت کا خیال کرتا ہے تو اس کا قدیمی طریق سمجھنے کی بجائے کہنے لگے کہ ہم کو ذلیل جانکر نفرت کیجاتی ہے۔ اور اس طرح سے جو ناجائز طرفداریاں کیجاتی تھیں انکو بجا ثابت کرنے کے لئے اور دُوسروں کو بدنیت اور فسادی اور ہمدردی کے ناقابل ٹھہرانے کے لئے ان شکایتوں کو معقول عذر قرار دیا گیا۔ مگر قاعدہ ہے کہ سزا دینی یا بدلہ لینا عداوت کو بھڑکاتا ہے اس لئے ان شکایتوں سے ول اور پہلے اور اب موجودہ ہم وطنوں کو بدنیت اور شریر کہتے کہتے اُنکے بزرگوں کو ملزم ٹھہرانے اور ہمیشہ سے ظالم اور سفاک ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ اور ایسی کوشش نے پرانے بادشاہوں اور انسے بڑھکر مذہبی پیشواؤں کی نسبت وُہ وُہ اتہام اور بے ادبیاں صادر کروائیں جنکو سُنکر رونگٹے کھڑے ہوں اور خون میں جوش آئے اور فتنہ و فساد کی وُہ آگ بھڑکی کہ اب ایک فریق دُوسرے کی تقریر نہیں سُن سکتا۔ اور تحریر اور اخبار اور رسالہ غصہ سے کانپ اُٹھنے کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ اور لُطف یہ کہ ابتک اِن سب بیہودیوں کو قومی ہمدردی کے روغن نے چھپایا ہُوا ہے اور قوم پر جان دینے والے اِن ظلموں کے ارتکاب سے وُہ فرض اتم ادا کرتے ہیں جس سے بڑھکر دُنیا میں کوئی نیکی نہیں اور جب تک یہ حالت قائم ہے اور جب تک ہمدردی کے مفہوم کا اس طرح پر خون ہوتا رہیگا۔ ہندو مسلمانوں کی عداوت روز افزوں ترقی کریگی اور زوال کا مُنہ نہ دیکھے گی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمدردی کو خواہ غلط سمجھا گیا مگر اس طرح کے استدلال کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہوش اور زمانے کی حالت کو دیکھنے کی قوت درکار تھی اور

چونکہ ہندو پہلے بیدار ہوئے ہیں اور مسلمان بہت دیر تک مۓ شبینہ کے خمار میں مبتلا رہے اس لئے ہمدردی کا احساس اور اس کے لئے ایسی رفتار پہلے ہندو بھائیوں نے اختیار کی۔ مگر خیر یہ میرا اپنا خیال ہے اور ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ موجودہ عداوت کا سُراغ ملتا اُسی تقلید کی خواہش کیا ہے جو انگریزوں کے آنے پر کسی قوم میں زیادہ اور کسی میں کم پیدا ہوئی۔ اور جس طرح انگریزوں کے اکثر حالات کو ہم نے غلط سمجھا۔ اسی طرح ہمدردی کے سمجھنے میں یہ غلطی کی اور یہ غلطی بڑھ کر عداوت تک پہنچی۔ اس لئے اب اگر ہندو مسلمان دونوں عداوت کے نقصان کو سمجھ گئے ہوں اور اس کو دُور کرنا چاہتے ہوں تو ضرور ہے کہ جو افعال وُہ قومی ہمدردی کے خیال سے کرتے ہیں اُن پر نظرِ ثانی کریں اور دیکھیں کہ ہمدردی اور انصاف کہاں تک برابر رکھا جا سکتا ہے اور کہاں تک اور کیا نقائص ہیں جن سے ہمدردی ظلم بنجاتی ہے۔

ہمدردی کی حقیقت۔ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اپنوں کے ہونے کا فائدہ ہی کیا جب بُرے وقت میں اور مصیبت پڑنے پر کام نہ آئیں۔ مگر آہ! انسان بہت دھوکہ باز مخلوق ہے اور دُوسروں کو دھوکا دینا ایک طرف کبھی اپنے آپ کو بھی دھوکا دے لیتا ہے۔ فقیر صدا کرتا ہے "مجھے پیسہ دینے والے تیری آئی بلا دُور"۔ اور اکثر نادان محض اسی خیال سے دینے میں جلدی کرتے ہیں کہ فقیر کا بھیس شیر کا بن ہے۔ کیا معلوم کوئی بلا آنے کو ہو جسے دیکھکر یہ پکار رہا ہے" اور اگر اتفاق سے رات کو چور آئے اور خبر ہو جانے پر بھاگ نکلے۔ یا آگ لگ جائے اور جلدی سے فرو کر دیں تو پھر شاہ جی پر لوگوں کو اعتقاد ہونا ہی تھا خود شاہ صاحب کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ "جو بات ہمارے مُنہ سے نکلے خدا پوری کر دیتا ہے"۔ اسی طرح قومی راگ گانے والے یہاں بھی قصور اور شرارت کرنے کے بعد ایسے فقرے کہتے

ہیں شرارت سے اور دوسروں کو اُلّو بنانے کے لئے۔ مگر جادو کا اثر ضرور ہو جاتا ہے
اور نہ صرف سُننے والوں کا دل پسیجتا ہے۔ بلکہ کہنے والے بھی ایسا کرنے والوں
کو ایشور کا اوتار اور ولی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح پر یہ عقیدہ عام ہو گیا ہے کہ
کسی پر چھُری پھیر کر آئے یا مال مار کر لائے۔ اپنوں کا فرض ہے کہ اپنے کو بچائیں اور
اُسکو کنوئیں میں سے نکالنے کے لئے مضائقہ نہیں۔ اگر غیر کو دھکا دیکر پھینکدیا
اور اس کی پُشت پر سے رستہ بنائیں۔ مگر ایک وقت پر کسی عقیدے کا عام ہو جانا
اَور بات ہے لیکن واقعیت کو بدل نہیں سکتا اور غور کرنے والے دیکھ سکتے ہیں
کہ ہمدردی کے معنی کسی کی تکلیف کے وقت میں اعانت کرنا ہے اور اعانت
اِسی طرح ہو سکتی ہے کہ جو کام وہ نہیں کر سکتا اور جو وسائل اس کو حاصل نہیں انکے
لئے خود کوشش کریں اور جو شخص اس غرض سے مالی یا بدنی تکلیف اُٹھاتا ہے وُہ
ہمدرد ہے۔ اب اگر ایسی تکلیف کسی شخص نے کسی انسان کے لئے محض اس کو
انسان سمجھکر اُٹھائی ہے تو وُہ انسانی ہمدرد ہے اور اگر کسی کے لئے اپنا ہمقوم
سمجھکر اُٹھائی ہے تو قومی ہمدرد ہوگا اور بیشک جس طرح انسانی ہمدردی ایک
وصف ہے قومی ہمدردی بھی وصف کہلانے کی مستحق ہے لیکن یہ نہ ہو کہ
کسی کے لئے تکلیف پہنچے۔ ایک شخص کو۔ اور اس کا اعزاز دیا جائے دُوسرے
شخص کو جس نے تکلیف نہیں اُٹھائی۔ اور اسی طرح یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ کسی کو
ضرورت ہے کھانے کی اور ہم اپنے پاس سے دینے کی بجائے اُس کے کپڑے
بیچ کر کھانے کا سرانجام کر دیں یا اُس کی کمر پر گوشت خورہ دنبل ہے اور ہم بکری
کا قیمہ بھرنے کی بجائے اس کی اپنی ران کا گوشت کاٹ کر زخم کو بھر دیں تو ہمدردی
نہ ہوگی اور اگر بالکل آنکھیں بند کر لیں تو اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ کھانے کا سرانجام
کرنے اور گوشت خورہ کو بھرنے میں ہمدردی کی مگر ننگا کر دینے اور ران کو چیر

ڈالنے سے دوسری ضرورت اور دوسرے عضو کے بارہ میں ظلم کیا۔ اور اسی طرح یہ بھی ہمدردی نہیں کہ ایک بھوکے کو کھانا کھلانے کے لئے ایک اور کی جیب کتر لی یا مادہ فاسد کو نکالنے کے لئے کسی عضو کو چیرنا یا کاٹ ڈالنا ضرور ہے اور بیمار اذیت سے گھبراتا ہے تو محبت کے جوش میں اپریشن سے باز رہنا ہمدردی نہیں بلکہ ظلم ہوگا اور نیز جو دیوانہ کپڑے پہن کر آگ لگا لیگا اور کپڑے فنا کرنے کے ساتھ اپنے جسم کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ اس کو لباس پہنانا ظلم ہے اور ہمدردی کا مستحق وہ ننگا ہر جو کپڑوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور اپنے تئیں سردی گرمی سے بچانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بالکل یہی منظر پیش آتا ہے۔ اگر ملک یا کم از کم اپنی قوم کو ایک شخص فرض کیا جائے مثلاً

(۱) **مقدمات**۔ اگر عدالت میں ایک شخص نے ناحق یا اپنے حق سے زائد دعویٰ دائر کیا ہے اور وہ شخص حاکم عدالت کا ہمقوم ہے اور مدعا علیہ غیر ہے اور اس لئے حاکم اس کی رعایت کرتا ہے۔ فریق ثانی پر سوال اس طرز سے کئے جاتے ہیں کہ اظہار سے خود بخود مدعی کے بیان کو تقویت پہنچے۔ مدعی کی شہادت پر مناسب جرح کرنے سے روک دیا جاتا ہے اس کی دستاویزوں سے ڈھونڈھ کر وہ موقعے نمایاں کئے جاتے ہیں جو اُسے مفید ہوں اور یوں روئداد کو پختہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ فیصلہ اس کے حق میں ہوسکے یا کبھی بغیر ایسی حکمتوں کے سینہ زوری سے روئداد کے خلاف محض ہمدردی کے خیال سے ڈگری دیجاتی ہے تو اس صورت میں فریق ثانی پر ظلم ہونے اور اس سے اس کا حق چھیننے کے علاوہ خود اپنے ہمقوم کو حق کے خلاف کوشش کرنے کی جرات دلائی جاتی ہے اور بھیڑیئے کو انسان کا خون چٹانے کے بعد خود اس کے پالنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکتے اسی طرح خلافِ واقع فریاد اور ناجائز کوشش کی عادت ڈال کر خود اپنی قوم کے لئے ایک خوفناک

دشمن پیدا کیا جاتا ہے اور سوسائٹی کے ایک رکن سے ہمدردی کرتے ہوئے ایک ملکی بھائی پر ظلم کرنے کے ساتھ خود اپنی قوم کو نقصان پہنچانے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایک جیب کترے کو دوسرے بھوکے کو کھانا دینے سے آئندہ اور جیبیں کترولنے کا سامان کیا جاتا ہے اور چونکہ ایسا فعل ہمدردی نہیں اس لئے مقدمات میں جج کے فرائض سے زیادہ رعایت بھی ہمدردی میں داخل نہیں اور ایسے لوگوں کو موجد ظلم کہنے کے بجائے خیرخواہِ قوم سمجھنا غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) اِمتحان۔ اگر ممتحن اپنے ہمقوم اُمیدواروں کے جوابوں پر نمبر دیتا ہے جو غلط ہیں یا ایسے جوابوں پر پُورے نمبر دیتا ہے جنمیں غلطی ہے تو چونکہ یونیورسٹی نے اسکو ممتحن قرار دیا ہے اس لئے کہ وہ اُمیدواروں کی واقعی قابلیت سے اطلاع دے اور یونیورسٹی کو اُمیدواروں کے واقعی قابلیت معلوم کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ جو قابل ثابت ہوں انکی شہادت دے اور سرکار یا پبلک اس شہادت کے مطابق قابل آدمیوں سے ملکی خدمات میں وُہ کام لے جسکے وہ اہل ہیں اور یوں ملک اور اہل ملک کی خوشحالی کو ترقی ہو ورنہ نالائقوں کے ہاتھ میں کام دیا جائیگا تو عمدگی سے سرانجام نہ ہوگا اور گورنمنٹ اور ملک کی تمام قوموں کو اس سے نقصان پہنچیگا۔ اس لئے جو ممتحن ہمقوم کی قابلیت کو اصلی حالت سے بہتر ظاہر کرتا ہے وُہ دھوکا دیتا ہے اور نہ صرف یونیورسٹی کے کام کی خوبی کو زائل کرتا ہے بلکہ سرکار کو اور پبلک کو نقصان پہنچاتا ہے اور پبلک میں خود اس کی قوم بھی شامل ہے۔ اس لئے وہ ایک دُنبل میں قیمہ بھرنے کے لئے تمام جانداروں کا گوشت چھیلنے کے علاوہ خود اپنی قوم کے تمام جسم میں گھاؤ ڈالنے کی تدبیر کرتا ہے اور ایسا شخص نہ صرف ہمدردی کے وصف سے عاری ہے بلکہ انسانیت اور عقل کا معمولی وصف بھی اُسکے اندر پایا نہیں جاتا۔ اور اگر کوئی شخص اپنے ہمقوموں کو اس طرح کی امداد دینے کے ساتھ غیر قوم کے لائق

امیدواروں کے نمبر کم کرنے یا انہیں ناکام رکھنے کی کوشش کرتا ہے تا جو خدمات اُنکو مل سکتی ہوں وُہ اُس کے ہم قوموں کو ملیں تو کاروبار پر نالائقوں کو قابض کرنے کے علاوہ قابلوں کو کام سے اور کام کو قابلوں سے محروم رکھنے کا مرتکب ہوتا ہے اور ایک فعل سے نقصان پہنچا کر دُوسرے فعل سے اہل لیاقت پر اور مُلک پر ظلم کرتا ہے اور خود کوئی تکلیف برداشت کرنے کے بغیر ہمدردی کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُس تکلیف و مُصیبت سی جو اس کے ہاتھوں بہت سے بندگانِ خدا کو پہنچی۔

(۳) نالائقوں کو مُلازمت دینا۔ اگر کوئی با اختیار اپنے صیغہ میں قومیت کے خیال سے بھرتی کرتا ہے ایسے لوگوں کی جو اس کام کی قابلیت نہیں رکھتے تو اس نقصان کے ساتھ جو وُہ اپنے مُلک اور گورنمنٹ کو پہنچاتا ہے اور اُس ظلم کے ساتھ جو وُہ قابل آدمیوں پر نازل کرنے کا مرتکب ہوتا ہے حقیقت میں اُس شخص پر بھی ظلم کرتا ہے جسکی ہمدردی ظاہر کیجاتی ہے۔ کیونکہ نالائق اپنے فرائض کو نہ سمجھنے کے سبب ایسی غلطیوں کا نشانہ بن سکتا ہے جن سے خود اسکو نقصان پہنچے۔ اور نیز اگر اسکو کام کرنے کی جُرأت نہ دلائی جائے تو بعض اوقات وُہ خود بھی لائق بننے کی کوشش کرتا ہے اور وُہ نہیں تو اس کی نظیر کو دیکھکر اور نالائق اپنے تئیں لائق بنانے کی کوشش کرینگے اور اکثر کامیاب ہوسکینگے لیکن نالائقوں سے ہمدردی کرنے کی رسم انکو نالائق رہنے اور مُلک کو ترقی اور کمال سے محروم نہ رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور خود انہی کے ہاتھوں انکو بہت سے نقصان پہنچانے کا باعث ہوتی ہے۔ پس یہ ہمدردی حقیقت میں اُس شخص کی سی ہمدردی ہے جو دیوانہ کو کپڑے پہناتا ہے اور دیوانہ کپڑوں کو آگ لگا کر اپنے تئیں بھی تلف کر دیتا ہے اور اس نے ایسا ہمدرد خود دیوانہ کہلانے کا مستحق ہے۔

(۴) **غیر مستحق کو ملازمت دینا** اگر نوکری ایسے شخصوں کو دیجاتی ہے جو قوم کے لائق افراد تو ہیں مگر اُس صیغہ سے تعلق نہیں رکھتے یا اس کام کے اُمیدواروں میں جونیئر ہیں اور غیر قوم کے سینئر اُمیدوار بھی قابلیت رکھتے ہیں تو بیشک ایسے حاکم نے کام کو قابل ہاتھوں میں دیا اور اس لحاظ سے ملک اور گورنمنٹ کا کوئی قصور نہیں کیا۔ لیکن جو شخص کسی کام کے لئے تگ و دو اور کوشش کرتا ہے قدرت کا قانون ہے کہ وُہ کامیاب ہو اور اسی قانون کا علم ہے جس سے ہر طرح کے علمی اخلاقی اور رُوحانی کمالات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اگر معلوم ہو کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہ ہوگا تو کوئی شخص کوشش کی طرف قدم نہ اُٹھائیگا اور ظاہر ہے کہ سررشتوں میں اُمیدوار رہنا اور مفت کام کرتے رہنے سے ایک وقت پر معاوضہ پانے کی اُمید رکھنی یہ بھی ایک کوشش ہے بلکہ یہی کوشش ہے جس سے عام طور پر کام ملا کرتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے لیکن جو حکّام کوشش کرنے والوں کو مایوس کر کے ایسے شخصوں کو کامیاب کرتے ہیں جنہوں نے کوشش نہیں کی وُہ اپنے طرزِ عمل سے سکھانا چاہتے ہیں۔ کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اُس جذبہ کو نابود کرنا چاہتے ہیں جس سے دُنیا کی تمام ترقیاں وابستہ ہیں۔ اور اس طرح پر اگر وُہ علمی لیاقت بڑھانے کی ترغیب دیتے ہیں تو عملی قابلیت اور مقاصد تک پہنچنے کے صحیح رستہ کو بُھلانا چاہتے ہیں اور اس لئے عملی طور پر وُہ بھی گورنمنٹ ملک اور خود اپنی قوم کو کچھ کم نقصان پہنچانے کے مرتکب نہیں ہوتے اور یہی غیر ہمدردانہ ہمدردی ہے جس کے بھروسے پر ہمارے ملک کے ہزارہا نوجوان ادھوری تعلیم کے بعد مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے ہمقوموں کے لئے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر انکو یقین ہوتا کہ بغیر لیاقت کے کام ہرگز نہ ملیگا۔ تو یا تعلیم کو تکمیل تک پہنچاتے اور یا اس طرف توجّہ نہ کرتے

اور کسی اَور کام میں لگتے اور اس لئے ہمارے ایسے ہمدرد بعض لوگوں کو بالا خانوں پر بیٹھک چڑھا دیتے ہیں مگر اُن سیڑھیوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں جن سے اُنکے اَور بھائی چڑھ سکیں اور اس لئے ہمدردی کا اعزاز پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

(۵) تناسب۔ اگر یہ بھی نہ ہو اور صیغہ کے اُمیدواروں میں سے قابل افراد کو جگہ دیجائے۔ مگر کوشش یہ ہو کہ تمام صیغہ پر محض اپنی قوم کا تصرف ہو اور اُدھر اس ملک یا علاقے میں دیگر قومیں بھی آباد ہوں تو ان اقوام کے بہت سے فوائد اور اغراض کو بغیر کسی بدنیتی کے بھی نقصان پہنچ جانا یقینی ہے کیونکہ قومی رسم و رواج اور قومی عقائد اور جذبات کو غیر قوم کا فرد اس خوبی سے سمجھ ہی نہیں سکتا جس طرح سمجھنا ملکی کاروبار اور انتظام سلطنت کے واسطے ضروری ہے اور یہی وہ اصُول ہے جس سے شائستہ قومیں رعایا کا کسی نہ کسی حد تک کاروبا حکومت میں شریک ہونا ضروری جانتی ہیں اس لئے کسی صیغہ کو ایک قوم کے تصرف میں دیدینے سے انتظام حکومت اور ملکی امن و امان میں اسی قدر خلل پیدا ہوگا جس قدر اُس صیغہ کا اثر ہے اور اس فعل سے وُہ تمام قومیں متاثر ہونگی جو ملک میں آباد ہوں۔ پس ایسی کوشش کرنے والے اُن نتائج کو نہیں دیکھتے جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہُوئے ملک اور خود اُنکی قوم کو بُرے اپنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبُور کرینگے اور یہ لوگ قوم کے وہ نادان دوست ہیں جو جسم میں زہر پھیلا کر اُمید رکھتے ہیں کہ بیمار صحت یاب ہو جائیگا۔

(۶) مجرموں کی طرفداری۔ جو افسر اپنے ہمقوم ماتحتوں کے قصوروں کو چھپاتا ہے یا جو اہل الرائے فساد کرنے والوں میں سے اپنے طرفداروں کی بیجا حمایت کرتا ہے وُہ انکو اُس نقصان سے بیشک محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو

صحت پہنچے کو ہو لیکن قطع نظر اس ظلم کے جو ان لوگوں کے ہاتھوں کسی نہ کسی پر ہوتا ہے وُہ شخص اپنے لوگوں کو ایسے جرم کرنے کی عادت ڈلواتا ہے۔ کیونکہ جُرم کرنے پر ایک دفعہ بری ہو جانے سے دُوسری بار اسی قسم کا کام کرنے کی جُرأت ہوتی ہے اور ایسے ایسے موقعے ملتے رہیں تو ہر دفعہ جُرأت بڑھتی جاتی ہے اور دُنیا میں جس قدر شُہدے اور مجُرم پائے جاتے ہیں اُن کا آغاز اکثر اسی قسم کے اتفاقی واقعات سے اور کمال اِسی طرح کے خوش نصیبیوں سے ہوتا ہے اور اس لئے خواہ ایک دفعہ کے بعد دُوسری دفعہ مجرم کسی اَور کے ہاتھ سے سزا پانے پر اپنی عادت کو چھوڑ بیٹھے اور دیگر خواہش رکھنے والے بھی عبرت حاصل کریں۔ مگر جو لوگ پہلی دفعہ یا ہمیشہ اپنے مجرموں کی حمایت کرتے ہیں اُنہوں نے اپنی طرف سے وُہ تخم بو دیا ہے جسکا ثمر ان لوگوں کی سنگدلی اور سفاکی ہو۔ بس ایسے لوگ علاوہ ملک کے اور انصاف کے دشمن ہونے کے اپنی قوم کے ہمدرد بھی نہیں ہیں اور اُس عضو کا اپریشن نہیں کرتے جو آخر کار تمام جسم کو مسموم کردیگا اور ہلاکت کا باعث ہوگا۔

ہمدردی کا موقع۔ غرض یہ اور اس قسم کے اَور کام جو انصاف کے خلاف اور خود اپنی قوم کیلئے بہت سے بد نتائج کا موجب ہیں سخت ترین ظلم کہلانے کے مستحق ہیں اور ہمدردی کا اعزاز نہیں پا سکتے۔ اور وقت پر ہوا خواہوں یا خود غرضوں کی طرف سے اُن کی تعریف اِس لئے کیجاتی ہے کہ اُن پیچ در پیچ اور مخفی نتائج تک نظر نہیں پہنچتی جو بظاہر خفیف واقعات سے پیدا ہوتے ہُوئے آخر میں خوفناک تباہی تک پہنچاتے ہیں اور قوم کو ترقی کے سچے رستہ پر چلنے نہیں دیتے۔ البتہ جن کاموں سے محض فائدہ متصور ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں۔ انکو اپنی قوم سے مخصوص کرنا قومی ہمدردی ہوگا۔ چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں جن رفاہ عام کے کاموں سے
محض فائدہ متصور ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں انکو اپنی قوم سے مخصوص

کرنا قومی ہمدردی ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص روپیہ رکھتا ہے اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ وُہ اس روپیہ کو صرف اپنی قوم کے فوائد پر صرف کرے یا جو شخص اپنی زندگی یا اُس کا کچھ حصّہ وقف کرنا چاہتا ہے۔ وُہ خاص اپنی قوم کی خدمت میں مصروف ہو۔ پلیڈر اپنی قوم کے سائلوں سے کچھ نہ لے یا کم خرچہ پر پیروی کرے ڈاکٹر اپنے قوم والوں کو بلا فیس طبّی امداد دے۔ عالم اپنا وقت اپنی قوم کے درس و تدریس میں صرف کرے اور اسی طرح وُہ کام جو محض کسی کے اپنے اختیار میں ہو قومی ترقی کے خیال سے کیا جائے تو بیشک قومی ہمدردی ہوگی۔ مگر ان مثالوں میں بھی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ گورنمنٹ ایڈووکیٹ کا فرض ہے کہ ہر ایسے مُستغیث کیلئے پیروی کرے جس کے لئے تنخواہ پاتا ہے۔ ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اُس ہسپتال میں آنے والے تمام مریضوں کا علاج کرے جس میں وُہ نوکر ہے۔ تنخواہ دار مدرس کو ایسے تمام طلبا کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے۔ جو اُس کے زیر تعلیم ہوں۔ اس لئے یہ لوگ اگر اپنے منصبی فرائض میں اپنے ہمقوموں کی جانب غیروں سے زیادہ توجہ کرینگے تو وُہ بھی ظلم اور خیانت کے مرتکب ہیں۔ اعزاز و تحسین کے لائق نہیں۔ مگر جن افعال پر کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا یا کسی قانون کی پابندی لازم نہیں اور کرنے والے کو انتخاب کے لئے پُوری آزادی حاصل ہو۔ وُہی افعال ہیں جنہیں قومی ہمدردی کا موقع مل سکتا ہو اور ایسے کاموں سے کسی کو شکایت اور رنج کرنیکا حق نہیں۔ اور عداوت پیدا نہیں ہو سکتی۔

ہمدردی کا اعلیٰ معیار۔ مگر یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ قومی اور افرادی تہذیب کا ایک معین درجہ ہو جس کی حد تک اپنے اختیاری خدمات کو قوم کے ساتھ مخصوص کرنا قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ ورنہ جب شائستگی اور اخلاق میں اس حد سے آگے ترقی ہوتی ہو تو اور پردے کھلتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے دولت و ثروت اور دُنیا کے عیش و آرام کو کسی قوم اور کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور اس کا دسترخوان اعلیٰ و ادنیٰ

سب کے لئے وسیع ہو۔ علم و فن حاصل کرنے کی قابلیت بھی کسی خاص قوم اور فرقے سے مخصوص نہیں۔ صحت حاصل کرنے کے وسائل اور کاروبار میں کامیاب ہونے کی تدابیر بھی ہر قوم کو یکساں مفید ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ سب ضروریات ہیں اور قدرت نے سب ابنائے نوع کے لئے بلالحاظ قوم و ملت مہیا کی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص جیب میں پیسہ ڈال کر گھر سے نکلتا ہے اس نیت سے کہ کسی بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لئے دے تو چونکہ وہ پیسہ ہر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے اور اسی لئے بنا ہے تو اب ایک بھوکے کو دیکھ کر اس لئے نہ دینا کہ وہ دینے والے کا ہم قوم نہیں اور تلاش کرنا کہ بھوکا بھی ہو اور ساتھ ہی وہ اسی نسل سے ہو جس میں دینے والا ہے یا انہی عقائد کا پابند ہو جو دینے والا رکھتا ہے تو حقیقت میں یہ خیرات میں ایسی صفت کا ایزاد کرنا ہے جو قدرت نے اس کے اندر نہیں رکھی اور یہ اعتقاد کر لینا ہے کہ یہ پیسہ ہماری جیب میں اگر غیر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اور ذرا باریک نظر سے دیکھا جائے تو اس بھوکے پر ظلم ہے جو ہر ایک کے کام آنے والا پیسہ لیکر جانیوالے کو سب سے پہلے ملا تھا۔ اور اسی طرح جو شخص کوئی اور خدمت کرنے کے لائق ہے اور خدمت کرنی چاہتا ہے تو چونکہ سب قابلیتوں میں قدرت نے ہر قوم کو فائدہ پہنچانے کی خاصیت رکھی ہے اور قدرت ہی نے فائدہ پہنچانے والوں کو وہ قابلیت دی ہے اس لئے فائدہ پہنچانے کی نیت کرنے کے بعد درحقیقت منشائے قدرت کے خلاف ہوگا۔ اگر اس شخص کو محروم رکھا جائے جو سب سے پہلے فائدہ لینے کا مستحق ثابت ہوا ہے اور محروم اس خیال سے رکھا جائے کہ وہ اُن مراسم کا پابند نہیں جو فائدہ دینے والے کو پسند ہیں۔

عداوت کا دفعیہ۔ بیشک ملک میں ایسا اعلیٰ اخلاق اور حاجتمند کو دیکھکر مدد کے لئے بیقرار ہو جانے کا جذبہ اور تمام انسانوں کو مساوی سمجھنے کا یقین پیدا

ہونا ایک طرف۔ ابھی اس کا امکان بھی دُور ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ابھی ہمدردی کے ابتدائی درجوں میں اور ظلم میں تمیز کرنے کا ملکہ بھی نظر باکثر حالات مُلک میں پیدا نہیں ہُوا۔ اور تمام ایسے واقعات میں جہاں دو فریق یا دو اُمیدوار مختلف قوموں میں سے ہوں ہمدردی کی لہر اُٹھتی ہے۔ اس شخص کے لئے جو اپنا ہمقوم ہو اور نہیں توجہ کی جاتی اُس ضرورت یا استحقاق کی طرف جو غیر کو حاصل ہے۔ اور یہی غلط فہمی باہمی عداوت اور عناد کا باعث ہوتی ہے اور جب تک باقی رہیگی عداوت کو نابود نہ ہونے دیگی۔ اور اس سے آگے یہ شکایتیں کہ ہندو یا مُسلمانوں نے بعض ایسی تجارتیں کیوں اختیار کیں جو پہلے دُوسرے فریق کے قبضہ میں تھیں۔ یا کسی فریق نے علیحدہ پولیٹیکل انجمن کیوں بنائی۔ بلکہ یہ بھی کہ دُوسروں سے جُدا ہوکر کسی حاکم کو گارڈن پارٹی کیوں دی۔ اِن باتوں پر واویلا کیا جانا اور عداوت کا سبب سمجھا جانا ہے اسی لئے کہ رنجش کی تخم ریزی بیجا طرفداری کے جذبہ سے ہو چکی ہے اور اس کا پھل اِن شکلوں میں ظاہر ہونا ضرور تھا۔ لیکن اگر اُن تمام نتائج کو غور سے دیکھا جائے جو طرفداری کے شوق میں دُوسروں پر ظلم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور دُوربینی کی حس کو ترقی دیکر اُن نقصانوں کو معلوم کیا جائے جو غلط ہمدردی سے خود اپنی قوم کو پہنچ سکتے ہیں تو پھر جس طرح دشمن کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھکر گاڑی کو دریا میں ڈبونے کی کوشش نہیں ہو سکتی اور ایک چھت کے نیچے بیٹھکر اس کو جلانے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دشمن کے ساتھ خود اپنی ہلاکت کا یقین ہوتا ہے اسی طرح مقدمات - ملازمت - امتحان اور پولیٹیکل جدوجہد کے موقعوں پر غیروں کے حقوق پامال کرنے کا خیال بھی نہ آئیگا۔ کیونکہ عقل پیش بین اُس وقت بھی اسی طرح خود اپنی قوم کے لئے مضرت اور نقصان محسوس کریگی۔ اور عقل کی ایسی اصلاح اور اخلاق کی اس قدر درستی کے بعد جب وُہ افعال سرزد نہ ہونگے جو عداوت کو پیدا کرتے اور اسے ترقّی دیتے ہیں اور انصاف

کا جذبہ غلط ہمدردی پر غالب آکر ایک کے ہاتھ سے دُوسرے کو ناجائز تکلیف نہ پہنچنے دیگا تو عداوت خود بخود محبت اور یگانگت میں بدلجائیگی اور اس وقت دل و دماغ کی روشنی اُن تاریکیوں کو بھی دُور کر دیگی جن سے عداوت کے دیگر اسباب پیدا ہوتے ہیں اور سمجھ میں آسکیگا کہ اگر بالفرض مُسلمان سلاطین کے ہاتھ سے غیر مذہب رعایا کو کبھی امن نصیب نہیں ہُوا تو بھی اس وقت وہ لوگ موجُود نہیں جنکے جور و ستم کی فریاد کیجاتی ہے اور اب جو نسل موجود ہے وُہ دیگر اقوام کے ساتھ ایک سلطنت کے ماتحت ایک ہی طرح کے قوانین کی پابند اور ایک ہی مُلک کی خوشحالی اور بدحالی میں حصہ لینے والی ہے۔ اس لئے اس جور و ستم کا انتقام جو گذشتہ مُسلمانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں سے لینا جنکو اس میں بالکل دخل نہیں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔

ایک اور ضرورت غرض میرا خیال ہے کہ عداوت ہمدردی کو غلط استعمال کرنے سے پیدا ہُوئی ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے اور دل میں اعتقاد ہو کہ جن معاملات میں انصاف اور قانون کو دخل ہے ہمقوم اور غیر اور دوست اور دشمن برابر ہیں اور ہمدردی صرف اُن موقعوں میں ہوسکتی ہے جہاں کسی قسم کی رعایت انسان کی اپنی مرضی اور انتخاب پر موقوف ہو تو ملک میں عداوت کا نشان نہ رہیگا۔ اور تمام واقعات کی حقیقت کھُل جائیگی۔ جن سے باہم دگر شکایت کرنے کا موقع ملتا ہے مگر ان سب مرحلوں کو طے کرنے کے بعد مجھے ایک امر کی نسبت پھر بھی اندیشہ ہے اور مَیں خیال کرتا ہوں کہ مذہبی بحث و تکرار اگرچہ فی نفسہٖ بُری نہیں ہیں مگر اس میں بدتہذیبی سے کام لینا اور اصُولِ مذہب پر روشنی ڈالنے کی بجائے مذہبی پیشواؤں کو بُرا کہنا اور غلط اتہاموں سے دیگر مذاہب کو بدنما کرنا بعض صاحبوں کا پیشہ ہوگیا ہے اور مَیں سمجھتا ہُوں کہ اُن میں ہمدردی کا جوش اور غلطی سے ایسی کوششوں کو مفید سمجھنے کا خیال بھی نہیں بلکہ محض شکم پروری اور گرم بازاری کی خواہش ہر جگہ

نادانوں کے مذہبی جوش اور غلط ہمدردی کے خیال سے فائدہ اُٹھا کر پوری کیجاتی ہو
اور اس لئے ایسے لوگ ہمدردی اور انصاف کو سمجھ لیں جب بھی توقع نہیں ہو سکتی کہ آگ
پر تیل ڈالنے اور دونوں قوموں کو ایک دُوسرے کے خلاف بھڑکانے سے باز آئیں
ان لوگوں کی تعداد کیسی ہی محدود ہو۔ ملک میں فتنہ وفساد قائم رکھنے کے لئے
کافی سے زیادہ ہے اور وُہ نادانوں کے مذاق کو ایسا خراب کر چکے ہیں کہ مضمون
نگاری سے معاش پیدا کرنے والوں کو مفید مضامین پر ایسی قدر افزائی کی توقع
نہیں جس قدر بازاری گالیوں اور کمینہ طعن وتشنیع کی اشاعت سے متصور ہے اور اس
لئے ان کی تعداد میں کمی آنے کا احتمال بھی نہیں۔ لیکن اگر عداوت ملک کے لئے مضر
ہے اور اگر ترقی باہمی محبت اور اتحاد پر منحصر ہے تو جہاں مُلکی ترقی کا ذریعہ سمجھکر غیر مُلکی
اشیاء کو ترک کرنے اور لوگوں سے چھُڑوانے کی کوشش کیجاتی ہے حالانکہ عام پبلک
ملکی اور غیر مُلکی میں تمیز کرنے کی قابلیت اور نیز خواہش نہیں رکھتی اور جہاں قومی ہمدردی
کی دھُن میں بعض بعض جگہ ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان ہندوؤں کو بائیکاٹ کرتے
سُننے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک کا گذارہ دُوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ وہاں ترقی کا اصلی
راز دریافت کرنے والوں اور اتحاد ویگانگت کی قدر وقیمت سمجھنے والوں میں کیا ایسے
جوانمرد پیدا نہیں ہو سکتے جو بے تہذیب مضمون نگاروں کو بائیکاٹ کریں۔ اور ایجوکیشنل
سوشل اور پولٹیکل اغراض کے لئے جد وجہد کرنے اور لوگوں کو ترغیب دینے کے ساتھ
اس امر کا بھی عزم کریں کہ دل آزار تحریروں اور بانیان مذاہب کی بے ادبی کرنیوالے
رسالوں اور اخباروں کو نہ خریدینگے اور جہانتک ممکن ہوگا لوگوں کو ان کی امداد و
اعانت سے باز رکھینگے۔ اور جس طرح ٹمپرنس سوسائٹی یا اصلاح تمدن کے حامی بعض
عادات اور رسوم کو چھوڑنے کا عہد کر کے اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے کی مسلسل کوشش
کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سوسائٹی فتنہ انگیز تحریر وتقریر کو چھوڑنے اور چھڑوانے

کی باقاعدہ کوشش کو اپنا فرض گردانے تو کیا ایسی کوشش پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا؟ یا کیا اہل ملک کی باہمی عداوت ملک کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی جس قدر شراب خواری اور دیگر رسوم سے متصور ہے۔ اور کیا مذہبی دل آزار تحریریں لعنت کو بڑھانے اور ایک کو دوسرے کے خون کا پیاسا کرنے کی منحوس خدمت ادا نہیں کرتیں؟ اگرچہ دل و دماغ ان نتائج کو محسوس نہیں کرتے تو اُنکے لئے بیشک کسی کوشش کا موقع نہیں اور دریا کی دو دھاروں کو شوق سے علیحدہ ہو کر اپنی روانی کا زور کھو دینا چاہیئے مگر ایسے لوگوں کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ واقعے کی سچی کیفیت کو سمجھنے والے بھی موجود ہیں اور انہی کا فرض ہے کہ ہمدردی اور انصاف کے مدارج سمجھیں اور سمجھائیں اور عداوت کی آگ پر پانی ڈالیں اور تیل ڈالنے والوں کے آگے دیوار آہنی بن کر کھڑے ہو جائیں +

محمود علی از کپورتھلہ

تیمارداری۔ مولوی محمد سعید صاحب صوفی نے تیمارداری نام ایک کتاب انگریزی زبان سے ترجمہ کی ہے جسے شیخ محمد عبد اللہ صاحب وکیل علیگڈھ و ایڈیٹر رسالہ خاتون نے شائع کیا ہے۔ اور جنرل بکنگ ایجنسی علیگڈھ سے (بقیمت ۱۲) مل سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لائق مترجم نے ایک ایسی ضرورت کو پورا کیا ہے جو مدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اور اردو خوان صاحبان اور خواتین اس کتاب کو بہت کارآمد پائینگے۔ ابتدا میں شیخ محمد عبد اللہ صاحب نے دیباچہ کے طور پر چند صفحے لکھے ہیں۔ جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں بعض ہدایات تیمارداری کی ایسی درج ہیں جو انگریزوں کے ملک یا اُنکے طریق بود و باش کے لئے مناسب ہیں اور ہندوستان میں اُن پر عمل نہیں ہو سکتا۔ لیکن عام اصول ہر جگہ یکساں ہیں اور اُن پر عمل کرنا بیماروں اور تیمارداروں دونوں کے لئے مفید ہوگا +

جاپان میں تعلیم نسواں

مسز کیلب صاحبہ نے لاہور میں ایک مختصر سی زنانہ لٹریری سوسائٹی قائم کی ہوئی ہے جہاں کبھی کبھی پردہ دار خواتین کو جمع کر کے بعض دلچسپ مضامین پر لکچر دیئے جاتے ہیں یہ مضمون ایک لکچر کا ترجمہ ہے جو خود مسز کیلب صاحبہ نے چند روز ہوئے دیا تھا:-

جاپانی عورتیں پرانے زمانے سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ مگر جو تعلیم مردوں کو دیجاتی تھی اس سے عورتوں کی تعلیم کو کوئی نسبت نہیں ہوتی تھی۔ سترھویں صدی میں جب جاپان میں علوم و فنون کا ایک دَور جدید شروع ہو رہا تھا تو اہل الرائے لوگوں نے محسوس کیا کہ عورتوں کو فقط نرمی فرمانبرداری۔ دیانت۔ رحمدلی وغیرہ نیکیوں کی تلقین ہی کافی نہیں۔ بلکہ اُن کی دماغی قوت کو بھی ترقی دینی چاہیئے۔

ایک شخص کیبارا نامی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورتوں کے بہت سے نقص صرف اُن کی جہالت یا اُن میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔ اس کی رائے تھی کہ سات برس کی عمر تک لڑکے اور لڑکیوں کو یکجا اور یکساں تعلیم دیجاتے۔ اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم جُدا ہونی چاہیئے۔ اور انہیں چینی زبان کی قدیم علمی کتابیں لکھائی پڑھائی اور حفظ کرائی جاویں۔ اور عورتوں کے متعلق پرانے عالموں کی تصانیف انکے درس میں رکھی جاویں۔ جب دس برس کی ہو جاویں تو انہیں گھروں سے باہر نہیں جانا چاہیئے۔ اور وہیں سینا۔ بُننا۔ حساب کتاب اور انتظام خانہ داری سیکھنا چاہیئے۔ جب اَور بڑی ہو جائیں تو اُنکے بزرگوں کا فرض تھا کہ انہیں عامیانہ اور ناشائستہ کتابوں اور گیتوں سے پرہیز کرنے کی تاکید کر دیں۔ اور اس بات کی احتیاط کریں کہ عورتوں کی چاروں ضروری

خصلتیں یعنی پاکدامنی - وضع داری حیا اور خدمت گزاری غرض وُہ سب صفات جو عورت کی شان کے شایان ہیں ان میں موجود ہوں - تاکہ جب ان کی شادی کا وقت آئے تو وُہ سچی نسوانی خوبیوں سے معرا نہ پائی جاویں

کیبارا کے بعد اس کے بعض مداحوں نے اس کی ان ہدایات کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا اور اعلےٰ تعلیم نسواں اس کا نام رکھا - چونکہ یہ کتاب اس وقت کی تمدنی حالت کے موافق تھی اس لئے اس کو اس قدر شہرت اور وقعت حاصل ہوئی کہ کوئی شریف گھر ایسا نہ تھا جس میں اس کتاب کا ایک نُسخہ موجود نہ ہو - لوگ اسے لڑکیوں کی تعلیم کا دستور العمل سمجھتے تھے - اس کے رُو سے عورتوں پر بزرگوں کی تعظیم اور اطاعت لازم تھی اور مرد اور عورت کے فرائض بالکل متمیز تھے - یہ کتاب اس قدیم چینی مسئلہ کی حامی تھی - جس کے مطابق طلاق کی سات وجوہات تھیں اور نکاحِ بیوگاں ممنوع تھا حقیقت یہ ہے کہ مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے بارے میں یہ کتاب چین کے مذہبی پیشوا کنفوشیس کے اقوال کی تفسیر تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عمل ہمیشہ کنفوشیس کے اقوال پر نہیں رہا - کیونکہ بہت سی پُرانی روایات اور تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں سب اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ ایسی ایسی ہمت والی عورتیں گذری ہیں جو جنگی اور سیاسی معاملات میں شریک ہوتی تھیں اور تمدنی امُور میں مردوں سے پُورا مقابلہ کرسکتی تھیں - چنانچہ آٹھویں صدی میں شاہزادیاں تخت پر مسلسل بیٹھتی رہیں - مگر دسویں صدی سے ان کی حالت میں زوال شروع ہوا اور عورتوں کی دماغی اور اخلاقی قوت کم ہونے لگی - نزاکت خوبی سمجھی جانے لگی اور یہ فیشن ہو چلا کہ عورتیں تکلف سے اپنے آپ کو نازک اور حسین ظاہر کریں اور

حیا و شرم کے یہ معنے قرار پائے کہ خود اپنے خاندان کے مردوں کے سامنے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے۔ اِس کے بعد بارھویں صدی میں جب فوجی گروہ کا زور ہوا تو عورتوں کو خانہ نشین رہنے اور اپنے آپ کو مٹانے کی تلقین ہونے لگی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بُدھ مذہب کا زور بڑھتا جاتا تھا اور وُہ یہ سکھاتا تھا کہ عورتیں گناہ کی پتلیاں اور بے وفا اور بے رحم طبع ہیں اور انہیں لازم ہے کہ اپنے آپ کو مٹا کر اپنی زندگی عبادت میں صرف کریں اور اگر اس پر بھی اطمینان قلب نہ حاصل ہو تو تارک الدُّنیا ہو جائیں۔ مردوں عورتوں کو اس زمانہ میں ایک دُوسرے سے بالکل جُدا رکھا جاتا تھا اور ان کو سیر وغیرہ کے لئے بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب کنفیوشیس کا مذہب پھر تازہ ہونے لگا تو عورتوں کو کسی قدر زیادہ آزادی ملی۔ مگر اس مذہب کے جو مسائل مردوں کی فوقیت کے بارے میں تھے وُہ اور زور پکڑ گئے اور یہ بھی خرابی پیدا ہوئی کہ اس مذہب کے عالم اکثر ایسے مرد تھے جو خود اچھے اخلاق نہیں رکھتے تھے۔

دسویں صدی کے اخیر اور گیارھویں صدی کے شروع میں خاندان فیوجی دارا کی ملک میں بڑی عزت تھی۔ اس خاندان کی بیٹوں میں سے پاشاہوں اور شاہزادوں کے لئے بیگمات چُنی جاتی تھیں۔ اور انہیں اس اعلیٰ مرتبہ کے قابل بنانے کے لئے نہایت لائق اور تعلیم یافتہ اُستانیاں موجود رہتی تھیں جو انہیں تعلیم دیتی تھیں۔ اور جب وُہ محلات میں جاتی تھیں تو وُہ اُنکے ساتھ جاتی تھیں۔ ان بیگمات میں سے بعض ایسی تربیت یافتہ ہوتی تھیں کہ وُہ صاحبِ تالیف و تصنیف گذری ہیں۔ انہیں میں وُہ مشہور عورت ہے جس کا نام مونوگٹاری ہے اور جس کی نظم و نثر بلحاظ خوبی و طرز ادا کے مدتوں طالب العلم لڑکے اور لڑکیوں کو قابل تقلید نمونے کا کام دیتی رہی۔ وقتاً فوقتاً عورتوں کے فائدہ کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جاتی

رہیں جس میں بیشتر زور اس امر پر دیا جاتا تھا کہ عورت کو چاہئے کہ اپنے شوہر کے ساتھ وفاداری کرے اور جان پر کھیل جائے مگر ناموس پر دھبہ نہ آنے دے - مگر عورتوں کو سوسائٹی میں اپنا اصلی مرتبہ اس وقت حاصل ہوا جب پندرہ سو انچاس میں ۱۵۴۹ فرانسس زیویر نامی ایک جسویٹ پادری وہاں پہنچا - اس نے نہ صرف عیسوی مذہب جاپان تک پہنچایا - بلکہ اس نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی اور گو ایک پولیٹکل صدمے نے تھوڑے ہی عرصہ میں جسویٹ پادریوں کو جاپان سے نکال باہر کیا لیکن جو شعلہ وُہ بھڑکا گئے تھے وُہ بڑا ہوتا گیا اور انیسویں صدی تک بیرونی اور اندرونی واقعات نے ایسی صورت اختیار کی کہ نوجوانان قوم نے بوڑھوں کی مخالفت کے باوجود یہ فیصلہ کر لیا کہ مغربی تہذیب کو اپنے ملک میں رواج دیں - عام اصلاح کی جو تجویز ہوئی اس سے عورتوں کو خارج رکھنا ناممکن سمجھا گیا اور تسلیم کیا گیا کہ کوئی لڑکی اچھی بیوی اور اچھی ماں نہیں بن سکتی جب تک کہ وُہ تعلیم نہ حاصل کرے - اعلیٰ خاندانوں نے لڑکیوں کے مدرسے قائم کرنے کے واسطے بہت سا روپیہ دیا - اگرچہ وُہ مدرسے انہیں خاندانوں کی تعلیم کے لئے بنے تھے اور ان کا فائدہ محدود تھا تاہم وُہ تعلیم نسواں کے پیشرو تھے اور ان سے طریق تعلیم میں ایک جدت پیدا ہوئی سال ۱۸۷۱ء میں شاہ جاپان نے اپنے اُمرا کے نام ایک فرمان جاری کیا - جس میں انہیں ممالک غیر کی سیاحت کی ترغیب تھی اور اسی میں تعلیم نسواں کے متعلق حسب ذیل ارشاد تھا -

"ابھی اس مُلک میں ہمارے پاس عورتوں کی تعلیم کے واسطے کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے اور وُہ عموماً معاملات کے سمجھنے اور اُن پر رائے قائم کرنیکی قابلیت میں ناقص ہیں - بچوں کی تربیت ماؤں کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح مائیں اُن کی تربیت کرینگی اسی طرح وُہ بڑھینگے - یہ ضروری معاملہ ہے - اس لئے یہ مناسب

ہوگا کہ اب سے جو لوگ باہر جائیں وُہ اپنی بیبیوں کو اور لڑکیوں کو یا بہنوں کو ساتھ لیجائیں۔ تاکہ وُہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اُور مُلکوں میں عورتیں کس طرح تعلیم پاتی ہیں اور کس طرح بچّوں کی پرورش کرتی ہیں"۔

اس تاکید کے بعد تعلیم نسوان کا شوق بڑھتا گیا اور ہر طبقہ کے لوگ علم کی تلاش میں دَوڑ پڑے ۱۸۷۲ء میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم ملک میں جاری کی گئی اور یہ حکم ہوا کہ ہر درجے کے لوگوں کے لڑکے لڑکیاں ۶ برس کی عمر میں مدرسوں میں داخل ہو جائیں۔ ۱۹۰۵ء کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری اور نجی کے زنانہ مدرسوں کی کل تعداد ایک سو تھی اور طالب علموں کی تعداد ۴،۲۱۵،۴ - لڑکوں کے مدرسین کی تعداد ۲۷۱ اور تعدادِ طلبا ۱۰۴۵۱۱ تھی - چونکہ آبادی میں زن و مرد قریب قریب برابر ہیں اور مدرسے جانے والی لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد میں ایک اور تین کی نسبت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نسواں میں ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ حال میں وہاں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ عورتوں کو ایسی تعلیم دیجائے جس سے وُہ اگر ضرورت پڑے تو اپنی روزی پیدا کر سکیں۔ اور ٹوکیو میں ایک چھوٹا سا طبّی مدرسہ جاری ہوا ہے۔ جس میں عورتیں ڈاکٹری تعلیم پا رہی ہیں اور نرسیں اور دائیاں بن رہی ہیں اور اس وقت ۱۴۰ عورتیں ملک میں ڈاکٹری کا کام کر رہی ہیں۔

سن ۱۹۰۱ء میں ٹوکیو میں زنانہ یونیورسٹی کھولی گئی جس میں تدبیر خانہ داری لٹریچر معلّمی اور سائنس کی تعلیم ہوتی ہے اور عنقریب ورزشی تعلیم۔ موسیقی اور فنونِ لطیفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اس یونیورسٹی میں جاری ہونے کو ہے۔ اس کے ساتھ کنڈرگارٹن اور ابتدائی سکول اور زنانہ ہائی سکول ہیں۔

ایک محکمہ ایسا بھی ہے جس میں دست کاری سکھائی جاتی ہے اور تجارتی

تعلیم دیجاتی ہے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں عورتوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں کی جارہی لیکن مغربی خیالات کے موافق ابھی بہت ترقی درکار ہے مجھے شک نہیں کہ جوں جوں جاپان کے مردوں میں علم زیادہ ہوتا جائے گا وُہ تسلیم کرینگے کہ اگرچہ عورت کو زیادہ تر اپنے گھر کے فرائض اور بچّوں کی تربیت ہی میں مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس کے فرائض کا دائرہ وسیع ہے۔ مثلاً اپنے شوہر کی رفاقت۔ بیماری میں اس کی خبر گیری اس کی تکالیف میں اس کی حوصلہ افزائی روزمرّہ کے معاملات کو حسنِ تدبیر سے طے کرنا اور شوہر کے دل میں اپنے خاندان کی ترقی اور قوم کی ترقی کے لئے اعلیٰ اور نیک ارادے پیدا کرنا یہ سب کچھ جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو ہر طرح کی عمدہ تعلیم دیجائے اور اُن کی اخلاقی اور دماغی تعلیم و تربیت مکمّل ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دُوسرے کا تتمہ ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دُوسرے کے بغیر نامکمّل ہے +

جامِ سُرُور منشی دُرگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو انڈین پریس الہ آباد میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ بیشتر نظمیں وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً اوراقِ مخزن و زمانہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور وُہ نظمیں بھی جو حال میں رسالہ ادیب الہ آباد میں نکلی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ منشی صاحب کا کلام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ مُدت سے درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اُمید ہے کہ انکے کلام کے معترف اس مجموعہ کے شائع ہونیکی خبر خوشی سے سنیں گے اور اسے خرید کر اپنے کتب خانوں میں جگہ دینگے۔ کاغذ لکھائی چھپائی سب عمدہ ہیں۔ کتاب کے شروع میں منشی نوبت رائے نظر نے ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اور سرور صاحب کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت دو سو صفحہ کے قریب ہے اور قیمت دو روپیہ ہے +

کوہِ سائنس

موسم بہار شباب پر تھا۔ جس کے دلفریب مناظر قدم قدم پر دل چھینے لیتے تھے۔ نیلگوں آسمان کا صاف چمکدار رنگ آنکھوں میں کھُبا جاتا تھا۔ رُوئے زمین کثرتِ گلہائے بوقلموں اور میوہائے گوناگون سے روکشِ باغِ ارم بن رہی تھی۔ دِل بے اختیار اُس صنّاعِ بے بدل کی چابکدستیوں پر لوٹ تھا۔ جس طرف نظر اُٹھ جاتی تھی حکمت ہی حکمت نظر آتی تھی۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

کچھ عرصہ میں یُوں دلفریب قدرتی مناظر کی خوبیوں سے حظ اُٹھاتا رہا۔ آخر پھرتے پھرتے تھک کر ایک چٹان کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ جس کو قدرت کے رنگساز کاری نے سبز رنگا تھا۔

خشک پتّوں کے جھڑنے کی سریلی جھنکار۔ آبشاروں کے زمین پر گرنے کی دلفریب آواز۔ مُرغانِ خوش الحان کے دلکش نغمے عجب فرحت بخش تھے۔

الغرض مَیں اپنے ارد گرد کی دلفریبیوں پر غور کرتے کرتے خوشگوار نیند کے مزے لینے لگا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ مَیں ایک وسیع میدان میں کھڑا ہوں۔ جس کے وسط میں ایک کوہ فلک فرسا سدِ سکندری کی طرح ایستادہ تھا۔ جس کی بلندی دیکھ کر طائرِ وہم و خیال کے ہوش اُڑتے تھے۔ یہ میدان سبزہ آغاز نوجوانوں سے بھرا پڑا تھا۔ جن میں سے اکثر بڑے جوش و

خروش سے قدم بڑھائے چلے جاتے تھے۔ اگرچہ رستہ اکثر جگہ بالکل سیدھا اور ناقابلِ گذر تھا۔

وُہ لوگ جنہوں نے ابھی چڑھنا شروع کیا تھا۔ اپنے کو قلۂ کوہ کے قریب ہی سمجھتے تھے۔ مگر جُوں جُوں وُہ آگے بڑھتے تھے۔ نئے نئے پہاڑ ایک دُوسرے پر اُٹھتے ہُوئے نظر آتے تھے۔ سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی جو اُنہوں نے اوّل اوّل دیکھی تھی۔ اس وقت ایک دُوسرے پہاڑ کا دامن ثابت ہوتی تھی۔ آخرکار رفتہ رفتہ تمام پہاڑ بادلوں میں غائب ہونے لگے۔

مَیں ان تمام چیزوں کو نہایت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعۃً میرا فرشتۂ ہدایت ظاہر ہُوا اور کہنے لگا۔ "یہ پہاڑ جو تیرے سامنے ہے۔ **کوہِ سائنس** ہے۔ اِس کی چوٹی پر **صداقت** کا مندر ہے۔ جس کی چوٹی بادلوں کے اوپر ہے۔ اور اس کے رُخ کو نور کا نقاب چھپائے ہُوئے ہے۔ خاموشی اور غور سے اس کے پرستاروں کی ترقی دیکھ۔"

مَیں نے دیکھا کہ اس پہاڑ تک رسائی صرف ایک دروازہ سے ہے۔ جسکو **دروازۂ زبان** کہتے ہیں۔ اس کی محافظ ایک عورت تھی جس کے چہرہ سے غرور و فکر نمایاں تھا۔ اس کے لب ہر دم حرکت میں تھے۔ گویا وُہ اپنے دل میں کوئی چیز دُہرا رہی تھی۔ اس کا نام **حافظہ** تھا۔ جونہی کہ مَیں پہلے دروازہ میں داخل ہوا میرے کان ناخوشگوار کریہہ آوازوں کے شور سے کر ہوگئے۔ معاذ اللہ اس قدر مخلوط اور بے معنی تھیں۔ کہ انکے سامنے غوغائے بابل بھی گرد تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے مڑ کر پہاڑ کو دیکھا۔ جہاں ہمیشہ صاف اور فرحت بخش ہوا چلتی تھی۔ رستہ پر آرل اور دیگر سدا بہار درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔ اور تجلی انوار جو اس مقدس دیوی کے رخ سے درخشاں تھے۔ اس کے پرستاروں کے چہروں کو عجیب پُرجلال بناتی تھی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا "آہ! کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس پہاڑ کو طے کرتے ہیں"۔ ابھی یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مقدس صورت سراپا نور و محبت پہلو میں ایستادہ نظر آئی۔

مقدس صورت "۔ ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ ہیں جنکو نیکی قناعت کے محلوں میں داخل کرتی ہے"۔

میں "۔ کیا نیکی اس درۂ کوہ میں رہتی ہے"۔

مقدس صورت "۔ ہاں میں درہ میں بھی ہوں۔ پہاڑ کو بھی روشن کرتی ہوں۔ میں ہی مزدور کو محنت کے وقت خوش کرتی ہوں۔ میں ہی حکیم کو غور و فکر کی حالت میں تسلی دیتی ہوں۔ میں شہروں کی عام جماعتوں میں شامل ہوں۔ میں مرتاض کو اس کے تنگ و تاریک غار میں مبارکباد دیتی ہوں۔ میرا مسکن ہر ایک دل میں ہے جو میرا دلدادہ ہے۔ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہوں۔ جو میری تمنا کرتا ہے۔ بیشک سائنس تم کو عالم و فاضل بنا سکتی ہے مگر صرف میں ہی ہوں جو تمہیں حقیقی خوشی کی راہ پر لگا سکتی ہوں"۔

جبکہ مقدس دیوی اس طرح ہمکلام تھی۔ میں نے اسقدر زور سے اپنے ہاتھ اسکی طرف بڑھائے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ شبنم چاروں طرف پڑ رہی تھی۔ تمام دلفریب مناظر رات کے تاریک پردہ میں غائب ہوتے جاتے تھے۔ میں جلد جلد گھر کی طرف روانہ ہوا اور تمام رات مجھے اسی خاموشی اور غور و فکر میں گذری +

محمد سجاد علی ایف۔ اے (کرنال)

کلامِ اکبر

کیا ہے دَورِ فلک میں کوئی تمکین کے ساتھ جب زمانہ چلے ایک ہی آئین کے ساتھ
دل دیا۔ مال دیا۔ پیار کیا اُنکو مگر ان بُتوں کو وہی کاوش ہے میرے دین کے ساتھ
مخلصانہ جو نہ ہو مدح تو کیا لُطف آئے چشمِ غمّاز کی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ

رہی نہ قلب میں قوّت زمانہ سازی کی دُعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی
فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو ہمیں سے داد بھی چاہی خوش امتیازی کی
بہت خلوص سے حاضر رہا میں خدمت میں مگر حضور نے مجھ سے زمانہ سازی کی
خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی
ہمیشہ پیشِ نظر ہیں وضو شکن منظر اس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی
گلے میں پھیرتے ہیں تیغ معذرت کے ساتھ خدا کے فضل سے عادت ہے دلنوازی کی
اگرچہ بینڈ کی گت بھی ہے لغزب اکبر مگر وُہ بات کہاں نغمۂ حجازی کی

کیوں خدا کے جاب میں بحثوں کی اتنی دُھوم ہے ہست میں کُچھ شبہ نہیں ہے حقیقت نامعلوم ہے
اس تغیر پر بھی ہے ذہنوں میں قائم کوئی چیز اور وُہ کیا ہے فقط یا حیُّ یا قیوم ہے

میں نے جو کہا چاند سے رخسار کو لا پاس کہنے لگا بوسے کا تو کر لیجیے لا پاس

کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

نہیں کچھ اس کی پرسش اُلفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

سید اکبر حسین

عورت کی ساخت

سنسکرت کے جادو نگار نے اپنے علم الاصنام کے رُو سے لکھا ہے کہ جب توشتری دیوتا عورت ذات کے بنانے کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ تمام مسالہ تو مرد کی تعمیر میں صرف ہو چکا۔ اب کوئی ٹھوس عنصر باقی نہیں رہا جو عورت کی ساخت میں کام آئے۔ چنانچہ اُس نے بحرِ تفکّر میں غوطہ لگایا اور دیر بعد زانو سے سر اُٹھا کر اس نظم کے نصفِ اوّل میں جو اشیاء مذکور ہیں بہم کر کے انہیں گوندھ ملا کر عورت کی مورت تیار کر دی۔ جب یہ خیال اُردو کے مینا کار کے ہاتھ آیا تو اُس نے نہ صرف اسے نظم ہی کا لباس پہنایا بلکہ اپنی شاعری کی قلمکاری سے پُرانے خاکہ میں ایسے رنگ بھرے کہ صنفِ لطیف کی ایک بولتی چالتی تصویر تصوّر کی نگاہوں میں کھنچ گئی

چاند کی لیکر گولائی۔ سانپ کا پیچ اور خم
گھاس کی پتّی کی ہلکی تھرتھراہٹ بیش و کم

بیدِ مجنوں کی نزاکت بیل کے بل کی کجی
بانکپن طاؤس کا۔ نرمی گُلِ کہسار کی

پیارے پیارے۔ بھولے بھولے دیدۂ آہوئے چیں
جن میں ہو رقصِ شعاعِ نورِ خورشیدِ مبیں

ابر سے آنسو۔ صبا سے بیوفائی لی اُڑا
سہم خرگوش اور چیتے سے لیا جور و جفا

سرد مہری برف نے دی۔ سختی ملی الماس سے
تا بتانِ آہنی دل کا۔ دلِ سنگیں بنے

طوطیٔ گلزار نے رنگینیٔ منقار دی
قمریٔ بیزار نے شیرینیٔ گفتار دی

روزِ اوّل سے ودیعت نور کا جوہر ہوا
پرِ بلبل کا اضافہ اس پہ ہلکا پن ہوا

گوندھ گوندھا کر یہ مسالہ جب اکٹھا ہو گیا
دستِ قدرت نے بنایا ایک ڈھانچا نور کا

آگ کا تن بن گیا اور نُور کی صُورت بنی
شکل عورت کی بنی کیا موہنی مُورت بنی

بال سنبل سے لئے نرگس سی چشمِ نیمخواب
رُوئے روشن نے کیا کسبِ ضیائے آفتاب

رُخ ہوا وَالفجر اور وَاللیل زلف اسکی بنی
سُورۂ وَالشّمس سے فرخندہ پیشانی بنی

چشمۂ حیواں کی کھولی مانگ نے سیدھی سڑک
خندہ پیشانی نے صبحِ عید کی پائی چمک

چاندسے مکھڑے پہ قطراتِ عرق کی ہے نمی
چاند کے ٹکڑے پہ افشاں یا ستاروں نے چُنی

ابروئے قوسی کے رکھے ہیں برابر دو ہلال
یا لکھا ہے مطلعِ موزونِ دیوانِ کمال

آنکھ دشتِ کاشغر کا آہوئے رمدیدہ ہو
ہر نگاہِ مست جس کی فتنۂ خوابیدہ ہو

ایک جانب ابروئے پیوستہ نے کھولی کماں
دُوسری جانب ہے تُرکِ چشم نے تھامی سناں

اِک نگاہ کے وار میں ہر شیر آہو ہو گیا
تیرِ مژگاں جو اڑا دل میں ترازو ہو گیا

آتشیں رُخسار میں روشن ہوئی نارِ خلیل
خندہ رُدنی ہنسکے بول اُٹھی ہو اللّٰہ الجمیل

معجزۂ شق القمر کا وُہ لبِ اظہار ہے
اِس کی خاموشی میں پنہاں معنیٔ گفتار ہے

ہر ادا میں بات ہے ہر بات میں انداز ہے
سحر ہے فتنہ ہے یا جادو ہے یا اعجاز ہے

جنت الفردوس سے آیا ہے وُہ سیبِ ذقن
پانی پانی آبِ دنداں سے ہوا دُرِّ عدن

لعل سے لب اور گوہر سے دُرِ دنداں بنے
پنجۂ دستِ حنائی پنجۂ مرجاں بنے

دست و بازو کی جو دیکھی تازہ رُوئی کی بہار
آتشِ سوزِ دروں سے جل اُٹھی جانِ چنار

نُور کے سانچے میں اس کا قدِ موزوں ڈھل گیا
ایک افسوں تھا کہ جو خلقِ خدا پر چل گیا

بن گیا قامت قیامت چال محشر ہو گئی
عالمِ ایجاد میں ہر حال محشر ہو گئی

صادق
(از سرینگر کشمیر)

موسم بہار

سنبھل بیٹھو بے موت کے مرنے والو حسینوں پر ایماں فدا کرنے والو
محبت کا اُلفت کا دم بھرنے والو قدم عشق کی راہ میں دھرنے والو
ہوا باغِ عالم کی بدلی ہوئی ہے
چمن میں گھٹا کیسی چھائی ہوئی ہے

اُمنڈ آیا ابرِ بہار آسماں پر ترانے ہیں مرغِ چمن کی زباں پر
مٹے سب عنادل کے شورِ فغاں پر گیا جوبن آنے لگا بوستاں پر
ابھی خشک تھے سب پہاڑ اور جنگل
ہوا فیضِ باراں سے جنگل میں منگل

گھٹا آتی ہے بدلی موسم نے صورت ہوئی اور سے اور گلشن کی حالت
نظر میں لگی چبھنے پھولوں کی رنگت وہ کلیوں کا کھلنا وہ ان کی نزاکت
نیا روپ گلشن میں بدلا سبھی نے
نکالے غضب پاؤں سروِ سہی نے

سیہ کار بادل بہت پی گیا ہے کسی میکدے پر کہیں جھک پڑا ہے
عجب رنگ سے جھومتا یہ اُٹھا ہے بہکتا ہوا ہر طرف جا رہا ہے
ہے لغزش اسے مے پرستوں سے بڑھ کر
عجب کیا جو کھل کھیلے مستوں سے بڑھ کر

ہر اک لکۂ ابر کی اُف رے شوخی بدلنے کو آیا ہے رندوں سے ٹوپی
ملا جھک کے سب سے دم بادہ نوشی اندھیرے میں اس کو غضب کی یہ سوجھی

ہر اک میکدے میں اجارا ہے اس کا
کہ رندوں سے اب بھائی چارہ ہے اس کا

برستا ہے رم جھم شب و روز پانی   ہے صورت گلوں کی غضب کی سہانی
کوئی سرخ ہے اور کوئی آسمانی   کوئی جمپئی ہے تو ہے کوئی دھانی

چمن کا ہے کچھ اور انداز گویا
یہ سبزہ ہے طاؤسِ طناز گویا

ہری دوب کوسوں نظر آ رہی ہے   جہاں تک نگہ جائے لہرا رہی ہے
نزاکت سے کیا کیا وہ بل کھا رہی ہے   خرامِ حسیناں کو شرما رہی ہے

رگِ ابر کے واسطے نوکِ نشتر
ہے دوب کیوں سر اُٹھائے نہ کیونکر

مزہ موسمِ ابر کا آ رہا ہے   کوئی لُطف معشوق سے پا رہا ہے
کوئی جام بھر بھر کے چھلکا رہا ہے   کوئی سیرِ گلزار کو جا رہا ہے

اُٹھائیں نہ قسمت سے گو لُطف کچھ ہم
مُبارک ہو عرشی کو یا رب یہ موسم

ابوالاعجاز عرشی

نیا زمانہ

ہمارے عنایت فرما پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے موجودہ زمانہ کی انقلابی حالت کا نقشہ مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچا ہے۔ زمین تو پرانی ہے مگر کیفیتیں نئی ہیں:-

پیدا ہوئے ہیں دشمنِ ایماں نئے نئے   ہندو نئے نئے ہیں مُسلماں نئے نئے

ویدوں پہ تازہ تازہ چڑھاتے ہیں حاشیے
گھڑتے ہیں لوگ معنئے قرآں نئے نئے

انساں نعوذ کیا خدا کے بھی سجدے سے عار ہے
پیدا ہوئے ہیں اندنوں شیطاں نئے نئے

کوثر کے بھی خیال میں اب کچھ مزا نہیں
چشمے نکالے خلد میں رضواں نئے نئے

سالوس - وہمی اور جنونی ہیں انکے نام
بندھتے ہیں اہل دل پہ یہ بہتاں نئے نئے

ہو اتفاق شیخ و برہمن میں کس طرح
پیدا ہیں اختلاف کے ساماں نئے نئے

جتنے پڑھے نفاق و حسد اُس قدر بڑھے
تعلیم کے یہ ہم پہ ہیں احساں نئے نئے

اُن کی طرف کسی کی توجہ ذرا نہیں
ہیں جو کھلے ترقی کے میداں نئے نئے

گھر اپنا ایک دل میں بھی تم سے نہ بن سکا
کیا ہو گیا بنائے جو ایواں نئے نئے

داخل نہیں جو ذیل میں اُنکی وہ جرم ہے
ہیں مفتیان عصر کے فرماں نئے نئے

سودائی ہے کوئی تو کوئی ست جگی نژاد
اس گھر میں گھس کے بیٹھے ہیں مہماں نئے نئے

تسخیر ملک دل کا کسی کو نہیں خیال
سرور نئے نئے ہیں نو سلطاں نئے نئے

تھل بیڑا نوح کی بھی نہ کشتی کا لگ سکے
کلجگ میں اُٹھ رہے ہیں وہ طوفاں نئے نئے

زور آزمائیوں کے ہیں مجرے سٹیج پر
رستم نئے نئے ہیں نریماں نئے نئے

حاکم سے بے رُخی ہے تو آپس میں لاگ ڈانٹ
ہیں قوم کی ترقی کے ساماں نئے نئے

جو خال ہے وہ بڑھ کے مسا ہو رہا ہے اب
لاتی ہے رنگ زلف پریشاں نئے نئے

پیرس میں جا کے ٹھانی ہے خدمت ہو قوم کی
اُٹھتے ہیں بیٹھے بیٹھے یہ خفقاں نئے نئے

ہے نقطۂ سیاسی ترقی کا اب قطب
لوگوں کو خوب ہوتے ہیں ہیجاں نئے نئے

بد دل برادروں سے کیا شبہ سے بدگماں
ہیں یہ طریق خدمت اخواں نئے نئے

اُلفت وطن کی دل میں سر میں ہے جوش عشق
دعوے نہیں یہ آپ کو شایاں نئے نئے

سودا ہے سر کو آنکھوں میں چھائی ہے تیرگی
ہم دیکھتے ہیں خواب پریشاں نئے نئے

خال سیہ سے زینت حسن صبیح ہے
بُت سیکھیں دلبری کے عنواں نئے نئے

کوشش یہ ہو رہی ہے سوا مرد ہیں بنائیں — پیدا ہوئے ہیں حامی نسواں نئے نئے
کھانے میں لڑکے۔ لڑکیاں ورزش میں ہیں یہاں — تعلیم کے ہیں کارنمایاں نئے نئے
اندرا سن آگے بال کے کمرے کے بیچ ہے — تفریح کے بھی چاہئیں عنواں نئے نئے
لیکر بغل میں ایک پری ناچیں بزم میں — تہذیب پر ہوئے ہیں جو قرباں نئے نئے
چکر کہاں یہ جا کے ٹھہرتا ہے دیکھئے — لاتی ہے رنگ گردش دوراں نئے نئے
اُن کے نکالنے کی بھی تدبیر کیجئے — دل میں جو پال رکھے ہیں ارماں نئے نئے
اہل زباں کا سرد ہے بازار ان دنوں — شاعر نئے نئے ہیں سخنداں نئے نئے
ٹھہرا ہے حصر ملت و قوم اب زبان پر — تہذیب کے یہ چیلے ہیں ارکاں نئے نئے
یاران رفتہ کی کہیں اب کس سے داستاں — دُنیا نئی ہے اور ہیں انساں نئے نئے

کیفی بہت نہ بزم سخن میں تو بڑھ کے بول
نقاد بن کے بیٹھے ہیں سحباں نئے نئے

کیفی

شکوہ محبوب

مری حسرتوں کا تم نے نہ کیا خیال جاناں — مری آرزو کو تم نے کیا پائمال جاناں
مرے درد کی خبر ہو نہ تو پوچھو حال جاناں — یہی بے وفائیاں ہیں سبب ملال جاناں
یہ ستم اگر نہ ہوتے تو میں مضطرب نہ ہوتا

وہ خدا دکھائے گھڑیاں کہ ہوں شاد کام ہم تم — نہ ہو اپنے جی کا رونا، نہ شباب کا یہ ماتم
کہ رہا نہ دوست کوئی، نہ کوئی رفیق ہمدم — میں ہوں اور درد فرقت مرا دل ہے اور غم
مگر اُف نہ لب پہ آئی وہ وفا شعار ہوں میں

وُہ فراق میں تمہارے مری آہ، اورزاری   وُہ نہ آنسوؤں کا رُکنا شب و روز اشکباری
مری بسترِ الم پر وُہ تڑپ وہ بیقراری   مری زندگی ہی کیا تھی فقط اک نفس شماری
مرا حال کاش! غم میں کبھی منقلب نہ ہوتا

مری داستانِ فرقت نہ سُنے کوئی الٰہی   مری پُرالم حکایت نہ سُنے کوئی الٰہی
مرے دردِ دل کی حالت نہ سُنے کوئی الٰہی   مرا ذکرِ عشق و اُلفت نہ سُنے کوئی الٰہی
چمنِ خزاں رسیدہ گُلِ داغدار ہُوں میں

مرے عشق اور محبت کی نہ تم نے قدر جانی   نہ کبھی پیام بھیجا، نہ سلام ہی زبانی
ہُوا حیف! مجھ کو حاصل نہ مآلِ زندگانی   نہ ثمر جہاں میں لایا مرا نخلِ کامرانی
کہ شرابِ وصل ہوتی، کوئی محتسب نہ ہوتا

مرے کام کے نہیں ہیں یہ سرور و عیش و عشرت   مرے کام کے نہیں ہیں یہ متاعِ مال و دولت
نہ میں راحتوں کا خواہاں نہ میں چاہتا ہوں عزت   نہ میں طالبِ تسلی، نہ میں خوگرِ نصیحت
ستمِ فلک سے نالاں دلِ بیقرار ہوں میں

مرے دل کو کیوں لگی ہے یہ ہوائے وصلِ جاناں   کہ بنا دیا ہے جس نے مجھے شکلِ یاس و حرماں
کبھی بیکسی میں چُپ ہے، کبھی ناشکیب گریاں   یہ بلا گلے نہ لگتی کہ نہیں ہے جس کا درماں
جو میں جرمِ دل دہی کا کبھی مرتکب نہ ہوتا

نہیں تابِ ضبطِ نالہ مرے لب پہ اب فغاں ہے   نہیں زیست کی توقع مجھے زندگی گراں ہے
نہ شباب کی اُمنگیں، نہ یہ دل مرا جواں ہے   میں ہُوں مبتلائے کلفت مرا دم فقط رواں ہے
مرا غم نہ پوچھ محوی کہ بحالِ زار ہُوں میں

محمد حسین محوی لکھنوی

رُباعیات

دُنیا سے سفرِ عدم کا کرنا ہے تجھے
اور منزلِ ہستی سے گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا
اس خاک سے مُنہ لحد کا بھرنا ہے تجھے

دنیا ہوگی نہ اوج و پستی ہوگی
آنکھوں کے سامنے نہ یہ بستی ہوگی
سوتے ہونگے لحد میں اک دن تہِ خاک
تعبیر تری یہ، خوابِ ہستی ہوگی

اس دارِ محن میں اَہ! خورسند ہے تُو
اے خاک نشیں! زمیں کا پیوند ہے تو
دِل دولتِ فقر سے غنی کر منعم!
کیوں حرصِ زر و مال میں پابند ہے تو

مُنہ مانگے دُرِ یگانہ دے گا تجھ کو
سو طرح سے آب و دانہ دے گا تجھ کو
غم رزق کا کھا رہا ہے کیوں اے غافل
دیتا ہے جو سب کو، کیا نہ دے گا تجھ کو؟

دکھلا کے یہ سبز باغ، بجھ جائیں گے
سینے کے، لحد میں داغ بجھ جائیں گے
ہو جائے گا نظروں میں زمانہ تاریک
ان آنکھوں کے جب چراغ بجھ جائینگے

پیوندِ زمیں قالبِ بیجاں کردو!
اس مٹی کو زیرِ خاک پنہاں کردو
حاجت ہی کفن کی کیا فقیروں کے لئے
عُریاں آئے تھے، دفن عُریاں کردو

[redacted]

دل میں نہیں کوئی خوں کا قطرا باقی ۔ اشکوں نے نہ آہ! کچھ بھی رکھا باقی
دل ہو گیا زیست کی حلاوت سے سیر ۔ اب موت کی چاشنی ہے چکھنا باقی

لازم ہے صفائے قلب طاعت کے لئے ۔ ہے شرط خلوص آدمیت کے لئے
آلودہ اسے دروغ و غیبت سے نہ کر ۔ غافل! ہے زبان شکرِ نعمت کے لئے

آزادیِ دل دامِ ہوس میں کیسی؟ ۔ راحت غمِ فکرِ پیش و پس میں کیسی!
پابندیِ نفس اور اُمیدِ نجات ۔ پرواز کی آرزو قفس میں کیسی!

سمجھا ہی رہا یہ سازِ ہستی ہیہات ۔ مر کر بھی کھلا نہ رازِ ہستی ہیہات
پایاں نہیں قصۂ مختصر کچھ تیرا ۔ اے طولِ شبِ درازِ ہستی! ہیہات

دنیائے دنی بھی ہے بلا کا پھندا ۔ ہر تارِ نفس حرص و ہوا کا پھندا
اُبھری ہوئی ہیں جو جسمِ لاغر پہ رگیں ۔ ہے طائرِ جاں کو یہ قضا کا پھندا

وحشت دلِ مُبتلا پہ طاری ہو گی ۔ غم سے نہ وہاں بھی رستگاری ہو گی
بالیں پہ نہ غمگسار ہو گا کوئی ۔ سُنتے ہیں لحد کی رات بھاری ہو گی

رودادِ غمِ سفر سُنانے سے رہے ۔ مانندِ صبا خاک اُڑانے سے رہے
کرلیں جی بھر کے پیار یارانِ وطن ۔ ہم جا کے عدم کو آہ! آنے سے رہے

وہ لطفِ بہارِ زندگانی نہ رہا — وہ دورِ نشاط و کامرانی نہ رہا
اب وقتِ سفر ہے صبحِ پیری آئی — سایہ تیرا اے شامِ جوانی! نہ رہا

اک طرفہ فسوں ہے زندگانی ہیہات — پیری ہے نہ طفلی، نہ جوانی ہیہات
بازیچۂ اطفال ہے دنیا کا طلسم — اک کھیل ہے دورِ فانی ہیہات

ارمانِ شباب کا لہو ہے دل میں — داغِ غمِ آرزو کی بو ہے دل میں
دنیا کی تو سیر کر چکے اے ثناکر — اب کنجِ لحد کی آرزو ہے دل میں

(ثناکر میرٹھی)

ہماری زبان

(ایک گیت)

شہد و شکر سے شیریں اردو زباں ہماری — ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری
اس کے نقاط میں ہے اسکے حروف میں ہے — آرام دل ہمارا تسکینِ جاں ہماری
ہندوستان کی ہے بیشک یہ آبرو — پردے میں ہے اسی کے عزت نہاں ہماری
کشمیر سے دکن تک برما سے تا بہ کابل — یکجاں ہمیں کرے گی اردو زباں ہماری
اس کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے اپنا — معلوم کیا کسی کو دشواریاں ہماری
اس کو بچائیں گے ہم جبتک کہ دم میں دم ہے — ہم میزباں ہیں اس کے یہ میہماں ہماری
عالم میں یکزبانی سے بن بسی ہیں قومیں — ہے محوِ صد زبانی بستی یہاں ہماری
ان صد زبانیوں نے گونگا کیا وطن کو — ہم بھول زباں ملالے قسمت کہاں ہماری

شمع اخیر شب ہیں ہم محفل جہاں ہیں — باقی رہے گی کب تک پھر داستاں ہماری

ناواقف تپش کو معلوم کیا بھلا ہو

گرمی دل و جگر کی طور تپاں ہماری

غلام محمد طور۔ بی۔اے

نخل ماتم

کھلا سکے نہ ہوا جس کو۔ میں وہ غنچہ ہوں — کسی سے ہو نہ سکے حل۔ میں وہ معمّا ہوں

لٹا ہوا سا چمن۔ آب رفتہ دریا ہوں — میں کیا کہوں تجھے ہمدم کہ کون ہوں کیا ہوں؟

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں

مٹا ہوا سا نشانِ سر مزار ہوں میں

ہرا بھرا چمن خوش شگفتہ رشک جناں — ہزار حیف کہ دم بھر میں ہو گیا ویراں

سناؤں کس کو میں اب حالِ سوز درد نہاں — نہ خویش ہے نہ برادر نہ سر پہ باپ نہ ماں

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

نظر سے گر گیا آنسو کی طرح ہر منظر — نہ باغ سے کوئی مطلب نہ خواہش گل تر

ہے کچھ تجھی سے تسلی خاطرِ مضطر — نہ مجھ سے آنکھ چرا اے تصور مادر

رواقِ منظرِ چشم من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

یہ مرغ پر زدہ بے بال و پر رہے کب تک — تن ضعیف تہ بار سر رہے کب تک

عزیز ماں سے پسر بیخبر رہے کب تک — یہ جسم پردۂ چشم نظر رہے کب تک

حجاب چہرۂ جاں میشود غبارِ تنم
خوشا دمیکہ ازیں چہرہ پردہ برفگنم

امیدِ خاطرِ محزوں کبھی برآئیگی — کبھی تو گردشِ افلاک رنگ لائیگی
تڑپ تڑپ کے کسی دن تو جان جائیگی — یقین ہے کہ کبھی موت مُنہ دکھائیگی

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

تجھے نہیں ہے نشیمن، ہوں میں بھی خانہ بدوش — ترے جگر میں حرارت ہے میرے خون میں جوش
وفورِ گریہ سے ہوجاؤں آہ میں بیہوش — جھکائے سر کو درختوں پہ تو رہے خاموش

بنال بلبل اگر با منت سرِ یاریست
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست

جگر میں چٹکیاں لیتا ہے دردِ بے درماں — ہے خونفشانی پہ آمادہ چشمِ اشک فشاں
دلِ حزیں میں نہیں تابِ ضبطِ آہ و فغاں — نہ منع کر مجھے رونے سے ناصحِ ناداں!

برو بکارِ خود اے واعظ اینچہ فریاد است
مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتاد است

کبھی تو کشتِ تمنا بہار پر آتی — کبھی تو آرزوئے جانِ زار بر آتی
کوئی امید کی صورت نہیں نظر آتی — کوئی نہیں عدم آباد کی خبر آتی

صبا اگر گذرے افتدت بکشورِ دوست
بیار نفحہ از گیسوئے معنبر دوست

کیا ہے گردشِ گردوں نے جب سے خانہ خراب — ترقیوں پہ ہے بیتابیِ دلِ بیتاب
نہ دن کو ہے کوئی آرام اور نہ رات کو خواب — خدا کسی کو نہ دے دردِ فرقتِ احباب

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہو

یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہو

رباعی

زخمِ دلِ صد چاک دکھایا سب کو — افسانۂ دردِ غم سنایا سب کو
افسوس نہ ایک یارِ صادق نکلا — دیکھا سب کو اور آزمایا سب کو

سید احمد حسین ۔ آمجد

تازہ غزلیں

(از جناب سید امداد حسن صاحب ظفر نیوری)

حکایتِ ستم و جورِ یار ۔ یعنی چہ — شکایتِ الم روزگار ۔ یعنی چہ
وفائے وعدہ ز یارانِ ایں زمانہ مجوے — کشودِ کار بجز کردگار یعنی چہ
ز دستہائے حنابستہ کار نکشاید — کشودِ کار ز دستِ نگار یعنی چہ
ز بختِ خویش امیدِ وصالِ یار محال — ہوائے صبح ز شبہائے تار ۔ یعنی چہ

ظفر ز دردِ غمِ روزگار نالیدن
چو نیست در کفِ تو اختیار ۔ یعنی چہ

ولہٗ

ہوسِ وصلِ یار ۔ یعنی چہ — ہمہ دم بیقرار ۔ یعنی چہ
بسرِ غنچہ خزاں دیدہ — آمدِ نوبہار ۔ یعنی چہ
واعظ از عاشقاں قرار مجوے — عاشقاں را قرار ۔ یعنی چہ
دلِ تو از دست دادہ آخر — گلہ روزگار ، یعنی چہ
بفغان آمدن ز سختیٔ عشق — ظفرِ دلفگار ، یعنی چہ

(از جناب کمال لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم)

غمزے نے ناز نے انداز نے دل چھین لیا
اُن سے پھر چشمِ فسوں ساز نے دل چھین لیا

کسی غمزے نے نہ انداز نے دل چھین لیا
اس سُریلی تیری آواز نے دل چھین لیا

مجھ سے کہتے ہیں وہ مل کر یہ ستم تو دیکھو
فلکِ تفرقہ پرداز نے دل چھین لیا

یوں بھی بیہوش بنا دے نہ جوانی کی ادا
کہتے پھرتے ہیں ترے ناز نے دل چھین لیا

نہ مروت رہی آنکھوں میں نہ وہ پاسِ وفا
فتنہ پرداز دغا باز نے دل چھین لیا

اُٹھ گیا بیٹھ کے پہلو سے بدل کر چتون
ساز کر کے مرے دمساز نے دل چھین لیا

یہی قسمت اک ادا نے ہمیں بیہوش کیا
یہ بھی خوبی نگہِ ناز نے دل چھین لیا

دیکھ اس رنگ کو پردے سے نکل کر باہر
پردے والے تری آواز نے دل چھین لیا

یہ تو ہے خوبیٔ تقدیر شکایت کیسی
شکر ہے اک بتِ طناز نے دل چھین لیا

آج بیٹھے ہیں کمال اپنے جگر کو تھامے
اس ادا سے نگہِ ناز نے دل چھین لیا

(از حضرت صفدر مرزا پوری)

لے ہی لینگے مرا دل کہتے ہیں نادان ہیں یہ
دے ہی دونگا انہیں سیدھا سا مسلماں ہوں میں

واں کھلیں شانے پہ اور یاں اُتر آئیں دل میں
تیری ان زلفوں کی درازی سے پریشاں ہوں میں

میری وحشت نے بنایا ہے تماشا مجھ کو
رونقِ بزم ہوں گو بے سروساماں ہوں میں

ذوقِ ایذا طلبی باعثِ راحت ہے مجھے
درد خود اُٹھ کے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں میں

اک نظر دیکھ لے او خانہ برانداز حجاب
دیر سے منتظرِ جنبشِ مژگاں ہوں میں

تیر کتنے ہیں بدن میں یہ خبر کیا لیکن
مردمِ چشم کی صورت تہِ مژگاں ہوں میں

مرگِ دشمن پہ بھی ہیں مجھ پہ بلائیں نازل
بال بکھرائے کوئی اور پریشاں ہوں میں

ترے صدقے میں مجھے صبحِ وطن یاد آئی
ترا ممنون بہت شامِ غریباں ہوں میں

اُس نے جب کھول کے بالوں کو بنائی گھونگر
حلقے حلقے نے کہا دل سے کہ زنداں ہوں میں

غیر کو مدِ نظر کیوں ہے اُٹھانا میرا
نہ تو چلمن نہ نقابِ رُخِ جاناں ہوں میں

یہ تو کہیئے کہ ٹپک جاتے ہیں آنسو ورنہ
انہیں قطروں کو کروں جمع تو طوفاں ہوں میں

جوشِ تمنا ہے کہ نکلے نہ جنوں کی حسرت
ہمہ تن مثلِ مہِ نو جو گریباں ہوں میں

جان ہی لیکے ٹلی ایسی ادا سے آئی
اے اجل تیرے اس انداز پہ قرباں ہوں میں

خوش ہوں اُس در پہ کہ صورت مری غم سے بدلی
غیر آتے ہیں تو کہتا ہوں کہ درباں ہوں میں

روز ہوتے ہیں درِ یار پہ سجدے صفدر
شرم آتی نہیں کہتے ہو مسلماں ہوں میں

(از بخشی حضور علی صاحب المتخلص بہ عاشق)

وعدہ دیدارِ فردا چال تھی صیاد کی
بند ہستی ہیں جکڑنے کی غرض بنیاد کی

رُوح سے پوچھی جو وجہِ ہستیِ قیدِ وجود
بولی۔ مجھ کو کھینچ لائی آرزو صیاد کی

توڑ ڈالوں کا قفس کی تیلیاں فولاد کی
قید ہو سکتی نہیں مجھ سے تو اب صیاد کی

اے پرِ پروازِ آزادی اُڑا لیجل شہ مجھے
عُمر گذری منتیں کرتے ہوئے صیاد کی

رازِ فطرت لاکھ ڈھونڈھے حضرتِ انساں مگر
کب پہنچ سکتا ہے تہ تک وہ عدم آباد کی

سخت جانی سے مری دونوں کی سیری ہوگئی
میرے شوقِ قتل کی اور سختیِ جلاد کی

نخلِ اُلفت بار ور ہوتے نہیں دیکھا کبھی
جانِ شیریں چھن گئی یہ مُزد تھی فرہاد کی

وقتِ کشتی تھا میں سر خوش زیرِ زانوئے حبیب
اور خون چھپکے پیا کی تیغ اس جلاد کی

کاش ہوتا جلوۂ دیدارِ حق سے بہرہ ور
ہائے یہ قسمت کہاں تھی عاشقِ ناشاد کی

چھپکر تیار ہے

صبح زندگی

شائقین کو مژدہ ہو کہ کتاب جسکا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جسکی فرمائشیں دفتر مخزن میں چھپنے سے بہت ہی پیشتر سے موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط قلم دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے قسم اول کے کاغذ کی چونکہ مانگ زیادہ ہے اسلئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوانی چاہئیں۔ کتاب دو سو چھتیس ۲۳۶ صفحہ کی ہے اور اسمیں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے وہ تمام حالات جو تربیت سے متعلق ہیں قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کو لڑکیوں کو جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم ہونیکی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرز بیان ایسا موثر ہے کہ فوراً دلنشین ہو جاتا ہے خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے چھاپنے کاڑھنے کی بہت سی باتیں تصریح سے لکھی گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دئیے گئے ہیں۔ عورتوں کی زندگی پرستانی کا وعظ اس کتاب کی روح رواں ہے۔ دوسرے سال۔ پھوپھی کا بھتیجی کو رخصت کرنا اور آخری نصیحتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان کے متعلق بیان کرنیکی ضرورت نہیں کیونکہ کتاب استاد اہل زبان یعنی منازل السائرہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبدالراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ بلحاظ واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر اخلاقی کتاب زنانہ لٹریچر میں موجود نہیں۔ **قیمت** قسم اول (عہ) قسم دوم (عمہ) علاوہ محصول ڈاک۔

درخواستیں بنام مینیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹرایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک۔ (۸/)

رسومِ دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت مع محصولڈاک۔ ۱۲/

منازل السائرہ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا اڈیشن۔ (۸/)

خوابِ ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن۔ (۴/)

ابومسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت (۴/)

مکتوباتِ آزاد۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ با تصویر ۶/

کلامِ نیرنگ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۶/

انتخابِ مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک۔ (۱/)

دردِ جانستاں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ ۸/

دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۶/

مثنویاتِ میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کر کے شائع کی ہے (۱/)

سیرِ تبت۔ انگریزی کتاب فی رایرس ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰/

مرقعِ خوشخطی۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کتاب جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہوری نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسنِ ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے تمام میں مدنظر رکھا ہے۔ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کتاب اس فن کیواسطے اسوقت تک ملک میں موجود نہیں۔ ۵/

درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

کایا پلٹ کو

کہ ہم آبحیات عرب میں اکسیر البدن اور اطبا کی اصطلاح میں اکسیر اعظم کہتے ہیں

اطبائے سلف وخلف کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں روح الکل ایک غلاف کے اندر ملفوف ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماہر علم ان اجزائے ارضی وغلاف کو دور کرکے روح کو حاصل کرلے پھر وہ روح جس مرض میں دیا جائے مرض کیسی ہی لاعلاج ہو وہ روح کو طاقت دیکر مرض کو نکال دیتا ہے۔

ایسی اکسیر دوائیں ہر ایک کو معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعض خاص لوگوں کو جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتا ہے تو ان پر ان بوٹیوں کا راز افشا کرتا ہے جس میں روح الکل زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم اور خضر علیہ السلام اور بڑے بڑے سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی چیزوں کے متلاشی رہے حکیم میکائیل۔ حکیم ہرمس۔ ڈاکٹر یونس نے ایسے جواہر کو آبحیات لکھا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں۔ روح کو تبدیل ہیئت کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا اس لئے وہ سرایت کرکے جسم سے مرض کو بالکل نکال دیتا ہے۔

اکسیر البدن دوائی کا خاصہ ہے کہ مرض کو جسم سے داخل ہوتے ہی خارج کر دیتا ہے اور مزاج کو فطرتی حالت پر پہنچانا اسکا پہلا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکسیر اعظم ہر قسم کی مختلف لاعلاج بیماریوں میں تیر بہدف کا کام دیتی ہے اس لئے عام لوگ اس قالب ہیئت کی روح الکل کو آبحیات کہتے ہیں۔ بعد تجربہ مندرجہ ذیل عوارض میں یہ موثر ومفید ثابت ہوئی ہے۔

تصدیق [illegible]

تصدیق [illegible]

فوائد مصدقہ۔ تپ محرقہ۔ تپ صفراوی۔ تپ پرسوت۔ تپ دق۔ سل کے لئے بےمثل دوا ہے۔ ہیضہ۔ اسہال۔ پیچش۔ بچے نیلا پڑ کر سرسام۔ دردسر۔ درد شکم۔ درد پہلو۔ نمونیا۔ ذات الجنب۔ سرفہ۔ استسقا۔ طپش دل۔ سوزش وغیرہ میں سریع الاثر۔ ناسور بدھو کا زخم۔ درد گردہ۔ مسوڑوں سے خون آنا۔ پھوڑے پھنسیاں۔ پٹھوں کا اکڑاؤ۔ بواسیر۔ بھگندر۔ تالو کا سوکھ جانا۔ دانت کا درد۔ درد کمر۔ قبض۔ درد نقرس۔ چھپاکی۔ قے تتلی۔ زخموں میں کیڑے پڑنا۔ کثرت تشنگی۔ تشنج۔ بےخوابی۔ کھانسی خشک وتر۔ ورم پستان۔ آگ سے جلنا وغیرہ وغیرہ میں کایا پلٹ بیّن فائدہ کرتی ہے۔ **قیمت** فی شیشی ۱۲ محصولڈاک ۳ [illegible]

مینیجر کارخانہ حاجی الحرمین الشریفین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما۔ لاہور

کیا واقعی مسیحائی نہیں ہے؟

تازہ شہادت ۔ جناب سب انسپکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات اسکی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے۔

خضاب عالمگیر اس کی تعریف اسقدر ہی کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا۔ بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی ۸؎۔

مرشد افیون ۔ اس عرق کے چار روزہ استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے۔ مروڑ اور دست نہیں آنے دیتے

دافع بواسیر خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسّے بلا ضرر بیخ و نابود ہو جاتے ہیں یہفتہ بھر میں صحت کامل قیمت ۲؎۔

ممیری کا سرمہ ۔ دھند۔ غبار جالا۔ پھولا۔ پڑوال۔ سرخی۔ ککرے رسوں کا شرطیہ علاج۔ موتیا بند کے لئے بیحد مفید۔ آنکھوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہے فی تولہ ۲؎ خالص ممیرہ فی تولہ ۵؎۔

اکسیر الحیات

عشق سے اترتے ہی فوراً کمزور اور مردہ اعضاء پر اثر کرتی ہے

اکسیر الحیات

دل و جگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دور کر کے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات

طاقت کے لئے بیحد مفید اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات

ضعف مثانہ کیلئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے

اکسیر الحیات

کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چہرے کی بے رونقی اڑ جاتی ہے۔ چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات

کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دبلے پتلے آدمی کو پُر زور بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات

کی ان گنت خوبیاں ہیں جو لکھنے میں نہیں آسکتیں غرض تمام امراض جسمانی کا حکمی علاج۔ فی شیشی للعہ

تازہ شہادت ۔ جناب شیخ فرزند علی صاحب ڈپٹی انجنیر اسسٹنٹ فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات مسیحا سے بڑھکر ثابت ہوئی ہے۔ آپکے علاج قابل ہیں

گلگونہ ترنجی اگر آپ حُسن اور حُسن میں دلفریبی کی شان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ضرور گلگونہ ترنجی منگائیں۔ چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیل چھائیاں اور محاسے دور کر کے رخسار مثل گلاب بنا دیتا ہے حُسن پرست لعاب قدردانی فرمائیں۔ قیمت ۱؎ ملے

ہمیرا تیل خوشبودار ۔ زندہ دل دوستو! ہم نے آپکی خاطر ایک اعلیٰ اور خوشبودار تیل ہمیرا تیل بنایا ہے۔ جسکی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے بالوں کو نرم اور ملائم اور چمکدار بنانے کے علاوہ دردسر کو مفید ہے دماغ کی کمزوری اور خشکی دور کرتا ہے اور بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور بڑھاتا ہے ۱؎۔

صاف لگاتے ہی بال دور نوعلے نور ۸؎

ڈاکٹر محمد علی سندیافتہ ایل ایم ایس شفاخانہ مشیر صحت شہر فیروز پور (پنجاب)



مخزن

اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا [illegible] ماہوار مجموعہ

[illegible]

مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم ہر ایک اُردو خواں کے پاس ضرور موجود ہونی چاہیے

مخزن حکمت کو سرکاری انعام

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی یعنی صوبہ پنجاب کی درسی کتب کی سرکاری کمیٹی نے "مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم" مصنفہ جناب شمس الاطباء کو اردو زبان کے لٹریچر میں ایک مفید اضافہ تسلیم کر کے پنجاب گورنمنٹ سے اسکی قدردانی کی سفارش کی چنانچہ حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہٗ نے ازراہ قدردانی اسے مبلغ [illegible] روپے انعام مرحمت فرمایا۔ "مخزن حکمت" فی الحقیقت ہر ایک گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

حضور وائسرائے ہند کی قونسل کے ممبر جناب آنریبل لفٹننٹ ملک عمر حیات خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای لکھتے ہیں
"مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم" کو جس قدر میں نے دیکھا ہے ایک ضروری کتاب ہے ایسی کتاب کی سردست سخت ضرورت تھی اس کو تصنیف کر کے مصنف نے ملک اور اہل ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے جسکے واسطے سب کو ان کا مشکور ہونا چاہیے۔ چونکہ ہر ایک آدمی کے پاس ہر وقت ڈاکٹر یا حکیم اور ملک کے ہر ایک حصے میں ہسپتال یا شفا خانے نہیں ہو سکتے اس واسطے ایسی عمدہ کتاب کا ہر فرد بشر اور کم از کم ہر گھر میں موجود ہونا ازبس ضروری ہے کیونکہ میں علم طب سے بالخصوص ماہر نہیں اس لئے مخزن حکمت پر ایسی رائے کے تحریر کرنے کی جرأت کی"۔

آگرہ میڈیکل کالج کے معلم علم الادویہ و علم کیمیا جناب ڈاکٹر محمد ماشاء اللہ خاں صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس [illegible] لکھتے ہیں
"مخزن حکمت" کے اکثر مقامات کو میں نے دیکھا ہے۔ فیملی میڈیسن یعنی علم طب خانگی پر یہ ایک بے نظیر مکمل اور صحیح کتاب ہے۔ اس میں جابجا بہت سی تصاویر بھی ہیں۔ قابل مصنف نے جس جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے اسکے لئے درحقیقت وہ اہل ملک کے کمال شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں "مخزن حکمت" کا ہر ایک گھرانے میں موجود ہونا نہایت ہی مفید ہے۔

[illegible] صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت کتاب مجلد چار روپے [illegible] ملنے کا پتہ: کتب خانہ جناب شمس الاطباء (دہلی بازار) لاہور

مخزن

مس میری کوریلی

موجودہ مصنّفینِ انگلستان میں یہ جادو نگار ناول نویس پایہ بلند رکھتی ہے۔ مس میری کوریلی کی عمر اس وقت چالیس برس سے زیادہ ہوگی۔ مگر اپنی باقاعدہ اور محتاط زندگی اور خوشحالی کی بدولت نسبتاً کم سن نظر آتی ہے۔ انگلستان میں جن مشاہیر کے دیکھنے کا مجھے موقعہ ملا اُن میں مس میری کوریلی بھی ہیں۔ اور یہ موقعہ خوش قسمتی سے اتفاقیہ طور پر حاصل ہوگیا۔ شیکسپئر کے مولد و مسکن یعنی سٹریٹ فورڈ کنار ایون کو مس میری کوریلی نے اپنا وطن بنالیا ہے۔ وہاں ایک خوش وضع مکان میں جس کے در و دیوار موسم بہار میں خوبصورت بیلوں اور خوشنما پھولوں سے لدے ہوتے ہیں وہ دلچسپ اور نتیجہ خیز ناول لکھے جا رہے ہیں۔ جن کی اس وقت اطرافِ عالم میں دھوم ہے۔ انگلستان میں بعض ادیب ایسے بھی ہیں جو کوریلی کے ناولوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی تصانیف گو زوردار اور پُرمطالب ہوتی ہیں۔ مگر زبان کے اعتبار سے بالکل اوّل درجہ پر نہیں رکھی جاسکتیں۔ لیکن اُن سے اختلاف رائے رکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور سب سے بڑھکر سند قبولِ عام کی ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ یہ قبولِ عام مس میری کوریلی کو اخبارات کی ناموافقت کے باوجود حاصل ہوا ہے۔ تصانیف کے

اخبارات کی تعریف عموماً ضروری سمجھی جاتی ہے اور اسی سے مصنفین کی شہرت کو پر لگتے ہیں۔ مگر کوریلی نے بعض باتوں سے لندن کے اخبار نویسوں کو ناراض کر لیا ہے لیکن اس عالی ہمت عورت کے عزم و استقلال کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ وہ اخبارات کی ناراضگی کی بالکل پروا نہیں کرتی۔ اسے اپنے کام سے کام ہے۔ اہل ملک کے طبقہ کے نقائص نہایت صفائی کے ساتھ اپنی کتابوں میں بتاتی ہے اور اخبار نویسوں تک کو اس کے نکتہ چین قلم سے بریت نہیں۔ جہاں موقعہ ہو انکی بھی خوب خبر لیتی ہے۔

غریب لوگوں کی حمایت۔ اہل دولت کی خرابیوں اور بے اعتدالیوں کی شکایت مذہب اور نیکی کی تاکید۔ انصاف پسندی اور ایمانداری کی تائید یہ باتیں اس کی پُر تاثیر تحریر کی خصوصیات ہیں اور شاید کوئی ناول اس کے قلم سے ایسا نہیں نکلا جس میں یہ امور پیش نظر نہ رکھے گئے ہوں۔ مثال کے طور پر اس کے ایک مشہور ناول ٹریژر آف ہیون (خزانۂ بہشت) کے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ یہ ناول میری نظر سے گذرا تھا۔ اور اس کے چند فقرے میں نے نقل کر لیے تھے جن سے وہ مقاصد ظاہر ہوتے ہیں جو کوریلی نے اپنی تصانیف میں پیش نظر رکھے ہیں۔

غربا | بناوٹی غربا تو ہزاروں لاکھوں ہیں۔ مگر اصلی غربا نہیں ملتے۔ وہ غریب جو کبھی سوال نہیں کرتے جنہیں ایسے خط بھی لکھنا نہیں آتا جس میں کسی سوال ہو۔ اور اگر لکھنا آتا ہو تو بھی نہیں لکھتے۔ جو صبر کے ساتھ فاقہ کشی کرتے ہیں۔ جو مصیبتیں جھیلتے ہیں مگر شکایت زبان پر نہیں لاتے۔ اور جو رضا بقضا جان دیدیتے ہیں۔

یہ غربا ایسے کمیاب ہیں جیسے کوئلوں کی کان میں ہیرے۔

زبردستوں کی شکایت | کسی امیر کی موٹر کسی غریب کے بچے کو کچلتی ہوئی نکل گئی ہے اور پتہ نہیں چلا کہ کس کی گاڑی تھی اور کون اس میں سوار تھا۔

اس بے بسی کو بچے کے کسی عزیز کی زبان سے کہتی ہے:-

"بیشک ہم غریب لوگ ہیں۔ بے خانمان و آوارہ ہیں۔ سڑکوں کی مرمّت کرنے والے اور مزدوری سے پیٹ پالنے والے ہیں۔ ہم میں یہ طاقت نہیں کہ اُن امیروں سے جو اپنی سواریوں کے نیچے ہمیں کچلتے ہوئے چلے جائیں مقابلہ کریں۔ گویا ہمارے لئے کوئی قانون ہی نہیں۔ کیونکہ قانون کی امداد بھی داموں سے ملتی ہے اور ہمارے پاس ایک کوڑی نہیں۔ وُہ ہمیں ان شیطانی چرخوں کے نیچے جنہیں وُہ موٹر گاڑیاں کہتے ہیں رَوند ڈالیں مگر ان کے مہربان جوری والے کہہ دینگے کہ ہمارے زخم یا ہماری موت اتفاقی تھے۔ لیکن قسم ہے اپنے پیدا کرنے والے کی۔ کہ اگر وُہ جان لے سکتے ہیں تو ہم بھی لے سکتے ہیں۔ اور اگر قانون انہیں ہمارے بچوں کے قتل کی سزا نہیں دیتا تو ہم تنگ آکر قانون اپنے ہاتھ میں لینگے اور اُن کو قتل کرینگے۔ خواہ ہمیں اس کے عوض میں پھانسی ہی کی سزا ہو"۔

قناعت ابّا جان کہا کرتے تھے۔ کہ جو ذراسی بات بھی قابلِ شکر ہو ہمیں اُسے بڑا جاننا چاہئیے اور اس سے پُورا فائدہ اُٹھانا چاہئیے۔ جب ہر طرف سے خوشی کے سامان ہوں تو خوش ہونا آسان ہے۔ لیکن جب ہر طرف تکالیف کی گھٹا چھائی ہو اور اس میں ایک ذراسی چمک خوشی کی کہیں نظر آئے تو اس تھوڑی سی خوشی کا جتنا شکر ادا کریں وہ کم ہے"۔

رُوحانیت "اِس سیّارہ (یعنی زمین) سے جس پر ہم نے جنم لیا ہے۔ زیادہ خوبصورت کوئی چیز کبھی ہم نے نہیں دیکھی۔ گو ہم میں ایک احساسِ خفی ایسا موجود ہے جو آگاہی دیتا ہے کہ ہماری بینائی زیادہ صاف اور اعلیٰ ہو جائیگی تو حُسن کے اس سے بھی بہتر جلوے نظر آنے لگیں گے۔ علمائے سائینس نے اپنی اصطلاح میں رُوح کے لئے احساسِ خفی رکھنے والا وجود ایک نیا اور

پیچیدہ نام تجویز کیا ہے۔ مگر روح یقیناً بہتر نام ہے"۔

بقائے دوام "میرے لئے نیستی کوئی شے نہیں۔ موت غلط لفظ ہے۔ ارض و سما کے درمیان زندگی بخش ہستیاں ہیں۔ اجزا کی تحلیل از سر نو پیدا ہونے کے ہم معنیٰ ہے۔ میرے نزدیک سب زندگی ہی زندگی ہے۔ شاندار زندگی۔ ہم جیتے ہیں۔ ہم ہمیشہ زندہ رہے ہیں۔ ہم ہمیشہ زندہ رہینگے"۔

سچی محبت "وہ طلسم میرے ہاتھ نہ آیا۔ جس سے زندگی کی تمام تاریکیاں روشنی سے بدل جاتیں۔ اُس ایک طلسم کے نہ پانے سے ہر چیز جو بیش بہا تھی میرے حصہ میں نہ آئی۔ درد۔ رنج۔ نقصان۔ بڑھاپا۔ موت۔ یہ سب مجھے گوارا ہوتے۔ اگر وہ ایک سحر تاثیر طلسم جسے محبت کہتے ہیں۔ مجھے ہاتھ آجاتا"۔

نورِ ایمان "اب اسے ایمان کا درجہ حاصل ہوا۔ کامل محبت کی مدد سے وہ کامل ایمان کے رتبہ پر جا پہنچا۔ ایک سیدھے سادے مگر لطیف انسانی کیرکٹر کے آئینے میں اس نے اپنے معبود کا نور دیکھ لیا"۔

یہ فقرے جن کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ نہ صرف میری کوریلی کی طرزِ تحریر کا اندازہ لگانے میں مدد دینگے۔ بلکہ اس سے معلوم ہوگا کہ یہ نیک دل عورت کس قدر دلسوزی اور متانت کے ساتھ فسانہ نگاری کا حق ادا کر رہی ہے۔ اور کیسے کیسے مفید نتائج ناول کے دلکش پیرایہ میں پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ اقتباسات نامکمل ہونگے۔ جب تک دو ایک نمونے اُن فقروں کے نہ پیش کئے جائیں۔ جن میں میری کوریلی نے اخبارات انگلستان کی خبر لی ہے۔ اس کتاب میں ایک موقعہ پر اخبارات کی اس عادت پر کہ وہ جرائم کی خبریں جلی حروف والے عنوانوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ یوں اعتراض کیا ہے:۔ "انسان مقلد حیوان ہے۔ جو افعال اچھے یا بُرے وہ دیکھتا یا سنتا ہے انکی تقلید کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پُرانے زمانوں میں بھی جرائم دنیا میں موجود تھے۔ مگر اس وقت کوئی ایسی

کی طرح جلی حروف کی سُرخیاں قائم کرکے بڑے بڑے اشتہارات کے ذریعہ نہیں
عوام کے سامنے پیش نہیں کرتا رہتا تھا" ایک اور موقعہ پر ایک اڈیٹر کی زبانی یہ عبارت
لکھی ہے۔ "جو پہلا موقعہ دفتر اخبار میں ملازمت کا ملا وہ مَیں نے لے لیا۔ اسکی قلیل
تنخواہ تو ترغیب لانے والی نہ تھی۔ مگر تجربہ اور معلومات قابلِ قدر تھیں میں کارخانہ
کی اندرونی حالت دیکھتا تھا۔ کہ سوسائٹی کے بکھیڑے اور لوگوں کے ذاتی معاملے
کس کس ترکیب سے پبلک کے روبرو لانے کے لئے تیار کئے جاتے تھے خبریں
کس طرح بدلی جاتی تھیں۔ تاکہ سٹاک اکسچینج یعنے سٹے والوں کے کاروبار پر
بُرا اثر نہ پڑے۔ مَیں یہ بھی دیکھتا تھا کہ بالکل بے معنی مباحثے محض اخبار میں
جگہ پُر کرنے کو دفتر ہی سے چھیڑ دیئے جاتے تھے۔ گو ظاہر کیا جاتا تھا کہ پہلا
خط کسی بیرونی نامہ نگار کا ہے"۔

جس دلیری سے زبردست اشخاص یا جماعتوں کا مقابلہ میری کوریلی کرتی
ہے۔ یہ دلیری بہت کم لوگوں کے حصّے میں آئی ہے۔ کچھ [illegible] ذکر ہے کہ
امریکا کے ایک امیر شخص نے یہ خواہش کی کہ سٹریٹ فورڈ کے ایک مکان
کو جسے شکسپیر سے کچھ نسبت تھی خرید کر از سرِ نو تعمیر کرے اور اس میں ایک
کتب خانہ قائم کرے۔ چونکہ وُہ بڑی رقم اس مکان کے خریدنے کے لئے صرف
کرنے کو تیار تھا۔ اس لئے مالکانِ مکان بیچنے پر آمادہ تھے۔ اور وُہ مکان جو
اس وقت سولھویں صدی کی طرز تعمیر کا نمونہ اور شکسپیر کی ایک یادگار سمجھا جاتا
ہے۔ اپنی ہستی کھو کر ایک نو دولت امریکائی کی یادگار بن جاتا۔ لیکن میری کوریلی
نے اس تجویز کے برخلاف اپنی آواز بلند کی اور اس کے ساتھ اور بھی ہم خیال
اُٹھ کھڑے ہوئے اور عام رائے اس تجویز کے اس قدر خلاف ہوئی کہ وُہ مکان
اپنی اصلی حالت میں باقی رہ گیا۔ مَیں جب سٹریٹ فورڈ گیا۔ اور شکسپیر کی

یادگاریں دیکھیں۔ جن کا مختصر سا حال اُسی زمانہ میں نذرِ ناظرینِ مخزن کیا گیا تھا۔ اُسی موقعہ پر میری کوریلی کو دیکھا۔ پچاس ساٹھ آدمیوں کی ایک جماعت جس میں بہت سی انگریز لیڈیاں بھی شریک تھیں اور صرف دو تین ہندوستانی شامل تھے۔ شیکسپیر سوسائٹی لندن کی طرف سے سٹریٹ فورڈ گئی۔ اس سوسائٹی نے اس سیر کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لئے یہ بھی انتظام کیا کہ یہ جماعت میری کوریلی سے ملاقات کرے۔ خط و کتابت سے یہ قرار پا گیا کہ جب ہم سب ضروری قابلِ سیر مقامات کو دیکھ چکیں تو چاء پینے کے لئے وہاں کے ایک ایسے رسٹوران میں جائیں جو شیکسپیر کے زمانے میں بھی قائم تھا اور وہیں میری کوریلی آکر اس جماعت سے ملاقات کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میری کوریلی نے اس وقت بنفشی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اور چہرہ پر اسی رنگ کی باریک جالی کا نقاب تھا۔ اس کے آتے ہی حاضرین نے جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور کچھ دیر تک سب چاء پیتے رہے۔ چاء کے بعد سوسائٹی کی طرف سے ایک صاحب نے میری کوریلی کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے تکلیف فرما کر حاضرین کو اس ملاقات کا موقعہ دیا۔ میری کوریلی کی تصانیف کی خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ بھی کہا کہ شیکسپیر کے نام کو زندہ رکھنے اور اس کی یادگاروں کے قائم رکھنے میں جو کوشش وُہ کر رہی ہے وُہ نہایت درجہ شکریہ کے قابل ہے۔

اس کے جواب میں چند مختصر الفاظ میں میری کوریلی نے اس تقریر کا شکریہ ادا کیا۔ اور قابلِ تعریف منکسر المزاجی سے کہا کہ مَیں مزارِ شیکسپیر کی ایک ادنیٰ مجاور ہوں۔ مَیں نے جو آواز بلند کی تھی کہ کوئی یادگار ضائع نہ کیجائے۔ اس میں مَیں نے حقِ پاسبانی ادا کیا تھا۔ احسان قوم کا ہے جس نے میری حقیر آواز پر توجہ فرمائی۔ اس کے بعد بعض صاحبان سے ازراہِ اخلاق ایک آدھ بات کر کے رخصت

ہوئیں۔ ہمارے ہندوستانی احباب میں سے بھی ایک شخص دروازہ کے قریب تھا۔ ایک لیڈی نے اس کی تقریب ملاقات میری کوریلی سے خاص طور پر کی اور کہا۔ یہ دیکھئے کتنی دور سے آپ کو دیکھنے آئے ہیں۔ اس نے جواب میں کہا "میں انہیں دیکھکر بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ ان کے ملک سے مجھے دلی اُنس ہے۔ گو میں کبھی وہاں نہیں گئی"۔

میری کوریلی نے اپنی عمر تصنیف کے لئے وقف کر رکھی ہے اور ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتی ہے۔ سٹریٹ فورڈ کو اس نے بوجہ اپنی تنہائی پسند طبیعت کے انتخاب کیا ہے اور نیز اُس عقیدت کی وجہ سے جو اُسے شیکسپیر کے ساتھ ہے۔ وہ شیکسپیر کی تصانیف ہمیشہ خاص شوق سے پڑھتی ہے وہ اُن چند خوش قسمت لوگوں میں ہے جنہیں تصنیفات کی بدولت خوشحالی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی کتابیں کئی دفعہ لکھی جانے سے پہلے قیمت پا جاتی ہیں۔ اور وہ فارغ البالی کے ساتھ خدمتِ ملک و ملت میں مصروف ہے۔

اخبار والوں سے اس کی ناراضگی مختلف اسباب پر مبنی ہے۔ مگر ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ جس سے نہ فقط ناراضگی کی ایک وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم و دانش اور لیاقت و شہرت نے میری کوریلی کو اُن صفات سے محروم نہیں کر دیا۔ جو عورت کی خصوصیات میں سے ہیں۔ خواہ انہیں کوئی خوبیاں سمجھے خواہ کمزوریاں۔ مثلاً باوجودیکہ وہ باعتبارِ صورت معمولی شکل کی لیڈی ہے۔ وہ اپنے آپ کو خاصے اچھے صورت داروں میں شمار کرتی ہے۔ بہت دفعہ اخبار والوں نے اس کی شہرت کے لحاظ سے اس کی تصویر شائع کرنی چاہی اور اس سے تصویر بغرضِ اشاعت مانگی۔ اُس نے عذر کیا۔ انگلستان کے اخبار والے جو ہر وقت اپنے پرچوں کی دلچسپی بڑھانے

کی فکر میں رہتے ہیں۔ معمولی عُذرات کو کب مانتے ہیں۔ ایک اخبار والے کو کہیں سے کوئی بھدّی اور نادرست سی تصویر میری کوریلی کی ہاتھ لگ گئی۔ اور اُس نے وُہ تصویر چھاپ دی۔ اس پر میری کوریلی کو بہت غصّہ آیا اور اس نے کہا کہ مَیں اخبار والے پر لائبل کا دعویٰ کرتی ہوں۔ اور اس کے بعد اپنی ایک تصنیف کے ساتھ اپنی تصویر خود شائع کی۔ گویا یہ مطلب تھا کہ صحیح تصویر یہ ہے۔ اس سے پہلے وُہ کبھی اپنی تصویر شائع کرنے پر راضی نہ ہُوئی تھی۔ مگر اخبار والوں کی ترکیب پھر بھی کامیاب رہی۔ اور فطرتِ نسوانی مدّت کے ارادہ پر غالب آگئی۔ اور اخبار والے کی چھاپی ہُوئی بُری تصویر کی تکذیب کے لئے اُس نے اپنی صحیح تصویر شائع کر دی۔

جس میں کوئی نہ کوئی کمزوری نہیں وُہ انسان ہی نہیں۔ مگر حیثیت مجموعی میری کوریلی کی زندگی قابلِ رشک زندگی ہے۔ اور اُن زندگیوں میں ہے جن کے خاتمہ پر اگر ماضی پر نظر دوڑائی جائے گی تو نیکی کرنے کی کوشش اور بندگانِ خدا کی خدمت کا ایک سلسلہ طولانی نظر آئے گا اسی کتاب میں ایک موقعہ پر کسی کا قول میری کوریلی نے نقل کیا ہے اور وہی اس کا دستور العمل معلوم ہوتا ہے:۔

"حُسن صداقت ہے اور صداقت حُسن۔

بس یہی ہے جو تمہیں اس دنیا میں معلوم ہے اور یہی ہے جس کے جاننے کی حاجت ہے۔"

عبد القادر

حُرّیّت و مساوات

نمبر
(۳)

الما نیا کے تاریک اُفق پر تہذیب و آزادی کا جو نیّر تاباں نمودار ہوا وُہ مارکس کا اعجاز کار فرمائی تھا جس سے ایک طرف تو الما نیا کا مطلع جگمگا اُٹھا، اُدھر دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوندھ پڑ گئی۔

اِس انسانی زندگی کی تصویر اگر الفاظ میں اُتاری جائے تو یہ ہوگی۔

۱۸۱۸ء میں ایک بچہ (جس سے آگے چل کر بڑے بڑے کارنامے صادر ہوئے، اور جو مارکس اعظم کہلایا) آغوش گیتی میں آیا۔ پال پوس کر والدین نے شفیق اُستاد کے زیر تعلیم میں دیدیا، جہاں یہ ذہن و ذکا کا پُتلہ علوم متعارفہ سے بہت جلد فارغ ہو گیا۔ یہاں سے فراغت کے بعد کالج کی تعلیم کا درجہ تھا، لہذا برلن کی یونیورسٹی میں قانون پڑھنے لگا۔ یہاں سے بون گیا۔ یہاں قانون کی تکمیل کی۔ قانونی تعلیم کا زمانہ پورا ہو گیا، تو پیشۂ قانون یا کسی عدالتی خدمت کو انجام دینے کے بجائے قومی اور مُلکی ریفارم کی ہوس اُسے دامنگیر ہوئی۔ اس جوش نے اُسے پیرس پہنچایا، تاکہ پولیٹکل اکانومی وغیرہ کی تکمیل کر سکے۔ لیکن اسی زمانہ تحصیل میں جبکہ اُسے اصولاً دماغ و ذہن کی یہ دشوار گذار مسافت خاموشی سے طے کرنا چاہیے تھا، وُہ اپنے جوش سے نچلا نہ بیٹھ سکا اور وہاں کے پولیٹکل مباحثہ پر ایسے زبردست دنداں شکن آرٹکل لکھ مارے کہ چین سے مدت تعلیم بھی پوری کرنا اسے

سلہ اس مفید تاریخی سلسلہ مضامین کے نمبر ۱ و ۲ مخزن بابت مارچ ۱۹۱۰ء اور اپریل ۱۹۱۰ء میں شائع ہو چکے ہیں جناب مولوی سجاد علی خاں تعالی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ بقیہ حصص بھی جس وقت تیار ہونے جائینگے ارسال کئے جائینگے۔ ایڈیٹر

نصیب نہ ہوا۔ یعنی بحکم گورنمنٹ وُہ پریس سے نکال باہر کیا گیا، پریس سے نکل کر بردکسل آیا، اور یہاں بے روک ٹوک اُس نے اپنے زبردست قلم سے معاملات کا خاکہ اُڑانا شروع کیا، نکتہ چینی کے بعد معاملات کی گتھیاں سلجھانے، اور مدبرینِ ملک کو مفید مشورہ دینے لگا، اب ایک مدت کی مشق کے بعد اُس کا قلم نہایت سنجیدہ اور موثر رستہ پر آگیا تھا،

یہ اُنیسویں صدی کا وسطی دَورہ تھا۔ جب یہ باحمیت صاحبِ ایثار بندہ خدا، ابنائے جنس کی خاطر پالیٹکس اور قانونی اجزا سے مرکب جسم کی سرفروشی بڑے جوش اور سرگرمی کے ساتھ کر رہا تھا، اس کا جوش کبھی اُسے ایک ہمدردِ قوم واعظ کی مقدس صورت میں قوم کے سامنے پیش کرتا، کبھی وُہ غیرت وحمیت کا پتلہ، پلیٹ فارم پر اس لئے کھڑا دکھائی پڑتا، کہ قوم کے صاحبِ جاہ متکبرین کا پایہ اقتدار گھٹا کر، اور افلاک و ثروت کو باہم خلط ملط کر کے طبائع کا ایسا خمیر تیار کر دے جس سے محض دولت و خاندانی عزت کی بنا پر قائم کیا ہوا شخصی امتیاز اُٹھ جائے۔

اِن معرکۃ الآرا مباحث میں اُس کے جادو نگار قلم سے موافق و مخالف گروہ یکساں طور پر متاثر ہوتا، اور اُس کی سچی حمایت کا دعویدار بنجاتا۔

زبان سے اصلاح حال، قلم سے اشاعتِ خیالاتِ اصلاح کے سوا اکثر تیغ بکف بھی وُہ اس معرکۃ القوم کے سر کرنے کے لئے میدان میں مردانہ وار بڑھتا ہوا دکھائی دیا ہے، اُس کی شہرت وعظمت جن کارناموں کی شرمندہ احسان ہے اُس میں حمایتِ اہلِ حرفہ وصنعت ابتدائً اُس کے اجتماعی مباحث کی تمہید خشک اور پھر قصیدہ وغزل کی ردیف تاباں بنکر چمکی۔ اس نے صنعت وحرفت اور تجارت کے اصوُل کو ایک خاص نکتہ ملحوظ رکھکے قابلِ اصلاح ٹھہرایا، یعنی۔

"قیمت اشیاء اُن کی اُجرت کاریگری سے زیادہ کیوں رکھی جائے" اس کی

رائے ہے کہ

"صنعت کسی شے مصنوع کی اصل قیمت و جوہر ہے کیونکہ اسی سے"
"قیمت گھٹتی بڑھتی ہے اور کسی مادہ سے بغیر کچھ صرف کئے محض کاریگری"
"سے تم سب کچھ بنالو گے، لیکن کاریگری کا بل نہ رہنے پر مال وال سب"
"بیکار ہے۔ اس بنا پر حاکم عدل کا یہ فیصلہ ناطق و بلا مرافعہ ہے، کہ"
"شے مصنوع کی قیمت میں مادہ کی قیمت کے بقدر صاحب مال کا حق ہے"
"اور باقی سب صنّاع کو ملنا چاہیے"۔

یہ فیصلہ مارکس اور لاسال کے جلسۂ متفقہ کی ججمنٹ کا نتیجہ ہے

صنّاع جنکی خوشحالی اور فارغ البالی سے صنعت کے بقا، باہمی مقابلہ اور گوناگون ایجادات کی توقع ہوسکتی ہے، نظام قدیم نے اُن کے سوشل اصلاحات اور پرائیویٹ حالات سے کلیتہً قطع نظر کی ہے۔ درآنحالیکہ اُن کی وجہِ معاش محض صنّاعی تھی اُنکو اپنی محنت کا پورا معاوضہ ملنا عین انصاف بلکہ اور اُن کی حوصلہ افزائی کا باعث تھا، بخلاف اس کے اس انتظام میں مزدوری کا نرخ یعنی کاریگر کا حق شے مصنوع کی قیمت میں کم، اور مادہ کی قیمت جو اصحاب دول کو پہنچتی ہے سونے کے مول رکھی گئی ہے، جس سے کس قدر عظیم حق تلفی ہنرمند، اور ناخون سے گوشت جدا کرنے کی برابر مشقت کرنے والے کاریگر کی ہوتی ہے، وہ باوجود ایک کمال جاننے کے بھی آج ویسا ہی قلاش ہے، اور عسرت سے زندگی بسر کرتا ہے، جس طرح ایک ادنیٰ کام کرکے مصیبت سے اپنا پیٹ پالتا۔ المختصر یہ وہ نظام ہے جس نے صنعت و تجارت سے متمتع ہونے کا اہل دول کے لئے بیمہ کردیا ہے، اور کم مایہ لوگوں کو تجارت کے نفع سے بالکل محروم۔

الغرض مجاوی اصلاح پر اُس نے چیخ چیخ کر قوم کے سامنے عرض معروض کیا،

مگر سرد مہری اور بداقبالی نے سب کے لب ایسے بند کئے کہ طلسم خاموشی کسی طرح نہ ٹوٹا، پر اس غیور، ثابت قدم، اور ہمت نہ ہارنے والے سرخیل نے تمدن کی وسیع سلطنت کے تمام تحریکاتِ نظم و نسق کی طرح اسے بھی شانِ بدات اور آغازِ امر کا امتحانِ اہمیت قرار دیا۔

اُس نے جب اُس زمانہ کی تاریخ پر نظر ڈالی جبکہ صنعت و تجارت اذلِ زرین مخلوق کا فریضہ سمجھی جاتی تھی، اور زمانہ موجودہ کے حالات سے (جب کہ تجارت سے بالاتر کوئی ذریعۂ ترقی و کسبِ مال نہیں) مقابلہ کیا، تو اِس آغاز کا نقشِ عظمت اُور بھی دل پر اُبھر آیا۔ پھر تدریجًا نامُوسِ ارتقا نے اپنا جلوہ دکھایا، جس سے بتائی ہُوئی راہ پر چلنے والے اور اتفاقِ رائے کرنے والے نظر آئے۔ رفتہ رفتہ ایک بڑا گروہ اُس کے ہم خیالوں کا مُلک میں جمع ہو گیا جنہوں نے مل کر ایک کمیٹی قائم کی، جس کا مقصد۔

"بیکس پیشہ وروں کی حمایت"

تھا، ۱۸۶۹ء میں بڑے جوش اور سرگرمی سے اُس نے شہر باسل میں اپنا افتتاحی اجلاس کیا جس میں ادنیٰ لوگوں سے لیکر اعلیٰ تک شریک ہُوئے۔ عام رُجحان اور رجُوعِ خلق نے وزیر اعظم، اور عمائدین مُلک کو بھی کھینچ بُلایا، ہر طبقہ کے افراد نے دلی جوش سے اس کی ممبری قبول کی، اور بہت جلد وہ مُبارک دن بانیانِ کمیٹی کو دیکھنا نصیب ہوا جبکہ اُس کی فہرست ممبری میں ۲۵ ہزار ناموں کی خانہ پُری ہو گئی اور کمیٹی کا کام قاعدہ سے چلنے لگا ضابطہ اور دستور العمل مرتب کیا گیا۔ اس کے ضوابط کے چند دفعات کا خلاصہ بغرضِ اظہارِ اہمیتِ مقاصد درج ذیل ہے:۔

(۱) چونکہ محنت و مشقت یا بالفاظِ دیگر صنعت و دستکاری ہی حالاتِ زندگی

میں خوشگوار انقلاب پیدا کرنے، اور تمدن میں نفع بخش، فائدہ رساں، اور دلچسپ اضافہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اِس لئے انسانوں کے ایک گروہ کثیر کی اس عملی جہاد میں شرکت کی ضرورت ہی لیکن اس تحریک کے فروغ پانے کے لئے سوشل نظم و نسق میں انصاف، عدل اور ہمدردی کا عنصر زیادہ شریک کرنا چاہیئے۔ موجودہ نظام میں انصاف کے دونوں پلڑے برابر نہیں ٹھہرتے۔ لہٰذا ضرورت ہی کہ ایسا معیار بنایا جائے جس سے ہر شخص کی محنت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکے۔ اور اُسے اُسکا پورا معاوضہ مل سکے۔ حق تلفی نہ ہو۔ جو ایجاد و اختراع کے تنزل کا اصل سبب ہے

(۲) موجودہ نظام نے تمام ذرائع کسب ہنر کو دولتمندوں کے ہاتھ میں دیدیا ہے جس سے پیشہ ور بالکل اہلِ دول کے دست نگر ہیں، اور دولتمند اُن کی چارہ فرمائی سے لاپروا، اور لاعلم محض، لہٰذا اس موجودہ انتظام کو شکست دینا سوشل نظام کا سنگِ بُنیاد رکھنا ہی، کاروباری انسانوں کی قسمتیں بجائے سنگدل تونگروں کے قوم یا قوم کے دردمند قائم مقاموں کے سپرد کرنا چاہیئے۔ علیٰ ہٰذا۔

الغرض جب اِس مشن کی بُنیاد مستحکم، اور اُس کے منشا کی اشاعت مُلک میں ہو چکی، تو اُس کے خاص اعضا نے پولیٹکل جدّ و جہد سے الگ تھلگ رہنے کو آئندہ نوبت میں اپنے عظیم الشان مقاصد کے لحاظ سے مضر خیال کرکے پولیٹکل حقوق کے مطالبہ کی دلوں میں ٹھانی، چونکہ مُلک میں اُن کا پُورا اعتماد مسلّم ہو چکا تھا اس لئے اُن کی اس طلب پر مُلک کے ہر گوشہ سے جو صدا بلند ہوئی۔ وہ اُن کے مطالبات کی آواز بازگشت تھی، آخر اُنہیں شاہی کونسلوں میں چند جگہیں ملیں، رفتہ رفتہ اُن کا حلقہ کونسلوں میں بڑھتا رہا، اور ۱۸۹۷ء میں ۲۲ لاکھ آدمیوں کی متفقہ آواز کا پاس تھا، جبکہ ۵۶ سیٹیں امپیریل کونسل میں خاص اِن جمعیت کے اعضا کی تھیں،

مُقابلہ قوم انگلش کہ مہذب اقوام میں ایک بڑی ذی اور اقبالمند قوم ہے جب آپ اُس کے فلسفۂ عروج پر غور فرمائینگے تو اس نتیجہ تک پہنچینگے کہ اُس کی موجُودہ حیرت انگیز ترقیاں اور اصلاحات محض قانونِ اجتماع کے معجزات ہیں۔ یہ سب اُن کی شخصیت یا پرسنلٹی سے نفرت، مساوات جمہوریت اور آزادی کی حمایت کا نتیجہ ہے۔

وُہ تمام ممالک جن کے نام آسمانِ تاریخ پر ستاروں کی طرح جڑے ہیں، اپنے اپنے عہد میں علم، دولت، تہذیب اور ترقی سے معمورہ چکے ہیں، اٹلی، بلجیم، ہالینڈ اور دیگر ممالکِ یورپ میں بھی اجتماعیہ کو فتح، اور اُسی کے حکم واثر سے سولزیشن کا قانون نافذ رہ چکا ہے، مگر ممالک کا اجتماعی حیثیت سے مقابلہ کرتے ہوئے فرنچ قوم کی اُس اعلیٰ استعداد اور درجۂ تفوق کا اعتراف نہ کرنا بھی سخت ظلم ہے جو اُس کا خاصہ ہے، اُن کے طبائع فطرۃً اس تحریک سے اس قدر مانوس ہیں کہ کسان، اور ادنیٰ محنت مزدوری کرنے والے بھی اس کے دل سے حامی ہیں، یہی نہیں بلکہ اس چھوٹی اُمت میں جہاں زیادہ سوشیالسٹ ہیں، اکسٹریمسٹ (غیر معتدل) بھی پائے جاتے ہیں۔"

عموماً یہ گروہ چند انواع پر منقسم ہے۔ جن کے نام بھی اُن کی نوعیت اغراض کے طور پر جُدا جُدا ہیں، ایک میگزین جو نہایت اعلیٰ پیمانہ سے نکلتا ہے اُن کا خاص آرگن ہے، اس کے علاوہ متعدد اخبارات ہیں جن میں یہ مباحث ہمیشہ چھڑے رہتے ہیں۔

فرانس کے علاوہ جن ممالک متمدنہ میں آجکل اس مسئلہ سے تشغف ہے وہاں بھی اس پر بڑے شدومد سے زور دیا جارہا ہے برِ اعظم یورپ تو ان خیالات کا اصلی جولانگاہ ہے۔ یہاں سے نکلکر دوسرے برِ اعظم مثل امریکہ آسٹریلیا والوں کے خیالات جانچئے تو ان خیالات کا دریا اُمنڈتا ہوا وہاں بھی نظر آئیگا۔

امریکہ میں تو یورپ ہی کی طرح اس کے چند علمی و عملی گروہ ہیں۔ لیکن اس کی اشاعت وترقی کی جو صورت انگلستان والوں نے اختیار کی ہے وہ سب سے جدا اور فائدہ رساں ہے۔ وہاں ایک مشن (متحدہ کمیٹی) ہے۔ لیکن اس کے تحت میں ازروئے تقسیم عمل چند کام کرنے والے علمی اور عملی گروہ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:-

۱- اتحاد جسکی بنیاد سنہ ۸۲ء میں قائم ہوئی تھی۔

۲- ہنرمند اور مزدوری پیشہ لوگوں کی انجمن۔

۳- اس میں کام کرنے کے اوقات کا یقین، اور انکی مزدوری کی تجویز و تعیین کے مسائل پر بحث ہوتی ہے۔

۴- انجمن فابیہ - جو اجتماعی تحریک کے متعلق علمی ذخیرہ بہم پہنچانے اور اس کی اشاعت و تدوین کی ذمہ وار ہے۔

(باقی آئندہ)

خان عالی (از دکن)

مشورہ

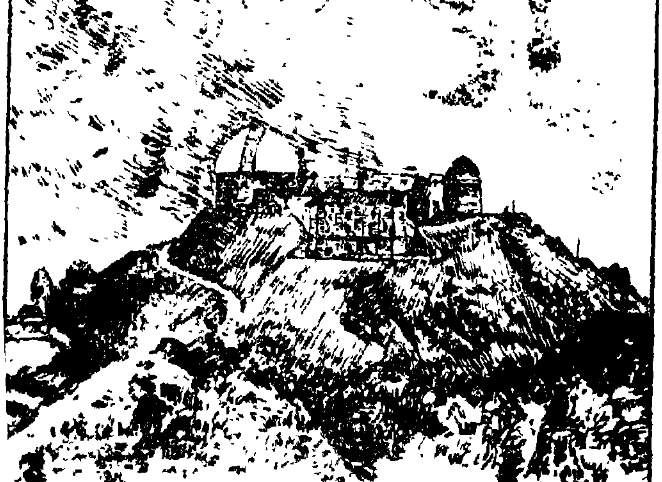
اس نام کا ایک رسالہ سال گذشتہ سے جبلپور سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اور یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے۔ کہ ادب اردو کے رسالوں میں مشورہ کے اجرا سے ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ ہم اس کا خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ یہ رسالہ کامیاب ہوگا۔ سید یعقوب الحسن صاحب حسن اس کے ایڈیٹر ہیں۔ انتخاب اور ترتیب مضامین پسندیدہ ہیں۔ حصہ نظم و نثر جدا جدا ہے۔ اور رسالہ مشاہیر کی تصاویر سے بھی مزین ہوتا ہے مگر تصاویر کی چھپائی زیادہ احتیاط اور توجہ چاہتی ہے۔ اس کی قیمت عوام سے ع۸ اور والیان ملک سے عـــ۵ روپیہ ہے۔

چاند کا دوسرا رُخ

آئرلینڈ کے ایک باشندہ نے ایک دفعہ یہ کہا کہ چاند جسامت میں سُورج سے دوگنا بڑا ہے۔ کیونکہ چاند ہمیشہ اپنی نُورانی کرنوں سے رات کے اندھیرے کو دُور کرتا ہے۔ برعکس اس کے سُورج تو صرف دن کو ہی نمودار ہوتا ہے جس وقت کہ ہم کو اس کی بہت پروا بھی نہیں ہوتی۔

کچھ شک نہیں۔ کہ چاند ایسی ہی اعلیٰ قدردانی کے لائق ہے۔ مذکورہ بالا قول کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اُن بڑے بڑے لائق ہیئت دانوں کی تحقیقات کے رُو سے۔ جنھوں نے بمقابلہ دُوسرے ستاروں کے اپنی عمر کا زیادہ حصّہ اسی کی تحقیقات میں صرف کیا ہے اور اس کا نقشہ ایسی صحت سے مرتب کیا ہے کہ برّاعظم افریقہ کے نقشہ سے کم معتبر نہیں خیال کیا جاسکتا۔ چاند کے متعلق اُنکی یہ رائے ہے کہ اسکا ایک بہت بڑا حصّہ اب تک ہماری آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

(رصد گاہ)



چاند کے دُوسرے رُخ کیا ہے ؟

پہلی نگاہ میں تو یہ سوال ایسا ادق معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اُس کے واسطے خواہ مخواہ کا دردِ سر لیا جائے۔ کیونکہ قمر کا اِسقدر علم تو ہر شخص گلی کُوچہ میں بھی ہر روز حاصل کرتا رہتا ہی کہ وُہ بارہا اپنا وُہی حصّہ ہمارے سامنے لا پیش کرتا ہے۔ جو سُورج کی کرنوں کے پرتو سے منوّر ہو کر راتوں کو نظر آیا کرتا ہے۔ اور دُوسرا آدھا ابدالآباد تک ہم سے اوجھل ہی۔ اسی بنا پر اکثر گمان کرتے ہیں۔ کہ وُہ حصّہ ضرور ایسی نادر اشیا سے پُر ہو گا۔ جس کا ہم محدود عقل والے انسان خیال بھی نہیں کر سکتے۔

لارڈ بیکنسفیلڈ اس سے بھی آسان معاملے میں چکرا گیا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ کہا۔ اِس سے زیادہ حیران کرنے والا گورکھ دھندہ اَور کیا ہو گا کہ اِس ستارے کا نام کیا ہے اور اس کا کیا! چاند کے "دُوسرے رُخ" کے پُراسرار معمّے کو حل کرنے کی کوشش اُمیدوں کا خون کرنے والا کام ہے۔ عوام کے خیال کے مطابق تو بظاہر یہ درست معلوم ہوتا ہے کہ چاند ہر بار اپنا ایک ہی رُخ زمین کی طرف لے آتا ہے۔ گر نتیجہ میں آپ کو بتا دینگے کہ چاند کا وُہ حصّہ جسکو اسکا مستقل رُخ کہا جاتا ہے۔ کبھی بھی دو مسلسل راتوں میں یکساں نہیں رہتا۔ اسکا لگاتار تبدیل ہیئت کرنا ہی نہیں جو روشنی کے کم و بیش ہونے کی وجہ سے ہلال اور بدر کی حالت میں ظہور پذیر ہوتا رہتا ہے۔

چاند کا "دُوسرا رُخ" جو ہم سے پوشیدہ ہی اس کے کل محیط کے پانچویں حصّے کو بھی دیکھنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔ ورنہ ہم اپنے اس علم کی مدد سے جو ہم کو اسکے آشکارا حصّے کی بابت ہی۔ کاربراری کے لایق حالات دُوسرے حصّے کے بھی دریافت کر لیتے۔

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ چاند اپنے ہر دَورہ میں جو وُہ زمین کے

گرداگرد کرتا ہے ایک چکر اپنے محور پر بھی لگاتا ہے۔ ہم اس حرکت کو دیکھ نہیں سکتے اور نہ دیکھنے کی وجہ سے اکثر اس کو باور بھی نہیں کرتے۔ لیکن چاند کا بار بار ایک ہی رُخ ہمارے سامنے لے آنا خود اس کا ثبوت ہے۔ اگر یہ محوری گردش اپنے محور کے گرد ہی کرتا تو قمر کا وُہ سلسلۂ کوہ جسکی بابت کہاجاتا ہے کہ اس کا ایک سرا ایک غربی ستارے کی طرف پھرا ہُوا ہے۔ ہمیشہ اسی ستارے کی جانب جھکا ہُوا نظر آتا۔ علاوہ اس کے زمین کا چکر کاٹتے ہُوئے اس کی ہر ایک جانب ہم کو بخوبی دکھائی دیتی۔

چاند کی یہ محوری گردش جو وُہ اپنے محور کے گرد کرتا ہے مستقل حرکت ہے لیکن اس کی وُہ رفتار جس سے وُہ اپنے بیضاوی راستے پر چلتا ہے یکساں نہیں جب وُہ زمین کے بالکل قریب پہنچتا ہے تو اسکو ایک زبردست مرکزی کشش اپنی طرف کھینچتی ہے۔ لیکن وُہ اپنی رَو کی تعجیل میں جلدی وہاں سے خلاصی پاکر آگے چلا جاتا ہے۔ یہاں سے نکلنے پر زمین کی مرکزی کشش کے اثر سے اس کی رفتار بالکل کم ہوجاتی ہے اور جُوں جُوں وُہ زمین سے دُور ہوتا جاتا ہے۔ یہ رفتار بھی بتدریج رُو بہ ترقی ہوتے ہوتے پھر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔

ان دونوں اکٹھی حرکتوں کے سبب جو چاند خارج از عقل تیزی سے اپنے مقررکردہ رستہ پر زمین کے گرد کر رہا ہے اور ساتھ ہی اپنی محوری گردش میں بھی مشغول ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس کی رفتار معتدل حالت میں آئے۔ اسکے دُوسرے رُخ کا کچھ حصّہ دکھائی دیگا۔ جب ساتھ ہی بالمقابل روشن کنارے سے اتنا ہی نظر سے غائب ہوجائیگا اور جب چاند اعتدال پسندی سے دھیمی رفتار پر آجاتا ہے۔ تو یہ نادر قدرتی منظر بھی اُلٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔ یعنی جو حصّہ کہ تیز رفتاری کے وقت پوشیدہ تھا اس وقت وُہ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے

ہم کو قمر کے "دوسرے رخ" کے مغربی اور مشرقی خطہ کا کچھ حصہ دیکھ لینے کا موقع ملجاتا ہے بلکہ قدرے دقت کے ساتھ ہم کو شمال اور جنوب کی ایک ذرہ ذرہ جھلک کی بھی اجازت ملجاتی ہے۔ اگر زمین کے اس راستے کو جس پر وہ آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ ایک لیول میں تصور کریں۔ تو چاند کی اس معلق سڑک کو جس پر ہو کر وہ زمین کے گرد گھومتا اور بانا تنتا ہے۔ لہردار ( ) سے تشبیہ دی جائیگی۔ یعنی کسی وقت تو وہ زمین کی لیول سے اونچا ہو جاتا ہے اور کبھی نیچا۔ جس وقت چاند اونچائی پر ہوتا ہے تو اس وقت ہم ایک قطب شمالی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور جوں جوں وہ نیچے کیطرف اُترتا جاتا ہے ویسے ہی ہم کو اسکے قطب جنوبی کا سراغ ملتا جاتا ہے۔ جو ہم سے جنوب کی طرف کو جھکا ہوا ہوتا ہے۔

چاند کے "دوسرے رخ" کا جتنا حصہ معلوم ہو چکا ہے۔ اس میں تھوڑی سی بیشی کی ابھی اور بھی اُمید ہے۔ ایک محقق کا ارادہ ہے کہ زمین کے مشرقی یا مغربی سرے پر کوئی رصدگاہ قائم ہو۔ جہاں سے مشرقی اور مغربی حصہ بہ نسبت اسکے زیادہ دکھائی دے۔ جتنا کہ زمین کے مرکز کے نزدیک کھڑا ہو کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے اور یہ طے شدہ مسئلہ اس معاملے میں ہمیں بہت مدد دے سکتا ہے۔ کہ زمین کا محیط چاند سے چار گنا زیادہ ہے۔

چاند کے اس حصہ کی جس کا ہماری زمین سے چولی دامن کا ساتھ ہے مسلسل تبدیلیاں ان تصویروں سے واضح ہو جائینگی۔ جو مختلف وقتوں میں چاند کی ایک ہی حالت کی لی گئی ہیں۔ یہ تصویریں مشہور و معروف ہیئت دان ڈاکٹر ایڈورڈ ہولڈن کی پورے دس برس تک ایک آبزرویٹری میں مسلسل تحقیقات کا نتیجہ ہیں تصویر نمبر ۱ میں پورے بدر کی حالت بھی عیاں ہے اور اس میں ایک سیاہی مائل حصہ بھی نظر آتا ہے۔ اگر اس سیاہی مائل حصہ کو قمری سمندر مانا جائے جو دوسری جگہ

تصویروں میں صلیب کے (+) نشان سے نمایاں کیا گیا ہے تو یہ ہلالی تصویر میں بالکل کنارے کے پاس موجود ہے اور بدر میں قریباً درخشاں حصّہ کے مرکز کے پاس ہے۔ چاند کے اس ردوبدل کا حال دو ہلال والی تصویر سے اور بھی اچھی طرح واضح ہو جائیگا۔ دونوں میں دیوار نما کناروں والا ایک نالا یا غار قطب جنوبی کے پاس جس کے آگے صلیب کا نشان ہے دکھائی دیتا ہے۔ ایک تصویر میں تو یہ چاند کے معلوم شدہ منوّر کرہ کے کنارے کے نزدیک ہے اور دُوسرے ہلال میں کنارے سے بہت ادھر آگیا ہے۔ اور ساتھ ہی آتش فشاں پہاڑوں کا ایک حجم غفیر بھی ہم کو



نظر آنے لگ گیا ہے۔

"بجائے اس کہ چاند اپنا غیر مبدل چہرہ ہم کو ہر بار دکھاتا حقیقت میں چاند متغیر حالت میں ہمارے سامنے نمودار ہوا کرتا ہے اور اس خفیف سی کمی بیشی یا اُتار چڑھاؤ کے باعث "دُوسرے رُخ" کا وہ قلیل حصّہ جو ہم کو نظر آیا کرتا ہے ہماری طرف پھر جاتا ہے یا آشکارا ہو جاتا ہے۔

ہم کو دُوسرے رُخ" کو بنظر سرسری دیکھنے کا موقع تو ملتا ہے لیکن بمقابلہ نصفی

غائب شدہ کرہ کے حجم کے ہم کو بہت ہی کم حصہ نظر آتا ہے - صرف اس کے گرد کے کنارے ہی دکھائی دیتے ہیں - اور اس سے زیادہ دریافت کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی - برخلاف اس کے چاند کے پیش نظر حصہ پر سورج کی روشنی اتنی تیزی سے پڑتی ہے - کہ جس سے ہم اس کے ہر ایک چیز کی تفصیل کیا نظری اور کیا بذریعۂ فوٹو بڑی آسانی سے دیکھ اور اتار سکتے ہیں -

یہ درست ہے کہ وہاں سے ہم کو کوئی خوفناک اور پُراسرار حالات نہ تو معلوم ہوئے اور نہ ہی آئندہ ایسی توقع ہے لیکن ہمارے اُن خیالوں کا خون ضرور ہو گیا ہے جو اپنے تصور میں چاند کی نسبت ہم رکھتے ہیں - ہم ایک نہایت ہی خوبصورت تصویر وہاں کی آبادی کی بابت بنائے بیٹھے تھے - جادو اور مافوق العادت قوتوں والے انسان جو بادلوں پر سوار اڑتے رہتے تھے - پردار حیوانات - ہولناک جنگل - سبزہ زار کے دلفریب منظر - ایسے درخت جو انسانی سر والے پھل لاتے ہیں - انسانی زبان بولنے والے اور سنہری تاج سے مزین پرندے - خوفناک متلاطم سمندر - خوشگوار میٹھے پانیوں سے لبریز دریا - آہ! یہ خیالی دل خوش کن طلسم موجودہ دوربینوں نے درہم برہم کر دیا ہے -

اس نامکمل فطرت والے انسان کی عقل نے جہانتک اس گتھی کو سلجھایا یا جہانتک آئندہ دریافت ہونے کی اُمید ہے - اسکا لبّ لباب یہ ہے کہ چاند کا "دوسرا رُخ" بالکل اُس رُخ کے مشابہ ہے جو ہر رات ہمارے سامنے چمکا کرتا ہے " دوسرے رُخ" کا جو حصہ کبھی کبھی نظر آتا ہے - ٹھیک وہ ویسے ہی نقش و نگار سے مزین ہے - جیسے کہ اُس حصے پر جس سے ہم مانوس چلے آتے ہیں - ہر جگہ ویسے ہی سربفلک آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے جو وسعت میں انگلینڈ کے ایک ضلع کے رقبہ سے بھی زیادہ وسیع ہیں - اور مدت دراز سے آتش فشانی چھوڑ کر بالکل خاموش پڑے ہیں - پست قد

پہاڑوں کے مسلسل سلسلے بھی بالکل ایک جیسے - ہموار میدان اور دہشت ناک غار بھی یکساں - غرض مہیب اور دحشت انگیز سنسان نظارہ دونوں حصوں کا کسی بات میں ایک دوسرے سے تفاوت نہیں رکھتا - کیونکہ صدیاں چھوڑ قرون ہو چکے - کہ قضا و قدر نے اپنا نہ ٹلنے والا قانون کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ اس پر بھی صادر کر دیا - اور اس غریب نے بھی سسک سسک کر اپنا دم توڑ دیا - مدت ہو گئی ہوتی کہ احکم الحاکمین کے زبردست کارندے انہیں فرشتے کھو یا قوتیں - اسکو ملیامیٹ بھی کر ڈالتے - لیکن اس فانی انسان کو سبق عبرت دینے کے واسطے کسی نامعلوم وقت تک اسکو برقرار رہنے دیا - اور جہاں اسکو نمونہ عبرت بنایا - وہاں ساتھ ہی اسکو راتوں کو منور کرنے کے واسطے انسان کے مفید مطلب بھی بنا دیا - غرض چاند آجکل ایک مُردہ جسم ہے - آہ! وُہ وقت بھی آنیوالا ہے جب ہماری اس زمین کو بھی شربت موت چکھ کر اپنے ہمسایہ چاند کا ساتھ دینا ہوگا - لیکن کب؟ اس کی مدت مقرر کرنا عقل انسانی سے خارج ہے - اور پیشتر اس کے کہ وُہ رُوح فرسا وقت آئے - مدت دراز گذر چکی ہوگی کہ اپنے غرور کا کوس لِمَنِ الْمُلْكُ بجانے والے حضرت انسان اس دار ناپائدار سے معدوم ہو چکے ہونگے -

چاند کے قطب جنوبی پر بیشمار آتش فشاں پہاڑ قطار در قطار بکھرے پڑے ہیں اور اُنکے پہلو ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہو گئے ہیں کہ وُہ بالکل ایک کابلی کے موافق چپٹے نظر آتے ہیں - اور جب سُورج اپنی پوری طاقت سے اُن پر چمکتا ہے تو اُن کے پیچھے چکا چوند کی وجہ سے روشنی کا ایک وسیع سمندر نظر آنے لگتا ہے - ہم کو ایسے پہاڑوں کا سُراغ قطب کے ادھر اُدھر وہاں تک ملتا چلا جاتا ہے - جہاں سے آگے نظر انسانی کا گذرنا ناممکن ہے - ہموار سیاہی مائل سطحات جو سمندر خیال کی جاتی تھیں - اور شاید زیادہ

درست ہوگا کہ اُن کو خشک شدہ سمندروں کی تہیں مشرق سے مغرب کو حدِ نگاہ تک پھیلی پڑی ہیں اور ابھی اُن کی انتہا معلوم ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ چاند کے "دُوسرے رُخ" کی طرف بھی یہ ہونا ضروری ہے یعنی برباد شدہ خشک چٹانیں بغیر ہوا بغیر پانی۔ اور ہر ایسے عنصر کے جو ہمارے علم کے رُو سے زندگی قائم رکھنے کے واسطے ضروری ہے۔



چاند کا قطب جنوبی

ہوا کی غیر موجودگی ہی ہر قسم کی نیچرل متحرک مشینوں کے مفقود ہونے کا باعث ہے۔ غالباً گرمی اور سردی کی دو متضاد تاثیروں سے متاثر ہو کر عام بڑی چھوٹی چٹانوں کی عالمگیر بربادی اور عظیم الشان وجُودوں کی درہمی برہمی ہوتی رہتی ہوگی۔ اور ان چٹانوں کا چٹخ چٹخ کر بلندی سے گرنا اس مسلسل بے حسی اور

ابدی خاموشی کو توڑنے کا باعث ہوتا ہوگا۔ لیکن آواز تو بغیر ہوا کے کسی مصرف ہی کی نہیں آفتاب کی تیز سے تیز گرمی کے وقت بھی وہاں کا ٹمپریچر پانی کو منجمد کرنیوالے نقطہ سے کبھی اوپر نہیں چڑھتا اور موسم سرما کی لمبی سرد راتوں کی ٹھنڈک کو تو کسی چیز سے تشبیہ ہی نہیں دے سکتے اور ہر قسم کے خارج از وہم و گمان افسانے گھڑنے کے واسطے اس سے اعلیٰ کوئی جگہ مل نہیں سکتی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ چاند نے اپنا رُخ چھپا کر بیشمار مصنفوں کے خیالات کو فریفتگی کی حالت سے اپنی طرف متوجہ کرالیا۔ شاعروں اور فسانہ نگاروں نے بھی مدتوں سے چاند کی تعریف میں اسی قدر مصروفیت رکھی ہے۔ جیسے سائینٹسٹوں نے لیکن زمانہ گذرنے پر بھی اس کی دلچسپی کم ہونے میں نہیں آتی۔

چند سال ہوئے ایک جرمن ہیئت دان پروفیسر ہینسن کی ایک تھیوری مروج ہوئی تھی۔ جس نے چاند کے "دوسرے رُخ" میں ذی حیات کے موجود ہونے کے خیال کی طرح ایک اَور خیال کو رواج دیا تھا۔ اس کا یہ عقیدہ تھا کہ چاند کا وہ نصف



(تصویر نمبر ۴)

حصہ جو ازل سے ہمارے واسطے ہو چکا ہے۔ بلند پہاڑوں سے اٹا ہوا ہے اور چاند ٹھیک گول کرہ نہیں۔ اس واسطے ہم کو اس پر کرہ ہوا کے کم یا بالکل نہ ہونے پر متعجب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ "دوسرے رُخ" پر کرہ ہوا دوگنی مقدار میں موجود ہے۔

پانہ صداقت سے گرے ہوئے ہونے پر بھی اپنے وقت میں اس تھیوری کی بڑی قدر ہوئی۔ گو اس وقت اس کی ذرا بھی وقعت نہیں رہی۔

لیک رصدگاہ واقعہ مونٹ ہملٹن کلیفورنیا کی ۳۶ انچی دُوربین سے یہ فوٹو لئے گئے ہیں۔ یہ کلیفورنیا کے ایک لکھ پتی کی طرف سے رصدگاہ کو نذر کی گئی تھی۔ یہ دُوربین آجکل چاند کے قطر سے چند ایک فٹ کی سکیل میں اس کے کُرہ کا مکمل فوٹو چارٹ تیار کرنے کے ضروری کام میں مشغول ہے۔ چاند کے متعلق تحقیقات کرنے والوں کے واسطے یہ دریافت بڑی کارآمد ہوگی۔ کیونکہ اس سے اس کے ہر ایک حصے کی جہانتک عقل کو رسائی مل سکیگی پُوری پُوری تشریح ہو سکیگی۔ اور اُمید ہے کہ اس سے یہ سب سے پُرانا سوال بھی حل ہو جائیگا جو ابھی تک شک وشبہ کی زنجیر سے معلق ہے۔ کہ آیا قمر کے پُرانے آتش فشاں پہاڑوں کا زور مفقود ہو چکا ہے۔ یا اس کے اندرونی حصے میں ابھی آتشی مادہ موجود



ہے۔ ایک بالکل تازہ فوٹو سے جو ایک فرانسیسی ہیئت دان نے میٹرن آبزرویٹری سے لیا تھا۔ کچھ خاص قسم کے نشان پائے گئے ہیں۔ جنکی تشریح ابھی قابلِ اطمینان

تو نہیں ہوئی - لیکن دریاؤں کے تلے بتائے جاتے ہیں - یہ ایک علامت ہوا کے موجود ہونے کی ہے - وہ ضرور گہری غاروں یا آتش فشاں پہاڑوں کے اندر موجود ہوگی - خواہ کتنی کم مقدار میں کیوں نہ ہو -

شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا - کہ چاند کے "دوسرے رُخ" کے عجیب و غریب حالات علم ہیئت ہم کو اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکتا - نصف صدی پیشتر جب سپکٹروسکوپ ابھی دریافت نہیں ہوا تھا - ہم ستاروں کے علم سے بالکل نابلد تھے لیکن اب ہم کو اُن کے عنصر کی کیمیاوی اصلیت اور وہ حرکت جو وہ ہماری طرف آنے یا جانے میں کرتے ہیں - معلوم ہو گئی ہے - اور شائد کسی دن ہم نئی شعاعوں کی مدد سے ہم چاند کا مکمل فوٹو لینے پر بھی قادر ہو جائیں -

قصہ مختصر موجودہ طریقہ سے دوسرا رُخ مکمل دیکھنے سے مایوس ہو کر اس عقدہ کو حل کرنے کے لئے ہم کو کسی دوسرے حصے سے آنے والے آسمانی سیاح یا اجنبی سیارہ کا انتظار کرنا چاہئے - جو خرام ناز کے دوران میں اپنی ٹھوکر سے اس مُردہ ہزارہا سالہ کو قم کہہ کر اُٹھانے کی بجائے کم از کم اپنی ٹھوکر سے اس کا چھپا ہوا رُخ ہماری طرف پلٹ دے - تاکہ ہم کو اپنی معلومات میں قابل قدر اضافہ کا موقع مل جائے لیکن آہ! روح لرز اُٹھتی ہے - کہ یہ علم کی طلب کسی بڑی بربادی کی تحریک کر رہی ہے - خدانخواستہ اگر یہ ٹھوکر کبھی لگ ہی جائے - تو جو کچھ بربادی چاند کو برداشت کرنی پڑے گی - کم از کم اسی کے لگ بھگ زمین کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا -

یہ بڑا دل شکن خیال ہے - کہ ہمارا سب سے قریبی ہمسایہ اپنا بہت بڑا حصہ ہم سے چھپائے لئے پھرتا ہے - آسمانی وجودوں میں سے سوائے ایک آوارہ گرد دُمدار ستارے کے اور کوئی ایسا نہیں جو ہم سے بہت قریب آتا ہو - لیکن یہ فاصلہ بھی اس سے سو گنا زیادہ ہے جو ہمارے اور چاند کے درمیان واقع ہے - اور باقی تو وہم و گمان کی حد

سے بھی پرے بھٹک رہے ہیں ۔ لیکن چاند قریبی ہمسایہ ہے ۔ یہ صرف اس فاصلے سے نو گُنا زیادہ ہے جو خط استوا پر زمین کے محیط کا ہے ۔ بہت سے ملاح قریباً اتنا بحری سفر کر چکے ہیں اور آجکل کے زود رفتار ہوائی جہاز اس فاصلے کو دس دن میں طے کر کے ہم کو چاند میں جا اُتاریں گے ۔

اگر ہماری قسمت کبھی ہم کو اس معراج پر پہنچا دے ۔ جس سے ہم کو ہوا پر پُورا پُورا اختیار ہو جائے ۔ تو اس وقت بھی سب سے پہلے ہمارے لب پر یہی ہوگا "ہائے چاند کا دُوسرا رُخ" ۔

(ترجمہ) فضل الٰہی ۔ کاردار

جذبات نادر

(حصہ دوم)

منشی نادر علیخاں صاحب نادر کاکوروی کا کلامِ منظوم جس کا بیشتر حصہ اُردو کے ادبی رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکا ہے اور کچھ حصہ ایسا ہے جس کی اشاعت کی ابھی نوبت نہیں آئی تھی ۔ مجمُوعہ کی صُورت میں شائع ہو گیا ہے ۔ اور اس میں ایک مثنوی لائٹ آف حرم یا نور محل نامی بھی شامل ہے ۔ اُمید ہے کہ جناب نادر کے کلام کے قدردان اس مجمُوعہ کے شائع ہونے کی خبر نہایت مسرت سے سُنیں گے ۔ اور اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لینگے ۔ لکھائی اور چھپائی صاف اور عمدہ ہیں اور اس پر قیمت فقط ۸ رکھی گئی ہے مصنف سے کاکوری ۔ ضلع لکھنؤ کے پتہ سے مل سکتی ہے ۔

دل کی پریشانی

مولوی رضاء اللہ صاحب بی۔ اے انجنیئر انہار خلف شمس العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم نے لطیفہ خیز پیرایہ میں ہماری شاعری کے بعض پہلوؤں پر ظریفانہ نکتہ چینی کی ہے اور عامیانہ عشق کی جسکو غلط فہمی سے عشق کا خطاب دیا جاتا ہے ہنسی اڑائی ہے۔ گو نکتہ چینی اور ہنسی دونوں میں کسی قدر مبالغہ سے کام لیا ہے۔ تصویر تین سے وہ اپنے خیال کی توضیح کرتے ہیں پینچ کے رنگ کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی رضاء اللہ صاحب نے علم ادب کے لئے طبیعت پائی تھی۔ جو انجنیری کی مصروفیتوں میں اپنا اثر پوری طرح نہیں دکھا سکی۔ مگر بالکل بے نتیجہ بھی نہیں رہی:۔

جناب ایڈیٹر صاحب!

نہایت ادب سے یہ راست رہست۔ بے کم و کاست درخواست آپ کی خدمت میں روانہ کر کر ملتجی ہوں۔ کہ آپ ازراہ کرم۔ میرے ناچیز معروضات پر ضروری کامل توجہ فرماویں۔

مَیں آپ کے اخلاقِ حمیدہ اور اوصافِ پسندیدہ پر پورا بھروسا رکھکر۔ اپنے ذاتی حالات کو معرضِ انکشاف میں لاتا ہوں۔

(۱) میرا دماغ پرلے درجہ کا خشک اور منتشر واقعہ ہوا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں تنگ آگیا ہوں۔ بہت علاج کئے یہانتک کہ مٹی کا تیل ملنے سے بھی خشکی دور نہ ہوئی۔ اب اپنے ایک دوست کی صلاح و مشورہ سے۔ دماغ کو دل کی امداد پہنچا کر اپنی زندگی کو یبوست اور انتشار سے بچاکر۔ سرسبز۔ خوشگوار اور باقاعدہ بنانیکا آرزومند ہوں۔ ایک اور علامت بھی قابلِ ذکر ہے۔ گھڑی میرے دل کے قریب

رہتی ہے - اور وُہ ہمیشہ تیز ہو جاتی ہے - اس سے شاید دل کا موجود ہونا ثابت ہو - کیونکہ گھڑی ساز اسکو درست بتلاتا ہے - خدا کرے کہ اس کے نیچے دل کی کوئی حرکت ہو۔

(۲) میری تعلیم - افسوس ہے - کہ سب کی سب سرکاری مدارس میں ہُوئی - جہاں سوا رخشک مضامین - اور قواعد و ضوابط کی پابندیوں کے کسی قسم کی زندہ دلی کا مشغلہ نہ تھا - پس مَیں نے بھی بمقتضائے فطرت کسی علم کو شوق سے نہیں پڑھا - اور محض تضیع اور دفع الوقتی سے کام لیا - یا اگر سچ پُوچھا جائے تو اُن جسمانی تکالیف سے بچنے کے خوف سے پڑھا - جو کم سنی میں اپنے سخت گیر بزرگوں کے واجب یا غیر واجب احکام کے انحراف سے ہوا کرتی ہیں - اور چونکہ تضیع اوقات مقصود تھا - اِس لئے اپنے لئے وہی مضامین پسند کئے جو بد تر سے بد تر ہو سکتے ہیں - مثلاً ریاضی اور اور سائنس وغیرہ - اور جب اس سے بھی دماغی پریشانی ختم نہ ہُوئی - تو فنِ تعمیرات کی طرف جُھک پڑا - جہاں سوائے اینٹ - پتھر - لوہا - چُونا وغیرہ سخت مرکبات و مفردات کے کسی اَور چیز سے سابقہ نہیں پڑتا رہا - قسم قسم کی طاقتوں کا حال پڑھا جن سے بات کو متوہم اور متوحش خواب - دماغ کی پریشانی کو اَور بھی زیادہ کرتے تھے - بحدیکہ میرا تمام ڈھانچ (جسم) بوسیدہ محسوس ہونے لگا - جو کچُھ سیکھا ایک عالم مدہوشی میں سیکھا -

(۳) میری یہ خواہش کہ واقعات کو صاف صاف - بے کم و کاست من و عن عرض کروں مجھے اس بات پر آمادہ کرتی ہے - کہ مَیں افسوس کے ساتھ اُس کمی تعلیم کا اعتراف کروں جو دل کی تعلیم گاہوں سے حاصل ہوتی ہے - اور جو اکثر مزین بالخال پٹھونا ہر ایک بڑے شہر میں - اور بالخصوص مجھ ناچیز کے اُجڑے دیار (دہلی) میں اِس گئے گذرے زمانہ میں بھی اسلاف کی متبرک روش پر دیکھی جاتی ہے - اِن قدیمی یونیورسیٹوں میں سُنا جاتا ہے - کہ دلرُبا لکچرار اور ہوش افزا سپیکر اپنی منجھی ہُوئی

آواز اور حرکات و سکنات جسم و چشم یعنی - غمزوں - عشووں - اداؤں - اور اشاروں سے ادق سے ادق مضامین آناً فاناً دل نشین کر دیتے ہیں - یہاں دماغ کی جگہ دل پر اثر ہوتا ہے - اور نگاہیں وہ کام کرتی ہیں - جو بجلی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں بھی اسی طرح پر سمجھایا گیا ہے - ورنہ میں تو چشم کو صرف بصارت ہی کے لئے کافی سمجھتا تھا یہاں پر میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ انواع و اقسام کی آوازوں کو مُردہ چوپایوں کی کھالوں اور آنتوں سے پیدا کرتے ہیں جن سے سامعین پر ایک بیخودی اور سرور کی حالت پیدا ہوتی ہے - میرا یہ خیال تھا کہ شاید نیند آجاتی ہوگی اور عالم خواب میں چلے جاتے ہونگے - مگر شاید ایسا نہیں ہوتا - بلکہ صرف دل کو اثر ہوتا ہوگا - اور معلوم نہیں - کہ دماغ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی - میرا یہ بھی ارادہ ہے - کہ اس تعلیم گاہ کے لیکچروں کو بھی پُوری دماغی قوت سے حاصل کرونگا افسوس ہے کہ مجھ کو کیا کیا کرنا پڑیگا اور آرام نہ ملیگا - پھر بھی میں ایوس نہیں ہوں

(۴) میں نے دل کا حال ایک ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا - تو اُنہوں نے اس کو ایک عجیب و غریب شکل پمپ بتلایا - سبحان اللہ! کہاں دل اور کہاں پمپ اُنہوں نے انگریزی مرکبات مثلاً ٹنکچر - ڈیجی ٹیلس - سپرٹ ایمونیا - ایرومیٹک - دل کی طاقت پیدا کرنے کے لئے بتلا دیئے - اور چونکہ وُہ طب یونانی میں بھی اچھی خاصہ مہارت رکھتے تھے - اِس لئے - خمیرا ابریشم - گاؤزبان - مربائے آنولہ - ورق نقرہ مفید بتلایا - اس کو دماغ نے قبول نہ کیا - پھر مقصد حل ہوسکتا - تو کیونکر - اب سوا آپ کے اَور کوئی دروازہ چارہ جوئی کا نظر نہیں آتا - دماغی طاقت کا تو خواہاں ہی نہیں - اور یہ بھی سخت مشکل - بلکہ اگر ناممکن کہا جاوے تو بجا ہے -

• اِس لئے اگر دل ہی سے زندگی پُرلطف ہوسکے تو زہے نصیب - اِس لئے

جناب والا! آپ کو اس خشک مریض کے علاج کی تدبیر محض عند اللہ کرنی واجب ہے۔ اور باعث ثواب ہے۔ ورنہ میں اس بے بسی کے عالم میں بے نیل مرام چار و ناچار چکراتا پھرونگا۔ اور خدا معلوم کب تک۔

اب میں اس مسئلہ کے بعض دیگر ضروری امور پر اپنے خیالات اور لیاقتوں کا اظہار کرتا ہوں۔

(۵) ناچنا[۱]۔ گانا[۲]۔ بجانا[۳] نمبر اوّل کو میں ایسا ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ سینڈو (انگریزی پہلوان) کے نقشجات کے موافق ڈمبل کی ورزش کو۔ اور اسی قدر نفرت سے دیکھتا ہوں۔ جیسے ڈمبل۔ آپ معاف فرما دینگے۔ مگر بشرطیکہ حرکات اگر تھوڑی ہوں اور زیادہ وقت پر تقسیم کیجاویں۔ تو زیادہ نتیجہ خیز اثر نہیں پیدا کرتیں۔ حرکات آہستگی کی وجہ سے دماغی جوش پیدا کرنے والی نہیں رہتیں۔ پس اُن مجموعہ حرکات کا نظارہ جس میں جنبش اعضا بہت جلد جلد ہو۔ اور مختلف سمت میں اور مختلف طریقہ پر ہو۔ دماغ کو ایک گونہ تفریح جدّت کی وجہ سے بخشتا ہے ایسا ناچ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ مکان کے گرنے۔ فرش کے پھٹنے کا اندیشہ نہ ہو۔ مگر کچھ ہی ہو ایک اپنے ہم جنس کو ایسی حرکات کرتے دیکھنا جو اپنے لئے باعث مسرت ہوں۔ اور دُوسرے کے لئے نہوں۔ اس کی تحقیر کرنا ہے۔ باوجود ان سب خیالات کے میں اس کے لئے بھی ایسا ہی تیار ہوں جیسا کہ عشقبازی کے لئے اگر دل کی تروتازگی کا اسی پر مدار ہو۔

(نمبر دوم) گانا یا راگ۔ اس سے زیادہ مشکل دُنیا میں کوئی چیز نہیں ہو سکتی گو میں سمجھ لیتا ہوں۔ اور میرے چند دوست۔ گانے کی داد مجھ سے لیتے ہیں۔ اور بیحد خوش ہوتے ہیں۔ اگر چہرہ بدنما نہ ہو جاتا۔ اور اس بات کا علم ہو کہ چیخنے سے کسی کی سمع خراشی نہ ہوتی ہو۔ اور آواز کے نشیب و فراز سے راگ کے معنی کو

سمجھنے کے لئے کوئی مشکل یا دقت پیدا نہ ہوتی ہو۔ تو راگ اچھا مشغلہ ہے۔ پرندوں کے سامنے گانا نہایت موزون ہے۔ کیونکہ اس سے انکا احسان اُتر جاتا ہے۔ وُہ ہم کو بغیر کہے سُنے اپنا گانا سُناتے ہیں۔ راگ شاید اچھا ہے کہ مسلمانوں میں منع ہے۔ اِس وجہ سے کہ اس فن کے پیشہ ور تمام مسلمان ہیں۔ جُوں ہی کہ دل کی قوت کا احساس شروع ہوگا۔ مَیں اس کی دل سے قدر کروں گا۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ دیگر ممنوعات کی طرح اس کے اختیار کرنے میں بھی دِل کی یونیورسٹی کے پروفیسروں کی پیروی نہ کروں۔

(باجا) باجا تو مَیں بالکل سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ہاں البتّہ اسکو درست کر سکتا ہوں اور سب سے زیادہ دِل کے زندہ ہونے پر اس فن میں حصّہ لونگا۔ مَیں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ کہ یہ آسمان سے آئی ہُوئی چیز ہے۔ اور فرشتوں کو مرغوب۔ مگر وُہ فرشتے مسلمانوں کے نہ تھے۔ کیا عجب ہے کہ یہ راز بھی کُلی طور پر اس ہی سبیل سے معلوم ہو جاوے۔ کہاں مَیں اور کہاں یہ جستجو۔

(۷) (معشوق شاعری کے معشوق پر مَیں نے ہر پہلو سے غور کیا ہے۔



اسوقت صرف مختصراً ہلاکت کے پہلو پر عرض کرتا ہوں ۔جس سے آپ کو میری لیاقت کے اندازہ لگانے کا اچھا موقعہ ملیگا ۔

برچھی ۔ بھالا وغیرہ آلاتِ کُشتن وگردن زدن اس معشوق کے حضور میں سب موجود رہتے ہیں ۔ اور صرف یہی نہیں ہے ۔ بلکہ وہ اِن کے استعمال سے بھی بخوبی واقف اور ماہر ہیں ۔ انداز کُشتن میں سے کوئی انداز دُنیا میں ایسا دریافت نہ ہوا ہوگا ۔ جو اِن بُتوں سے بچا ہو ۔ گھر بیٹھے نشانۂ اجل ۔ قاتل کا نام مہلک زخم سے پُوچھ لیجئے ۔ اگر فرصت ملے تو آنکھ ملانے کی دیر ہے ۔ اور آئے گئے ہوئے ۔ غضب ہے ۔ مَوت کے فاصلہ تک لگے ہوئے ہیں ۔ سکون وحرکت کے انداز مختلف ۔ آہستہ خرامی کی ایک ادا ۔ تیز رفتاری تو ستم ہے جس کے سامنے کبک رفتاری کی کیا اصل ۔

یکایک پلٹ عبرت انگیز ہے ۔ آنکھ قدموں سے نہیں اُٹھتی ۔ اگر خدانخواستہ کوئی خوشی کا موقع آوے ۔ تو بس غضب ۔ توپوں کی آواز سے مغز پاش پاش ہوجائے ۔ اور یہ سب فقط رُعب جمانے کے لئے ۔ آئینز راسٹ اور لفٹ بھی عجب ادائیں ہیں ۔ مگر اپنوں ہی اپنوں میں ۔ ہماری طرف محض جفا کے لئے ہیں ۔ معلوم نہیں ۔ کون ہیں ۔ کہاں رہتے ہیں ۔ کہاں سے آتے ہیں کس طرح آتے ہیں ۔ اور کس لئے اس طرح کی سختی اور درشتی ۔ اور مَوت کا ڈراوا ۔ اور پھر ہم سے غریبوں پر ۔ اس سے جناب کو غالباً اندازہ ہو سکے گا ۔ کہ میں نے انکو کس قدر سمجھا ہے اور اُنکے دیگر خصائل جو سوارنیکی کے جملہ اوصاف سے معمور ہیں مجھ پر سب روشن ہیں ۔

(۴) (تصویر یار) یعنی اُن کا حُلیۂ مُبارک ۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ اُن کی جنس معلوم نہیں ۔ یہ شکایت تو زبانِ زدِ خاص و عام ہے ۔ کہ اُن کا دہن اور کمر ہے ہی نہیں ۔

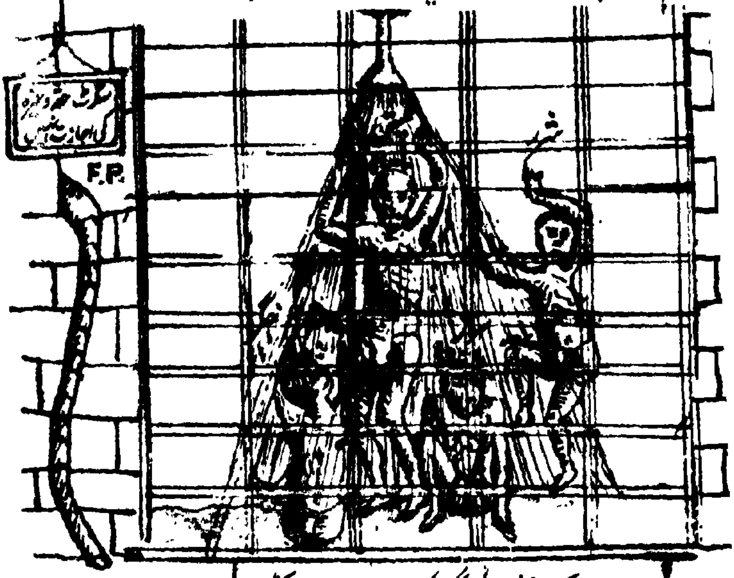
آنکھ بجائے خدا کے نور سے پُر ہونے کے۔ قہر آلود ہے۔ تیر اندازی کی کچھ حد و غایت ہی نہیں ہے۔ ایک فی صدی بھی اس سے شاید نہ بچا ہوگا۔ باوجود اس قدر مُہلک ہونے کے۔ گورنمنٹ گزٹ میں ایک خانہ بھی ایسی عجائب و غرائب اموات کا نہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ کیا اندھیر ہے۔ جناب والا! یہاں عرض کرتا ہوں۔ کہ میں ایسی آنکھ دیکھنے کا بے انتہا شائق ہوں۔ میں موٹے شیشہ کی عینک لگا لونگا۔ تاکہ تیر مژگاں سے محفوظ رہ سکوں۔ ابھی کل پرسوں کا ذکر ہے۔ کہ ایک تیر مژگاں ہوا میں اُڑتا ہوا میری آنکھ میں جا پڑا۔ گو کہ وہ اپنی طاقت کھو چکا تھا۔ مگر پھر بھی بےحد بے چینی پیدا کر دی۔ میں خوب سمجھتا ہوں کہ جس وقت یہ تیر پوری طاقت سے چلایا جاتا ہوگا تو کس قدر مخلوقات کو تباہ کرتا ہوگا۔ میں پہلے اس کو آنکھ میں پلک کا گر جانا ہی خیال کیا کرتا تھا۔ مگر اصلیت سے اب آگاہی ہوئی۔ کیا اُن کی طرف دیکھنا گناہ ہے۔ کہ مرگِ مفاجات اُس کی سزا ہے۔

کمر اور دہن اصل میں ہیں بھی کچھ نہیں۔ گوشت کو انسانی ڈھانچ سے نکال دیجئے تو یہ بھی غائب۔ انگلیاں نازک۔ آنکھیں غضب آلود۔ دائمی تبسم چہرہ پر۔ تصویر یار کا یہی ڈھانچ رہ جاتا ہے۔ لبِ لعل مفقود ہو جاتے ہیں۔ موتی جیسے دانت سب دکھائی دینے لگتے ہیں۔ کمر بھِڑ اور چیونٹے سے مشابہت کھا سکتی ہے۔ دونوں موذی بھی ہیں۔ مگر ہیں حقیر اور چھوٹے چھوٹے۔ آنکھیں ہرن جیسی۔ واہ کیا ہرن۔ کیا انسان۔ اڑھائی آنہ سیر گوشت بکے جو کباب کرکے کھایا جائے۔ انسان کو حیوان سے تشبیہ دینا اشرف المخلوقات کو کہاں تک زیبا ہے۔

لبِ شیریں اگر مکھیاں بھنکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ تو اچھے ہیں۔ لعل کو میں نے دیکھا نہیں۔ آپ کے موزیم میں ہوگا۔ ابرو۔ کمان جیسے جو بہت قدیم اور متبرک آلاتِ حرب سے ہے۔ اِس لئے تشبیہ بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اور آجکل

تو لائسنس بھی اس کے لئے لینا نہیں پڑتا۔

شعر فہمی کا مادہ مجھ میں اوائل عمر ہی سے ہے۔ میرے والد مرحوم فارسی کی درس پڑھاتے تھے اور مجھ سے بغیر اپنی امداد کے اشعار کا مطلب حل کراتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے مگر یہ کہتے تھے۔ کہ امتحاں میں ناممکن ہے کہ تو کامیاب ہو۔ میں چپ کا چپ رہ جاتا تھا کہ آپ تو اس قدر خوش اور پھر امتحان کے بُرے نتائج میرے لئے۔ میں اپنے مطلب کو بخوبی تصویر کی صورت میں ادا کرسکتا ہوں۔



داروغہ جی کہتے تھے کہ آجکل گرمی کی وجہ سے یہ چاروں اکٹھے کر دیئے گئے ہیں۔ اور کپتان صاحب کا حکم تھا کہ ہر وقت پانی جاری رہے۔ نام پوچھنے سے معلوم ہوا کہ آپ شرر۔ سوز۔ تپش۔ اخگر ہیں۔ اندھیرا رکھا جانے کا حکم تھا۔ کیونکہ روشنی سے دل ہی جوش اٹھتا تھا۔ سگرٹ پینے کی نہایت ممانعت تھی۔ اخگر کے لئے تو بس موت ہے۔ خدا فضل کرے۔

فائر پمپ اس احتیاط کے واسطے لگایا گیا ہے کہ خدانخواستہ اگر کسی جگہ آگ لگی ہو تو اسکو ان مریضان کے دیکھنے کا موقع نہ ملے اس سے وحشت بہت ہوتی ہے۔

داروغہ جی یہ بھی کہتے تھے کہ شعلہ رو بالکل نہیں آسکتے۔ خواہ کسی قسم کے ہوں یہ احتیاط اصحاب گورنمنٹ بہا قابل غور ہے نہ معلوم مفید ثابت ہو یا باعث ضرر۔



حضرات شیفتہ و فریفتہ

داروغہ جی کہتے تھے کہ ان دونوں پر تو مجھ کو بھی ترس آوے ہے۔ (بانگر کے ضلع کے راجپوت تھے۔ اردو بہت عمدہ بولتے تھے) اسی وجہ سے یہ دونوں ایک ہی جگہ رکھے گئے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے شاملِ حال تھے۔ فریفتہ بالکل ازخود رفتہ تھے۔ شیفتہ فریفتہ کو سنبھال سکتے تھے۔ داروغہ جی کہتے تھے کہ یہ تقریباً مدہوش ہیں۔

مَیں نے عاشق شعرا پر بہت رحم کرکے ایک جگہ اپنے ذہن میں تجویز کی ہے جہاں وُہ آرام سے رہینگے اور مَیں نے اُنکی وہاں کی حالتوں کا نقشہ بھی کھینچا ہے جو میرے پاس موجُود ہے۔ مگر فی الحال صرف چند تصاویر ارسال خدمت ہیں۔ آپ کو اس سے میرے کمالات کا اندازہ لگانے کا موقع ہوگا۔

اس درخواست کے جواب باصواب سے آگاہی بخشیں۔ ناکامی ہوئی تو افسرانِ بالا دست کی معرفت اسکو ارسال خدمت کرونگا۔ مَیں اپنی لیاقتوں پہ پُورا پُورا بھروسا کرتا ہوں اور ساتھ ہی آپ کے انصاف پر بھی +

رضاء اللہ

بھائی کا خط

مندرجہ ذیل خط ایک بھائی نے لندن سے اپنے چھوٹے بھائی کو لکھا ہے۔ ایک دوست نے یہ دیکھکر کہ خط نصائح سے بھرا ہُوا ہے۔ اسے بغرض اشاعت بھیجدیا ہے :-

پیارے بھائی!

شادباش۔ زندہ باش۔ تمہارا خط ملا۔ باعث مسرت وخوشی ہُوا۔ میں یہاں سے دو ہفتہ میں جرمنی چلاجاؤنگا۔ وہاں ڈگری لینے کے لئے یونیورسٹی میں داخل ہونگا۔ صرف قانون کی حاضری کے لئے انگلستان آیا کرونگا۔ میں تم کو کیا لکھوں۔ بہتر ہوگا۔ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں۔ کہ تم کو اپنی آئندہ تعلیم اور ترقی کے لئے کیا کیا کرنا چاہئے۔ مگر یہ وعدہ کرو کہ افراط اور تفریط کی غلطی نہیں کروگے سب سے پہلی بات اور غلطی جو مجھ کو اپنی تعلیم میں یہاں آکر معلوم ہُوئی وُہ یہ تھی کہ جہاں مَیں نے اپنے دل و دماغ کو علم سے نشو و نما دینے میں اپنی وسعت سے زیادہ کوشش کی۔ وہیں اپنے جسم اور قویٰ پر ظلم کرتا رہا حالانکہ حقیقی انسان اُس وقت بنتا ہے جب نہ صرف رُوح تربیت یافتہ ہو بلکہ رُوح کا مسکن یعنی جسم بھی حالتِ صحیح میں ہو۔ یہاں جس قدر عُلما وفضلا کو دیکھتے یہ معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون کا دماغ سکندر کے جسم میں مسکن پذیر ہے۔ یا موجُودہ زمانہ کی مثال سے ہیگل کی رُوح سینڈو کے جسم میں ہے۔ یہی ان لوگوں کی اعلیٰ تصانیف- عجیب صنائع۔ حیرت انگیز ایجادات اور بڑے کارناموں کا سب سے بڑا راز ہے- پس تم ابھی سے اپنے جسم کی بہر طور حفاظت کرنا۔ خدا اسکو امراض اور حوادث سے محفوظ رکھے۔ ورزش اور تفریح سے اسے غذا پہنچانا تا کہ جب تم جوان ہو

تو اپنے بھائی سے نہ صرف دماغی قابلیت میں کہیں بڑھ چڑھ کر ہو۔ بلکہ ذاتی وجاہت صورت اور تناسب جسمی میں بھی مکمل انسان کا نمونہ ہو۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ حقیقت میں تمہارے اندر اس اجتماع سعدین سے وہ خوبیاں اور محاسن پیدا ہوں جو انسانوں کو برگزیدہ بناتے ہیں۔ یہاں بچے۔ عورتیں۔ جوان تو ایک طرف رسن رسیدہ لوگ۔ کالجوں کے پروفیسر تک بھی جو خشک طبعی کے لئے مشہور ہیں۔ ہمیشہ ہر قسم کے کھیل کود میں شریک ہوتے ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں جو فٹ بال۔ کرکٹ۔ ہاکی۔ تیرنا۔ درخت پر چڑھنا۔ سکیٹ کرنا یعنی برف پر پہیے دار جوتوں سے چلنا۔ ناچنا۔ گھوڑے پر چڑھنا۔ بائسکل اور موٹر چلانا۔ گاڑی چلانا۔ تاش کھیلنا۔ شطرنج کھیلنا۔ ڈرافٹ کھیلنا۔ گانا۔ باجہ بجانا۔ پیانو بجانا یا ان میں سے اکثر چیزیں نہ جانتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود ایسی سخت محنت کرنے کے جس کا ہندوستان جیسی گرم آب و ہوا میں رہنے والوں کو کوئی اندازہ نہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ صحیح البدن رہتے ہیں۔ جو آدمی یہاں ان چیزوں سے ناواقف ہو اس کو ہر شخص تعجب کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کے متعلق اتنا لکھنا کافی ہوگا۔ کیونکہ تم جیسے ذہین کے لئے اشارہ ہی کافی ہے۔ مگر پھر مکرر یاد دلاتا ہوں کہ میزان اور تعدیل کا خیال رہے۔ اگر جسم نحیف رہ گیا تو ناقص انسان ہو۔ اصلی معیار وہ کامل انسان ہے جس کی تعریف میں اس سے قبل کر چکا ہوں۔ اب رہی دماغی تعلیم سو پیارے بھائی اس میں ہندوستان کے لوگ سخت بدقسمت ہیں۔ ایسی بے ربط اور ناقص تعلیم سے جیسی کہ ہمارے اسکولوں میں ہوتی ہے سوائے اس کے کہ دماغ کو نقصان پہنچے۔ کوئی فائدہ نہیں تاہم چونکہ اس سے گریز ناممکن ہے اور اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اس کا حصول لابد ہو گیا ہے۔ اپنے امتحانات کے پاس کرنے میں کوشش لازم ہے مگر زیادہ کوشش

یہ ہونی چاہئے۔ کہ وقت کا بیشتر حصّہ سب سے پہلے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں صَرف کیا جائے۔ کیونکہ نظر بحالات اس کا فائدہ مستقل اور اس کا علم مفید ہو۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انگریزی کی سہل اور آسان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے مگر اپنی استعداد سے زیادہ مشکل کتاب ہرگز نہ پڑھنی چاہئے۔ ایسا کرنا بالکل ایسی ہی غلطی ہے۔ جیسے کوئی آدمی اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھالے۔ اور اپنے جسم کو نقصان پہنچائے۔ مضامین کے لحاظ سے اُس مضمون کی کتابیں بیشتر دیکھنا چاہئیں۔ جس کی آئندہ تعلیم حاصل کرنے اور جس میں مہارت اور قابلیت کے حصول کا خیال ہو۔ علاوہ بریں ہمیشہ کچھ کتابیں قصّوں اور کہانیوں کی بھی دیکھتے رہنا چاہیئے۔ اور عُمدہ ناولوں کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ اس مُلک میں آجکل یہ کوشش ہو کہ جملہ علوم وفنون کے مسائل کو ناولوں میں بیان کیا جائے تاکہ پڑھنے میں دلچسپی ہو اور علوم کو فروغ اور اشاعت ہو۔ گو علم کی پری کا اس شیشہ میں اُتارنا آسان نہیں تاہم طبائع کا رجحان اسی طرف ہے۔ دوسری بات یہ کہ کوئی انسان جب تک اپنی قومی اور ملکی زبان کا ماہر نہ ہو باوجود علم وقابلیت کے چارپائے بر وکتابے چند کا کم وبیش مصداق ہے۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم میں سے کوئی انگریزی زبان میں ملٹن یا شیکسپیئر کا پایہ حاصل کرسکے مگر ہمارے لئے یہ ممکن ہے کہ ہم غالب اور اقبال کے درجہ کو پاجاویں۔ اگر کوئی علمی فتوحات ہم سے ممکن ہیں تو اپنی زبان ہی میں ممکن ہیں اور ہماری تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہم اردو سے ناواقف رہتے ہیں۔ پس اگر اس کمی کو کامل طور پر پورا نہ کیا جائے تو تمام تعلیم اور جدّ وجہد علمی بیکار ہے۔ یہ ایک ایسی محنت ہوگی جو کبھی بار آور نہ ہوگی۔ فرصت کے اوقات میں اُردو کی معقول تصنیفات۔ یعنی سرسید۔ مولانا حالی۔ شبلی۔ نذیر احمد اور آزاد کی کتابیں غور سے مطالعہ طلب

ہیں۔ گفتگو میں ہمیشہ پاک اور غیر ملوّث زبان بولنی چاہیئے۔ تحریر میں غیر زبان سے مدد لینا میری رائے میں گناہ ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ گو فارسی ہمارے مدارس کی تعلیم میں شامل ہے۔ مگر ہم کبھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کچھ مولوی صاحب کی نیکی۔ کچھ ممتحن کی نرمی۔ کچھ اُردو کی واقفیت کی وجہ سے فارسی سے شناسائی ان سب کے باعث امتحان میں کسی طرح نکل جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا اپنے آپ کو بزعم خود۔ فارسی دان سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ اگر کسی زبان کے سیکھنے کا قصد کریں تو اس کے حصول میں سخت کوشش کریں۔ اسوجہ سے کہ یہ مشکل نہیں اور فرانسیسی کی طرح دُنیا کی شیریں ترین زبانوں میں ہے۔ چوتھا مضمون جو تمہارے آئندہ ارادوں کے لحاظ سے ضروری ہے۔ ریاضی ہے۔ چونکہ میں ہمیشہ اس میں پھسڈی تھا۔ میری رائے اس کے مطالعہ کے طریقہ کی نسبت کسی کام کی نہیں ہو سکتی مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس میں تم جسقدر کوشش کرو کم ہے جتنا زیادہ جانو گے اتنا ہی آئندہ زیادہ تعلیم میں کام آئیگی۔ بالخصوص علم مساحت (منسوریشن) علم مساحت عملی (پریکٹیکل منسوریشن) علم مثلث ومخروط (ٹرگنومیٹری) علم جرثقیل (مکینکس) علم الماء (ہائی ڈرالکس) وغیرہ کے متعلق ریاضی میں کامل واقفیت لابدی ہے۔ سب سے اہم دو باتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ ریاضی میں مشق ضروری ہے۔ دُوسرے پہلی بات کو سمجھ کر دُوسری بات شروع کرنا چاہیئے۔ مگر ایک نہایت ضروری پہلو ابھی رہ گیا۔ وُہ یہ ہے کہ اگر آئندہ اعلیٰ انجنیری کی تعلیم حاصل کرنے کا قصد ہے تو دستکاری کے شوق کو نہ صرف جاری رکھو۔ بلکہ بڑھئی اور لوہار کا کام جسقدر ہندوستان میں سیکھا جا سکتا ہے سیکھ لو از حد مفید ہوگا۔ یہاں انگریزوں کے لڑکے جب انجنیرنگ میں شامل ہوتے ہیں تو ریاضی میں ہندوستانیوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس امر میں ہندوستانی بڑھے رہتے ہیں۔ مگر جب مشینوں کے سمجھنے کا معاملہ آتا ہے اور بڑا

اور لوہار کی ادنیٰ اور اعلیٰ باتوں کے علم کے متعلق سوال ہوتا ہے تو بیچارے ہندوستانی ایک لفظ نہیں جانتے اور انگریز بچے بن سمجھائے سب کچھ پہلے سے جانتے ہیں۔ اگر کچھ عرصہ تک یہ دونوں کام سیکھ لوگے تو پھر سمجھ خود بخود بڑھ جائیگی۔ اور سینکڑوں ایسی باتیں معلوم ہو جائینگی جو کتابوں کے مطالعہ سے نہیں آسکتی ہیں۔

اگر تم میرے بڑے بھائی ہوتے اور میں چھوٹا اور یہ خط تم مجھ کو لکھتے تو میں ضرور کہتا کہ میاں چونکہ خود سب مراحل طے کر چکے ہیں۔ ناصح بن گئے ہیں۔ اگر خود انہیں کوئی یہ سب باتیں کرنے کو کہ دیتا اور کر لیتے تو ہم بھی دیکھتے مگر تم زیادہ سعادتمند ہو جن باتوں کو قابل عمل پاؤ اور جن سے خود اتفاق کرو۔ انکی جانب کوشش کرو۔ کیونکہ زندگی کا حقیقی کارساز خدا ہے۔ تدابیر پر ہمیشہ تقدیر غالب ہے۔ انشاءاللہ جس راستے سے تم آؤ گے۔ محافظ حقیقی اپنے سایہ عاطفت میں بحفاظت تم کو ترقی کے انتہائی عروج تک پہنچا دیگا۔ ہمیشہ میری یہی دعا ہے۔ مجھے فرصت کم رہتی ہے۔ اس لئے اگر خطوں کا جواب دینے میں توقف یا تاخیر ہو تو قابل معافی ہے۔ تمہارا بھائی تمہیں ہمیشہ یاد کرتا ہے اور ہمیشہ اس خیال سے خوش ہے کہ اس کے لئے نہ صرف قوتِ بازو ہوگے بلکہ اس کے سب سے بڑے رفیق اور دوست۔ امید ہے کہ ہم دونوں اپنے ماں باپ کی خدمت بجالائینگے۔ یہ خط میں نے محبت کے جوش میں لکھدیا ہے اگر کہیں کمی یا نازیبائی ہو تو معاف کرنا۔

عبدالرحمٰن (از لندن)

ابن ابی امیر

ابن ابی امیر دار العلوم قرطبہ کے ایک پروفیسر کا لڑکا تھا۔ جو اپنی قانونی لیاقت کی وجہ سے گو ایک لائق مقنن سمجھا جاتا تھا۔ مگر دنیوی اعزاز کے لحاظ سے ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ یہ غریب مگر شریف النسل پروفیسر اُن بہادر عربوں کی اولا سے تھا جو سپہ سالار اسحاق اور اس کے جان نثار بربریوں کے ساتھ حملہ آور فوج میں شامل تھے اور جنہوں نے شاہ رازرق بادشاہ اسپین کو شکست دیکر اندلس میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی تھی۔

ابن ابی امیر بھی اسی دار العلوم میں پڑھتا تھا اور ایک معمولی طالب علم کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر اس کے خیالات اور حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے باپ کی طرح اپنی زندگی یونیورسٹی کی چہار دیواری کے اندر گمنامی میں بسر کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ لڑکپن ہی سے اس کو بادشاہت کے خواب آنے لگے تھے اور حکومت و دولت کے خیالی پلاؤ پکایا کرتا تھا۔ خدا معلوم کس بات نے اس کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ ایک روز ضرور بادشاہ بنیگا۔ اس کے دل میں یہ خیال کچھ اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ہمسن طالب علموں اور دوستوں کے سامنے نہایت ہی وثوق اور یقین کے ساتھ اپنی بادشاہت کے متعلق پیشینگوئی کیا کرتا تھا اور انکو یقین دلاتا تھا کہ میں ایک روز ضرور اندلس کا تاجدار ہونگا اور تمام ملک پر حکومت کرونگا۔ یہ کلام سنکر لڑکے اس سے تمسخر کرتے تھے۔ مگر وہ اُنکے ہنسی مذاق کی کچھ پروا نہ کرتا تھا اور اُن کے سامنے اپنی بادشاہت کے انتظام پیش کرتا تھا۔ اور اُن سے کہتا تھا کہ تم میں جس کسی کو جو عہدہ پسند ہو وہ ابھی سے مجھے بتادو۔

تاکہ جب میں عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لوں تو اس کا اسی عُہدہ پر تقرر کروں - گو یہ باتیں اسوقت مجنونانہ اور قابلِ تمسخر خیال کیجاتی تھیں - مگر ایک ایسا دن ضرور آنیوالا تھا - اور آیا - کہ جس طرح وُہ کہتا تھا وُہی ہُوا - اور اُس نے حسبِ وعدہ اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک بھی کیا -

ہم جس زمانہ کا حال بیان کرنا چاہتے ہیں - یہ خلافتِ اندلس کا وُہ زمانہ ہے جب کہ خلیفۂ حَکَم ثانی کی کمزوری اور طالب علمانہ اصُول نے خلیفۂ اعظم عبدالرحمان ثالث کی پالسی کو کمزور کر دیا تھا - جس کی وجہ سے دربارِ اندلس میں سازشوں کا بازار گرم تھا - اکابرِ سلطنت اپنا اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے - بیگماتِ حرم سرا نے بھی پولیٹیکل معاملات میں دست اندازی شروع کر دی تھی - اور لوگ اُن کے ذریعہ سے بڑے بڑے عہدے حاصل کرتے تھے - ان سب میں سلطانہ عروہ کا جو ولیعہد ہشام کی ماں تھی بہت اقتدار بڑھا ہُوا تھا - اور وہ سلطنت کے کاروبار میں بہت دخیل ہو رہی تھی

ابن ابی امیر نے طالبعلمانہ زندگی سے نکل کر پہلے پہل خطوط نویسی یا عرائض نویسی کا پیشہ اختیار کیا اور دار القضاء کے ملازمین کے خطوط اور عرضیاں لکھنے لگا - مصحفی جو اسوقت امیر بیت المال تھا اس کی قوت اور اختیارات بہت بڑھے ہُوئے تھے اور سچ پوچھو تو وُہی اصلی وزارت کر رہا تھا - کیونکہ تمام محکمہ جات پر اس کی حکومت قائم تھی - ابن ابی امیر جو فطرتاً ایک عقلمند اور ہوشیار نوجوان تھا - اس نے فوراً اس بات کو تاڑ لیا کہ کوئی جگہ لینے اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے مصحفی تک رسُوخ پیدا کرنا چاہیئے - غرضکہ اُس نے بہت جلد امیر بیت المال کی سرکار میں اپنی رسائی پیدا کی - اور دفتر میں ایک چھوٹی سی اسامی پر مامور ہو گیا - اس نے اپنی کوششوں کو یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ بہت جلد اپنی حکمتِ عملی اور عام دلفریب طریقوں اور تحفہ تحائف کے ذریعہ سے

حرم سرائے میں آمد و رفت پیدا کی اور سلطانہ عروہ کے یہاں اس قدر اپنا رسوخ اور اعتبار بڑھایا کہ وُہ خاص طور پر اس پر مہربان ہوگئی اور اس کو ولیعہدِ سلطنت کے مقبوضات کا کارکن بنا دیا۔ اور اس کے علاوہ رفتہ رفتہ وُہ ایک دو عدالتوں کا جج اور سٹی گارڈ کے ایک حصّہ کا کمانڈر بھی ہوگیا۔ غرضکہ اکتیس برس کی عمر سے پہلے ہی وُہ چند مختلف اہم خدمتیں انجام دینے لگا اور ارکینِ سلطنت میں اس کا بھی ایک رتبہ قائم ہوگیا۔

ابن ابی امیر صرف لائق۔ ہوشیار اور عقلمند ہی نہ تھا۔ بلکہ اخلاق حمیدہ اور عاداتِ پسندیدہ بھی اس میں موجود تھے۔ کریم النفسی اور منکسر المزاجی اس میں حد درجہ کی تھی۔ غریبوں اور محتاجوں کے ساتھ سلوک سے پیش آتا تھا۔ اور ضرورتمندوں اور اہلِ غرض کے کام نکالنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ ان عُمدہ صفتوں نے اس کو خاص و عام میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا اور ہر شخص اس کی محبّت کا دم بھرتا تھا۔ غرضکہ ابن ابی امیر ملک میں اس قدر رسُوخ حاصل کرنے پایا تھا کہ دفعتاً خلیفہ حکم کا انتقال ہوگیا۔ ولیعہد ہشام کی عُمر اسوقت صرف بارہ برس کی تھی۔ ایک حریف مُدعی نے سلطنت کا دعویٰ کیا اور محل سرائے کی فوج "سیلو" نے بھی سر اُٹھایا۔ مگر مصحفی اور ابن ابی امیر کی تدبیروں کے آگے فوج کی کیا چل سکتی تھی۔ حریف مدعی قتل ہوا اور یہ بغاوت وہیں کی وہیں دبا دی گئی اور کمسن ہشام مسندِ خلافت پر بٹھایا گیا۔ سلطانہ عروہ کا تو پہلے ہی سے سلطنت میں اقتدار بڑھا ہوا تھا۔ اب بیٹے کے تخت پر بیٹھنے سے اس کی قوت اور بھی بڑھ گئی اور ساتھ ہی اس کے ابن ابی امیر کی بھی خُوب بن آئی اور اس کو اپنی حکومت اور اقتدار قائم کرنے اور اپنے ذاتی جوہر اور لیاقت دکھانے کا ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔

مصحفی کو تو پہلے ہی سے سلطنت میں بڑا رسُوخ حاصل تھا۔ اب کمسن خلیفہ کی

مسند نشینی اور قلمدان وزارت کے ہاتھ آنے سے وہ بالکل سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک بنگیا۔ پہلے پہل تو ابن ابی امیر مصحفی کے ساتھ مل جل کر کام کرتا رہا اور اسکی ہر پالسی میں شریک رہا۔ مگر ان دونوں کی یہ موافقت بہت دنوں تک نہ چلی۔ کیونکہ ابن ابی امیر کے بلند خیالات اور دلی جذبات بھلا کب کسی کی ماتحتی قبول کرنیوالے تھے۔ وہ تو خود خلافت اندلس کے سیاہ و سفید کا مالک بننا چاہتا تھا۔ مصحفی کی خودسرانہ حکومت کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ اسی عرصہ میں شمالی سرحد کے عیسائی شہزادوں نے سر اٹھایا۔ مصحفی جو صرف اہل قلم تھا اور اس نے کبھی میدان جنگ کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔ بہت پریشان ہوا کہ اب کیا کروں اور کس کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجوں۔ ابن ابی امیر بھی جس نے ابھی تک اپنے آپ کو بطور ایک جج یا ایک مدبر سلطنت کے پبلک کے سامنے پیش کیا تھا اور کبھی کسی معرکہ آرائی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اب صرف اپنے ہاشمی خون پر بھروسہ کرکے اس نے یکایک قلم کے بدلے تلوار ہاتھ میں اٹھائی اور فوج کی سپہ سالاری قبول کرکے میدان جنگ کو روانہ ہوگیا اور وہاں پہنچکر خوب داد شجاعت دی اور بہادری کے ساتھ حملہ کرکے دشمن کو پسپا کر دیا۔ اور جو مال غنیمت ہاتھ آیا وہ فیاضی کے ساتھ تمام فوج میں تقسیم کر دیا۔ اہل لشکر اپنے اس نوجوان سپہ سالار کی بہادری اور فیاضی کو دیکھکر اس کے گرویدہ ہوگئے اور اس کا دم بھرنے لگے۔ غرضکہ وہ فتح و ظفر کے ساتھ قرطبہ واپس آیا اور اہل اندلس پر اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف ایک مدبر ملک اور منتظم سلطنت ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک بڑا بہادر اور قابل سپہ سالار بھی ہے۔

چند روز کے بعد اسی سرحد پر ایک دوسری مہم درپیش آئی اور اس مرتبہ سپہ سالار غالب جو سرحدی افواج کا ایک بہادر اور جری کمانڈر تھا وہ بھی اس کے ساتھ تھا اس مرتبہ بھی ابن ابی امیر ہی کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے دشمنوں کی خوب سرکوبی کی

غالب اس کا دوست بنگیا اور اُس نے اپنی لڑکی کا عقد اس کے ساتھ کردیا۔ غرضکہ ان مسلسل فوجی کامیابیوں اور اس رشتہ مناکحت نے مصحفی کے ساتھ پولٹیکل معرکہ آرائیاں کرنے کے لئے ابن ابی امیر کے پوزیشن کو بہت مستحکم بنادیا سب سے پہلے اُس نے مصحفی کے بیٹے سے قرطبہ کی چیف جسٹس کی کرسی خالی کرائی اور خود اُس پر قبضہ کیا۔ مگر اُس نے اس مشکل اور اہم عُہدہ کا کام ایسی لیاقت اور انصاف کے ساتھ انجام دیا کہ جب خود اُس کا بیٹا کسی الزام میں پھنسکر عدالت میں آیا تو اس نے اس کے ساتھ بھی ذرا رعایت نہ کی اور اسقدر اسکو دُرّے لگوائے کہ وُہ مرگیا۔ اور انصاف پسند باپ نے قانون کی پابندی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ بیان کیاجاتا ہے کہ اس سے قبل نہ کبھی شہر میں ایسا عمدہ نظام ہوا تھا اور نہ اس قدر انصاف سے قانون کی پابندی عمل میں آئی تھی غرضکہ اس طرح کے عُمدہ انتظام اور عدل و انصاف نے اہلِ قرطبہ کو اس کا اور بھی گرویدہ بنادیا۔

خلیفہ حکم کو وفات کئے ہوئے صرف دو ہی برس گذرنے پائے تھے کہ ۹۷۸ء میں آخر کار وزیر اعظم مصحفی نے جبکہ اس کا ستارہ اقبال عین عروج پر تھا اپنے نوجوان حریف ابن امیر سے میدان پالٹکس میں شکستِ فاش کھائی اور مسندِ وزارت خالی چھوڑ کر قید خانہ میں پناہ لی۔ مالِ غنیمت میں صرف قلمدانِ وزارت ہی ابن ابی امیر کے ہاتھ نہیں آیا۔ بلکہ مسندِ خلافت بھی اُس کے قبضہ قدرت میں آگئی۔ کیونکہ نوعمر ہشام تو صرف نام کا خلیفہ تھا اور رات دن حرم سرائے میں رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ اسکو اتنی بھی خبر نہ تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ رہی مجلس شوریٰ وُہ بھی ابن ابی امیر کی پالسی کی تابع تھی۔ جو چاہتا تھا وُہ کرتا تھا۔ کوئی اس کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکتا تھا۔ غرضکہ قرطبہ کا وزیر

باتدبیر کہو یا سلطان ذی شان جو کچھ تھا وُہ ابن ابی امیر ہی تھا - تمام روبکارات - فرامین اور اشتہارات اسی کے نام سے جاری ہوتے تھے - خطبہ بھی اسی کے نام سے پڑھا جاتا تھا - اور سکّوں پر بھی اسی کا نام کندہ ہوتا تھا - وُہ شاہی عبا میں بھی پہنتا تھا جن پر اس کا نام کڑھا ہوتا تھا اور جو اُس زمانہ میں خاص بادشاہوں کے لئے مخصوص تھیں - غرضکہ اُس نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں جو پیشینگوئی کی تھی وُہ یُوں پُوری ہُوئی اور وہ اندلس کا مطلق العنان بادشاہ بنگیا -

ابن ابی امیر نے نہایت حسن تدبیر سے ملک کا انتظام کیا اور جو بدامنی اور کمزوری سلطنت میں پیدا ہو گئی تھی اس کو بخوبی رفع کیا - اور ملک میں ہر طرح سے امن وامان قائم کر دیا - وُہ ہر فوجی اور ملکی محکمہ پر بلا کسی کی وساطت کے خود نگرانی رکھتا تھا - اور ہمہ تن انتظام سلطنت میں مستغرق رہتا تھا اور ہمیشہ رعایا کی فلاح وبہبودی اور آرام و آسائش کا خیال رکھتا تھا - اُس نے ایک جرار فوج بھرتی کر کے افریقہ پر کئی مرتبہ فوج کشی کی اور سلطنت اندلس کو سواحل بربر تک وسیع کر دیا - وُہ سال میں دو مرتبہ مسیحی ریاستوں پر فوج کشی کرتا تھا اور جب اس کی فوج ظفر موج شاہی یلغار پر رہتی تھی تو تمام مسیحی علاقہ جات میں تہلکہ مچا رہتا تھا - اُس نے پچاس مرتبہ نہایت ہی کامیابی کے ساتھ لشکر کشی کی اور بہت سی ریاستوں کو فتح کر کے سلطنت اندلس میں شامل کر دیا - انہی مسلسل کامیابیوں کے بعد اُس نے اپنا لقب المنصور اختیار کیا اور واقعی وُہ اس لقب کا پُورا مستحق بھی تھا - کیونکہ جس قدر زیادہ اور متواتر فتوحات اُس نے حاصل کیں وُہ آج تک کسی جنرل سے نہ ہو سکیں - ساتھ ہی اس کے وُہ ایک علم دوست اور فلسفیانہ خیال کا آدمی بھی تھا - اور اہل علم کی بہت قدر ومنزلت کرتا تھا - کتاب اور تلوار کو پہلو بہ پہلو رکھتا تھا اور فوج کشی کے موقع پر بھی عُلما اور شعرا ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تھے - اُس نے اپنے عہد میں

اندلس کو اقبال و دولت اور عزّت و عظمت پر پہنچا دیا تھا۔ غرضکہ ابن ابی امیر نے چوبیس سال تک نہایت ہی شان و شوکت اور فتح و ظفر کے ساتھ سلطنت کی اور ۱۰۰۲ء میں بمقام مدینا سلی" دفعتاً بیمار پڑ کر انتقال کیا اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ ایک معمولی حیثیت کا آدمی بھی اپنی لیاقت و قابلیت اور محنت و کوشش سے میدانِ ترقی میں کہاں تک سبقت لیجا سکتا ہے +

صادق حسین

چند دلچسپ رسالے

منشی شرف الدین احمد خاں صاحب ہیڈ کلرک جیل ریاست رام پور نے چند چھوٹے چھوٹے مگر دلکش رسالے ہمارے پاس بغرض ریویو بھیجے ہیں اُردو میں اس قسم کی کتابیں جو بچوں کے لئے مفید اور بڑوں کے لئے دلچسپ ہوں۔ بہت کم ہیں۔ ان میں نپولین کی ماں طبقہ نسواں میں مقبول ہونے کے لائق ہے۔ جس سے پہلا خط ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ جس کے ذریعہ لکھنے والے نے ناظرین کو مذہب کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چند رسالوں کا ایک سلسلہ ہے جنمیں سے ہر ایک میں کسی مشہور جاپانی کے حالاتِ زندگی درج ہیں۔ ان میں مارکوئیس اِیٹو اور مارکوئیس یاماگاٹا کے حالات بہت کارآمد سبق سکھانیوالے ہیں۔ مشاہیرِ جاپان کے سلسلہ کی کتابوں میں ہر ایک کی قیمت ۱؍ ہے۔ جس سے پہلا خط ۱؎ میں ملتا ہے۔ اور نپولین کی ماں کی مختصر سوانح عمری ۲؍ کی قیمت پر مؤلف موصوف سے مل سکتی ہے ٭

نا اُمیدی

انسان کا دل منبع ہے جذبات کا اور خواہشوں کا۔ جذبات کی حد مقرر کرنا دشوار ہے۔ لیکن خواہشوں کی انتہا اُنکے پُورے ہونے تک ختم ہوجاتی ہے۔ مگر خواہشات کا سلسلہ طویل ہے اور ایک خواہش کے بعد دُوسری خواہش اِس طرح نمودار ہوتی ہے۔ جیسے زنجیر کی ایک کڑی کے بعد دُوسری کڑی۔ یہی جذبات اور خواہشوں کا متواتر ایک دُوسرے کے بعد پیدا ہوتے رہنا انسانی حیات میں کشمکش اور حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ایک خواہش پُوری ہونے کے بعد دُوسری پیدا نہ ہو تو نہ صرف انسانی زندگی سست اور ساکن ہوجائے بلکہ انسانی کوششیں بند اور انسانی ترقی رُک جائے۔ اور انسان جہاں اسکی پہلی خواہش پُوری ہو وہیں قانع ہوکر بیٹھ رہے۔ لیکن ایک آرزو برآنے کے ساتھ ہی ابھی اس کا لُطف اُٹھانے کا اور اپنی حرکت کو روک کر ذرا دم لینے کا موقع بھی نہیں ملتا کہ فوراً ہی ایک اور آرزو سابقہ آرزو کی جگہ لیکر دل میں گدگدی پیدا کرتی ہے اور محنت کے مارے انسان کو اس طرح بے چین کرتی ہے کہ وُہ اسی طرح کمر باندھے دُوسری کشمکش میں اپنے آپ کو ڈال دیتا ہے اور پھر اپنی کوششوں کو تازہ دم کرکے اس نئی خواہش کے حاصل کرنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ یہ دَور انسان کی زندگی بھر رہتی ہے۔ سوائے اُس آخری وقت کے جبکہ موت اور اپنے قریبی انجام کا خیال ان خواہشوں کو اُبھرنے نہیں دیتا اور وہیں دل ہی کے اندر ان کا دم گھونٹ دیتا ہے۔

ہر خواہش جو دل میں پیدا ہوتی ہے اس کے دو انجام ہوتے ہیں یا تو

وُہ خاطر خواہ پُوری ہو یا نہ ہو۔ اگر ایک خواہش پیدا ہو جاتی ہے تو چاہیئے کہ اُس کے پُورا ہونے پر دل کو خوشی اور راحت میسّر ہو لیکن ایسا نہیں ہوتا اور بیقرار دل کو آرام نہیں ملتا۔ خواہش کے پورا ہوتے ہی معًا الطلوب سے ایک قسم کی سیری نال بہ نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک اور تازہ خواہش نئے تیر و پیکان سے پیراستہ دل کو چھیدنا شروع کر دیتی ہے۔ فورًا انسانی قوتیں دُوسری طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس سابقہ خواہش کا پُورا ہونا بالکل ہیچ اور ادنیٰ معلوم ہوتا ہے۔ ایک خواہش کے بعد دُوسری خواہش کے وجود میں آئیگا۔ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور یہی انسان کو محنت کرنے۔ مصائب جھیلنے۔ اور اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالنے پر تحریک اور تحریص کرتا ہے۔ یہی اسکی کوششوں کو برابر جاری اور برقرار رکھتا ہے اور یہی اس کی زندگی کی مصروفیت کا سبب ہے۔

لیکن اس دَوڑ میں سرگرم رکھنے والی صرف اُمید ہے۔ اگر اس اُمید میں ذرا سا بھی تزلزل ہو جاتا ہے تو کوششیں ادھوری رہجاتی ہیں۔ دل برداشتہ ہونے سے حرکت بند ہو جاتی ہے اور آخر وُہ حالتِ سکون پیش آتی ہے جس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھکر یا تو کسی غائبانہ امداد کی توقع کرنی پڑتی ہے یا خوشی سے اپنی بدقسمتی پر آنسو بہانے کی نوبت آتی ہے۔ یہ آخری حالت انسان کی نہایت اضطرابی حالت ہے اور اُسی کا نام نااُمیدی رکھا گیا ہے۔ جب کسی وقت انسان اس حالت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے لئے دُنیا میں خوشی کے راستے سب طرف سے بند ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اُمید جو خوشی کی بشیر ہے اپنی آمد و رفت موقوف کر دیتی ہے اور زندگی کا ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل اور وبال ہو جاتا ہے۔ قوتِ متخیلہ بھی جس کا عمل اُمید کے ماتحت ہے کوئی دُور و نزدیک راحت اس کے لئے

پیش نہیں کر سکتی۔ کوئی سامان اسکو اپنے دل کے مسرور کرنے کا نظر نہیں آتا۔ اس نا امیدی کا سیلاب جب ایک بدنصیب سامنے سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو اسکے ساتھ مایوسانہ لہجہ میں دفعتہً پکار اُٹھتا ہے ؎

سنبھلنے دے ذرا اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے   کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

بہت سے ایسے لوگوں کو جنہوں نے خودکشی کر کے دُنیا کے مصائب سے نجات پائی ہے بعض لوگ بزدل اور کمزور بتلایا کرتے ہیں لیکن یہ بزدل بتلانیوالے جوانمرد غالباً اُس حالت سے آگاہ نہیں ہوتے اور نہ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو نا امیدی کی حالت ہے۔ اگر یہ الزام لگانیوالے اپنے دلیر دلوں میں کسی ایسے شخص کی حالت کا تصور کرینگے جس کی ایک دلی آرزو پوری ہونے کی کوئی صورت نہ ہو جسکو امید کی ڈھارس بندھانیوالا چہرہ کسی طرف نظر نہ آتا ہو۔ جسے در و دیوار سے مایوسی کی آوازیں آتی ہوں جس سے ہمدردی ظاہر کرنے والی کوئی زبان نہ ہو تو وہ دیکھیں گے کہ وہ ایسا ایک شخص ہے جس کی حالت حقیقی طور پر قابلِ رحم ہے۔ زندگی اس کے لئے بے مزہ ہے۔ دُنیا میں وہ رہتا ہے مگر دُنیا سے اسکو بہت کم دلبستگی ہے۔ جاننے پہچاننے والے اُس سے انجان بنتے ہیں اور کوئی متنفس نہیں کہ اسکے درد کا شریک ہو۔ ایک ایسے شخص کی زندگی یقیناً کوئی زندگی نہیں ہے اور وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور یہی خیال جب اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے تو وہ بار بار زبان سے کہتا ہے "زندگی! یہ زندگی زندہ رہنے کے قابل نہیں" اور آخر وہ ایسے دیوانہ وار فعل کا مرتکب ہوتا ہے جسے صرف اس کی حالت اور اسکا دل جائز سمجھ سکتا ہے۔

اے وہ لوگو! جنکے دامنِ گلِ مراد سے بھرے ہوئے ہیں۔ اے وہ لوگو! جن کی آرزوئیں کامیابی کے چشمے سے سیراب ہیں۔ تم خوش ہو! تمہارے دل

مسرور ہیں! تمہارے چہرے بشّاش اور منوّر ہیں۔ تمہارے لبوں پر تبسم ہے۔ اس لئے کہ تمہارے دِل کا غنچہ اُس نا اُمیدی کے مُرجھا دینے والے جھونکے سے محفوظ ہے جسکی ایک ہی لپٹ اعضا کو نڈھال۔ چہرہ کو زرد کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھوا کر بٹھا دیتی ہے۔ جو دِل میں وُہ سوزش اور پژمردگی پیدا کرتی ہے جس سے دِل کے بخارات سرد آہوں کی صورت میں نکلتے ہیں۔ خُدا کا شکر کرو۔ اور اِس مسرت کے وقت کو غنیمت سمجھو اور خُدا کرے کہ تم اس بادِ سموم سے ہمیشہ امن میں رہو جس کے جھونکے مسرور سے مسرور دِل کو افسردہ اور پژمردہ بنا دیتے ہیں لیکن اُن مجروح دلوں پر نہ ہنسو جنکو نا اُمیدی نے خستہ بنا رکھا ہے۔ وہ لوگ جنکی زندگی اُنکے لئے وبال ہے اور جو اِس وسیع دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتے۔ جو اُنکے مُرجھائے ہوئے دِل کو ذرا شگفتہ کرے وُہ جنہیں سہارا دینے والی آس پاس کوئی چیز نہیں۔ وہ جو مایوسی کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ جنہیں انسانی ہمدردی کا کوئی ثبوت نہ ملا اور اس بیکسی کی حالتیں وُہ خدا پر بھی بھروسہ زائل کرکے اس کی رحمت سے دِل شکستہ ہو گئے ہیں۔ اَے کامیابی کے تاج پہننے والو! تم ایسی مخلوق پر ہنسو نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنکو انکی غیرت اور حمیّت نے موت سے بیخوف بنا دیا ہے جو اپنے ارادوں میں ایسے مستحکم ہیں کہ اپنی آرزوؤں پر اپنی جانیں قربان کرنا اپنی نجات سمجھتے ہیں یہ ایسے غیرت دار دل رکھنے والے ہیں کہ کسی کے بار احسان اور مرہونِ منت ہونے کو اپنی زندگی سے بدتر جانتے ہیں۔ بہرحال اَے دُنیا کی مسرّت سے فیضیاب ہونے والو۔ تم ایسے لوگوں سے ہمدردی کرو۔ ان پر رحم کرو یا کم از کم انکو انکے حال پر چھوڑ دو۔

اَے وُہ لوگو! جنکے ساتھ دُنیا کی اُمّیدیں وابستہ ہیں۔ اَے وُہ کہ تم

سے توقعات رکھنے والے تمہاری طرف اس بات سے تک رہے ہیں۔ اے وُہ کہ تم دُوسروں کی مرادوں کو سرسبز کرنے والے ہو۔ کیا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کہ تمہارے دست نگر۔ محتاج۔ اور امّید وار لوگوں کی خوشی تمہاری ذات پر منحصر ہے۔ اور انکی دِل کی شگفتگی کی امید وار کلی مُرجھا کر انکی زندگی کو کس قدر وبالِ جان کر دیگی۔ اگر وُہ تمہارے تیور اپنی امیدوں کے خلاف برگشتہ دیکھینگے۔ مایوسی کی گرم لپٹ اس غنچۂ دل پر جو مسرت کا مخزن ہو گیا اثر کریگی جس کی تر و تازگی حیات کے لئے لابدی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جن لوگوں کے دِل افسردہ۔ مجروح اور مایوس ہیں۔ زندگی اُنکے لئے کوئی راحت نہیں رکھتی۔ صرف تنفس ان کے لئے عذاب ہو۔ اور وُہ اپنا آرام سوائے اس صُورت کے کسی اَور چیز میں نہیں دیکھتے کہ جس قدر جلد ہو اس دُنیا کو خیرباد کہکر اس عذاب سے نجات پائیں۔

پس اَے دلوں کی مراد برلانیو الو! دیکھنا تم ایسے بڑے گناہ کے مرتکب نہ ہونا کہ اس دِل کو مایوس کرو جس نے اپنی خوشی اور راحت کو تم پر چھوڑ رکھا ہے۔ اَے لوگو! اگر تمہارے سینوں میں دل اور دلوں میں احساس ہو تو کسی امید وار دل کو نا امید نہ کرنا۔ سب کی بندھی ہُوئی آس کو دانستہ یا نادانستہ طور پر یا اپنی بے پروائی سے خاک میں نہ ملا دینا۔ تمہارا ایک ادنیٰ فعل دُوسرے کی خوشی پر بہت بڑا اثر ڈال سکتا ہے۔ پس اس امر کا خیال رکھنا کہ ایسا گناہ عظیم تم سے کبھی سرزد نہ ہو کہ وہ امیدوار جو ایک اُمید لئے تمہارے در پر آتا ہے اور خدا نے تمہیں اس امید کے پُورا کرنے کی مقدرت بھی دی ہے ایسا نہ ہو کہ وُہ دِل شکستہ تمہارے پاس سے مایوس جائے۔ تم دُوسروں کی کاربراری کرو۔ خُدا تمہاری کاربراری کریگا۔ اپنی زندگی کے طرزِ عمل میں اس بات کا ضرور

خیال رکھنا کہ تم بھی دل رکھتے ہو۔ تمہارے دل میں بھی آرزوئیں اور اُمنگیں پیدا ہوئی ہیں اور ہونگی۔ اور تمہارے دل بھی کم و بیش امیدوں کا سرچشمہ ہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہ دن دیکھنا پڑے جو کہ تمہارے تغافل اور لاپرواہی سے دوسروں کو نصیب ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ تمہارے شاد اور خرم دل ناامیدی کی تلخی سے آگاہ ہوں۔

کون ہے وُہ شخص جو اُس دل کی بیکلی سے آگاہ ہو۔ جسکی تمناؤں کا خون زمانہ کے دستِ تظلم نے کیا ہے اور جس پر ناامیدی اپنی تاریک گھٹا سے احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جب وہ اپنے ایسے ہمجنسوں کو جو بعض باتوں میں اس کے برابر اور بہت سی باتوں میں اُس سے کم ہیں۔ کامیابیوں سے سرخرو دیکھتا ہے تو جو رنج اس کے دل کو کاٹتا ہے اور جو حسرت اس کے سینہ میں پیدا ہوتی ہے وُہ ایسی ہے کہ اس کی تکلیف اور اس کے مزے سے کوئی نہیں کہہ سکتا (سوائے اس مظلوم دل کے) کہ میں آگاہ ہوں۔

ہائے محرومی! تیری شکایت کس سے کی جائے؟ اور تجھے کیا کہکر الزام لگایا جائے۔ انسانی کوشش کو ضرور پھل لانا چاہئے۔ مگر اُس وقت جب وُہ بالائی طاقت جسے بعض تقدیر سے اور بعض اتفاق سے تعبیر کرتے ہیں انکے موافق ہو اور اگر نہیں۔ تو اے محرومیٔ تقدیر۔ آ۔ آ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے۔ اور چل۔ جہاں تک تو مجھے لیجا سکتی ہے۔ لیکن دیکھ۔ میری ایک حد مقرر ہے۔ اس سے زیادہ دُور تو مجھے نہیں لیجا سکتی۔ موت کے سمندر کے کنارہ پر پہنچکر میں تجھ سے بالکل آزاد ہوں۔ اور نیز انسان جب چاہے تجھ سے آزادی حاصل کرسکتا ہے۔

لطیف احمد

نامۂ اکبر

حال میں اپنے کرم فرما جناب سید اکبر حسین صاحب اکبر کی خدمت میں ہم نے ایک خط لکھا تھا جس میں کلام کا تقاضا بھی تھا۔ اس کے جواب میں ایک نہایت شفقت آمیز خط اُنہوں نے تحریر فرمایا ہے۔ اس کا فقط ایک حصّہ جو کلام کے متعلق ہے وہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ اس میں تین چار شعر ہیں جو اپنی اپنی جگہ نہایت پُرلطف اور معنی خیز ہیں سید صاحب قبلہ تحریر فرماتے ہیں :۔

مکرمی۔

شرمندہ ہوں کہ بہ تعمیل ارشاد اشعار پیش نہ کرسکا۔ اوّل تو اس قدر تردّدات میں رہتا ہوں کہ جس کی کچھ حد نہیں۔ دُوسرے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب یا وہ گوئی خوش نہیں آتی۔ مَیں نے اس زمانہ میں کچھ نہیں کہا۔ بجز اس مطلع کے ؎

ہر اِک کو موت کا اِک دن پیام آئیگا
خدا کا نام لئے جاؤ کام آئیگا

اس کے ساتھ ایک شعر اَور بھی ہوا ہے ؎

اگرچہ صبح کو پھیکے ہیں مثل مہ صائم
چمک اُٹھینگے یہ جب وقت شام آئیگا

ہاں۔ ایک مطلع اَور یاد آگیا۔

اُنہیں کے مطلب کی کہہ رہا ہُوں زبان میری ہے بات اُنکی
اُنہیں کی محفل سنوارتا ہُوں چراغ میرا ہے رات اُنکی

ایک اور تازہ شعر ہے۔ یونیورسٹی کے متعلق مولینا شبلی کا یہ مصرع پڑھ کر

کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

بیساختہ میرے دل میں یہ الفاظ پیدا ہو گئے ؎

چہ خوش گفتید کایں تعلیم ما در دستِ ما باشد
ولے شرط است کاں دستِ شما جزوِ شما باشد

تالاب حسین ساگر

(ماخوذ از نظم مسز سروجنی نائیڈو صاحبہ)

ہے چشمۂ محبت تو اے حسین ساگر　　دلچسپ جانفزا ہے کیا خوب تیرا منظر
کرتے ہیں سب نچھاور دُرِّ نیاز تجھ پر　　دوشیزۂ سحر بھی کرتی ہے ناز تجھ پر
دکھلا رہی ہے کیا کیا وہ دلربا ادائیں　　گرویدہ کر رہی ہیں سب کو تری فضائیں
بنکر تری محبت خود چھا رہے ہیں بادل　　نظارہ کر رہے ہیں منڈلا رہے ہیں بادل
بجلی کی طرح ہر دم بیتاب ہو رہے ہیں　　صہبائے دیدِ رخ سے سیراب ہو رہے ہیں
تو چشمۂ طرب ہے تجھ پر خدا کی رحمت　　ہر سو تری بدولت چھائی ہے شانِ عشرت
آ آ کے دیکھتا ہے ہر ایک تیرا منظر　　لیکن کھلا نہ تیرا رازِ نہاں کسی پر
ہے دلفریب منظر تیری روپہلی چادر　　ہے دامنِ فسوں گر تیری روپہلی چادر
چشمِ تمیز گر ہو سب خوبیاں عیاں ہیں　　الفت کی تجھ میں ظالم نیرنگیاں عیاں ہیں
شانِ نہفتہ تیری پوچھے کوئی صبا سے　　رازِ آشنا کا اکثر کھلتا ہے آشنا سے
عالم میں چار سو ہے الفت کا تیری شہرہ　　میٹھی سروں میں موجیں گاتی ہیں راگ تیرا

وارفتہ ہو نہ کیونکر دل سے شباب تیرا — دم بھر رہے ہیں ظالم ہر سو حباب تیرا
ہمراز تو ہے میرا چاہوں نہ تجھ کو کیونکر — قائم مری طرح ہے تو ایک سے وفا پر

میری نظر میں گویا تو حور ہے پری ہے
تصویر جان و دل کی تو جیتی جاگتی ہے

[illegible]

رباعیاتِ شوکت

ہر چیز الٰہ عالمیں تیری ہے — یہ دورِ زماں ترا زمیں تیری ہے
ہر سجدہ شکرانہ پر اک سجدہ ہے فرض — سجدے کو بھی دی ہوئی جبیں تیری ہے

اک پلّہ میں تیری شان غفّاری ہے — اک پلّہ میں انسان کی سیہ کاری ہے
ہے خوف کہ سوکھ کر ہو کانٹا میزان — انبار گناہ کا بہت بھاری ہے

گر دیدے ماسوا کے خوش ہوتی ہے — آنکھ اپنے نصیب کو بہت روتی ہے
ہے نوکِ مژہ پر اشکِ غم کی قیمت — کہتے ہیں جو بندھ گیا وہی موتی ہے

رضواں کو جناں میں جا کے خورسند کروں — طوبیٰ میں قلم کی شاخ پیوند کروں
گر چپ رہوں غنچوں کی حقیقت کھل جائے — بولوں تو عنادل کی زباں بند کروں

بڑھ بڑھ کے ہوسِ زیست کا غم اور ہوا — چل چل کے نفس تیغِ دو دم اور ہوا

جو حرص تھی شیب میں بھی سیدھی نہ ہوئی — جھکتے ہی کمر کے تیغ و خنجر ہوا

کرتے ہیں معاش کے لئے لاکھ جتن — لیکن نہیں سیکھتے کوئی علم نہ فن
سیری ہو شکم کی یادِ حق سے کیونکر — تسبیح کے دانے نہیں بنتے خرمن

مجدد السنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت (میرٹھ)

مظلوم کربلا

یہ نادر اور بےمثل نظم ایک مذہبی رسالہ میں میری نظر سے گذری۔ انداز بیان ایسا دلکش اور خیالات ایسے لطیف اور حکیمانہ تھے کہ دل نے گوارا نہ کیا کہ اس نظم کا لطف اکیلا ہی اٹھاؤں۔ اس لئے نظم مذکور کسیقدر گستاخانہ تصرف کے بعد ہدیۂ ناظرین مخزن کرتا ہوں اور حضرت عزیز لکھنوی سے کلام بلاغت نظام کی ارباب نظر سے داد چاہتا ہوں۔

عبرت سے دیکھ صفحۂ صحرائے کربلا — ہے دفترِ مکارمِ اخلاقِ مصطفےٰ
گذرے ہیں گو بہت سے حوادث جہان میں — جب سے ہوئی ہے عالم و آدم کی ابتدا
لیکن نہ تجھے خدا کی قسم اے حریفِ صبر — ہے کوئی مثل واقعۂ طفِ کربلا
وہ کربلا کہ جس کے ہر اک ذرہ سے عزیز — تاباں ہوئی ہے حکمتِ اشراق کی ضیا
تکمیلِ علمِ نفس جو منظور ہے تجھے — اس نفسِ مطمئنہ پہ کر غور اک ذرا
اعراض جسکے معجزہ افعال جسکے کشف — تقریر جسکی وحیِ خداوندِ کبریا
ہر فعل جس کا ہے سبق آموزِ معرفت — ہر کام جس کا باعثِ خوشنودیِ خدا
وہ نفسِ مطمئنہ کہ جس پر جہان میں — جتنی مصیبتیں تھیں ہوا سب کا خاتمہ
کیا پوچھتا ہے علمِ سیاست کا اس کے حل — عاجز ہے جس کے درک سے یہ عقلِ نارسا
کی ہے اسی نے تو عملی درسگاہ میں — اخلاق کے تمام مطالب کی ابتدا
اس کی عدالت اس کی سخاوت پہ کر نظر — نوشیروان و حاتمِ طائی کا ذکر کیا
کیا پوچھتا ہے اسکی شجاعت کے معرکے — رستم کا تذکرہ ہے جہاں تنگ و ناروا

عاشور کو وہ چہرے پہ آثارِ انبساط — اللہ رے شوقِ وصلِ خداوندِ کبریا
اس کی ضریح کعبۂ وجدانِ شرع ہے — کیونکر کریں طواف نہ ارواحِ انبیا
وقفِ بلائے عشق کرے اپنے دل کو جو — جانے وہی حقائقِ علوی کی انتہا

ہاں اے شریکِ مجلسِ ماتم بتا نہ مجھے — ہوتا ہے کون دوسروں پر اس طرح فدا
غافل ذرا تصورِ ساذج سے کام لے — آنکھوں کو بند کرکے ذرا دیکھ ماجرا
ہر ایک ذرہ دشت کا کیسا ہے مضطرب — اُبلا ہے خونِ ناحقِ مظلومِ کربلا
لاشوں کے ڈھیر کشتوں کے انبار ہر طرف — وہ جلتی جلتی ریت وہ میدان کی ہوا
بے سر پڑے ہیں چند جوانانِ ہاشمی — رگ رگ میں جوش زن جو لہو تھا وہ بہ گیا
ہر موجۂ سموم سے اس دشتِ کین میں — آواز آ رہی ہے کہ یا دافع البلا

اے مستِ ذوقِ فلسفۂ عشقِ سرمدی — ہوتے ہیں اسکی راہ میں دیکھ اس طرح فنا
ایسا سنا ہے تو نے کہیں جذبِ باطنی — دیکھے ہیں اس طرح کے کہیں صادق الولا
اللہ رے اُن کا نورِ مجرد سے اتصال — قلب و دماغ عالمِ انوار بن گیا
دیکھ اس کو صبر کہتے ہیں کہتی ہیں اس کو ضبط — جبر اپنے اختیار پہ کرنا محال تھا
گیتی تمام قبضۂ قدرت میں جس کے ہو — وہ اور تشنہ لب ستم اے چرخِ پُر دغا
دُنیا میں دیکھ قطعِ علائق ہے اسکا نام — کرتے ہیں دور قلب سے یوں حبِ ماسوا
اللہ رے تابِ ضبط و توانائی شکیب — جزوِ ضعیف ایک دل اُس پہ یہ بلا

جو معرضِ وقوع میں آیا حسین سے — ہرگز نہ تھا یہ فطرتِ انساں کا مقتضا
مافوقِ طاقتِ بشری تھا ہر ایک فعل — اللہ رے مواظبتِ حکمِ کبریا

ادب آموز

کیا سنائیں ہم تمہیں نیرنگیٔ عالم کا حال ہے کتابِ اک جامِ اسمیں دیکھ لو تم جم کا حال
آئنہ حالِ سکندر ہے، یہاں رستم کا حال ہست ایں جا ہر عروجے را زوال ....

غافلو! انجام کی تم کو خبر کچھ بھی نہیں مال کیا اور کیا مآلِ مال و زر، کچھ بھی نہیں
آرزوئے زر سے حاصل جز ضرر کچھ بھی نہیں عشرتِ دنیا ہے نیرنگِ خیال ....

مال و زر پایا جو ترکہ میں تو اس پر کیا غرور پاس رہ سکتا نہیں یہ، تم اگر ہو بے شعور
آدمی بننا اگر چاہو تو ہے کوشش ضرور چاہئے کسبِ ہنر کسبِ کمال ....

ایک جا بیٹھے ہوئے کیوں شکوۂ قسمت کرو ہاں! اٹھو چل پھر کے دیکھو کوشش و محنت کرو
فکر کی زحمت اٹھاؤ، سعی کی عادت کرو سعی کا انجام ہے جاہ و جلال ....

بات شیریں ہوتی ہے شیریں تر از قند و نبات بات شیریں ہوتی ہے شیریں تر از آبِ حیات
خلق سے تو سب سے مل اور سب سے کر میٹھی بات خلق سے پیدا نہ کر رنج و ملال ....

نیکیوں سے دل لگاؤ تم یہ عادت خوب ہے نیک ہو یا بد اسے نیکی بہت مرغوب ہے
نیک ہو جو شخص اک عالم کا وہ محبوب ہے نیک ہے محبوبِ ربِّ ذی الجلال ....

غیر اپنے ہونگے شیریں ہو اگر اپنی زباں — دوست ہو جاتے ہیں دشمن تلخ ہو گی گر زباں
اپنے قابو میں نہ ہو غصہ میں وہ کیسی زباں — گر نہ بیہودہ تو ہرگز قیل و قال ....

کچھ کرو فکرِ تجارت تم میں غیرت ہو اگر — یا ہنر سیکھو کوئی، منظورِ حیرت ہو اگر
کچھ نہ کچھ کرتے رہو فکرِ معیشت ہے اگر — کاہلی سے ہے تمہارا خستہ حال ....

کیجے احساں مفلسوں پر پاس دولت ہو اگر — بیکسوں کے کام آؤ، تم میں ہمت ہو اگر
اے ذہینِ خستہ جاں تم میں مروّت ہو اگر — خاطرِ احباب کا رکھو خیال .....

— سید غلام مصطفےٰ ذہینؔ

قندِ مکرّر

(تضمین بر ارمغانِ ناظرؔ)

کرمفرمائے بندہ چوہدری خوشی محمد خانصاحب ناظرؔ مہتمم بندوبست و گورنر کشمیر کی نظم بعنوان "ارمغانِ ناظرؔ" نے جو مخزن ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ دل میں رہ رہ کر چٹکیاں لیں۔ مَیں نظم مذکور کے حرف حرف کو غور سے پڑھتا تھا اور اپنی گذشتہ زندگی کے اُن ایّام کو جو سری نگر کشمیر میں بسر ہوئے تھے حسرت آگین تخیل کی نگاہ سے دیکھتا اور تمنائے موہوم پر اِس سلسلۂ تصور کو ختم کر دیتا تھا۔ دن بھر اِسی صورت سے گذارا۔ انجام کار تقاضائے دل نے تضمین لکھنے پر مجبور کیا۔ حضرت ناظرؔ تو پھر سیر کشمیر سے دلشاد ہو رہے ہیں۔ مگر راقم کی حالت اُس بدنصیب عندلیب کی سی ہے جسے متواتر چار سال سے ایک نظر چمن دیکھنے کا

موقعہ نہ ملا ہو۔ گرہ صرف انہیں اشعار پر لگائی گئی ہے۔ جو دلی جذبات کا عکس ہیں اور راقم نے بنظر تسہیل امتیاز اصل اشعار ناظر پر جابجا نشانات (صاد) لگا دیئے ہیں۔

(مرزا مبارک بیگ مبارک)

اُس گلبدن سے کب یوں ہم ہمکنار دیکھیں　　　یارب جگر سے نکلے کب غم کا خار دیکھیں
بیتاب دل ہے چل بھی۔ رُوئے نگار دیکھیں　　　اے ساربان اُٹھائے کب تو مہار دیکھیں ص

ہم ہجر کے ستائے پھر کوئے یار دیکھیں ص
ہے آرزو کہ اُنکو پھر ایکبار دیکھیں

صحرا نوردیوں میں وحشت کا ڈھنگ دیکھا　　　کہسار گردیوں میں ہر سر بسنگ دیکھا
کشمیر سے نکل کر کیا کیا نہ رنگ دیکھا　　　یہ دشتِ سنگ دیکھا اور گُربہ تھنگ دیکھا ص

پھر لالہ زار دیکھیں اور شالا مار دیکھیں ص
ڈل کی بہار دیکھیں گل کا سنگار دیکھیں

ویران منظروں سے گھبرا گئی ہیں آنکھیں　　　سورج کی تیزیوں سے چُندھیا گئی ہیں آنکھیں
آئی نہیں ہے منزل اور آ گئی ہیں آنکھیں　　　پتھر کے دیکھنے سے پتھرا گئی ہیں آنکھیں ص

اب آبشار دیکھیں اور سبزہ زار دیکھیں ص
اب جوئبار دیکھیں ابرِ بہار دیکھیں

کیا کر رہے ہیں دونوں اعلانِ دلربائی　　　حق نے انہیں دیا ہے سامانِ دلربائی
وہ کانِ دلربائی وہ جانِ دلربائی　　　وہ ساعدِ حنائی وہ شانِ کبریائی ص

برگِ چنار دیکھیں یا دستِ یار دیکھیں ص
ہم بار بار دیکھیں۔ دیوانہ وار دیکھیں

ہیرا بھی زہر کھائے آئینہ ہووے حیراں　　　گوہر جو دیکھ پائے رہ جائے ہو کے غلطاں

له ۵ ہر ایک مقام کی نسبت مخزن ماہ اپریل سنہ ۱۹۰۹ء میں یارک صح ہیں۔

سیماب لوٹ جائے۔ چاندی کی ہو کیاریاں — طائر زمردیں میں الماس ہوں پرافشاں

پتوں پہ ڈل کے موتی۔ جب آبدار دیکھیں
جی چھوٹ جائیں ہو ہو کر بیقرار دیکھیں

جب نورِ صبح چمکے دیوار اور در سے — شبنم بکھار ہی ہو سبزے پہ کچھ گہر سے
نکلے صدائے نغمہ ہر شاخ سے شجر سے — وہ راگ کی گھٹا سی صحنِ چمن سے برسے

سرو و چنار مل کر گاتے ملار دیکھیں
اور وجد میں صنوبر ہوتی نثار دیکھیں

اے کردگار پھر ہوں سامانِ عشق پیدا — ابرِ بہار ہو اور جامِ مئے طرب زا
گلشن میں پھر ہو مجمع یارانِ باصفا کا — باغِ نشاط میں ہو۔ بزمِ نشاط برپا

ہر سمت چار یاری زیرِ چنار دیکھیں
یاروں سے یار مل کر لطفِ بہار دیکھیں

بیٹھے ہوں آسمانِ خوبی کے ماہ پارے — محفل میں بہ رہے ہوں نورِ ازل کے دھارے
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوں کچھ چلبلے اشارے — وہ حسن کے نظارے وہ عشق کے شرارے

وہ برقرار دیکھیں۔ یہ بیقرار دیکھیں
وہ عشوہ کار دیکھیں یہ دلفگار دیکھیں

چل پھر بہار دیکھیں جنت نشاں چمن کی — حسرت رہے نہ دل میں جامِ مئے کہن کی
ہر سمت کیاریاں ہوں نسرین و نسترن کی — انہار ہوں لبن کی۔ اقطار یاسمن کی

بو باس ہو چمن کی گلگشت زار دیکھیں
پھولوں کا وصف رکھیے گر کوئی خار دیکھیں

پانی کی ننھی ننھی لہریں مچل مچل کر — سبزے پہ لوٹتی ہوں پہلو بدل بدل کر
سیماب ہوں اگلتے چشمے ابل ابل کر — چاندی اچھالتی ہوں نہریں اچھل اچھل کر

شاخ و شجر سے اُن پر زر کا نثار دیکھیں
قربان کرتی نسرین پھولوں کے ہار دیکھیں

مُرغانِ نغمہ پرور ہر سمت ہوں نوا گر   پھولوں کی ٹہنیاں بھی جھومیں خوشی میں آکر
وُہ وُہ کرشمہ سازی دکھلائے ہوں اکٹر   وُہ وادیوں کا منظر ہو غیرتِ تھیٹر
نہروں کا ناچ مجرا سرو و چنار دیکھیں
ہارے نسیم بجاتی ساتھ آبشار دیکھیں

فصلِ بہار میں ہو صحرا بھی رشکِ بستاں   محفل جمائے بیٹھے ہوں اندر و سلیماں
کشمیر کے مناظر ہوں غیرتِ پرستاں   دریا کنار اُتریں جنگل کی سبز پریاں
اور کالے دیو بنکر سب دیودار دیکھیں
نگراں کھڑے سفیدے جوں چوبدار دیکھیں

لیجائے گر مقدر پھولوں کی انجمن میں   آئے شمیمِ گل سے پھر تاب خستہ تن میں
ہر سمت دیکھیں شانِ حُسنِ ازل چمن میں   ہر گل کے پیرہن میں نسرین و نسترن میں
ریحان میں یاسمن میں تصویرِ یار دیکھیں
ہر چیز میں اُسی کے نقش و نگار دیکھیں

رونق اُسی کی بن میں زینت اُسی کی گھر میں   اُلفت اسی کی دل میں سودا اُسی کا سر میں
جلوے اُسی کے دیکھیں ہم بحر اور بر میں   القصہ خشک و تر میں ہر سنگ میں شجر میں
ہر برگ میں شجر میں حُسنِ نگار دیکھیں
ہر شاخ میں ثمر میں اُسے آشکار دیکھیں

لداخ سے ہے منزلِ مقصود دُور ناظر   دِل ہو رہا ابھی سے ہے ناصبور ناظر
چل بھی کہیں شتابی اُنکے حضور ناظر   وہ زور چلے کی چوٹی ہے اپنا طور ناظر
واں جلوہ ریز برقِ حُسنِ آشکار دیکھیں *

* نسخہ تصرف کیا گیا ہے (مبارک)

سو بار غش میں آئیں گر ایکبار دیکھیں

دکھلائے ۔ دیکھئے کب کشمیر پھر مقدر — جاگیں نصیب ۔ بیٹھیں یاروں سے یار ملکر
بیتاب دل ہے ۔ بہر صادق حسین و حاضر — ملتے ہیں کب ۔ مبارک ۔ ناظر سراج و عنبر

کشمیر کی بہاریں یا کردگار دیکھیں
بچھڑے ہوئے ملیں پھر غم در کنار دیکھیں

عشق

کیا شے ہے؟ کسی عاشق سے پوچھا چاہیے

بزم میں ہے تذکرہ ۔ میں آج کیا کہنے کو ہوں — کچھ نہیں ۔ جو دل میں ہے وہ برملا کہنے کو ہوں
دعوتِ رُوح آج میں احباب کو کرتا ہوں پیش — خوانِ نعما پر عزیزوں کو صلا کہنے کو ہوں
ہوں میں کہنے کو جنوں ہی ہے کلیدِ قفلِ دل — اور اس چاکِ گریباں کو قبا کہنے کو ہوں
تم تو اینٹ اور پتھروں کو پوجتے ہو رات دن — عشق کو لیکن میں اب پیرِ ہُدیٰ کہنے کو ہوں
رحم آتا ہے مجھے حالت پہ معشوقوں کی آج — کیونکہ میں عشاق کو جادو ادا کہنے کو ہوں
چاہتا ہوں وصل سے تعبیر کرنا موت کو — ہجر کو وصلت سے لذت میں سوا کہنے کو ہوں
ضبط اور جذبِ اثر کے راز کو کرتا ہوں فاش — نالۂ شبگیر کو تیغِ ادا کہنے کو ہوں
میں کہوں گا تھی زلیخا شرم آور تمکیں کی چال — گو پریوں کی حرکتوں کو میں حیا کہنے کو ہوں
میں دکھاؤں گا کہ ایک اور ایک ملکر ایک ہے — دو کو لاتعداد اور بے انتہا کہنے کو ہوں
گوشِ محویت سے سُن لو سناتا ہوں جو میں — آج میں اک قصۂ حیرت فزا کہنے کو ہوں

تم نے سوچا بھی کبھی آخر کہ یہ کیا چیز ہے

عشق لعلِ بے بہا ہے یا فقط ناچیز ہے

میستوں پر جب تلک پہنچی نہیں تھی بیرزن — ذات شیریں کی جُدا تھی اور جُدا تھا کوہکن
دم سے تیشہ کے دوئی کی ہو گئی دم میں نفی — ہو گئے یک رُوح مطلق تھے جو یکجان دو تن
برجباسی آئے جمنا پر نہانے جب کبھی — عکس اپنا اُنکو آتا تھا نظر شکلِ کشن
باپ بول اُٹھا تن لاغر میں ڈالو لگایہ جاں — جب ہمایوں مرگ کے بستر پہ تھا صیدِ محن
کس طرح معشوق و عاشق بنگئے اک گلِ عشق — ہیں شہادت اسکی خاکِ نجد اور آبِ جمن
عشقِ صادق نفسِ امّارہ کو کرتا ہے فنا — عشق ولرماں عشق وحسرت میل اُٹھاتی ہے کُشتۂ عشق
عاشقوں کو زندۂ جاوید کر دیتا ہے عشق — بخشتے ہیں ساز و برگ اسکو سدا دار و رسن
ہم نے دیکھا بُت بنا۔ عاشق صنم کے سامنے — آپسے انسان کب ہوتا ہے کوئی حرف زن
عشق میں معشوق اور عاشق نہیں ہوتے گر ایک — ساتھ پروانوں کے کیوں جلتی ہے شمعِ انجمن
دیتی ہے بلبل پھڑک کر جان پنجرے میں اگر — پھٹ کے دل مٹی میں ملتے دیکھے گلہائے چمن

عشق شرطِ زندگی ہے عشق ہے شرطِ نجات
اسکے ہی ست پر ہے قائم کل جہاں کی کائنات

اپنے آئینہ میں عکسِ یار دکھلاتا ہے عشق — اپنے سایہ میں رُخِ دلدار چمکاتا ہے عشق
کرتا ہو ساگر کو سکہ ساگر ہے گوتم کی طرح — یکدلی یکرنگی انسانوں میں پھیلاتا ہے عشق
توپخانوں سے نہیں کرتا یہ قائم اتحاد — دشمنی کی دل میں چنگاری بجھا جاتا ہے عشق
تار پیڈو سے نہیں یہ کھینچتا ہے نقشِ صلح — باسنا کو صورتِ باروت بھسماتا ہے عشق
اس کی تسخیرِ غیریت کی خاصیت اک اور ہے — غیر کی آنکھوں میں اپنی شکل دکھلاتا ہے عشق
رہنے دیتا ہی نہیں ان میں تمیز و فرق کو — عاشقوں کو جامۂ معشوق پہناتا ہے عشق
تم کسی صورت پہ مٹجاؤ تو ہوتا ہے یہ حال — ہر مرقع میں وُہی تصویر کھینچ آتا ہے عشق
کہ نہیں رہتی تمیز من شدہ اسلئے — لوح سے دل کی دوئی کا حرف اُڑا جاتا ہے عشق

جس جلن سے شخصیت عاشق کی خاکستر ہوئی　　سینۂ معشوق میں بھی اسکو بھڑکاتا ہی عشق
تیر جس ترکش سے آکر دل میں بیٹھا ایک کے　　دوسرے کا دل اسی پیکاں سے چھیدوتا ہی عشق

جب کوئی ہو جائے داخل عشق کے دربار میں
پھر تمیز اس کو نہیں رہتی ہی رام اور مار میں

دیکھتے ہو باغ میں یہ گل یہ نرگس یہ چنار　　تو ہیں یاد آتے رُخِ رنگیں و چشم و دستِ یار
قامتِ دلدار پھر جاتا ہی آنکھوں میں ہیں　　دیکھو تم سروِ سہی کو جب کنارِ جوئبار
کھینچتی ہے نقش آنکھوں میں خرامِ ناز کا　　اپنی اٹھکیلی کی چالوں سے تدروِ کوہسار
تم اُلجھ پڑتے ہو سُنبل سے بس اتنی بات پر　　رکھتی ہی قدرے وہ شکلِ گیسوانِ تابدار
دیکھکر غنچہ دہانِ یار کی آتی ہے یاد　　کرتے ہو موتی کبھی اِک سلکِ دندان پر نثار
گر چڑھی ہوتی تمہارے سر کو دُردِ جامِ عشق　　تو تمہیں یکساں تھے گلزار اور دشتِ خارزار
یاد آنا ایک شے کا - بھولنے کا ہی ثبوت　　دھیان آنا - ہی فراموشی کو کرتا آشکار
دائرے میں عشق کے آتے تو تم کو ایک تھے　　گیسوے معشوق اور یہ عنبر و مشکِ تتار
ہو مجازی یا حقیقی - شرط نسخِ ذات ہے　　ہی فنائے ذات سے ہی عشقِ برحق کا نکھار
ایک کو دو دیکھنا ہی چشمِ احول کا خواص　　ہے دوئی اور غیریت سے دیدۂ بینا کو عار

اپنے آپے پر بھلا عاشق کی کب جائے نظر
یار بن کون و مکاں میں جب نہ کچھ آئے نظر

گل ہی ننگِ باغ چاک اس کے جو دامن میں نہیں　　بلبل بیزار دام اچھا ہے گلشن میں نہیں
ایک حالتِ عشق میں سرو اور قمری کی ہوئی　　پانو کی بیڑی بنی جو طوق گردن میں نہیں
ہو گئے جو صرفِ عشق اس مہر کے معشوق میں　　داغ جو دل میں پڑا کب ماہ روشن میں نہیں
ہو کنہیا کے نہ کاکل کی مہک جس میں بسی　　پھول پتی کوئی بھی ایسی مہابن میں نہیں
عشق کا رتبہ کہیں اعلیٰ ہی علم اور گیان سے　　فرق کچھ اس کے سوا رام او [illegible]

یہ خودی کی جس جلاتی ہے خس و خاشاک کو — دل میں پروانے کے ہے جو آگ گلخن میں نہیں
سینۂ عشاق میں جسکو دبا رکھا نہیں — ایسی چنگاری کوئی وادیٔ ایمن میں نہیں
جس سے جوئے اشک ماتھے کے پسینہ کو بہا — ایسی طاقت ہم نے دیکھی برق خرمن میں نہیں
عشق خالص جس کے دل میں ہو گیا ہو جاگزیں — امتیاز اس کے لئے شیخ و برہمن میں نہیں
دیر و کعبہ کیا؟ ہے ہفتۂ شبستان صنم — فرق چشم عشق میں مسکن ہی مسکن میں نہیں

حسن سے گر عالم تکوین نے پائی ہے شان
عشق نے پھونکی ہے اسمیں روح۔ اسکی تن میں جان

عیسوی بستم صدی اتنی تجھے فرصت کہاں — جو سُنے عشق حقیقی کی تو مجھ سے داستان
تیرے لیکھے طفل مکتب ہیں شسٹ اور المیک — جنکے نورِ روح سے روشن ہوا سارا جہاں
ہیں جنونی قیس اور فرہاد پتھر پھوڑتے — ہیر کا جیون ترے آگے ہے ٹرن کا بیاں
تیرا فتویٰ ہے کہ افسانہ ہے جنگِ کربلا — کشن لیلا پر ہے تجھ کو الف لیلہ کا گماں
قول ہے تیرا کہ ہے منصور مولودِ خیال — ایشیا کے شاعروں کی ہیں یہ سب خوش تر گپاں
تجھ کو شایاں ہے جو فرمائے بگرائے نکیت — ساری دنیا کی بھلا تاریخ کو جھونکیں کہاں
عشق کے آئینہ کو اس نے دوامی دی جلا — جو چتا سے قلعہ چتوڑ کی اُٹھا دھواں
غازۂ روئے محبت ہے جہاں آرا کا عشق — تار مکڑی کا بنیں جس سید کی بیڑیاں
تھی ہراول ہار توزیب عقب فتح ابد — عاشق اسلام کا کوفہ جو پہنچا کارواں
نقطۂ تکمیل پہ پہلا دکا پہنچا جو عشق — توڑ کر معشوقِ ازلی نکلا دیوارِ مکاں

ہے ہمارا عشق بے لوث اور محبت بیغرض
تو لگی رہ کام میں اپنے تجھے اس سے غرض

جلوہ افگن عشق دل میں ہو تو پھر کیا چاہیے — مرکز کون و مکاں اس دل کو کہنا چاہیے
[illegible] حکیموں کی نہ اسپر جاؤ تم — عشق کیا شے ہے؟ کسی عاشق سے پوچھا چاہیے

ہو محرک عشق کی خواہش تو وہ کب عشق ہے
دائرے سے عشق کے خارج تمنا چاہئے

آبِ حیواں پیکے پینا چاہتے ہیں سم کا گھونٹ
موت سے قبل اہلِ دنیا کو مسیحا چاہئے

ان بتوں ہی کی محبت میں اگر پتھر بنو
اس سے زیادہ اور دنیا میں تمہیں کیا چاہئے

کشن جی کو آکے اودھو نے دیا سبق جو آ
تیرے بھگتوں کی گرو دیوانی رادھا چاہئے

آجکل سچی محبت گرچہ نادر چیز ہے
اب بھی ہیں یوسف بہت لیکن زلیخا چاہئے

ہو کمالِ عشق میں کس کی طلب مطلوب کون
جائے تصویر آئینہ میں شکل زیبا چاہئے

عاشقِ صادق تجسس میں پھرا کرتے نہیں
چیز جو کھوئی ہوئی ہو اسکو ڈھونڈھا چاہئے

عشق اپنے سے جو ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا
کیف اس جامِ محبت کا بھی دیکھا چاہئے

تم سمندر میں اگر غوطہ لگا سکتے نہیں
تو کبھی اس بے بہا موتی کو پا سکتے نہیں

عشق کے عالم میں کیا دخل اختلافِ اضداد کا
ایک رتبہ ہے یہاں پہلاد اور فرہاد کا

کیا مجازی اور حقیقی؟ ہیں یہ تفرقے یقیں فضول
عشق عشق بے غرض ہے قول ہے استاد کا

جب نہیں کچھ شکوہ کی حس باقی تو پھر مانند ہے
اس چمن میں کام کیا ہے بلبلِ ناشاد کا

وصل کی خواہش ہے تو پھر وصل کے عاشق ہو تم
عشق سے کیا کام ہے اس کام[1] کی اولاد کا

ہے جو غفلت اور جفاؤں کا گلہ تو مفت میں
مت کرو بدنام تم نام اک ستم ایجاد کا

اسکو ہر شے میں شبیہ یار آتی ہے نظر
ہاتھ کب تکتا ہے عاشق مانی و بہزاد کا

خون شریانوں سے مجنوں کی نہ بہ جائے کہیں
قول ہمدردی سے لیلیٰ کے یہ تھا فصاد کا

عشق اور استغفراللہ نالہ و آہ و فغاں
عشق کیا ٹھہرا کہ ٹھہرا خنجر اک جلاد کا

سالماتِ عنصری میں شکلِ یار آئے نظر
پھر دماغ اسکو کہاں ہے یاد یا فریاد کا

آئینہ میں کب نظر آتی ہے تم کو شکل غیر
کیا دلِ صافی میں دخل اغیار و حبِ [illegible] کا

[1] کام یا کام دیو - عشق مجازی کا دیوتا -

اس لگی کو - آگ جس دل میں لگے - جانے وہی
آپ کو کھویا ہو جس نے - اسکو پہچانے وہی

عشق میں دل خاک ہو کر عالم آرا ہو گیا
عرش کی آنکھوں کا طفلِ اشک تارا ہو گیا

خودکشی ہے عشق برحق میں مسیحائی کی شرط
اپنا دشمن جو ہوا خلقت کا پیارا ہو گیا

من کو مارو تو خدا جانے وہ کیا سے کیا بنے
دیکھ لو اکسیر خالص مر کے پارا ہو گیا

پھر کہاں تم اور کہاں دیر و حرم کے سنگ و خشت
دل میں جب معشوق ازلی جلوہ آرا ہو گیا

گھاٹ اس تلوار کے اترا جو عاشق تر گیا
دھار تیغِ عشق کی گنگا کا دھارا ہو گیا

قعر میں بحرِ محبت کے ہوا جو دلنشیں
ساحلِ امید سے اس کو کنارا ہو گیا

آشنایانِ محیطِ عشق کو اس سے غرض
تشنۂ ساحل کو کوثر کا سہارا ہو گیا

بیم اور امید کی باقی نہیں رہتی لگن
جسکے دل میں عشق کا روشن شرارا ہو گیا

ہو گیا عشقِ مجازی میں بھی حاصل جب کمال
تو وصال و ہجر پھر یکساں گوارا ہو گیا

تخت پر عشقِ حقیقی کے جو بیٹھا ہو کوئی
اسکے سایہ سے جہاں پر نور سارا ہو گیا

اور میں اس سے سوا تم کو بتا سکتا نہیں
گر بتاؤں بھی سمجھ میں ہرگز آ سکتا نہیں

[illegible]

تازہ غزلیں

(از حضرت باقر عظیم آبادی)

در ہر دلیکہ عشق بوجہِ کمال نیست
در بارگاہِ قرب ز خوش مجال نیست

ز موجِ آز و حرص بساحل رسیدہ ایم
دیگر سفینۂ دلِ ما را وبال نیست

[illegible] بزنجیر زلفِ اوست
رزقم سوائے خونِ دل از سوق خال نیست

ازبند ہجر او شوم کے کشاد کار — ایں قفل را کلید بغیر از وصال نیست
حیرانم از رمیدنِ برگشتہ دیدنش — کیں طرفہ وضع در حرکاتِ غزال نیست
فہرست ناز و غمزہ و حسن است سینہ ام — فردِ حسابِ سیم و زر و ماہ و سال نیست
از خونِ دل نوشتہ شدہ در کتابِ عشق — نوشیدنِ شراب بہ ہجراں حلال نیست
داریم دل ز پرتوِ مہرش بسانِ روز — خورشید بامِ خانۂ ما را زوال نیست

شد آب خونِ دل ز غمِ ہجر باقرا
نم در لباسم از عرقِ انفعال نیست

(از جناب کمال لکھنوی خلف الصدق حضرت جلال لکھنوی)

پیچ زلفوں کا بڑھا ہے کس قدر — اس اُلجھنے میں مزا ہے کس قدر
ل کے وُہ مجھ سے جدا ہے کس قدر — اس تغافل کا گلا ہے کس قدر
خود پسند آیا ہے اپنا حُسن اُسے — اپنی صُورت پر فدا ہے کس قدر
دِل ہمارا آنکھ اُس بے مہر کی — بے مروت بے وفا ہے کس قدر
کچھ نہ مجھ سے پُوچھئے یہ پُوچھئے — آہ تیری نارسا ہے کس قدر
شرم میں ہیں کس غضب کی شوخیاں — شوخیوں میں بھی حیا ہے کس قدر
ہم مٹے جاتے ہیں جس کی یاد میں — وہ ہمیں بھُولا ہوا ہے کس قدر
دِل کو لیجا کر پھنسایا زُلف میں — اپنی قسمت بھی رسا ہے کس قدر
پڑ گئی جس پر نظر دِل لے لیا — سحر آنکھوں میں بھرا ہے کس قدر
بددُعا بھی وُہ نہیں دیتے ہمیں — بے اثر اپنی دُعا ہے کس قدر
مدعی ہو جاؤ تو معلوم ہو — میرے دِل کا مدعا ہے کس قدر
دخترِ رز سے جب پڑی ہٹ کر پڑی — آنکھ اپنی پارسا ہے کس قدر

نور کا دامن ہے دامانِ نقاب   روئے جاناں میں ضیا ہے کس قدر
کہنے والا کہہ رہا ہے دردِ دل   سُننے والا ہنس رہا ہے کس قدر
پھر گئی دِل لے کے قسمت کی طرح   آنکھ اُس کی بے وفا ہے کس قدر
زلفِ جاناں ہو نو پہچانے کوئی   اس بگڑنے میں مزا ہے کس قدر

پُوچھیے اُن ترچھی نظروں سے کمال
کج ادائی میں مزا ہے کس قدر

(از جناب قیصر- ایڈیٹر رسالہ الحجاب)

تیرے کُشتوں میں گِنا جاتا ہوں   مُفت بد نام ہوا جاتا ہوں
نقشِ کثرت پہ مٹا جاتا ہوں   راز وحدت کا بنا جاتا ہوں
ناتوانی ہے وجودِ عزت   اُنکی نظروں پہ چڑھا جاتا ہوں
اُس کے آنے کی ہوا اس درجہ خوشی   فرش کی طرح بچھا جاتا ہوں
زندگی خود ہے فنا کی تعلیم   اپنی ہستی پہ مٹا جاتا ہوں
اتنی شوخی نہ کر اے برقِ طور   دیکھ بیہوش ہوا جاتا ہوں
ضعف سا ضعف ہے اللہ اللہ   اپنی آہوں سے اُڑا جاتا ہوں
میرے رونے کو نہ پوچھو مجھ سے   وہ گھڑی تم کو ہنسا جاتا ہوں
چھیڑ کرنی ہے کسی سے منظور   جانبِ طور چلا جاتا ہوں
مجلسِ وعظ میں میری ذلت   اُجلے پوشوں میں لٹا جاتا ہوں

شعر گوئی وہ مرض ہے قیصر
آئے دن جس سے گھلا جاتا ہوں

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت (مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا) پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک (۱۲)

رسومِ دہلی مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگِ آصفیہ قیمت مع محصولڈاک ۔ ۱۲

منازل السائرہ ۔ مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن (۱۲)

خوابِ ہستی ۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن (۱۲)

ابو مسلم خراسانی ۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت (۱۲)

مکتوباتِ آزاد ۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ باتصویر ۔ (۶)

کلامِ نیرنگ ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی اے وکیل کے کلامِ منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۶

انتخابِ مخزن ۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب ۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک (۸)

دردِ جانستان ۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی ۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ ۸

دربار نمبر ۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۶

مثنویاتِ میر حسن ۔ مثنوی بےنظیر و بدرِ منیر کے ساتھ مثنوی گلزارِ ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کر کے شامل کی گئی ہے (۸)

سیرِ تبت ۔ انگریزی کتاب فرار سن ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰

مرقع خوشخطی ۔ فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے بتدی بچوں ۔ کاتبوں اور شائقینِ خط کیواسطے تیار کیا ۔ جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں ۔ علاوہ حسنِ ظاہری کے جو منشی صاحب نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا ہے ۔ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اسوقت ملک میں موجود نہیں ۔ ۵

درخواستیں بنام مینیجر مخزن ۔ لاہور آنی چاہئیں ۔

عالیجناب نواب وقار الملک بہادر کی نام نامی کو زندہ
اور ہر وقت یاد رکھنے کے لئے ہم نے

وقار الملک

ترکی ٹوپی اسی حال میں ولایت کے مشہور کارخانہ کرسٹی سے بنوا کر منگوائی ہے۔ اس جدید ٹوپی کی وضع اسقدر فیشن ایبل اور خوشنما ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قیمت سہ ناصر ۵ علاوہ محصول

محسن الملک پیٹنٹ

یہ اس نئی طرز کی خوشنما ٹوپی کا نام ہے جو اپنی خوبصورتی کے سبب تمام ملک میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور آج ہر فیشن ایبل شخص کے سر کا طرۂ زیب ہے۔ تمام استر چمڑے کا ہے قیمت [illegible] علاوہ محصول۔

فرمایشوں کے ساتھ سر کا ناپ آنا ضروری ہے۔ ہر رنگ کی ٹوپیاں موجود ہیں جس رنگ کی ضرورت ہو مفصل تحریر فرمایئے۔

ٹول کی عمدہ سلی سلائی قمیصوں کے علاوہ ہر قسم کا مال ہمارے ہاں سے بارعایت و کفایت مل سکتا ہے۔

راشد برادرز جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

کایا پلٹ کو

وید کہیں آبحیات عرب میں اکسیر البدن اور اطبا کی اصطلاح میں اکسیر اعظم کہتے ہیں۔

اطبائے سلف وخلف کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں روح الکل ایک غلاف کے اندر ملفوف ہوتا ہے۔ اگر کوئی ماہر علم ان اجزائے ارضی وغلاف کو دور کر کے روح کو حاصل کرے پھر وہ روح جس مرض کیلئے دیا جائے۔ مرض کیسی ہی ہو اس کا علاج ہو وہ روح کو طاقت دیکر مرض کو نکال دیتا ہے۔

ایسی اکسیر عام میں ہر ایک کو معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعض خاص لوگوں جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتا ہے تو ان پر ان بوٹیوں کا راز افشا کر دیتا ہے۔ جس میں روح الکل زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم اور خضر علیہ السلام اور بڑے بڑے سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی جڑی بوٹیوں کے متلاشی رہے حکیم میکائیل حکیم ہرمس۔ ڈاکٹر یونس نے اپنے جوہر کو آبحیات لکھا ہے اور وہ کہتے ہیں۔ روح کو تبدیل ہیئت کرنے میں کوئی مانع نہیں ہوتا اس لئے وہ سرایت کر کے جسم سے مرض کو بالکل نکال دیتا ہے۔

اکسیر البدن والی کا خاصہ ہے کہ مرض کو جسم سے داخل ہوتے ہی خارج کر دیتا ہے اور مزاج کو فطرتی حالت پر پہنچانا اس کا پہلا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ **اکسیر اعظم**، قسم کی مختلف علاج بیماریوں میں تیر بہدف کا کام دیتی ہے۔ اس لئے عام لوگ اس قالب ہیئت کی روح الکل کو آبحیات کہتے ہیں۔ بعد تجربہ مندرجہ ذیل عوارض میں موثر ومفید ثابت ہوئی ہے۔

فوائد مصدقہ تپ محرقہ۔ تپ صفراوی۔ تپ بلغمی۔ تپ دق۔ سل کے لئے بجلی وماہی۔ سینہ سا ہیا۔ ہیضہ کیلئے بے نظیر ہے سرسام سر درد۔ درد شکم۔ درد پہلو ہمیا۔ ذات الجنب۔ نزلہ۔ استسقا۔ طپش دل۔ سوزش وغیرہ میں سر درد الاغر۔ بہ درد۔ جبہ کا زخم۔ درد کان۔ مسوڑوں سے خون آنا۔ پھوڑے۔ پھنسیوں کا اگراؤ۔ ہواسیر۔ بھگندر۔ ناسور کا سوسنا۔ دانت کا درد۔ درد جگر۔ قبض۔ ٹڈوملوس۔ چھپاکی۔ تپ تلی۔ زخم میں کیڑے پڑنا۔ کثرت تشنگی۔ تشنج۔ بیخوابی۔ کھانسی خشک وتر۔ ورم پستان۔ آگ سے جلنا وغیرہ وغیرہ میں کایا پلٹ بین فائدہ کرتی ہے۔

قیمت

منیجر کارخانجات الحرمین الشریفین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما

[illegible]

دو پہر دن

مشہور عالم



اصلی راسکوپ سٹم واچ

یہ وہی پرانی چال کی اصلی راسکوپ سٹم جیبی گھڑی ہے جسکی پائداری کی نسبت ضرب المثل ہو کہ "دادا خریدے اور پوتا برتے" اور جو باحتیاط رکھے تو مدت تک گھڑی ساز کا منھ نہین دیکھتی۔ اسپر اسکی خوبصورتی اور ٹائم کی سچائی سونے پر سہاگہ ہے جب یہ گھڑی ہندوستان مین آئی کوئی بھی سوداگر آجتک پانچ روپیہ سے کم قیمت پر فروخت نہین کر سکا لیکن ہمنے پچاس ہزار گھڑیان اپنے خاص آرڈر سے ولایت سے منگوائین اور کوڑیون کے منافع پر فروخت کرنا شروع کر دین۔ یہی وجہ ہے کہ اسکی دھوم مچ گئی اور غیر ملکون تک جانے لگی۔ جہان ایک گھڑی گئی اسکو دیکھکر صدہا لوگون نے منگائین۔ اور اکثر اصحابنے زیادہ تعداد مین برائے فروخت منگاکر اچھا فائدہ اوٹھایا۔ ہزارہا سارٹیفکیٹ ہمارے دفتر مین اسکے موجود ہین اسکی نقل ولایت کے دیگر کارخانونے ہلکی گھڑیان بہت بنائین جنکو اکثر بھولے بھالے خریدار دو چار آنہ کی کفایت دیکھکر خریدکر پچھتاتے ہین۔ اسی لیئے ہمنے شرط کر دی ہے کہ اگر ناپسند یا کوئی نقص معلوم ہو تو اوسی قدر واپس کر دو اور قیمت مع خرچہ کے لے لو۔ اس سے زیادہ کوئی صورت اطمینان کی نہین ہو سکتی۔ دو یا زیادہ خریدنے سے محصولڈاک معاف اور بصورت چھہ گھڑی لینے سے علاوہ معافی محصول ایک گھڑی زائد دینگے۔

ملنے کا پتہ۔ برج باسی لال ویش ناولٹی ایجنسی نمبر ۱۹۵ بلدیو بلڈنگس شہر جھانسی

پانچ لاکھ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہوئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطور کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شراکت غیرے مالک مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپے کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۲ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے عجیب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے سنئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنجاتا ہے۔ کیا آپنے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر لی۔ اے صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ظلہ اور گورنمنٹ انگلیشیہ کے معزز عہدہ داران اور سرونسا نے روح حیات کو طاقت میں بے بہا بتایا ہے روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اچھی بجلی کی لاگ سے چاق اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چیٹ ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچروں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ امتیازانہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اسوقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت حائل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں۔ روح حیات تریاق کا تیر بہدف دوا ہے۔ بلکہ اعصاب کی ایک طاقت افزا غذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے ہی وقت ابتدائی حاصل ہوتی ہے۔ استعمال کیجئے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائینگے۔ جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)۔

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیاگر پروپرائٹر شفاخانہ عامہ

قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ

قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت کا معجزہ تو قریبا ہر ایک مسلمان
کو معلوم ہے۔ لیکن اس کا یہ نیا معجزہ صنعت تحریر ہے چنانچہ
حمائل شریف اعجاز صنعت جس کا یہ اشتہار ہے اسکے [illegible] صفحات
ہیں اور ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں پس چھٹی درمیانی سطر سے
اوپر اور نیچے پانچ پانچ سطریں ہیں۔ اور صنعت تحریر یہ ہے
کہ اس حمائل شریف کے تمام صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر سے
اوپر والی پانچوں سطروں سے مقابلہ ہے۔ یعنی
ہر صفحہ میں جن جن حروف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں۔ انہیں
حروف سے نیچے والی سطریں شروع ہوتی ہیں اور درمیانی چھٹی سطر کا مقابلہ مقابل
کے صفحہ کی درمیانی چھٹی سطر سے ہے۔ پس آپ سوچ سکتے ہیں کہ سامنے
قرآن شریف میں ایسی صنعتی تحریر کا ہونا معجزہ قرآن نہیں تو اور کیا ہے؟

نوٹ: اس جگہ اشتہار میں بھی اسی صنعت تحریر کا نمونہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ہر ایک سطر کے شروع میں ہر دو مقابلہ کی سطر کا نمبر [illegible]

عالیجناب [illegible]

[illegible]

قیمت مجلد حمائل شریف ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ) بلا محصولڈاک ملنے کا پتہ مولوی حکیم غلام محی الدین ناظم دار المصحف [illegible]

حقوق محفوظ

جون ۱۹۱۱ء

زیر ترتیب شیخ عبدالقادر بی اے

جلد (۲۱) نمبر (۳)

مخزن



اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام مینجر نول کشور پریس لاہور میں چھپا اور منشی فضل الہی پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ معہ محصولڈاک قسم دوم عہ فی پرچہ سات آنے تین پیسے

"مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم" ہر ایک اردو خواں کے پاس ضرور موجود ہونی چاہیے"

مخزن حکمت کو سرکاری انعام

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی یعنی صوبہ پنجاب کی درسی کتب کی سرکاری کمیٹی نے **مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر و حکیم** مصنفہ جناب **شمس الاطباء** کو اردو زبان کے لٹریچر میں ایک مفید اضافہ تسلیم کر کے پنجاب گورنمنٹ سے اس کی قدردانی کی سفارش کی۔ چنانچہ حضور نواب لفٹنٹ گورنر بہادر دام اقبالہ نے از راہ قدردانی اسے مبلغ مبلغ دو سو روپے انعام مرحمت فرمایا ہے۔ **مخزن حکمت** درحقیقت ہر ایک گھر میں موجود ہونی چاہیے۔

حضور والا سرائے ہند کی کونسل کے ممبر جناب آنریبل لفٹیننٹ **ملک عمر حیات خان صاحب** سی۔ آئی۔ اِی فرماتے ہیں۔ **مخزن حکمت (یا) گھر کا ڈاکٹر یا حکیم** کو جس قدر میں نے دیکھا ہے ایک ضروری کتاب ہے۔ ایسی کتاب کی سر دست سخت ضرورت تھی۔ اسکو تصنیف کر کے مصنف نے ملک اور اہل ملک کی بہت بڑی خدمت کی ہے جسکے واسطے سب کو انکا مشکور ہونا چاہیے۔ چونکہ ہر ایک آدمی کے پاس ہر وقت ڈاکٹر یا حکیم اور ملک کے ہر ایک حصے میں ہسپتال یا شفاخانے نہیں ہو سکتے۔ اس واسطے ایسی عمدہ کتاب کا ہر فرد بشر اور کم از کم ہر **گھر** میں موجود ہونا از بس ضروری ہے۔ کیونکہ یہ علم طب سے بالخصوص نا واقف ہیں۔ اسلئے **مخزن حکمت** پر ایسی رائے کے تحریر کرنے کی جرأت کی۔

آگرہ میڈیکل کالج کے معلم علم الادویہ و علم کیمیا جناب ڈاکٹر **محمد ماشاء اللہ خان صاحب** ایف۔ آر۔ سی۔ ایس فرماتے ہیں۔ **مخزن حکمت** کے اکثر مقامات کو میں نے دیکھا ہے۔ فیملی میڈیسن جیسے علم طب خانگی پر یہ ایک بے نظیر مکمل اور صحیح کتاب ہے۔ اس میں جابجا بہت سی تصاویر بھی ہیں۔ قابل مصنف نے جس جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے اسکے لئے درحقیقت وہ اہل ملک کے کمال شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں **"مخزن حکمت"** کا ہر ایک گھر میں موجود ہونا نہایت ہی مفید ہے"

حجم کتاب ایک ہزار تین سو چوبیس ۱۳۲۴ صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت کتاب {بلا جلد چھ روپے، مجلد سات روپے آٹھ آنے} ملنے کا پتہ **کتبخانہ جناب شمس الاطباء (گمٹی بازار) لاہور**

مخزن

لندن میں مسجد

لندن میں مسجد بنانے کا خیال کچھ نیا خیال نہیں ہے۔ جب سے مسلمانوں کے تعلقات انگلستان کے ساتھ بڑھنے لگے اور تحصیل علوم و فنون و تجارت و صنعت وغیرہ کے لئے مسلمان نوجوان انگلستان جانے لگے ہیں۔ یہ خیال دلوں میں بارہا پیدا ہوا ہے اور ایک دو مرتبہ باقاعدہ تجویز کی صورت میں بھی آج سے پہلے پیش ہو چکا ہے۔ لیکن اس مرتبہ ایسے بااثر اور مقتدر اصحاب نے اس تجویز کو پیش کیا ہے اور مسجد کے بنانے والوں کی جماعت ایسے جوش اور ہمت سے اس اہم کام کو سرانجام دینے کے لئے مستعد ہوئی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس آرزو کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور لندن میں آخر ایک عالیشان مسجد تعمیر ہو کر مسلمانوں کے لئے خیر و برکت اور فلاح دارین کا موجب ہو گی۔

لندن اس وقت دنیا کی تجارت کا مرکز اور علم و ہنر کا منبع ہے۔ اطراف عالم سے اقوام عالم کے افراد اس مرکز کی طرف کھنچے

آتے ہیں ؎

آنچہ در جملہ آفاق دریں جا حاضر
مومن و ارمنی و گبر و نصارے و یہود

یہ شعر لندن کے حال پر ایسا صادق آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کئی سو سال پہلے اسی کی شان میں کہا گیا تھا۔ اور اکثر مذاہب نے وہاں کے امن و آزادی اور مذہبی رواداری سے فائدہ اُٹھا کر اپنے معبد اس میں بنائے ہیں۔ مذہب عیسوی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرقہ ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی خاص عبادت گاہ اس عظیم الشان شہر میں نہ بنائی ہو۔ یہود گو تعداً میں تھوڑے ہیں۔ مگر باہمت اور متمول ہیں اور اتحاد قومی رکھتے ہیں۔ اُنکی اپنی عبادت گاہیں تو کئی ہیں۔ عام مذہب وہاں کا پروٹسٹنٹ عیسائی ہے اور پروٹسٹنٹوں کے گرجا گھروں کی سربفلک عمارتیں اور اُن کی آرائش اور اُن کی آمدنیاں تو غیر مسلم لوگوں کے وہم و گمان میں بھی مشکل سے آتی ہیں۔ اُن کی تقلید کا تو خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پس مسلمانوں کے لئے بھی لازم ہے کہ توحید کے نام کو روشن کرنے کے لئے دُوسری عبادت گاہوں کے پہلو بہ پہلو ایک مسجد بھی بنائیں جو اگر اعلیٰ سے اعلیٰ کلیسائی عمارات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ تو کم از کم اسلامی دُنیا کی بزرگی اور پایہ تخت انگلستان کی شان کے مناسب تو ہو۔

تعمیر مسجد کے ثواب کے متعلق کچھ لکھنا بالکل غیر ضروری ہے اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ (تحقیق بناتا ہے مسجدیں خدا کی جو کوئی مانتا ہے خدا کو اور روز قیامت کو اور جو نماز پڑھتا ہے) صاف اور صریح حکم ہے۔ گویا مومن کی ضروری صفت بیان کر دی گئی ہیں اور

لکھا ہے کہ جو یہ صفات رکھتا ہے اِس پر مساجد کو بنانے اور آباد رکھنے میں شریک ہونا فرض ہے ۔ ہمارے ملک میں مساجد کی کثیر تعداد بتا رہی ہے کہ مسلمان اِس ثواب کے کس درجہ معترف ہیں ۔ جب یہاں باوجود ضرورت نسبتاً کم ہونے کے ہزاروں لاکھوں روپے مُسلمان مساجد پر صَرف کرتے رہتے ہیں اور گلی گلی محلہ محلہ مسجد بناتے ہیں تو ایسی صورت میں کہ ایک اِتنی بڑی آبادی میں جس میں پچاس ساٹھ لاکھ نفوس آباد ہوں اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ایک بھی عبادت گاہ موجود نہ ہو ۔ ایک مسجد مہیا کر دینا ایک ایسا بڑا فرض مذہبی ہے کہ اس کے ادا کرنے کے لئے ہر مسلمان کو آمادہ ہونا چاہیے ۔

اگر لندن ایسا مقام ہوتا جہاں زمین معمولی قیمت پر مل سکتی اور عمارت کا خرچ غیر معمولی نہ ہوتا تو عجب نہیں کہ آج تک وہاں کئی مسجدیں بن جاتیں ۔ کئی مسلمان تاجدار ۔ کئی شاہزادے اور بہت سے خوشحال اُمرا اہل اسلام میں سے وہاں جا چکے ہیں اور کس کا جی نہیں چاہتا کہ ایسے بڑے شہر میں ایسی نیک یادگار چھوڑ آتے ۔ مگر لندن میں کوئی موزون اور موقر عبادت گاہ بنانے کے لئے لاکھوں روپے درکار ہیں ۔ اور اسی لئے کسی فرد واحد کی ہمت نہیں پڑی ۔ کہ وہاں مسجد بنا دے اور یہ مبارک تجویز قوم مسلمانان کی مجموعی توجہ اور کوشش کی منتظر اور محتاج ہے ۔ جو کمیٹی اب اس مطلب کے لئے قائم ہوئی ہے اُس نے پندرہ لاکھ روپیہ کا تخمینہ کیا ہے ۔ مگر ہمیں یہ بھی کافی نہیں نظر آتا اور عجب نہیں کہ بیس لاکھ سے کم میں سب ضروریات مہیا نہ ہو سکیں لیکن ایک ایسی بڑی قوم کے لئے جو دُنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے اور جس میں اب بھی ہزاروں خوشحال لوگ موجود ہیں ۔ یہ رقم ایسی نہیں جسے

سُن کر وہ ڈر جائیں اور ہمت ہار بیٹھیں ۔ بڑے چندے تو بڑے چندے ۔ چھوٹے چندوں سے بھی یہ رقم جمع ہو جانی ناممکن نہیں بشرطیکہ معزز افرادِ قوم ہر جگہ اس خدمت کو اپنے ذمہ لیں اور جمع کرنے کی سعی کریں۔

لندن کی منتظم کمیٹی کی طرف سے ایک چٹھی ان لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہے جنہوں نے مسجد کی جنرل کمیٹی کا ممبر ہونا منظور کیا ہے۔ اس کا ترجمہ ہم آج ناظرینِ مخزن کی اطلاع کے لئے شائع کرتے ہیں۔ جو صاحبان براہِ راست اس پتہ پر جو چٹھی مذکورہ میں دیا ہوا ہے اپنے عطیئے لندن روانہ کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن ناظرینِ مخزن میں سے اُن اصحاب کی سہولت کے لئے جو اس مبارک اور شاندار تجویز کی امداد کے لئے اپنا چندہ ہماری معرفت روانہ کرنا چاہیں۔ ہم یہ ذمہ داری لینے کو بھی تیار ہیں اور اس مطلب کے لئے دفترِ مخزن میں ایک رجسٹر مسجد لندن کے چندہ کے لئے کھول دینگے۔ جو چندہ مخزن کی معرفت روانہ ہونے کے لئے موصول ہوگا۔ اس کا مخزن میں اعلان کر دیا جائیگا اس تدبیر سے ان لوگوں کو بالخصوص آسانی ہوگی جو بہت بڑی رقوم نہیں دے سکتے۔ مگر اپنے محدود وسائل کے موافق اس کارِ ثواب میں شریک ہو کر داخلِ حسنات ہونا چاہتے ہیں۔ اگر اس ذریعہ سے کوئی معتدبہ خدمت مسجد کمیٹی کی ہم سے بن پڑی تو ہم اسے عین سعادت سمجھیں گے اور اگر قلیل امداد بھی ہو سکی تو بھی اس نسبت سے شاملِ ثواب ہونگے۔

چٹھی جو گذشتہ ہفتے میں لندن سے پہنچی ہے حسب ذیل ہے:-

مسجد لندن فنڈ

مربیان :- اعلیحضرت سلطان المعظم سلطان محمد خامس خلد اللہ ملکہٗ۔ فرمانروائے دولت عثمانیہ۔
اعلیحضرت سلطان احمد شاہ خلد اللہ دولتہٗ شاہ کجکلاہ ایران۔

عہدہ داراں

اعزازی پریسیڈنٹ :-
جناب شیخ الاسلام استانبول
جناب اخوند خراسانی مجتہد اعلیٰ نجف
جناب آغا سید محمد طباطبائی مجتہد اعلیٰ طہران

پریسیڈنٹ :-
ہز ہائی نس آغا خاں جی۔ سی۔ آئی۔ ای

چیئرمین :-
رائٹ آنریبل سید امیر علی۔ پی۔ سی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ ایل ایل ڈی۔

سکرٹریان :-
قمر الدین۔ عبد اللطیف صاحب۔
میجر سید حسن بلگرامی صاحب
پروفیسر ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ صاحب

خزانچی :-
عبد علی عتیق صاحب۔
بنک آف انگلینڈ۔

ڈیر مسٹر عبدالقادر

اگزکٹو کمیٹی مسجد لنڈن فنڈ کی جانب سے شکریہ قبول فرمائیے کہ آپ نے جنرل کمیٹی کا ممبر ہونا منظور کیا ہے۔ اور لندن میں اسلامی عبادت گاہ بنانے کی نیک تجویز کے پورا کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ کمیٹی نہیں چاہتی کہ اُن بیشمار اور دُور تک اثر کرنے والے فوائد کا مفصل ذکر کرے جو برٹش امپائر کے سب سے بڑے شہر میں ایک مسجد کے موجود ہونے سے پیدا ہونگے۔ اِتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مسلمانان مقیم انگلستان کی رُوحانی ضروریات کو پورا کرنے اور مختلف ممالک کے مسلمان بھائیوں کو یکجا جمع کرکے اُن میں برادرانہ خیالات کو ترقی دینے کے علاوہ ایک بڑا مطلب اس سے یہ نکلیگا کہ پُرانے تعصبات کے

زائل کرنے اور اہل برطانیہ اور پیروانِ اسلام کی باہمی ہمدردی اور اتحاد کا رابطہ مضبوط کرنے میں یہ تجویز مدد دیگی۔

اُن مسلمان نوجوانوں کے لئے جو تحصیل علم کے لئے انگلستان میں آئے ہیں۔ یہ مسجد مجوزہ مسلم یونیورسٹی ہند کی ایک مفید معاون ہوگی۔ کیونکہ اس کی بدولت وُہ نہ صرف نیک مسلمان بنیں گے۔ بلکہ وفادار اور معقول شہردارانِ ملک۔

کمیٹی کا یہ ارادہ ہے کہ اگر انہیں اسلامی دُنیا سے کافی مدد ملی اور خاص کر اُن لوگوں نے جنہیں خدا نے دولت دُنیا سے حصۂ وافر دیا ہے۔ اُن کی حوصلہ افزائی کی تو وُہ لنڈن میں ایسی مسجد بنائیں گے جو شانِ اسلام کے شایاں ہو۔ اور اس سلطنت کے عظمت کے متناسب ہو جسکے مرکز میں اس کی بنا ڈالنے کی تجویز ہے۔ یہ بھی قصد ہے کہ مسجد کے ساتھ ایک کتب خانہ اور ایک کمرہ اخبار بینی کے لئے بنایا جائے اور ہفتہ وار لکچروں اور وعظ کا سلسلہ جاری ہو۔ تاکہ مسجد اسلامی تحریک اور اسلامی تربیت کا منبع بن جائے۔ اور اس طرح یہ مسجد مسلمان طلبہ کو اُن ترغیبوں اور تحریصوں سے بچانے کا ذریعہ ہو جو اکثر اُن کے اخلاق کو نقصان پہنچاتی ہیں اور اُن کی زندگی کی اخلاقی بنیاد کو مضبوط کردے۔

کمیٹی نے یہ اندازہ کیا ہے۔ کہ زمین اور عمارت کے لئے نہیں نہایت متوسط درجہ کے تخمینہ سے ساٹھ ستر ہزار پونڈ اور مستقل آمدنی حاصل کرنے کے لئے اور اخراجات مسجد کے بہم پہنچانے کے لئے کم از کم تیس ۳۰ ہزار پونڈ درکار ہونگے۔ یعنی کل ایک لاکھ پونڈ یا پندرہ لاکھ

روپیہ چاہیئے۔ مگر کمیٹی کا یہ عقیدہ ہے کہ بلحاظ اس مقصد کی عظمت و اہمیت کے یہ رقم کچھ بڑی نہیں۔ اور یقین ہے کہ مسلمان جوش سے اس کام میں مدد دینگے۔ چونکہ مسجد کی تعمیر مسلمانوں کے اولین فرائض میں ہے۔

اعلیحضرت سلطان المعظم اور اعلیٰحضرت شاہ ایران نے اپنی عنایت خسروانہ سے اس فنڈ کا مربی ہونا منظور فرماکر خود بخود عطیے بھیجنے کی اپنی ہمدردی عملاً ظاہر فرمائی ہے۔ اسلامی دُنیا کے ان دو بڑے فرمانرواؤں کی ہمدردی ہمیں حوصلہ دلاتی ہے کہ تمام اکابر اسلام ہماری اپیل کے جواب میں جوش اور دریا دلی سے کام لینگے۔ مگر کمیٹی کا یہ خیال ہے کہ اگر یہ مجوزہ مسجد کبھی اس شان کی بن سکتی ہے جو برٹش امپائر کے مرکز کے شایان ہے تو اسی صورت میں کہ بیشتر حصہ اس کے مصارف کا مسلمانان ہند سے دستیاب ہو۔ کیونکہ وہی اس کے وجود سے سب سے زیادہ فوائد روحانی تعلیمی اور تمدنی حاصل کرینگے۔

بنک آف انگلینڈ نے مہربانی کرکے یہ منظور کر لیا ہے کہ اس فنڈ کے لئے جو عطیات آئیں۔ انہیں جمع کرتا رہے۔ چک یا ہنڈی بنام چیف کیشیر۔ بنک آف انگلینڈ۔ لندن۔ ای۔ سی ہونی چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ یہ تحریر ہونا چاہیئے کہ ٹرسٹیان لندن مسجد فنڈ کے حساب میں یہ رقم جمع کی جائے۔

ٹرسٹی صاحبان کے اسماء ذیل میں درج ہیں:-

رائٹ آنریبل۔ لارڈ ایمپٹل۔ جی۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای

رائٹ آنریبل لارڈ راتھچائیلڈ۔ پی۔ سی۔ جی۔ سی۔ وی۔ او۔

ہزہائی نس آغا خاں۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔

مرزا عباس علی بیگ (انڈیا کونسل)

منڈجی فکری بے (کونسل جنرل عثمانی)

ہزاکسلنسی صادق السلطنۃ (سفیر ایران)

رائٹ آنریبل سید امیر علی۔ پی۔ سی۔ سی۔ آئی۔ ای۔

آخر میں یہ بھی ہدایت ہے کہ جو صاحبان رقوم بنک میں براہ راست بھیجیں وہ اسکی اطلاع کمیٹی کے چیرمین یعنی رائٹ آنریبل سید امیر علی صاحب کو جن کا پتہ (ریفارم کلب۔ پال مال۔ لندن) ہے۔ ضرور دیدیں۔

ایڈیٹر

تاریخ اسلام

تاریخ اسلام جو اہمیت مسلمانوں کے لئے رکھتی ہے وہ تو ظاہر ہے مگر باعتبار اپنی حیرت انگیز ترقی کے اسلام کا ایک ایسا مذہب ہے کہ اس کے ابتدائی حالات اور اسکے بانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کارنامے اور اصحاب نبوی کے سوانح عام شائقین کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ منشی غلام قادر صاحب فصیح نے جو پنجاب کی اخباری دنیا میں مشہور آدمی ہیں۔ تاریخ اسلام کے دلچسپ واقعات مسلسل طور پر شائع کرنے سے ایک نہایت مفید اور قابلِ قدر کام شروع کیا ہے۔ یہ واقعات رسالوں کی صورت میں جن میں سے ہر ایک رسالہ ۴۸ صفحہ کا ہے چھپ رہے ہیں اور ہر مہینے میں دو ایسے رسالے نکلتے ہیں۔ اوراق کے ہندسوں کا سلسلہ ایسا رکھا گیا ہے کہ ناظرین بعد کو ان رسالوں کو مجلد کراتے وقت کتاب مرتب کر سکیں۔ واقعات مستند احتیاط کے ساتھ درج کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ اور زبان عام فہم اور سلیس اردو ہے۔ جو ضرور مقبول ہوگی۔ ہر باب بجائے خود مکمل اور دلکش ہے اور ایسا ہے کہ اس سے مبتدی اور منتہی دونوں محظوظ ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے متعلق ایسی عام پسند کتاب شاید اس سے پہلے اردو میں تیار نہیں ہوئی۔ جناب فصیح نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم ان کے مضامین کا کوئی اقتباس نمونہ کے طور پر مخزن میں شائع کریں اور انشاء اللہ کسی آئندہ اشاعت میں اقتباس درج کیا جائے گا۔ قیمت پیشگی سالانہ چار روپیہ ششماہی دو روپیہ اور رسالہ ہی ایک روپیہ مقرر کیگئی ہے اور منشی غلام قادر صاحب فصیح اڈیٹر تاریخ اسلام۔ شہر سیالکوٹ سے خط و کتابت ہونی چاہئے۔

چاند کا دُوسرا رُخ

مُندرجہ ذیل عالمانہ مضمون جناب مولٰینا علی حیدر صاحب طباطبائی کے تبحرِ علمی کا نمونہ ہے۔ اس مضمون سے چاند کے دُوسرے رُخ پر جو روشنی پڑتی ہے وُہ نہایت قدر کے قابل ہے۔ مُدت سے مخزن آپ کے فیضِ قلم سے محروم تھا یقین ہے وقتاً فوقتاً آپ اپنے اوقاتِ فرصت کا کچھ حصّہ ہمیں عنایت فرماتے رہینگے:۔

اس عنوان سے کسی کا مضمون رسالۂ مخزن میں شائع ہو چکا ہے مگر وُہ تشنہ رہ گیا تھا۔ چاند کے دُوسرے رُخ کے متعلّق جو باتیں ہمیں معلوم ہُوئی ہیں یہ ہیں کہ اس کے دُوسرے رُخ کا نور بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور ہلال و بدر کی شکلیں اُس میں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جس زمانہ میں چاند یہاں غائب رہتا ہے وُہ زمانہ دُوسرے رُخ کے کمالِ نور کا اور بدر ہونے کا ہے اور جس زمانہ میں چاند ہم لوگوں کو بدر معلوم ہوتا ہے وُہ زمانہ دُوسرے رُخ کی انتہائی تاریکی کا اور محاق کا زمانہ ہے۔ کمال کے بعد جس دِن چاند دب کر نکلتا ہے وُہی دِن دُوسرے رُخ کے ہلال ہونے کا ہے۔ جتنا ٹکڑا اِدھر کے رُخ کا روشن ہوتا جاتا ہے اُتنا ہی ٹکڑا دُوسرے رُخ کا تاریک ہوتا ہے اور جتنا ٹکڑا چاند کا ہمیں بے نور دکھائی دیتا ہے اُتنا ہی ٹکڑا اُدھر کے رُخ کا روشن ہوتا ہے۔ چاند کا اِدھر والا رُخ جب روشن ہوتا ہے تو اہلِ زمین اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ لیکن دُوسرے رُخ کی روشنی سے کسی سیارہ کو کچھ فائدہ نورِ شبہائے تاریک میں نہیں پہنچ سکتا۔ چاند اس قدر

چھوٹا ہے کہ زُہرہ یا مرّیخ کے معمورہ میں بغیر دُوربین کے دکھائی بھی نہ دیتا ہوگا جس طرح سیّارات کے چاند ہم لوگوں کو دُوربین کے بغیر نہیں دکھائی دیتے۔ اور دکھائی نہ دینا دلیل ہے اِس بات کی کہ اس کے انعکاس سے ملاء اثیر میں جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے وُہ دُوری مسافت کے سبب سے کسی سیّارہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی موجیں راہ میں مٹ کر رہ جاتی ہیں۔ غرض کہ چاند کے دُوسرے رُخ کی چاندنی کسی زمین کو نہیں پاتی جس میں کھیت کرے۔ اُس چاندنی سے لُطف اُٹھانے والا عالم میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ چاند کے اِدھر والے رُخ پر زمین کے روز روشن کا انعکاس جسے زمین تاب صاحب تشریح الافلاک فرماتے ہیں ایسا قوی ہوتا ہے کہ چاندنی سے چالیس گُنی زیادہ اس میں روشنی ہوتی ہے مگر آفتاب کی روشنی سے یہ روشنی بھی اس قدر کم ہے کہ زمانہ محاق میں چاند پر زمین تاب بہت قوت سے پڑتی ہے پھر بھی چاند دکھائی نہیں دیتا۔ اس زمین تاب سے دُوسرا رُخ چاند کا ہمیشہ کے لئے محروم ہے۔ وہاں کی راتوں میں یہ چاندنی کبھی نہیں چھٹکتی۔ یورپ کے مہندسوں کی پیمائش کے بموجب چاند زمین سے دولاکھ چالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس قربت کے سبب سے اتنا بڑا معلوم ہوتا ہے کہ قریب قریب آفتاب کے جرم کے اس کا جرم بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن زمین چاند سے چالیس گنی بڑی ہے۔ چاند کے اس رُخ پر سے کوئی زمین کو دیکھے تو اُسے ایک ایسا عظیم الشان جرم دکھائی دیگا جو آفتاب سے چالیس گنا تقریبًا بڑا معلوم ہوگا۔ یہ منظر دُوسرے رُخ پر چاند کے دکھائی نہیں دے سکتا۔ یورپ کے اہلِ رصد کی تحقیق یہ ہے کہ چاند پر کرہ بخار نہیں ہے۔ اور اس سبب سے وہاں کسی ذی روح

کا ہونا ممکن نہیں اس سے دُوسرے رُخ کا بھی حال ظاہر ہے کہ وُہ بھی ویران وغیر آباد ہے ۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک رُخ پر طبقہ بخار ہو اور ایک طرف نہ ہو۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ چاند کا دُوسرا رُخ ہمیشہ سے چھپا ہُوا ہے ۔ یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ تمام سیّارات اور آفتاب تو علیٰ نفسہٖ حرکت کریں اور ہمیشہ کروٹیں بدلتے رہیں اور اپنے اپنے مدار پر لُڑھکتے ہوُئے جائیں اور چاند اس وصف سے مُستثنیٰ ہو۔ مادہ کے خواص پر جن حکمائے فرنگ نے غور کیا ہے اُنہوں نے تو ہر ایک جوہر فرد میں حرکت علیٰ نفسہٖ پائی ہے ۔ پھر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ چاند میں یہ حرکت نہ ہو ۔ یہ حرکت چاند میں بھی تھی اور ضرور تھی ۔ زمین کی کشش نے بتدریج اس حرکت کو موقوف کر دیا۔ اِس بات کو بوجہ بصیرت سمجھنے کے لئے خیال کرو کہ چاند کی کشش زمین پر کیا اثر رکھتی ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں جس جس سمندر کے سمت الراس پر چاند آتا جاتا ہے وہاں کا پانی بانسوں بلند ہوجاتا ہے اور یہ سلسلہ دائمی ہے کہ ہر وقت چاند تو اپنی طرف زمین کو کھینچنا چاہتا ہے اور زمین اپنے رُخ پر چلنا چاہتی ہے ۔ اس کی کشش میں اور اس کے زور میں تعارض ہر وقت ہوتا رہتا ہے ۔ حکمائے وقت نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ ٹرام چل رہی ہے اور بار بار اس میں بریک لگایا جاتا ہے کہ سمندر کا جزر و مد بھی بریک کا لگنا اور کھُلنا ہے ۔ اس کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ زمین کی گردش دھیمی ہوتی جائے ۔ یعنی رات دن کا زمانہ چوبیس ساعت سے زیادہ ہوجائے ۔ گو سیکڑوں برس میں بھی زیادتی بقدر محسوس نہیں پائی گئی لیکن امتداد زمانہ کی تقسیم لاتقف عند حد کا حکم رکھتی ہے اور یہ مسئلہ حکمۃ قدیمہ کا حکمۃ جدیدہ میں بھی مسلمات سے ہے ۔

محققین فن جدید کیمیا کا یہ قول قابلِ ذکر ہے کہ جسم جن جواہر سے مرکب

ہے اُن میں کا ایک ایک ریزہ دُوسرے ریزہ کو نہ مسافت معیّنہ سے زیادہ قریب آنے دیتا ہے نہ دُور جانے دیتا ہے۔ اس فاصلہ کے امتداد کو ان ریزوں کی جسامت کے ساتھ وُہی نسبت ہے جو نسبت کرہ دو سیّاروں کی جسامت کو اُن کے درمیان کی مسافت کے ساتھ ہے۔ مثلاً جس طرح زمین کے تیس قُطر بھر چاند اور زمین کے درمیان کا فاصلہ ہے اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ ہر ریزہ کے پچیس تیس قطر بھر مثلاً دُوسرے ریزہ کی اس سے دُوری ہے۔ مبنیٰ وُہی قدما کا مسئلہ ہے کہ ہر بُعدِ ممتدّ کی تقسیم لاتقف عند حد کا حکم رکھتی ہے۔ غرضکہ چاند باوجود اس کے کہ زمین سے بہت چھوٹا ہے گردش زمین کی مزاحمت کر رہا ہے۔ اسی پر حکمائے وقت نے یہ قیاس کیا ہے کہ چاند کی گردش کو زمین نے اس قوّت سے روکا کہ بتدریج وُہ گردش موقوف ہی ہوگئی اور چاند کا دُوسرا رُخ ہمیشہ کے لئے ہم سے چھپ گیا۔ کسی زمانہ میں چاند میں بھی سمندر تھا اور زمین کی کشش سے اس میں ایسا شدید جزر و مد پیدا ہوتا تھا جو چاند کی گردش یومیہ کی سخت مزاحمت کرتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گردش موقوف ہوگئی۔ گو یہ محض قیاس ہی اور تمثیل کے سوا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ لیکن تمام حکمائے فرنگ اس قیاس کی تائید کرتے ہیں۔

یہاں چاند کے بیان میں ضمناً ان ریزوں کی جسامت اور ان کے درمیان کے فاصلہ کا ذکر بھی آگیا ہے جن سے اجسام کی ترکیب کے اکثر حکمائے عصر قائل ہیں۔ لیکن یہ امر حیرت انگیز ہے کہ بے دیکھے ہوئے اُن ریزوں کی مقدار کیونکر معلوم کرلی۔ اور اُن فاصلوں کی پیمائش پر کیونکر قدرت حاصل ہوئی۔ اس کی تقریر یہ ہے کہ وِلسن نے جو فنِ کیمیا کا محقق

ہے۔ ایک شیشہ میں سے ہوا خالی کر کے اس میں بھاپ بھر دی اور بھاپ کو تول بھی لیا۔ پھر اُس میں بجلی دوڑائی۔ بجلی دوڑاتے ہی بھاپ کہرہ بننے لگی اور شیشہ کے اوپر وار صاف کھُلی ہُوئی جگہ دکھائی دینے لگی اور جگہ رفتہ رفتہ زیادہ کھلنے لگی۔ لکیر کا سرکنا صاف معلوم ہوتا تھا۔ اس سے وِلسن نے یہ استدلال کیا کہ بھاپ کے جو ریزے کہرہ بنتے جاتے ہیں وُہ اسی سرعت سے نیچے اُتر رہے ہیں۔ جس سرعت سے لکیر سرکتی جاتی ہے اور فن طبعیات میں یہ مقرر ہو چکا ہے کہ جس کی جسامت معلوم ہو اس کی سرعت کا استخراج ہو سکتا ہے اور جس کی سرعت معلوم ہو جائے اس کی جسامت بھی اس ضابطہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔ غرض کہ اس طریقہ سے کہرہ کے ہر ریزہ کا حجم اور وزن اور شمار بھی سب کا معلوم ہو گیا۔ اور شیشہ کے اندر جتنی جگہ ہے وُہ تو معلوم ہی ہے جتنے اجزا ہیں اُن کا حجم بھی حساب سے معلوم ہو گیا اس سے فاصلہ کا حال بھی معلوم ہو گیا کہ دو ریزوں کے درمیان اس قدر دُوری ہو گی ٭

علی حیدر طبا طبائی

تمدّن اردو علم ادب کے رسالوں میں رسالہ تمدّن کے اجرا سے ایک اور دلچسپ اضافہ ہوا ہے۔ یہ رسالہ دہلی سے نکلا ہے اور اس کے ایڈیٹر مولوی عبدالراشد الخیری دہلوی ہیں۔ جنکی تحریر اور طرز تحریر سے ناظرین مخزن مدت سے آشنا ہیں۔ آج کل رسالہ عصمت کی ایڈیٹری بھی مولوی صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ جسے وُہ نہایت عمدگی سے نباہ رہے ہیں۔ اس طرح امید ہے کہ باغ ادب اردو کا یہ نیا پودا اُنکے ہاتھوں میں خاطر خواہ ترقی کریگا اور سرسبز ہوگا۔ مولوی صاحب نے تمدن کے پہلے نمبر میں اصلاح تمدن اپنا خاص مقصد قرار دیا ہے اور یہ بہت ضروری اور اہم مقصد ہے اگر وُہ اس رسالہ کے ذریعہ سے اسے پورا کر سکیں۔

روزنامچۂ نواب سربلند جنگ بہادر

ہم نواب سربلند جنگ بہادر حاجی مولوی محمد حمید اللہ خان صاحب چیف جسٹس حیدرآباد دکن کے ممنون ہیں کہ اُنہوں نے اپنی ڈائری کا جو وہ اپنے زمانۂ تعلیم انگلستان میں لکھتے رہے تھے۔ اُردو ترجمہ ہمیں عنایت کیا ہے اور اس کے شائع کرنے کی اجازت دی ہے۔ یہ روزنامچہ کئی اعتبار سے دلچسپ ہے اوّل تو اس سے معلوم ہوگا کہ آج سے پچیس برس پیشتر ہندوستانی طلبہ انگلستان میں کس طرح رہتے تھے اور اب کس امر میں تفاوت ہے اور کس چیز میں وہی حالات قائم ہیں۔ دوم اس سے سرسید احمد خاں مرحوم اور مولوی محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کے اس وقت کے حالات اور تعلقات کی کیفیت جابجا ظاہر ہوگی۔ جس سے ہر مسلمان کو گہری دلچسپی ہے۔ آج روزنامچہ کا ایک حصہ بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ دیگر حصص انشاءاللہ بعد میں وقتاً فوقتاً ہدیۂ ناظرین ہونگے:۔

یکم جنوری ۱۸۸۴ء اس سال بھی میں انگلستان میں موجود ہوں۔ اور میری صحت سال گذشتہ سے بہت بہتر ہے۔

کیمبرج میں تعطیلات ہیں۔ اس لئے میں برائٹن میں مقیم ہوں۔ علی الصباح میں پبلک لائبریری میں گیا۔ جو نپولین کے قریب واقع ہے اور وہاں جاکر ایک تاریخ کی کتاب میں غدر کا حال پڑھا۔ کیونکہ میں کالون صاحب کی نسبت کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا۔ جو اُس وقت آگرہ کے گورنر تھے۔ آج سخت برف باری ہوئی۔ شام کو پک صاحب کے خاندان کے لوگوں سے ملنے گیا۔ یہ ڈائری

خریدی اور چند خطوط لکھ کر سو گیا۔

۲ - جنوری | آج پھر لائبریری گیا۔ اور ڈی آر بلے کی یادداشت کا کچھ حصہ پڑھا اور اس سے بہت حظ اُٹھایا۔ جانسن کی گفتگو میں مجھ کو بہت مزا آیا۔ مَیں اس کتاب کو اور پڑھونگا۔ اور اگر ممکن ہوا تو ایولین کا بھی مطالعہ کرونگا کیونکہ جس کتاب میں جانسن اور برک کو مزا آیا۔ وہ ضرور اول درجہ کی ہوگی۔ کل سے مَیں کام کرونگا اور تعلیم پر ایک مضمون لکھونگا۔ کیونکہ مَیں نے اخبار ہندوستان میں اس مضمون کے دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ امید ہے کہ میں اس مضمون کو دلچسپ کر دوں۔ کاش ہربرٹ سپنسر کی کتاب یا اس مضمون کا کوئی حصہ جسکو میں نے پیشتر شروع کیا تھا میرے پاس ہوتا! آج کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ اس لئے مَیں کئی دفعہ ہواخوری کو نکلا۔ میں نے ڈبلیو اِی۔ منی سے دریافت کیا ہے کہ وہ اور مسز ایم کل مکان پر ملینگے یا نہیں۔ اور مجھ کو ملاقات کی اجازت دینگے۔

۳ - جنوری | آج ہندوستان کی ڈاک ملی۔ مکان پر سب بخیریت ہیں۔ نیشنل انڈین ایسوسیشن کے جلسہ کا کارڈ جو ۱۵۔ ماہ حال کو ہونے والا ہے وصول ہوا امید ہے کہ مَیں شامل ہوسکونگا۔

آج تقریباً گیارہ بجے مسٹر ڈبلیو۔ اِی۔ منی میرے پاس آئے اور اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ مسز منی علیل ہیں۔ اس لئے آج شام کو میں اُن کے ہاں نہیں جاؤنگا۔ آج صُبح کو مَیں مضمون متذکرہ بالا لکھتا رہا۔ اور بعد ازاں لائبریری جاکر کل والی کتاب پڑھی۔ کل سے زیادہ وُہ آج دلچسپ ثابت ہُوئی۔ یہ ڈائری بڑی طویل ہے اور میں جس طرح ہوگا اس کو جلد ختم کرنے کی کوشش کرونگا۔ اب میں موسم کے حالات صرف

کبھی کبھی لکھا کرونگا۔

۴۔جنوری | والدا و سید صاحب کو خط لکھے۔ لائبریری جا کر ڈایری کا کچھ حصّہ پڑھا۔ خاندان بک سے ملاقات کی۔ وہاں معلوم ہوا کہ تھیوڈور بک (پرنسپل علیگڈھ کالج) کچھ علیل ہیں۔ اس لئے سید احمد خاں انکو اپنے مکان پر لے آئے ہیں اس خبر کے آخری حصّہ کو سُنکر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

۵۔جنوری | مضمون "تعلیم" کو صاف کیا اور اس کا نام "تعلیم پر خیالات پریشان" رکھا۔ میں نے صرف تمہید ختم کی ہے۔ اس مضمون کے پانچ باب ہونگے۔ اور ہر باب تمہید کے برابر یعنی چار فلسکیپ صفحوں کا ہوگا۔ آج ایسا خراب موسم تھا کہ تھوڑی دور تک چہل قدمی کر سکا۔ کانراڈ بک آج شام کو میرے پاس آئے

۷۔جنوری | آج صبح کو پھر لائبریری گیا۔ اور دوسری جلد ختم کرکے تیسری کا کچھ حصہ پڑھا۔ اس ڈاری کو پڑھنے سے میرا اصلی مقصد یہ ہے کہ جانسن اور تھریل کی بابت کل حالات دریافت کروں۔ پیازی جس کی شادی آخرکار مسٹر تھریل سے ہوئی۔ جانسن مس برنی وغیرہ اور دیگر دوستوں میں جھگڑا ڈالنے کی بانی مبانی تھی۔ اور آخرکار اس عورت سے تھریل نے شادی کی

۸۔جنوری | آج بڑا خراب دن ہے۔ میں پانچ بجے کی گاڑی سے لندن روانہ ہوا۔ اور برائٹن اور اس کے موسم کو پیچھے چھوڑا۔ ساڑھے چھ بجے وکٹوریہ اسٹیشن پر پہنچا۔ اور ۲۳ نمبر کے مکان واقع بڈفورڈ پلیس میں جہاں تیاگو راجہ نے میرے لئے کمرہ لے رکھا تھا مقیم ہوا۔ میں لندن کے اس حصّہ سے سخت متنفر ہوں۔ لیکن چونکہ ان کے کھانے میں شریک ہونا ضروری ہے۔ اس لئے میں بمجبوری تکالیف برداشت کرکے یہاں رہتا ہوں۔ میں تھکا ہوا تھا اس لئے باہر نہ نکلا۔ صرف ایک ہوٹل میں جو قریب ہی واقع

تھا- کھانا کھانے گیا-

۹- جنوری | سہ پہر کو نیں کلیسا میں گیا- اور وہاں چند دوستوں سے ملاقات کی- ٹینیسن کی چھٹی میز پر پڑی ہُوئی ملی جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وُہ شہر سے باہر جانیوالا ہے- کلب میں لنچ اور ایک نئے کھلے ہوئے رسٹورانٹ موسومہ گیٹیس واقع سٹرینڈ میں کھانا کھایا-

۱۲- جنوری | کیپٹن ایسٹ وک کے ہمراہ لنچ کھایا- اس کے مکان پر اس کے بہت سے دوست اور بھانجیاں بھتیجیاں تھیں وُہ مجھ سے بہت مہربانی سے پیش آیا- اور کہا کہ جب کبھی شہر میں آؤ تو میرے ہاں ضرور آنا- اسکا مکان بہت وسیع اور خوب سجا ہُوا ہے- وہ لبرل خیالات کا آدمی ہے اور البرٹ بل سے متفق نہیں ہے- لنکنز ان میں مَیں نے کھانا کھایا-

۱۳- جنوری | مَیں مڈل مورز سے ملنے گیا- اور بعد ازاں کینسز سے ملاقات کرنے کے لئے بذریعہ ریل ابلنگ پہنچا- اور انکے ساتھ کھانا کھانے کے لئے ٹھہرا رہا-

۱۴- جنوری | انر ٹمپل میں آج پولک کا قانون ٹارٹ پر لکچر تھا اُسے سُننے گیا- مجھے اُن کے لکچر بہت پسند ہیں- مکان پر واپس آکر کپڑے بدلے اور خاندان بیبک سے ملنے گیا- آج کی پارٹی میں کیمبرج کے بہت سے اشخاص تھے- اور ان میں دونوں مس مارلیسن بھی تھیں- یہ شام بہت لُطف سے کٹی- وُہ سب سر ہوئے کہ رات کو یہیں رہو- مگر مَیں نے عُذر کیا اور ۱۲ بجے کے قریب واپس آیا-

۱۵- جنوری | ناشتہ کے بعد مَیں اور مہا گوراجہ کلب گئے اور چار بجے تک وہیں رہے- بعد ازاں کنور ہربہام جی ساکن مروی سے ملنے گئے جو

کورٹ ہوٹل کی اتر میں مقیم ہیں۔ انکے ساتھ چار پی اور پھر سب ملکر لنگٹن گئے۔ سات بجے کھانا ختم ہوا۔ اور ہم سب اپنے اپنے گھروں پر واپس آئے۔ انڈین اسوسی ایشن کے جلسہ کا بلاوا تھا۔ مگر مجھے سخت زکام تھا۔ اِس لئے اپنے مکان ہی پر رہا۔ اور کتاب ریئل پروپرٹی مولفہ ولیم کو پڑھتا رہا۔

۱۶-جنوری | ۳-بجے اسٹیشن کنگز کروس پر پہنچا۔ مگر کیمبرج کی گاڑی اسی وقت روانہ ہو چکی تھی۔ اِس لئے راستہ میں کچھ خریدتا ہوا کلیسیا آیا۔ پانچ بجے پھر اسٹیشن گیا۔ اور ساڑھے چھ پر کیمبرج پہنچ گیا۔ اتفاقاً اوگلوی سے کالج کے دروازہ پر ملاقات ہوگئی۔ اور بوس کو اس کے کمرہ میں دیکھکر سخت متعجب ہوا۔ کیونکہ وہ گلاسکو کی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے لئے چلا گیا تھا۔ مَیں نے اپنا سامان کھولا اور سونے سے پہلے ریئل پروپرٹی کا ایک باب ختم کیا۔

۱۷-جنوری | تمام دِن اپنے کمرہ ہی میں رہا۔ اور کچھ دیر یونین میں صرف کیا۔ کتابوں کو قاعدہ سے جمایا۔ اور دُوسرے اسباب کو ترتیب سے رکھا۔ کچھ کھانے پینے کا سامان منگوایا۔ معلوم ہوا کہ میری آرام کرسی کا ایک پایہ ٹوٹ گیا ہے۔ تعجب ہے کہ اُسے کس نے اور کیونکر توڑا۔ محافظ سے دریافت کرنا فضول ہے۔ بل سٹر وڈ سے اسے درست کرنے کو کہا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم تعلیم کے لئے گئے۔ ابھی بہت کم لوگ واپس آئے ہیں۔

۱۸-جنوری | ہندوستان خط لکھے اور اخبار پڑھے۔ ان میں کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی۔ بنی اللہ نے مجھے مسٹر ولفرڈ بلنٹ کی ایک چٹھی دی۔ اس نے اسکو غلطی سے کھول لیا تھا۔ یہ چٹھی مسٹر بی نے میرے والد سے کلکتہ میں ملکر لکھی تھی۔ اِس میں لکھا تھا کہ مَیں ہندوستان آکر خوش ہوا۔ اور

میرا شکریہ ادا کیا تھا کہ میں نے اس کی ملاقات اپنے والد سے کرادی۔ ہفتہ آئندہ میں والد اس کی نسبت ضرور تحریر کرینگے۔ میں ریئل پر و پر ٹی بڑے غور و خوض سے پڑھ رہا ہوں لیکن ابھی تک اسکو بخوبی نہیں سمجھا۔ تاہم محنت کرنی چاہئے۔

۱۹ - جنوری | آج میں نے خاصہ کام کیا اور پھر ٹہلتا ہوا یونین پہنچا۔ جب میں چار بجے واپس آیا تو دیکھا کہ میرا محافظ آرام سے میری کرسی پر آتش دان کے سامنے دراز ہے۔ اور خراٹے لے رہا ہے۔ میں چپکے سے واپس چلا گیا۔ گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہی سب سے بہتر طریقہ ہے۔ اب مجھے اپنی کرسی کے ٹوٹنے کا سبب معلوم ہوا۔ ان نوکروں کا تم کیا کر سکتے ہو جو کسی طرح نہیں ونبتے اگر انہیں برا بھلا کہو تو شرارتوں سے تمہارا ناک میں دم کردیں۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ ان کی باتوں سے اغماض کرو۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے جاکر دیکھا تو تمام چیزیں باترتیب لگی ہوئی تھیں۔ میں پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ اور تعلیم کے بعد ملبرڈ کھیلا۔

۲۰ - جنوری | کام کیا اور تھوڑی دور چہل قدمی کی۔ واریکر سے ملنے گیا۔ لیکن وہ کیمبرج میں واپس نہ آئے تھے۔ اس لئے انکے مکان پر اپنا کارڈ چھوڑ آیا۔ تعلیم کے بعد تشیرن کے ہمراہ کافی پی۔

۲۱ - جنوری | تقریباً تمام دن پڑھتا رہا۔ والنٹیروں کی وردی تیار کرانے کو دی۔ امید ہے کہ یہ وردی بہت جلد تیار ہو جائیگی۔ ابھی تک میری کھانسی اچھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے کاڈ لیور آئیل (مچھلی کا تیل) پینا شروع کردیا ہے۔

اس وقت تک دن میں ایک دفعہ تعلیم ہوتی ہے۔ بہت سے

طلبا آج واپس آ گئے ہیں اور باقی عنقریب آ جائینگے۔

۲۲۔ جنوری | گولیاں اور مشک جو والد نے میرے لئے بھیجا آج وصُول ہوا چند روز کے بعد سے ہیں گولیاں حسب ہدایت کھانی شروع کرونگا۔ چونکہ میں اس ٹرم کے لئے مجلس کا سکرٹری مقرر ہوا ہُوں۔ اس لئے مَیں نے گوورکو چٹھی لکھی اور اُس نے دریافت کیا کہ آیا وُہ آئندہ اتوار کو مجلس کا جلسہ اپنے کمرہ میں کریںگے۔ جواب وصُول ہونے کے بعد ممبروں کے نام خط روانہ کرونگا۔ آج سنگھ سے ملکر مجھے بہت خوشی ہُوئی۔ وُہ چند روز کے لئے یہاں آ گئے ہیں۔ مَیں نے اُن سے کہا کہ کل میرے ساتھ ناشتہ کرنا۔

۲۳۔ جنوری | سنگھ کے ساتھ ناشتہ کیا۔ مجھ کو خیال تھا کہ پروفیسر سیلی لکچر دینگے۔ مگر لٹریری اسکول جاکر معلوم ہُوا کہ میرا خیال غلط تھا۔ وُہ شاید آئندہ بُدھ سے لکچر شروع کریں۔ داس کے پاس گیا اور اس سے ذکر کیا کہ مجلس کا جلسہ یکشنبہ آئندہ کو ساڑھے سات بجے شروع ہوگا۔

آج گھر سے خط آئے۔ میرے والد نے لکھا ہے کہ وہ مسٹر دلفر دبلنٹ اور لیڈی اَین سے ملے۔ اور یہ لوگ علیگڈھ میں اُنکے ہاں مقیم ہیں۔ عم بزرگوار سید احمد خانصاحب نے لکھا ہے کہ وُہ کالج کے لئے چندہ وصُول کرنے پنجاب جانیوالے ہیں۔ میرے خیال میں آجکل وُہ کہیں لکچر دے رہے ہونگے وُہ کیسے جوش سے لکچر دیتے ہیں۔ اس کہنے کا ان پر بالکل اثر نہیں ہوتا کہ آپ اپنی صحت کی خبر لیجئے۔ کالج کی خاطر وُہ تمام تکالیف کو بطیب خاطر برداشت کرتے ہیں۔ خدا اُن کی عمر میں برکت دے۔ اور خدا کرے کہ میں واپس جاکر انہیں قوی و توانا پاؤں۔ آمین۔

۲۴۔ جنوری | نو سے دس تک پروفیسر کینی کے لکچر دربارہ کنٹریکٹ میں اور

۱۲ سے ایک تک سجوک کے لکچر دربارہ پولیٹکل فیلوسفی میں شریک ہا- کینی کے لکچر میں لوگوں کا ہجوم تھا- مجھے اس کا لکچر بہت پسند آیا- سجوک کے ہاں بہت لوگ نہ تھے لیکن اس کا مضمون یعنی فلسفہ اخلاق کا خیال کیا جائے تو آدمیوں کی تعداد خاصی تھی- پہلے ٹرم کی نسبت اس مرتبہ عورتیں کم ہیں کھانے کے بعد ٹہلنے نکلا- انڈین اسوسیشن جنرل کے اڈیٹر کے پاس اپنا چندہ مبلغ دس شلنگ روانہ کیا- قانون کنٹریکٹ مولفہ اینسن خریدنا چاہتا تھا لیکن کہیں نہ ملا- اگرچہ کئی کتب فروشوں کے ہاں تلاش کیا-

۲۵- جنوری | کننگھم کے لکچر میں گیا- ایم- اے- اور کالج کو کین صاحب کی کتاب روانہ کی- ٹیپ کے ہمراہ کافی پی- اور مختلف مضامین پر باتیں کرتا رہا-

۲۶- جنوری | حسب معمول کینی اور سجوک کے لکچروں میں شامل ہوا- آج شام کو سات بجے ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے عہدہ داروں کا انتخاب تھا- سکرٹری کی رپورٹ بہت عمدہ تھی- نتیجہ یہ ہوا کہ تن جو گذشتہ ٹرم میں وائس پریذیڈنٹ تھا- پریذیڈنٹ مقرر نہ ہوا- بلکہ وائس سکرٹری کے عہدہ سے بڑھ کر صدر نشین ہو گیا- ن اپنے عہدہ پر رہتا مگر اس نے انکار کیا اور اس لئے سٹن وائس پریسیڈنٹ ہو گیا- ولیم اور محمد حمید اللہ کے نام عہدہ سکرٹری کے لئے پیش ہوئے- آخر الذکر کو اگرچہ معلوم تھا کہ نتیجہ کیا ہوگا- لیکن اس نے انکار نہ کیا- کیونکہ وہ جانتا تھا کہ عہدہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ ہے-

اس کے ۱۴ ووٹ اور ولیم کے ۲۰ ووٹ ہوئے- ٹینزلی مانڈ اور میں ممبر مقرر ہوئے- ساڑھے نو بجے میں مسس پروتھرو کے ہاں گیا- وہاں

براؤننگ اور چند لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ یہاں ان میں چند لیڈیاں بھی تھیں ان میں سے مس میتھو سے وہاں پہلے بھی مل چکا تھا۔ او۔بی نے کہا کہ ہر اتوار کو مجھ سے ملنے آیا کرو۔ کیونکہ اس روز میں کالج ہی میں رہتا ہوں اور سب سے ملتا ہوں۔ گیارہ بجے کے بعد میں واپس آیا۔ اوامی سے ملا اور اسی کے مکان پر شپلے اور کارل کے فرزند سے ملاقات ہوئی۔ بارہ بجے سو رہا۔

۲۷۔جنوری | امپیریک کالج کے طالبعلم نکلس کے ہمراہ چہل قدمی کی۔ شام کو لیڈی ولسن سے ملنے گیا۔ یہاں چند گریجوئیٹوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے دو سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ تعلیم کے بعد گوور کے کمرہ واقع ڈاوننگ میں اجلاس مجلس میں گیا۔ میں نے عبدالواحد اور رام داس کا تعارف کرایا۔

۲۸۔جنوری | کننگھم کے لکچر میں شامل ہوا۔ آج شام کو چند احباب کو کافی کی دعوت دی۔ مختلف مضامین پر باتیں ہوتی رہیں۔ ٹرینٹی کالج کے ایک طالب علم نے ذکر کیا کہ ہندوستان کے کسی شاہزادہ نے ٹرینٹی کالج کے داخلہ کا امتحان پاس کرلیا ہے۔ اور آئندہ اکتوبر میں یہاں آکر رہیگا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شاہزادہ راجہ دلیپ سنگھ کا فرزند ہے میرے خیال میں وہ اب ایٹن میں ہے۔

۲۹۔جنوری | کینی کے لکچر میں گیا اور پھر سجوک کی کلاس میں شریک ہوا شیرز کے ہمراہ چہل قدمی کی۔ آج شب کو یونین میں اسپیچ دینی چاہتا ہوں۔ اس لئے پیشتر سے نوٹ لکھنے بیٹھ گیا۔ لیکن لکھنے میں مزاحمت ہوئی ختم نہ کرسکا۔ اور اس لئے اس ٹرم میں بھی اپنی پہلی اسپیچ نہ دے سکا۔

۲۰۔ جنوری | اسلی کے لیکچر میں شریک ہوا۔ تعلیم کے بعد شیلے۔ انگلنڈ۔ بارکر۔ ولیم اور پاول سے ملاقات کی۔ کتب فروش نے کنٹریکٹ مولفہ این سن کا ایک نسخہ میرے پاس بھیجا ہے اور میں کل سے بڑے غور کے ساتھ اسے پڑھونگا۔

آج صبح میں نے انشینیٹ لا مولفہ مین کا کچھ حصہ پڑھا۔ بڑی عمدہ کتاب ہے۔ میں نے عرضی دربارہ ترقی ہال پر پوس کے دستخط لئے۔ اس معاملہ میں ہم بہت زور سے کوشش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس مرتبہ عرضی پر بہت دستخط ہو جائینگے۔ اگر تمام طلبا مقامی کے دستخط ہو گئے تو ضرور کامیابی ہوگی۔

۲۱۔ جنوری | سجوک کے لکچر میں شریک ہوا۔ چونکہ زمین نرم تھی اس لئے واپس کے ساتھ بلیرڈ کھیلا۔ چند احبا کو کافی کی دعوت دی۔ کنور سرجی نے آکر مجھ سے کہا کہ بک کی چھٹی آئی ہے اور انہوں نے تمہیں سلام لکھا ہے۔ لوگوں کے جانے کے بعد میں نے چاہا کہ کچھ کام کروں۔ لیکن نیند آگئی اور میں کرسی پر پڑا ہوا سو گیا۔ اور جاگا تو اس وقت جب بہت رات آگئی تھی ✦

تحفۃ النساء

امرتسر کی لیڈی ڈاکٹر ح۔ س حسن صاحبہ نے ایک کتاب دو اڑھائی سو صفحہ کی بہ نام تحفۃ النساء شائع کی ہے۔ جس میں زنانہ امراض انکے علامات اور معالجے۔ بچوں کی پیدائش اور نگہداشت کے متعلق طبی ہدایات اور حفظانِ صحت کے طریقے درج کئے ہیں۔ یہ کتاب ایک ضرورت کو پورا کرتی ہے اور امید ہے کہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی۔ اور مفید ثابت ہوگی۔

بھاشا میں جواہرات

بھاشا کی قدر و قیمت سے جس قدر مسلمان غافل ہیں۔ اُن سے بڑھ کر ہنود غافل ہیں۔ حالانکہ وُہ اس کو بھارت ماتا کی زبان بتاتے ہیں۔ اب ان کی ماتا بھاشا نہیں رہی۔ بلکہ وُہ اُردو ماتا کی گود میں آ گئے۔ سوتیلی ماتا بھی آخر ماتا ہی ہوتی ہے۔

بھاشا نہایت پیاری بولی ہے۔ کیونکہ اس کی ماتا سنسکرت ہے۔ جو قدیم مستقل زبان ہے اور نہ صرف بھاشا کی بلکہ کئی زبانوں کی ماخذ ہے اور دُنیا کی نہایت پُرانی زبانوں میں ہے۔ بھاشا میں بڑے بڑے نیچرل اور سوشیل شعرا گذرے ہیں مگر ان کا کلام گمنامی کے ویرانے میں مدفون ہو گیا تھا۔ اب اس زمانہ کے جوہریوں نے خاک بیزی کر کے انکی تالیف و تصنیف کے بے بہا جواہر نکالے اور آویزۂ گوشِ ناظرین بنائے۔ مہاراج تلسی داس مولفہ کتاب رامائن بھاشا کے ممتاز شعرا میں سے ہیں۔ انکا کلام ایسا ہی چُست اور مضبُوط و مربُوط ہے جیسا فارسی میں مولانا نظامی گنجوی علیہ الرحمۃ کا اور عربی میں متنبی کا۔ قلّ و دلّ اور بالکل ٹھوس اور گُھٹا ہوا کلام۔ ورز اور حشو نام کو نہیں۔ روی ایسی سچی کہ سبحان اللہ۔ افسوس ہے کہ ہمارے اُردو شعرا کو بھاشا کی شاعری کا مذاق نہیں۔ اکثر شاعران نوا، تو خیر سے خود شاعری کی ماہیت ہی نہیں سمجھتے۔ اُردو شاعری کی حالت عام طور پر ابتک طفلانہ ہے اب ذرا کایا پلٹ چلی ہے۔ اور سوشیل شعرا گہوارے میں ہوں ہاں کرنے لگے

ہیں مگر ہونہار لہذا جلد بڑھنے اور پھولنے پھلنے کی اُمید ہے۔

ہم ذیل میں تلسی داس جی کی کتاب رامائن میں سے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی (ٹیکا) شرح بھی۔ کیونکہ مسلمان تو رامائن سے اشعار کی فصاحت و بلاغت و نزاکت کیا سمجھینگے۔ ہزاروں پنڈت نہیں سمجھتے جن کی نسبت بیاس جی فرماتے ہیں کہ مورکھ (جاہل) برہمن سے بیل اچھا جو کھیتی وغیرہ کے کام میں آتا ہے۔

مہاراج رامچندر جی بن میں براجے ہیں۔ بہار آ رہی ہے گھٹا چھائی ہے برسات کا موسم ہے۔ تلسی داس جی اس سمے کا سین دکھاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

منگل روپ بھئے بن تب تیں کینہ نواس رماپت جب تیں

شرح۔ جب سے رامچندر جی نے باس لیا (قیام کیا) بن منگل روپ بنگیا۔ رونق آگئی پھول پھلواری پر جوبن آگیا۔

برکھا کال میگھ نبھ چھائی گرجت لاگت پرم سہائی

شرح برسات کے دن آگئے۔ بادل آسمان پر گرجتے ہوئے بہت ہی بھلے لگتے ہیں۔

(دوہا) لچھمن دیکھو مورگن ناچت بارد پیکھ
گرہی برت رت پرکھ جن بشن بھگت کہنہ دیکھ

شرح اے لچھمن (رامچندر جی کے بھائی) دیکھو تو بادلوں میں پانی کی لہر دیکھکر موروں کے جھنڈ ناچ رہے ہیں جیسے کوئی خدا پرست گرستی (بال بچوں والا) بھگتوں (عارفوں) کو دیکھکر خوش ہوتا ہے۔

گھن گھمنڈ نبھ گرجت گھورا پریا بن ڈرپت من مورا

شرح بادل اُمڈ اُمڈ کر آسمان میں گھور گرج رہے ہیں۔ میرا دل اپنی محبوبہ (جانکی جی) کے بغیر ڈرتا ہے۔ جانکی جی کو راون ہر لے گیا تھا۔ انہیں کی تلاش میں آپ جنگلوں اور بنوں میں پھرتے ہیں۔

دامنی دمک رہی گھن ماہیں کھل کی پریت جتھا تھر ناہیں

شرح بجلی بادلوں میں چمک چمک کر رہ جاتی ہے جیسے بیوقوف دشٹ کی محبت قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔

برکھیں جلد بھوم نیرائی تھا نوہیں بدھ ودیا پائی

شرح بادل زمین کے قریب آ آ کر اس طرح رہتے ہیں جیسے علم پڑھ کے علما نیو جاتے ہیں یعنی منکسر اور فروتن بن جاتے ہیں (جس طرح بادل پانی سے بھرپور رہتے ہیں۔ اسی طرح علما علم سے معمور رہتے ہیں۔ کتنی بلیغ اور عمدہ تنظیر ہے)

بُند اگھات سہیں گر کیسے کھل کے بچن سنت سہیں جیسے

شرح پہاڑ مینہ کی بوندوں کی چوٹ اس طرح سہہ رہے ہیں۔ جیسے اچھے لوگ جاہلوں کی سخت کلامی سہتے ہیں۔ یعنی جس طرح اچھے صابر شاکر لوگوں کو جاہلوں کی گالی گلوچ سے اذیت نہیں ہوتی پہاڑوں کو بھی بوندوں کی چوٹوں سے اذیت نہیں پہنچتی (کیا اخلاقی تشبیہ ہے)

چھدر ندی بھر چلی اُتر آئی جس تھوڑے دھن کھل بورائی

شرح چھوٹی چھوٹی ندیاں پانی سے بھر بھر کر آپ سے باہر ہو ہو کر چل رہی ہیں۔ جیسے کوئی اوچھا کمظرف آدمی تھوڑا سا روپیہ پاکر باولا ہو جاتا ہے یعنی اُچھلنے کودنے لگتا ہے۔ بلاغت یہ ہے کہ ندی کا پانی

اس کا اپنا نہیں ۔ برسات میں ادھر ادھر سے آگیا ہے ۔

بھوم پرت بھاتا بر پانی جم جیو ہی مایا لپٹانی

شرح۔ زمین پر مینہ کا صاف اور پاک پانی گر کر یوں گندلا اور ناپاک ہوتا ہے جیسے رُوح دُنیا کی آلائشوں میں لپٹ کر مکدر ہو جاتی ہے ۔ سبحان اللہ کوئی شعر اخلاقی نتیجے سے خالی نہیں ۔

سمٹ سمٹ جل بھریں تلاوا جم سد گن سجن پہنہ آوا

سرتا سر جل ندہ میں جائی ہوئے اچل جم زہری پائی

شرح۔ ندیوں نالیوں کا پانی سمندر میں جا کر یوں گم ہوتا ہے جیسے عارف لوگ خدا کو پا کر خدا ہی میں گم ہو جاتے ہیں ۔ آہو ہو ہو شوکت

اے خضر راہ دوست میں کھویا گیا نہیں اپنے کو ڈھونڈھتا ہوں پتا دے سراغ دے

سمٹ سمٹ جل بھریں تلاوا جم سد گن سجن پہنہ آوا

شرح۔ پانی سمٹ سمٹ کر تالابوں میں اس طرح آ رہا ہے جیسے نیک آدمیوں کے پاس اچھی خصلتیں خود چلی آتی ہیں ۔ واہ تلسی داس جی کے کلام میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ برسات کا نیچرل سماں بھی لاجواب ۔ پھر ہر شعر میں اخلاقی چھینٹا ۔ جدھر سے چکھو میٹھا ۔ کیسا مبالغہ ۔ اور ایک لفظ خلافِ واقعہ نہیں ۔ شاعری اسے کہتے ہیں ہمارے اردو شعراء غور کریں اور سبق لیں ۔

(مجدد السنۂ مشرقیہ) احمد حسن شوکت ۔

(میرٹھ)

تاریخِ اسلام کا ایک سین

ہمارا ناول[۱] اُس پُر آشوب زمانہ سے شروع ہوتا ہے جب سے اسلامی تاریخ کا نہایت گاڑھا سیاہ خون جمع ہونا شروع ہوا ہے۔

زمانہ کا وُہ دور جسے خیر القرون کا باوقعت لقب خیر الناس (جناب رسول اللہ ﷺ) کی زبانِ پاک سے عطا ہوا تھا، ختم ہو رہا ہے، اور وہ تاروں بھری رات بھی آخر ہونے کو آئی۔ جس کے ستاروں نے آفتاب رسالت سے چمک دمک پائی تھی، پچھلی رات کا تارا یعنی عبد اللہ ابن زبیر بھی اپنی آخری چمک دکھا کر خاموش ہوا چاہتا ہے، اسلام کا سچا حامی، جان نثار، اور شریعت اسلام کا صحیح متبع اسوقت بجز اس کی جماعت کے اور کوئی اس ارضِ مقدس میں نظر نہیں آتا، گر وُہ اُن مدعیان خلافت کے مقابلہ میں ایک قدہ بیقدر ہے، جن کی بیداد نے حرم نبی، اور جگر گوشہ رسول پر وُہ ناروا مظالم روا رکھے، جس کا امتحان دشتِ کربلا میں غربت نینوا یا ایک خستہ حالی سید اور اس کے پیاروں اور لاڈلوں کی قیمتی اور انمول جانوں پر ابھی ہو چکا ہے، جس واقعہ نے ظلم و ستم کی دھاک بٹھا دی ہے۔

بانیانِ ستم کو یہ فتنہ محشر بپا کر کے بھی اپنے کئے پر پچھتاوا نہ تھا، بلکہ روز وہ جور و جفا کا ایک نیا شگوفہ کھلانے کے درپے رہا کرتے تھے۔ کہ فلک ان کے درپے ہوا۔ یزید کو داعی اجل نے مسندِ امارت سے

---

[۱] دسمبر ۱۹۰۹ء میں اس ناول کا ایک حصہ مخزن میں طبع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اور ترجمہ کرنیکا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اب تیار شدہ مسودہ انشاء اللہ تھوڑے تھوڑے عرصہ بعد پہنچتا رہے گا۔ (مترجم)

تاریک گوشہ لحد میں پہنچایا جس کے بعد اُس کا بیٹا معاویہ اورنگ نشیں ہُوا، مگر اس کے حصہ میں یہ منصب چند ہی روز کے لئے آیا تھا، لہٰذا چند روز حکومت وسلطنت کا مزہ لیکر یزید کے پاس وُہ بھی جا پہنچا۔ اس کے بعد امارت کو ایک گرگِ کہن (مروان ابن الحکم) نے جو شام میں اس پر دانت ہی جمائے بیٹھا تھا، اور گھور گھور کے اِدھر دیکھ رہا تھا، جا دبوچا، اور اپنا ہاتھ بیعت طلبی کے لئے دراز کیا، اس پیر تر تزویر کو اپنی اس آرزو میں بزورِ شمشیر خیت وسفارشِ شانِ تقدس کامیابی ہُوئی۔ بیعت ہو جانے کے بعد اُسے یہ دُبدا ہُوا، کہ مبادا خالد ابن یزید مدعی خلافت بنکر مخالفت کے لئے نہ اُٹھ کھڑا ہو، بطور پیش بندی اس نے اُم خالد سے نکاح کر لیا، اور اس چال سے اس نے خود خالد اور اس کے تائیدی گروہ کو رام کیا، مگر اس اہتمام پر بھی اُسے ۹ ماہ سے زیادہ سلطنت راس نہ آئی۔ کیونکہ اس کا بیٹا عبدالملک ۶۵ھ میں بالاتفاق امیر مان لیا گیا، اور اس کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی۔

عبدالملک ابن مروان کا زمانہ حکومت خاصہ رہا، اور ایک حد تک حکومت بنی اُمیہ کی بنیادوں کا استحکام اسی کے عہد سے شروع ہُوا، یہ سب واقعات ۶۵ھ کے آخر تک کے ہیں اس کے بعد کوفہ والوں میں ایک نئی قسم کا جوش پیدا ہُوا، یعنی وُہ لوگ جنہوں نے جناب سید الشہدا سے عہد شکنی کی تھی، اُنہوں نے اپنی غداری سے نادم ہو کر ابن زیاد اور اس کے گروہ سے شہدار کربلا کے خُونِ ناحق کے قصاص کا مطالبہ کیا، رفتہ رفتہ اس خیال کا ایک گروہ جمع ہو گیا، جس نے مختار ابن عبید نامی ایک شخص کو اپنا سردار بنایا، اور توابین کے لقب سے اپنے کو نامزد کیا، یہ گروہِ مجاہدین علاوہ قصاص طلبی کے عبداللہ ابن زبیر کے لئے

تبلیغ بیعت بھی کرتا تھا، جن دونوں باتوں کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا تھا، کہ اُمویین سے اور اِن سے رَن پڑتا، آخرکار ان سے اور اُمویین سے معرکہ آرائی کی نوبت آئی۔ دونوں طرف سے خوب تلوار چلی، توابین جنہیں قصاص میں مارنا چاہتے تھے وُہ اس معرکہ میں قصاص لینے والی تلوار کے گھاٹ چڑھے۔

جب اس جنگ و جدل کا خاتمہ ہُوا، تو اصُول سے چونکہ میدان توابین کے ہاتھ رہا تھا، جس سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اُن کی تبلیغ بیعت کا رُخ بھی بدل گیا، یعنی اس مرحلۂ ثانی میں وُہ بجائے عبداللہ ابن زبیر کے محمد ابن حنیفہ کے لئے تبلیغ بیعت کرنے لگے۔

محمد ابن حنیفہ کے متعلق اِن کا عقیدہ تھا کہ اُن پر ناموس جناب باری کا نزول ہوتا ہے اور ایک تابوت بھی توابین نے تیار کیا تھا، جس کی نسبت وُہ اس شان کا اعتقاد رکھتے تھے جو یہود تابوت سکینہ کی نسبت رکھتے تھے۔ غرضکہ ان تدابیر سے عراق میں مختار کا اثر پورے طور سے مان لیا گیا تھا، جو اِن اختراعات میں اُس کا اصل مطمح نظر تھا، اور اب گویا خلافت اسلام کی تین حسب ذیل تقسیمیں ہوگئی تھیں، شام و مصر میں عبدالملک ابن مروان کا سکہ رواں تھا۔ حجاز میں عبداللہ ابن زبیر کو جمہور نے امیر تسلیم کیا تھا، اور عراق میں مختار کی حکومت تھی، مختار ابن عبید کے اس نقض بیعت سے عبداللہ ابن زبیر کو طیش آیا، اور اُنہوں نے اپنے بھائی مصعب کو تھوڑی فوج دیکر مختار کو اُن کے انحراف کی سزا دینے کے لئے عراق کی طرف روانہ کیا، جہاں معرکہ کا اختتام اس امر پر ہُوا کہ مختار مصعب کے ہاتھ سے قتل ہُوا، اور عراق پر بھی امیر حجاز کا تسلط ہوگیا، لیکن اس تازہ فتح کے بعد مصعب اور اس کے جانباز سپاہیوں کو چین سے بیٹھنا نصیب

کہ شامیوں کا ایک جرار لشکر مقابلہ کے لئے آتا ہوا نظر آیا، جسے عبدالملک ابن مروان نے امیر حجاز کی حاصل شدہ قوت کو بجبر واپس لینے کے لئے روانہ کیا تھا، جس سے مصعب کے لشکر نے شکست کھائی، مصعب مارا گیا، اور فوج شام نے عراق پر پورا قبضہ و تسلط کر لیا،

اس مہم کے خاطر خواہ سر ہو جانے کے بعد عبدالملک کو حجاز کا خیال پیدا ہوا، کہ وہاں جو کانٹا ہے، اور سلطنت کی آنکھ میں جو کھٹک اگر اب نہیں، تو کبھی نہ کبھی ضرور کھٹکیگا، دُور کیا جائے چنانچہ بمشورہ امرار دولت ایک فوج گراں صوبہ حجاز کے تاخت و تاراج کرنے کو روانہ کی گئی۔ اس لشکر نے پہلے مدینہ پر قبضہ کیا، پھر وہاں سے وہی لشکر حجاج ثقفی کی زیر کمان مکہ کو روانہ ہوا، جہاں پہنچتے ہی اُس نے شہر مکہ کو اپنے محاصرہ میں لیلیا، اور عبداللہ ابن زبیر کو اطاعت کا پیغام بھیجکر بلا بھیجا، مگر وہاں سے صریح انکاری جواب ملا، یہ جواب سُنکر محاصرین شہر کے اندر داخل ہوئے۔ جہاں عبداللہ ابن زبیر یکہ و تنہا اُن کے ہاتھ آئے۔ کیونکہ اُن کے اعیان و انصار پہلے ہی کچھ سامان خورد و نوش نہ ہونے اور کچھ جان کے خوف سے ان سے علیحدہ ہو گئے تھے*

خ۔ ن۔ عالی

سفارش

دُنیاوی رنگ میں ہی نہیں مذہبی اور رُوحانی رنگ میں بھی شفاعت یا سفارش کی ضرورت یا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ اگرچہ سیاسی قوانین میں صراحتًا شفاعت یا سفارش تسلیم نہیں کی گئی مگر پھر بھی قانونی رنگ میں اسکی ہستی پائی جاتی ہے۔ کبھی صراحتًا اور کبھی کنایتًا کبھی شاہی درگذر کی صورت میں اور کبھی سلطانی رحم کے رنگ میں۔

انصاف اور رحم دونوں کا مقابلہ یا مزاحمت کسی نہ کسی رنگ میں ہوتی رہتی ہے اگرچہ سیاسی قوانین میں انصاف کی بابت اس قدر تاکید مزید تاکید کیجاتی ہے کہ رحم کی ہستی بالکل ہی مدھم پڑجاتی ہے لیکن پھر بھی انصاف کی طبیعت میں رحم کی ضرورت کا احساس کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے۔ باوجود ایک سیاسی قانون کی شدت کے کوئی نہ کوئی صورت درگذر کی پائی ہی جاتی ہے۔ تعزیرات ہند میں مستثنیات کا ہونا اور ضابطۂ فوجداری کی دفعات میں ۵۶۲ دفعہ کا پایا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ اگرچہ انگریزی انصاف یا انگریزی سیاست میں رحم کو نزدیک ہی نہیں آنے دیا۔ مگر پھر بھی مستثنیات اور دفعہ ۵۶۲ کو رحم کی ہستی کا اخیر پر اعتراف کرنا ہی پڑا۔

اگرچہ یہ کہا جائے گا کہ ان میں جو کچھ شرطیں اور قیود جائز رکھی گئی ہیں۔ ان کے ہوتے انصاف کے فرائض میں کوئی کمی نہیں آتی مگر باایں ہمہ رحم کی ہستی جلوہ نما ضرور ہوتی ہے اور یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ

رحم کی ہستی بھی اپنے حقوق کا مطالبہ کرتی ہی رہتی ہے۔

اخلاقی اور سوشیل قوانین میں بھی رحم اور رحمدلی کی ضرورت کا اکثر صورتوں میں اعتراف کیا گیا ہے۔ اخلاقی قوانین اور سوسائٹی کے قواعد کے رُو سے درگذر اور عفو ایک خاص خصوصیت رکھتا ہے اور ان دونوں قوانین میں اس ضرورت کا پورے زور سے اعتراف کیا گیا ہے جسے مذہبی رنگ میں دس گنا مکافات کا مستحق ٹھہرایا گیا ہے اور بہت کچھ تعریف کی گئی ہے۔

اگرچہ مختلف قوانین اور شرائع میں اس قسم کے عملیات کا نام سفارش یا شفاعت نہ رکھا گیا ہو مگر نتیجہ یہ کہا جائیگا کہ دوسرے الفاظ میں اُنکا مفہوم سفارش یا شفاعت ہی ہے۔

شفاعت یا سفارش کیا ہے اور اس کی تعریف کیا ہے؟

"کسی ضرورت کسی حاجت کسی تکلیف کسی مزاحمت کسی مالا یطاق حالت کے پیش آنے پر کسی ایسے شخص سے امداد چاہنا جو اس کے متعلق کچھ کر یا کرا سکتا ہو اور جس کے حدود اختیارات میں براہ راست یا بعض وسائل وہ کام یا وہ صورت ہو۔ یا ایک تبلیغ۔ اس بحث میں یہ سوالات خصوصیت سے قابل بحث ہیں۔

الف۔ سفارش یا سفارشوں کی ضرورت پڑتی ہے۔

ب۔ یہ عمل انسانی فطرت یا قوانینِ قدرت کے مطابق ہے۔

ج۔ اس کے بغیر گذارہ نہیں۔

د۔ سفارش کرنا یا سفارش کیا جانا کہاں تک درست ہے۔

ہ۔ کیا اغراضِ انصاف کے یہ عمل منافی ہے؟

میں وسیلہ بھی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں وسائل کی از حد ضرورت ہے۔
مطلب اس کا دوسرے رنگ میں یہی ہے کہ بعض امور کے پیش آنے پر
شفاعت سفارش یا وسیلہ کی ضرورت لازمی ہوتی ہے یا اس سے گریز نہیں۔
ایک حکیم کا قول ہے کہ

"دنیا میں کوئی شے بذاتہ بُری نہیں ۔ مگر استعمال قبیح سے بُری ہو جاتی ہے۔
اگرچہ عام طور پر اس سے اتفاق نہ کیا جائے لیکن بعض حالات میں یہ ماننا
ہی پڑتا ہے کہ

" یہ استدلال کسی حد تک درست اور صحیح ہے۔

سفارش ایک ایسی صورت ہے جسکی بعض اوقات سخت ضرورت پڑتی ہے اور
بناچاری اس کی ضرورت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن اس کے بُرے استعمال
اور محدود مفہوم نے اس کی نوعیت اور اس کی صحت میں بہت کچھ فرق
کر دیا ہے

" سفارش کرنا درست۔

" اور سفارش کیا جانا بھی صحیح۔

لیکن نہ ہر حالت میں اور نہ ہر وقت اس کے واسطے صحیح اصول اور صحیح
استعمال کی ضرورت ہے۔ اس میں ضرورت ہے کہ امور ذیل پر غور کیا جائے۔

الف۔ اصل واقعہ زیر سفارش۔

ب۔ سفارش کرانے والے کی حالت اور ضرورت کا وزن۔

ج۔ جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے اس کے اختیارات حدود اختیارات
اور اس کی پوزیشن اور ذمہ داری کا وزن کرنا۔

د۔ جسکے مخالف سفارش کی جاتی ہے اس کے حقوق اور مطالبات کا دیکھنا

اور وزن کرنا۔

۵۔ اپنی حقیقت اور وقعت کا موازنہ۔

یہ پانچ باتیں ہیں جو سفارش کرنے کے وقت ذہن نشین ہونی چاہیئیں اگر ان شرائط اور ان مقدمات کے خلاف کوئی سفارش کی جاتی ہے تو وہ ایک ایسی حرکت ہے کہ جس پر سفارش کرنے والے کو ضرورتاً افسوس کرنا زیبا ہے۔ اور یہی عمل ہے کہ جس سے سفارش کا دائرہ بہت کچھ تنگ ہوجاتا ہے اور سفارش کی وقعت اور تمیز میں اکثر دفعہ بہت کچھ شک و شبہ کیا جاتا ہے۔ میری رائے میں اگر بہ پابندی ہائے بالا کوئی سفارش کی جاتے تو وہ اغراض انصاف کے منافی نہیں ہیں۔ کیونکہ جس قدر صورتیں اغراض انصاف کے منافی ہوسکتی ہیں اُن کا بہت کچھ حصہ صور اور شرائط بالا میں پہلے ہی سے ملحوظ رکھ لیا جاتا ہے۔

رحمدلی کی اکثر اوقات ضرورت ہے اور اس کا صحیح طریقہ اس کے سوائے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ انصاف کا دائرہ ایسا تنگ نہ خیال کیا جاسے کہ اس میں رحمدلی سما ہی نہیں سکتی۔ انصاف اور رحمدلی میں ایسی مغائرت نہیں ہے کہ جیسے عموماً لوگوں کے ذہن نشین ہے۔ انصاف کا مفہوم یہ ہے کہ حق حقدار کو ملے اور رحم کا مفہوم یہ ہے کہ حقوق میں فرق نہ لاکر ایک شخص کے ساتھ ایک خاص رعایت کیجائے۔ ان دونوں کیفیتوں میں کوئی مغائرت نہیں ہے۔

ایک نو عمر نوجوان شخص کو زیر دفعہ ۵۶۲ ضابطہ فوجداری باوجود چوری کرنے کے بھی ضمانت پر چھوڑ دینا درصل انصاف کشی نہیں ہے۔ بلکہ انصاف کرنے کے بعد اُسے دائرہ رحم میں لاکر مہلت مزید دینا ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو گالی نکالتا ہے اور وہ شخص باوجود اس کے معاف کرتا ہے

دراصل یہ انصاف کشی نہیں ہے بلکہ ایک قسم کی سزا ہے۔ جب زید بکر کو اس کے مجرم یا ملزم ثابت ہونے پر معافی دیتا ہے تو دراصل وہ اخلاقی رنگ میں بکر کو ندامت دلاتا ہے جو ایک سخت سزا ہے۔ یہ کہنا کہ ایک شخص ایسے باپ کا لڑکا ہے جس نے اپنی زندگی میں مخلوق کی بہت کچھ خدمات کی ہیں اُس کے حق میں کچھ رعایات کی ضرورت ہے انصاف کشی نہیں ہے بلکہ انصاف پسندی ہے۔

تمدن یا تمدنی امور سے سفارش یا سفارشوں کا بہت کچھ تعلق ہے میری رائے میں سفارش تمدن کا ایک ایسا جزو ہے جس سے کبھی نہ کبھی واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ تمدن کا مفہوم ایک دُوسرے سے مِل جُل کر رہنا ہے مِل جل کر رہنے کی حالت میں سفارش اور درگذر معافی کی ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے۔ ہر ذی رُوح متمدنی رنگ میں صدہا معاملات میں روز ایک دُوسرے سے سفارش کرتا اور کراتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ سوائے اس کے گذارا ہی نہیں۔

امور سیاسی کے اعتبار سے گو ججوں اور منصفوں کو بعض حالات میں اس کی ضرورت نہ ہو لیکن شاہوں کو تو ایسی ضرورتیں پڑتی ہیں جب شاہی مراحم پر بعض لوگ اپنے تئیں چھوڑ دیتے ہیں تو اس کا مفہوم دوسرے الفاظ میں سفارش ہے۔ قانونِ سیاسی جس کی بعض صورتوں میں مخالفت کرتا ہے جب کبھی کوئی جج ایک خورد سال ملزم کو کسی قسم کی سہولت دیتا ہے تو وہ بھی ایک قسم کی سفارش ہی ہوتی ہے۔ ان دونوں نقصوں کے رفع کرنے کی صورت ہو سکتی ہے کہ سفارش کرتے وقت ان امور پر کامل غور کر لیا جائے۔ جنکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

سفارش یا سفارشوں کا اثر قبول کرنے کی حالتوں میں ہمیشہ امور ذیل کا لحاظ ہونا چاہیے۔

(۱) حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ سفارش کا موقعہ ہی نہ آئے۔

(۲) اگر سفارش کرانی ہو تو اس شخص کے پاس جو سفارش کرتا ہی تمام امور صحیحہ کا بیان کیا جائے۔ بالکل فریب آمیز الفاظ میں بات چیت نہ کی جائے۔

(۳) دُوسرے فریق کے حقوق واقعی کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ جس پر اس سفارش کی زد پڑے گی۔

(۴) سفارش کرنے والے کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ جس شخص کے پاس وُہ سفارش کرنا چاہتا ہے اس کے ساتھ اس کے تعلقات کس قسم کے ہیں۔

(۵) اور اس شخص کی اپنی ذمہ واری امر سفارش کے متعلق کیسی ہے اور کیا کچھ وسعت رکھتی ہے۔

(۶) کیا سفارش کا منظور کرنا خود سفارش قبول کرنے والے کے واسطے باعتبار حالات مضر تو نہیں ہے؟

(۷) سفارش کرنے والے کے حدود و اختیارات کہاں تک ہیں۔

(۸) سفارش کرانے والے کو یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہی کہ سفارش کرنے یا کرانے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ دوسرا شخص ضرور سفارش کے ماننے پر مجبور ہی کیا جائیگا۔ کیونکہ یہ اس شخص کا اپنا اختیار ہو۔

(۹) سفارش کرنے والا صرف سفارش کر دینے کا ذمہ وار ہے نہ کہ حسب سفارش کرا دینے کا بھی۔ یہ بھی ایک مشکل ہے کہ لوگ سفارش کرانے کے ساتھ ہی یہ بھی سوچ لیتے ہیں کہ جو شخص سفارش کرتا ہے

اس کا یہ بھی کام یا یہ بھی فرض ہے کہ وہ سفارش کے لائق کام بھی کرا دے
یہ ایک ایسا خیال ہے جو کسی صورت میں بھی موزوں نہیں کہا جا سکتا۔
اکثر صورتوں میں سفارش صرف ایک تبلیغ ہے نہ کہ جبر اور اکراہ۔

جس کے پاس سفارش کی جاتی ہے اُس کے بھی کچھ فرائض ہیں۔

الف۔ یہ کہ سفارش اور سفارش لانے والے اور فریق چہارم یا اصل واقعہ کی نوعیت پر غور کرے۔

ب۔ اپنی پوزیشن اور اپنے اعتبار پر بحث کرے۔

ج۔ انصاف اور رحمدلی میں موازنہ کرے۔

بعض وقت لوگ سفارش کراتے ہیں اور جب اس کے مطابق نتیجہ نہیں نکلتا تو جس کی معرفت سفارش کرائی تھی اس کے کوسنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ خواہ مخواہ کی بدبختی سے اس کی بدگوئی میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں بجائے خود یہ سوچنا چاہئے کہ کیا سفارش کرنے والے کا یہ حق ہے کہ ایک تیسرے شخص کو ساتھ ہی مجبور بھی کرے۔ اگر زید بکر کے پاس خالد کی بابت کوئی سفارش کرے تو زید کا یہ فرض نہیں ہے کہ بکر کو اس کے ماننے کے واسطے مجبور بھی کرے۔ البتہ زید کا یہ فرض ہے کہ اگر وہ سفارش منظور کرنے کی جرأت رکھتا ہے تو خالد کو وعدہ دے ورنہ صاف کہہ دے۔
اگر خالد کے ساتھ وعدہ ہو لیا ہے تو پھر اس کا ایفا بھی لازمی ہے۔
اب ماننا نہ ماننا بکر کے اختیار میں ہے اور بکر کو نہ ماننے کی صورت میں سوائے اس کے کہ اس نے کسی ذاتی خصومت اور کاوش دلی کی وجہ سے انکار کیا ہو۔ کوسنا اور برا کہنا آداب اخلاق

سے بعید ہے۔

بکر کا بھی یہ فرض ہے کہ

* زید سے صاف صاف کہدے۔ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو بہتر ورنہ انکار۔ عدالتی معاملات کی صورت میں ہمیشہ سفارشوں کا دائرہ تنگ ہونا چاہیئے اور جن کے پاس سفارشیں ہوں ان کا فرض اعلیٰ رہے کہ حقوق کے متعلق انصاف سے کام لیں۔ کیونکہ وہی اس کے ذمہ وار ہیں۔

سفارشوں کے اقسام حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

الف۔ اخلاقی سفارشیں۔

ب۔ سوشل سفارشیں۔

ج۔ وہ سفارشیں جن میں کسی دوسرے کے حقوق پر زد نہیں پڑتی۔

د۔ وہ سفارشیں جن میں دوسروں کے حقوق پر زد پڑتی ہے۔

ھ۔ مالی سفارشیں۔

و۔ قولی سفارشیں۔

ز۔ معادی سفارشیں۔

ح۔ معاشرتی سفارشیں۔

سفارش کرنے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بصورت نہ پورا ہونے کسی سفارش کے اس کے ساتھ جس کے پاس سفارش کی تھی کسی خصومت کی بنیاد نہ ڈالیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے کیا وہ اپنی زندگی میں سب قسم کی سفارشیں ان ہی لیا کرتے ہیں۔ کوئی شخص دنیا میں ہر دل عزیز نہیں رہ سکتا۔ ہاں اور نہ دونوں ایسی طاقتیں ہیں، جنپر انسانی تمدن کا بہت کچھ مدار ہے۔ ان دونوں سے وقت پر کام لینا چاہیئے نظر

ہاں سے ہی کام چلتا ہے اور نہ نہ سے۔

اگرچہ بعض وقت بعض سفارشیں تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں لیکن بعض اوقات اُن سے حق رسی بھی ہوتی ہے۔ اور ہمدردی کا بھی گونہ ثواب ملتا ہے۔ اگر اخلاقی رنگ میں سفارشوں کی بنیاد رکھی جائے تو میری رائے میں اُن کا کرنا نہ کرنا۔ اعراض یا انکار کرنا چنداں مضر نہیں ہے۔

اور اس میں تمدنی ضروریات کا اپنے رنگ میں مہیا اور ایفا ہوتا ہے۔ سفارش اور التجا میں فرق ہے۔ دونوں کی آمیزش بعض اوقات ایک بُرا اثر پیدا کرتی ہے۔ اور اس میں درجہ اور حد شناسی کی ضرورت ہے۔

(ایاز حد خود بشناس)

سُلطان احمد (بہاولپور)

ساجن موہنی یا تسخیر شوہر } ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس کے کچھ اوپر اسی صفحے ہیں جن میں فرہنگ بھی شامل ہے۔ مولوی سید احمد صاحب دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ کی اہلیہ صاحبہ نے مولوی صاحب موصوف کی صلاح و اصلاح سے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس میں میاں بیوی کے باہمی طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ عبارت سلیس اور بامحاورہ ہے اور مزید احتیاط کے طور پر اس خیال سے کہ یہ کتاب مبتدیوں کے ہاتھوں میں جائے گی۔ اخیر میں ایک فرہنگ کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت مفید ہے۔ قیمت ۸ر ہے۔ اور دفتر فرہنگ آصفیہ۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی سے مل سکتی ہے۔

مشاہیرِ عرب

یوں تو شاید ہی کوئی فن ایسا ہوگا جس کو اہل عرب نے درجہ کمال کو نہ پہنچا دیا ہو۔ مگر اس مضمون میں مختصر طور پر مَیں چند نامور عربوں کے نام لکھتا ہوں جنہوں نے زمانہ گذشتہ میں بعض علوم و فنون میں کمال حاصل کیا ہے۔

علمِ کیمیا | ابو موسیٰ جعفر کوفی موجودہ علم کیمیا کا ماہر تھا اس کے بعد اوروں نے بھی اس علم کو حاصل کیا جن کی جدّت۔ محنت اور رسائی ذہن نے حال کے کیمیا دانوں کو حیرت میں ڈالدیا ہے۔ علمِ طب اور علمِ جرّاحی اُس زمانہ میں بعید ترقی کر چکے تھے۔

علمِ ادویہ | اہل عرب نے علم ادویہ ایجاد کیا اور شفاخانے بنائے۔ ہر شہر میں دوا خانے جاری کئے جن کو دارالشفا کہتے تھے اور جن کا خرچ سلطنت کے ذمہ ہوتا تھا۔ علم نباتات کی تعلیم کے واسطے باقاعدہ باغات بغداد اور دُوسرے مقامات میں بنائے گئے تھے جہاں اس علم کے بڑے بڑے ماہر لوگ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتے تھے اور اس عُلم کے متعلق بحثیں کرتے تھے۔

علمِ جُغرافیہ و سیاحت | نویں صدی کے شروع میں جغرافیہ اور سیاحت کے متعلق کتابیں لکھی گئیں مسلم ابن حمیر جعفر ابن احمد المروزی۔ ابن فضلان مسعودی ابن ہوکل۔ البیرونی یاقوت۔ البکری۔ المقدسی۔ اور ادریسی عرب میں بڑے جغرافیہ دان گذرے ہیں۔

البیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا۔ ہندوؤں میں رہا۔ اُن کی زبان سیکھی۔ اُن کا فلسفہ اور ادب حاصل کیا۔ اُن کے عادات۔ اطوار۔ قانون مذہب

وغیرہ سیکھے۔ اُن کے عجیب عجیب عقاید دریافت کیے اور ملک کی جغرافیائی اور طبعی حالت معلوم کی اور ان تمام تحقیقات کو ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا۔ جس میں جا بجا ہومر۔ افلاطون اور دوسرے یونانی مصنفوں اور فلاسفروں کے حوالے دیے ہیں۔ ہندوستان کے حالات کے علاوہ اس نے علم نجوم۔ علم ریاضی۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ طب اور کیمیا پر بھی کتابیں لکھی ہیں۔ بیرونی کے کچھ عرصہ بعد ایک مشہور عالم اور سیاح ناصر خسرو پیدا ہوا۔ وہ عرصہ تک مرو میں رہا۔ یہاں سے ۴۳۶ھ میں سیاحت کو روانہ ہوا۔ نیشاپور۔ تبریز حلب وغیرہ میں سفر کرتا ہوا دمشق میں آیا۔ بیروت اور بیت المقدس گیا پھر مصر میں آیا۔ مصر سے مقامات مقدسہ کی سیر کی۔ پھر مصر میں گیا اور وہاں سے بلخ کو واپس چلا گیا۔ اس کے سفرنامہ سے زیادہ دلچسپ کتاب سیاحت کے متعلق آجتک شاید ہی لکھی گئی ہو۔

علم تاریخ

اس زمانہ میں علم قدامت اور سوانح عمری بھی علم تاریخ میں داخل سمجھی جاتی تھی۔ اس دلچسپ شاخ کے حاصل کرنے کے واسطے بھی بڑے بڑے دماغ خرچ کیے گئے۔ بلاذری جس کا انتقال ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء میں ہوا ہے بغداد میں پیدا ہوا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ اور کتابیں لکھتا رہا اور اس کی تاریخ فتوح البلدان بڑے پایہ کی کتاب ہے۔

ہمدانی نے (جو تیسری ہجری کے اخیر اور چوتھی صدی کے شروع میں تصنیف کی دُنیا میں آیا تھا) جنوبی عرب کی ایک صحیح اور معتبر تاریخ لکھی ہے۔ جس میں اس حصہ ملک کی مختلف اقوام کے حالات اور ان کی بربادی و تباہی کے قصے درج ہیں اور یمن کے حالات اور یمن کا جغرافیہ بھی شامل ہے۔ مسعودی طبری۔ اور ابن الاثیر کی تصانیف دیکھنے سے اُن کی اعلیٰ دماغی قابلیتوں کا

پتہ چلتا ہے۔ یہ لوگ متاخرین (ابوالفدا - ابن خلدون وغیرہ) کی طرح جہاں آتے بڑے مورخ تھے۔ وہاں بڑے جامع العلوم۔ فلاسفر۔ ماہر ریاضی اور جغرافیہ دان بھی تھے۔ مسعودی بغداد کا باشندہ تھا مگر نسلاً شمالی عرب تھا۔ اس نے جوانی میں سیاحت کی اور اسلامی دُنیا کا بڑا حصّہ دیکھ ڈالا - اوّل ہندوستان میں آیا۔ ملتان اور منصورہ گیا۔ پھر ایران اور کرمان کا سفر کیا۔ پھر دوبارہ ہندوستان آیا۔ کمبوجہ اور دکن میں بہت دنوں تک رہا۔ لنکا گیا۔ وہاں سے کہا لوگیا شاید چین کا بھی سفر کیا۔ وسطی ایشیا کی سیاحت کی اور بحر کاسپین تک پہنچا اپنی سیاحت کے اخیر میں وُہ کچھ عرصہ تک تبریز میں رہا۔ پھر بصرہ میں رہا۔ وہاں اُس نے اپنی پہلی تصنیف مروج الذہب شائع کی۔ پھر قاہرہ چلا گیا۔ یہاں کتاب التنبیہ اور پھر مرأۃ الزمان چھپوائی۔ یہ کتاب کئی جلدوں میں لکھی گئی تھی۔ جس کی اب صرف چند جلدیں پائی جاتی ہیں۔ مروج الذہب میں اُس نے اپنی زندگی کے بڑے بڑے تجربے لکھے ہیں اور اس پیرایہ میں بیان کئے ہیں کہ ناظرین کو علمی فائدہ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی بے انتہا حاصل ہوتی ہے۔

طبری (ابو جعفر محمد ابن جریر) بھی بڑا قابل مورخ تھا۔ بغداد میں ۹۲۲ء میں وفات پائی۔ اُس نے اپنی تصنیف ۳۰۲ھ / ۹۱۴ء میں پبلک میں پیش کی۔

ابن الاثیر ملقب بہ عزالدین عراق میں جزیرہ بنی عمر کا باشندہ تھا مگر موصل کے نواح میں اکثر رہتا تھا۔ ایک گاؤں میں اس کا خوبصورت مکان تھا جہاں بڑے بڑے علما کا مجمع رہتا تھا۔ اس کی جامع تاریخ الکامل کا زیادہ حصّہ اس گاؤں میں لکھا گیا تھا۔ یہ تاریخ ۱۲۳۱ء میں ختم ہوئی اور یورپ کی بڑی بڑی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اس نے موصل کے اتابکوں کی تاریخ بھی لکھی ہے۔

علم ہیئت ماشاء اللہ اور احمد بن محمد النہاوندی خلیفہ منصور کے زمانہ میں پُرانے ستارہ شناس تھے۔ خلیفہ ماموں کے عہد حکومت میں سند ابن علی یحییٰ ابن ابی منصور اور خالد بن عبدالملک بڑے مشہور ماہر علم ہیئت گذرے ہیں۔ ان لوگوں نے رات دن کی برابری۔ چاند سورج کے گرہن اور مدار ستاروں کے متعلق بڑی تحقیق کی اور آسمانی عجائبات کے معلوم کرنے میں ایسا غور و فکر کیا ہے کہ دُنیا حیرت میں ہے۔

محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے خلیفہ ماموں کے حکم سے سدھنت کا ترجمہ کیا۔ جس پر اُس نے بہت اچھے اچھے نوٹ اور نئے نئے معلومات درج کئے ہیں۔

ابو معشر نے عجائبات فلکیہ کو خاص طور سے ملاحظہ کیا اور انکو معلوم کیا۔ اسکا نقشہ علم نجوم کی تحصیل کے واسطے بڑی مدد کا ذریعہ ہے۔

موسیٰ ابن شاکر خلیفہ رشید کے زمانہ میں بڑا انجنیئر گذرا ہے مگر اس کے بیٹوں نے جو خلیفہ ماموں مستعصم اور واثق کے عہد میں تھے۔ علم ہیئت پر توجہ کی اور آفتاب اور دیگر ستاروں کی گردش کے متعلق حیرت انگیز معلومات اور تحقیقات بہم پہنچائیں۔ زمین کی جسامت معلوم کی۔ منطقۃ البروج کا دائرہ کی صورت میں ہونا تحقیق کیا اور دن رات کی برابری کے متعلق بھی بہتری معلومات حاصل کیں۔ ابوالحسن نے دوربین ایجاد کی جسکی صورت ایک نلکی کی سی تھی۔ النیظری اور محمد بن عیسیٰ ابو عبداللہ نے بھی موسیٰ بن شاکر کے بیٹوں کی پیروی کی اور وہی علم حاصل کیا۔ البطانی بھی ایک مشہور عالم علم ہیئت تھا۔ اس کی نقشوں اور فہرستوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ابوالوفاء خراسان میں ۹۳۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ عراق میں رہا اور

وہیں فن ریاضی اور علم ہیئت میں مہارت حاصل کی۔ ابن یونس بھی بڑا ہیئت داں اور ماہر فن ریاضی تھا۔ ۱۰۰۹ء میں فوت ہوا۔ اس کے معلومات و تحقیقات کو ابن الندمی (جس نے قاہرہ میں ۱۰۴۲ء میں انتقال کیا) اور حسن ابن ہیثم نے بھی جاری رکھا۔ وہ معالج چشم بھی بہت بڑا تھا۔ اسپین میں پیدا ہوا تھا لیکن مصر میں اکثر رہا۔ وہ اپنے علاج چشم کی تصانیف کے سبب سے یورپ میں بہت مشہور رہے۔ اس کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

ابن شاعر اور عمر خیام بھی فنِ ریاضی و ہیئت میں کامل تھے۔

فلسفہ اہل عرب نے علمِ الٰہیات اور فلسفہ کو بھی ویسے ہی شوق اور جوش کے ساتھ حاصل کیا جیسے علم ہیئت حاصل کیا تھا۔ فارابی اور بوعلی سینا عرب میں بڑے مشہور فلسفی گزرے ہیں۔ ابونصر فارابی اہل عرب میں ارسطوئے ثانی مانا جاتا ہے۔ یہ ابن سینا کا اُستاد تھا۔ یہ بات مان لی گئی ہے کہ ابن سینا دُنیا کے بڑے بڑے عالی خیال فلاسفروں میں سر تھا۔

شاعری عرب کے بیشمار شاعروں میں سے انتخاب کرنا بہت مشکل کام ہے ہم صرف چند نام شاعرانہ قابلیت کے لحاظ سے درج کرتے ہیں۔

ابونواس جو خلیفہ امین کے زمانہ میں تھا۔ امرأ القیس کے ہم پلہ شمار کیا جاتا ہے جو اسلام سے پہلے کا شاعر ہے۔

متنبی اور ابو تمام حبیب ابونواس کے بعد کے شاعر ہیں۔ ابن خلکان ابو تمام کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ شاعر اپنے تمام ہمعصر شعرا سے صفائی بیان اور شاعرانہ اعلیٰ لیاقت میں سبقت لے گیا ہے"۔ البحتری نویں صدی میں تھا۔ اس نے بھی ابو تمام کی طرح حماسہ لکھی ہے۔ لیکن متنبی کی شہرت نے اکثر متقدمین شعرا کی شہرت پر پردہ ڈال دیا ہے۔ الناہی بھی مشہور شاعر تھا اس نے حلب سنہ ۱۰۰۰ء میں انتقال کیا۔

حامد حسن قادری

الجزائر کی عربی

الجزائر اور تونس دو اسلامی ممالک براعظم افریقہ کے شمالی ساحل پر فرانس کے زیر حکومت ہیں۔ جس طرح ہندوستان میں بمصداق اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ انگریزی طریق بود و باش رائج ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح وہاں بھی نئی روشنی پھیلتی جاتی ہے۔ اور لوگ یوروپین طرز معاشرت اور خورونوش کے دلدادہ ہوتے جاتے ہیں خصوصًا وہ جنہوں نے یوروپ میں تعلیم پائی ہے۔ الجزائر کی زبان وہی ہے جو مراکش میں بولی جاتی ہے اور جسکا نمونہ مخزن میں اس سے قبل ہدیہ ناظرین ہو چکا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مراکش ابتک بفضلہ اسلامی سلطنت ہے وہاں یوروپ کی تہذیب کا اثر زبان پر بہت کم ہوا ہے۔ الجزائر میں نئی ضرورتیں پیش آنے کی وجہ سے کچھ تو نئے الفاظ زبان میں داخل ہو گئے ہیں اور کچھ پرانے عربی الفاظ نئے معنوں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ الجزائر کے باشندوں کی گفتگو (مع اس کے اردو ترجمہ کے) درج ذیل کیجاتی ہے۔ امید ہے کہ عربی دان ناظرین کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

خالد۔ مساء الخیر[۵۱] یا سیدی واش انت۔	**خالد**۔ تسلیم۔ مزاج شریف۔
ولید۔ بخیر۔ یسلّمک[۵۲]۔ اھلاً وسھلاً۔ شد کرسی	**ولید**۔ سب خیریت ہے۔ آپکی دعا سے آئیے آئیے۔ یہ کرسی لیجئے۔

[۵۱] یہ شام کا سلام ہے۔ جس طرح صباح الخیر صبح کا سلام ہے۔ [۵۲] لفظی معنی خدا آپکو سلامت رکھے۔ کوئی خوشخبری سنتے ہیں تو بھی کہتے ہیں اللہ یسلمک۔ کوئی تحفہ پیش کرتا ہے تو کہتے ہیں اللہ یکثر خیرک۔

اتحن وداسك۔ واش حال اهلك ؟

خالد۔ اهلی بخیر۔ من غیر بابا۔ علیہ الحمّہ۔

ولید۔ لاباس۔ یبرا غدوہ انشاء اللہ۔ تشرب الدّخان۔

خالد۔ قلیل ما نشرب[1]۔ الدخان یضرنی فی صدری۔ انا نتکیف مرتین فی النهار۔ بعد الماکلہ۔

ولید۔ تعمل ملیح۔ ما لکمی شی الدخان یا ولد! ابرم لی قارو او عمّرلی سبسی وجب عافیہ[2] وقل للخدیم یفرش الطابلہ وحطی العشاء۔

یہاں تشریف رکھیئے۔ گھر میں سب اچھے ہیں ؟

خالد۔ سب اچھی طرح ہیں۔ سوائے والد کے کہ انکو بخار آگیا ہے۔

ولید۔ کچھ اندیشہ کی بات نہیں۔ کل تک اچھے ہو جائینگے۔ انشاء اللہ۔ آپ چُرٹ پیتے ہیں ؟

خالد۔ بہت کم۔ میرے سینہ کیلئے تمبا کو مُضر ہے۔ دن بھر میں دو دفعہ پیتا ہوں۔ بعد کھانے کے۔

ولید۔ یہ آپ اچھا کرتے ہیں۔ دُھواں نگلنا بھی نہیں چاہیئے۔ لڑکے ! مجھے ایک سگرٹ بنا کر دے یا میرا پائپ بھرلا اور آگ لے آ اور خدمتگار سے کہہ کہ کھانے کی میز لگائے اور کھانا لائے۔

[1] عربی قدیم (اور مصر و شام میں اب بھی) اس موقع پر اشرب متکلم کا استعمال کیا جائیگا۔ دیار مغرب یعنی مراکش الجزائر تونس و طرابلس غرب وغیرہ میں جو قواعد میں ترمیم ہوگئی ہے وہ نقشہ ذیل سے ظاہر ہوگی

مضارع قدیم

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
غائب	یشرب	تشرب	یشربون	یشربن
حاضر	تشرب	تشربین	تشربون	تشربن
متکلم	اشرب	اشرب	نشرب	نشرب

مضارع دیار مغرب

	واحد مذکر	واحد مونث	جمع مذکر	جمع مونث
غائب	یشرب	تشرب	یشربو	یشربو
حاضر	تشرب	تشربی	تشربو	تشربو
متکلم	نشرب	نشرب	نشربو	نشربو

[2] آگ کو اصطلاح میں عافیہ کہتے ہیں۔ کیونکہ نار سے آتش دوزخ مراد ہے

خالد- الحال مندّی-
ولید- صبّت الشّتاء
والرعد تکلم فی اللیل- ماخلّانی ننجُ
نرقد والتبروری صبّت البارح
خالد- صبّت خشین بالزّاف
وکسّرولی الزجاج
کامل-
ولید- صبّ الثلج بالزاف فی بلیدۃ
الجبال داہم[۱] مغطّین بالثلج
خالد- حین تشرق الشمسُ
یذوب الثلج والجلید- لکن
الشتوۃ الملاجیۃ تکون باردۃ-
ولید- نحب خیر البرد متاع
زمان الشتاء وانّی خائف
من السخانہ متاع الصیف-

خالد- آجکل موسم مرطوب ہے-
ولید- آج رات کو بارش ہوئی ہے
اور گرج ایسی تھی کہ مجھے نیند نہیں آئی
کل اولے پڑے تھے-
خالد- اولے بہت بڑے بڑے
تھے میرے یہاں تو (کواڑوں کے)
آئنے ٹوٹ گئے-
ولید- بلیدہ میں برف اتنی پڑی ہے
کہ پہاڑ سب ڈھک گئے ہیں
خالد- جہاں سورج نکلا برف[۲]
سب گل جائے گی- لیکن اگلی
دفعہ جاڑا ضرور سخت پڑے گا-
ولید- میں تو جاڑے کے موسم میں
سردی پسند کرتا ہوں- گرمی سے البتہ
مجھ کو بہت ڈر لگتا ہے-

[۱] عربی قدیم میں فعل 'ہونا' مستعمل نہیں ہے- اگر میں خوش ہوں کہنا ہو تو کہیں گے 'انا فرحان' ہوں کے واسطے کوئی لفظ نہیں- دیار مغرب میں یہ کمی اس طرح پوری کی گئی ہے-

دانی - میں ہوں-	دانا - ہم ہیں-
دالک - تو ہے-	داکم - تم ہو-
داہ - وہ ہے-	داہم - وہ ہیں-

داہا یا داہی - وہ (عورت) ہے-

[۲] ثلج وہ برف ہے جو آسمان سے برستی ہے- جلید وہ جو زمین پر پانی کے منجمد ہونے سے بنتی ہے- اردو میں دونوں کو برف کہتے ہیں-

خالد- الربیع والخریف یعجبونی بالزاف -

ولید- یا ولد - العشاء واجد جب الخبز السخون والکیسان والخذمی والتباسی والفوط استعجل-

ولید- قبل ما نتعشوا تحب شیئ تشرب حاجه اشرب التای والا قهوه

خالد- نحب نشرب القهوه -

ولید- یا ولد! ذوج فناجل القهوه

ولد- ذالوقت نجیبهم لکم حلوین والا مرین -

ولید- واحد حلوه والاخوی بلا سکر

خالد- علاش ضربوا المدفع

ولید- سفینه بربانیه سلمت -

خالد- اش اجات تعمل -

ولید- یمکن جابت باش تجد الما والفحم -

خالد- الشقف متاع مصر یسافر الیوم یبقی نکتب واحد البریه -

خالد- موسم بہار و خزاں مجھے دونوں بہت پسند ہیں -

ولید- لڑکے! کھانا تیار ہوا؟ تازی روٹی اور گلاس اور چھریاں اور رکابیاں اور تولیہ جلدی لگاؤ -

ولید- کھانے سے پہلے آپ کچھ پئیں گے - چائے یا کافی؟

خالد- میں کافی پسند کرتا ہوں -

ولید- لڑکے دو پیالی کافی لاؤ -

لڑکا - ابھی لاتا ہوں - شکر ڈالکر لاؤں یا بلا شکر -

ولید- ایک میٹھی دوسری بلا شکر -

خالد- یہ توپ کیسی چلی؟

ولید- کسی بیرونی جہاز نے سلامی کی توپ سر کی ہوگی -

خالد- وہ یہاں کیا کرنے آئیگا -

ولید- ممکن ہے پانی اور کوئلہ لینے آیا ہو -

خالد- (خوب یاد آیا) آج مصر کا جہاز جانیوالا ہے اور مجھے ایک خط لکھنا ضروری ہے -

ولید۔ غاول۔ داھی قریب السبعۃ

خالد۔ اعطنی حبر و کاغظ۔

ولید۔ ماعلیہ ...... ماتبطاشی

فی الساعۃ اعمل العلوان

علی الغلاف۔

خالد۔ یا ولد۔ تعرف شیٔ

فاین البوسطۃ الکبیرۃ؟

اشرواحد الطابع والصقہ

علی الجریۃ وارمھا فی البوسطہ

واذاکان البوسطہ غلقت

تدّی الجریہ بیدک للشقف

ولد۔ فھمت۔

ولید۔ ھیّا ننعشّوا۔

خالد۔ ماعلیہ۔

ولید۔ اش عندنا ناکلوا فی العشاؑ۔

خدیم۔ عندنا الشرّبہ۔ والحوت

واللحّم المشوی۔ والخُضرۃ۔

خالد۔ کان شی صاید فی ھذالمحۃ

ولید۔ ماشی بالزاف۔ لکن فی

جھت الجبال یکون الارانب و الحجلان

والسمانات والحتیان فی العیون

ولید۔ جلدی کیجئے۔ سات بجنے والے ہیں

خالد۔ مجھے دوات اور کاغذ درکار ہے۔

ولید۔ بہت خوب...... اب دیر نہ

کیجئے۔ لفافہ پر پتہ فوراً

لکھ دیجئے۔

خالد۔ لڑکے! تو جانتا ہے بڑا

ڈاکخانہ کہاں ہے؟ ایک ٹکٹ

خرید کر لفافہ پر چپکا دینا اور

ڈاک میں ڈال دینا اور اگر ڈاکخانہ

بند ہو گیا ہو تو لفافہ کو خود

جہاز پر لیجانا۔

لڑکا۔ میں سمجھ گیا۔

ولید۔ آئے اب کھانا کھائیں۔

خالد۔ بہتر ہے۔

ولید۔ کھانا کیا کیا ہے۔

خدمتگار۔ شوربہ ہے اور مچھلی اور بھنا

ہوا گوشت اور ترکاری۔

خالد۔ کیا اس طرف کچھ شکار ملتا ہے۔

ولید۔ بہت تو نہیں مگر پہاڑ کی طرف

کچھ ملتا ہے۔ خرگوش اور تیتر اور بٹیریں

اور چشموں میں مچھلیاں۔

خالد۔ صیادۃ الشبکۃ خیر
من صیادۃ القصبۃ والصیادۃ
قبل ما تشرق الشمس۔

ولید۔ لما الریح قوی۔ الزواوش
یبقو مختبئین یا ولد جیب
قازوز[لہ]۔

خالد۔ ھذہ الدجاجۃ بنینۃ بالزاف

ولید۔ ذوق کل شوی۔ خذ السلاطہ

ولید۔ یا ولد۔ جیب الحلاوات و
الفاکھۃ والقھوۃ۔

ولید۔ راک ناکل شوی۔

خالد۔ کلیت اکثر منک۔

خالد۔ قداش ملّی ما تعشیت عشا
مجال ھذا۔

ولید۔ راک تتمسخر علیّ۔

خالد۔ مچھلی کا شکار بنسی سے بہتر
جال سے ہوتا ہے اور شکار دن
نکلنے سے پہلے شروع کرنا چاہئے۔

ولید۔ جب ہوا تیز ہوتی ہے تو جانور
سب چھپ جاتے ہیں۔ لڑکے!
لیمنیڈ لاؤ۔

خالد۔ یہ مرغی خوب پکی ہے۔

ولید۔ کچھ تو اور کھایئے۔ سلاد لیجئے۔

ولید۔ لڑکے! مٹھائی اور میوہ
اور قہوہ لاؤ۔

ولید۔ آپ تو کچھ کھاتے ہی نہیں۔

خالد۔ میں نے آپ سے زیادہ کھایا ہے۔

خالد۔ بہت عرصہ کے بعد ایسا عمدہ
کھانا کھانے میں آیا ہے۔

ولید۔ یہ آپ میری ہنسی اڑاتے ہیں۔

المترجم محمد احمد

~~~~~~~~~~

لہ اس کا ماخذ فرنچ لفظ (Gazeuse) ہے۔ یعنی گیس دار پانی
~~~~~~~~~~

ادبِ اُردو اور اُس کا فلسفہ

بیس برس سے مشہور ہے کہ ادب اردو کو ترقی ہو رہی ہے مگر یہ محض عقیدہ تھا کیونکہ ترقی ہونے اور ترقی دینے میں فرق ہے۔ ترقی ہونے کا مفہوم آزادانہ وسعت اور ترقی دینے کے یہ معنے ہیں کہ باقاعدہ ترقی کی کوشش کی جائے پہلی صورت البتہ صادق آ رہی تھی۔ کیونکہ ملک میں تجارتی اغراض سے ہزاروں پرچوں اور لاکھوں کتابوں کے شائع ہونے سے (جن میں زیادہ تعداد ناولوں تاریخوں سوانح عمریوں۔ غرض جھوٹے یا سچے قصوں اور بے نتیجہ اشعار کی ہے) سوائے ایک بیقاعدہ وسعت کے اور کوئی ادبی ترقی نہیں۔ اگر کسی باغ کے خوشنما درخت یُوں ہی چھوڑ دیئے جائیں۔ تو وہ باغ باغ نہ رہے گا بلکہ جنگل ہو جائیگا اور اس کی یہ ترقی معکوس ہو گی۔ مہندی کی کانٹ چھانٹ اور سبزہ کی کتر بیونت ہم کو یہ بتاتی ہے کہ باقاعدہ ترقی میں اصلاح جزوِ اعظم ہے اور بے قاعدہ وسعت اور باقاعدہ ترقی کے خلاف ہے ۲۵۔ لاکھ اشعار دس ہزار ناول۔ دو سو تاریخیں اور سو داستانیں چند سال کے اندر ملک میں شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ شعرا مؤرخ مترجم ایڈیٹر داستان نویس اپنے اپنے دفتروں کو لئے ہُوئے بازارِ اُردو میں آ گئے اور ادب اردو کی ترقی کا بازار گرم معلوم ہُوا۔ حالانکہ آم گھانس کی منڈی اور اس کے ہاٹ کو گرم بازاری نہیں کہتے (باستثنائے چند شعرا نے مذاقِ نظم کو بگاڑا۔ کیونکہ تخییل قدیم والوں نے خیالات خراب کئے اور نئی روشنی والوں نے فنِ شاعری میں داغ لگایا۔ نہ اُن کو شاعری کا فلسفہ معلوم تھا انکو اصولِ نظم

کا علم - مورخوں - مترجموں نے زمانہ کے موافق دلچسپی پیدا کرکے اپنے تجارتی اغراض پورے کیئے - اور اکثر ناول نویسوں نے تو ناول کے نام تک کو خاک میں ملا دیا - اسوقت ہزار اور مختل ناولوں میں ایک بھی اپنے حدوں سے درست ہوتا تو ترقی اردو کا ایک رکن ہوتا - نہ عبارت میں اثر ہے نہ معنی خیز الفاظ ہیں - نہ الفاظ کا صرف برمحل ہے - سو ناولوں میں سو جملے بھی ایسے نہ ہونگے جن کے الفاظ کو کوئی ادیب بدل نہ سکے - غرض یہ کہ محض کثرت کتب سے کوئی کتبخانہ باوقعت نہیں ہوسکتا - تو اردو کے کتبخانہ میں معمولی کتابوں کی تعداد بڑھائی گئی اور اس سے ادب کو کوئی نفع نہ پہنچا - ہمیشہ ہر امر میں کامیابی اس وقت ہوتی ہے جب ارادہ فعل پر مقدم ہو - اور فعل میں تدبیری مادہ ارادے کے مناسب ہو - اب تمام ہندوستان کے مشہور مصنفوں کے خیالات دریافت کیجئے تو بہت کم مصنف ایسے نکلینگے جنہوں نے ترقی ادب کی نیت سے کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کی ہو - صرف یہ خیال کیا کہ اس وقت ہندوستان میں کونسا مذاق پسند کیا جاتا ہے - تاریخ یا ناول کا یا سوانحعمری کا اسی کے موافق ترجمہ کیا یا تصنیف کی - محض اس غرض سے کہ عام پسند ہو کر جلد فروخت ہو جائے اور عبارت بھی اسی طرز کو جو عام پسند ہو تو اکثر مشہور مصنفین عام مذاق کے تابع رہے اور نیت یہ کہ مالی نفع اپنی ذات کو پہنچے اگرچہ میں اس خیال کو مذموم نہیں کہتا ہوں مگر یہ ضرور کہوں گا کہ نہ ایسے مصنفین ادیب ہیں نہ ترقی ادب اُن کا مقصود اصلی ہے - اب رہا فعل تدبیری یعنی عملی کوشش اور غیر مشہور مصنفین - البتہ ان میں سے بعض حضرات نے ادب کو ترقی دینے کی عملی فکریں کیں مگر اُن کا فعل ایسے اہم ارادے سے لگا نہ کھا سکا جیسا یہ ارادہ اہم ہے ویسا ہی عمل بھی بڑے پیمانہ پر ہونا چاہیئے - چند رسالوں

اور بعض غیر مشہور مصنفوں کی ادبی اوبی سانسوں سے اتنے بڑے قالب بیجان نہیں پڑ سکتی۔ ترقی ادب کے لئے ان بیچاروں کے ارادے تو بہت بڑھے چڑھے ہیں مگر انکی کوشش قلیل المقدار ہیں۔ ہر ایک ادبی ترقی کے لئے ہر مصنف کو اپنی تصنیف میں دو کام کرنا چاہئے۔ ایک بلحاظ معانی و مضامین دوسرا باعتبار عبارت۔ مضامین وُہ ہونے چاہئیں جو اس وقت اردو میں نہیں ہیں یا کم ہیں۔ کیونکہ کوئی زبان ترقی یاب نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ وُہ علمی زبان نہ بن جائے۔ اور علم سے میری مراد واقعات کا علم نہیں۔ کیونکہ واقعات کا علم جسے تاریخ کہتے ہیں اہل علم کی اصطلاح میں فن کہلاتا ہے اور کہانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا خواہ وہ سچی ہی کیوں نہ ہو۔ علوم وہ ہیں جو حواس باطنی سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ معقولات کہلاتے ہیں۔ غرضکہ مضامین تو فلسفیانہ ہونے چاہئیں اور عام مذاق کی اتباع نہ ہو۔ بلکہ اس کے بدلنے کی کوشش کیجائے اور عبارت تصنیف ایسی ہو کہ ساری کتاب کا کوئی لفظ تو کیا کوئی حرف بھی نہ گھٹ سکے نہ بڑھ سکے نہ بدل سکے۔ مثال میں ایک نثر کی کتاب پیش کرتا ہوں ایک نظم کی کیونکہ ادب کے بھی دو حصّے ہیں۔ نثر میں تعزیرات ہند اور نظم میں دیوان غالب ادب اُردو کے لئے سبق آموز ہے۔ غرض یہ کہ ویسے مضامین اور ویسی عبارت جن تصنیفات میں ہو اُن کی کثرت سے ادب کو ترقی ہو سکتی ہے ورنہ ہرگز نہیں۔

غالبًا انہی ضرورتوں کے لحاظ سے اُردو کانفرنس و سائنٹیفک سوسائٹی قائم ہوئی ہے جن میں لائق۔ معزّز اور روشن خیال ممبر ہیں۔ اگر اس کانفرنس نے اُنہیں کے موافق اصوُل سے کام کیا تو تھوڑے عرصہ میں اردو ادب کی تعمیر تیار ہو سکتی ہے۔ اب رہی رنگ آمیزی اور آرائش و زیبائش یہ قیامت تک ہوتی رہیگی اور ہوتی رہے۔ اگرچہ اُن اصُول کا بتانا حکمت بلقمان آموختن ہے مگر مضمون کو

مکمل کردینے کے لئے قلمبند کرتا ہوں۔

ہر ایک ادب تین چیزوں سے مرکب ہوکر مکمل ہوتا ہے ۱ الفاظ۔ ۲ قواعد۔ ۳ علوم ادبیہ

۱ الفاظ کی پانچ قسمیں ہیں۔ لغات۔ محاورات۔ روزمرہ۔ امثال۔ اصطلاحات

۲ قواعد میں دو شاخیں ہیں صرف و نحو۔

۳ علوم ادبیہ میں کئی علوم ہیں۔ معانی و بیان و صنائع بدائع وغیرہ۔

ان سب کی خانہ پُری کی جائے جو نہیں ہیں وہ لائے جائیں اور جو کم ہیں وہ پورے کئے جائیں اور ان کی تدوین کا طریقہ یہ ہے کہ ایک رسالہ شائع کیا جائے جسکے تین جزو ہوں۔ ایک حصہ میں الفاظ اور اُنکے معانی اور مخارج اور محلِ استعمال وغیرہ مع نظائر۔ دوسرے جزو میں قواعد صرف و نحو۔ تیسرے حصّہ میں علوم ادبیہ اور ایک ضمیمہ کبھی کبھی ایسا بھی لگا دیا جائے جس میں توسیع الفاظ اور وضع اصطلاحات علمیہ کا حصہ ہو۔ مگر ساتھ اس کے یہ بھی ضرورت ہے کہ اوّل ہر نمبر کا پروف ہندوستان بھر کے مسلم الثبوت ادیبوں کے پاس بھیجکر بعد رفع اختلاف دستخط لے لئے جائیں۔ اسکے بعد ملک میں پیش کیا جائے۔ اوّل تو سب اسکی پیروی کرینگے اور اگر کسی نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی تو وہ ٹکسال باہر ہے۔

علاوہ اس رسالہ کے اس کانفرنس کے انتظام سے یہ امر بھی متعلق بلکہ ضروری ہے کہ وہ علوم اور مضامین اردو میں لکھے جائیں جنکی علمی بلاغت کی وجہ سے بظاہر ہماری موجودہ زبان متحمل نہیں ہے اور بڑے بڑے مصنفین کو یہ خیال پیدا کر رہا ہے کہ اردو ذخیرہ ابھی مشکل۔ بلیغ اور نازک علوم کا ظرف نہیں رکھتا حالانکہ غور اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ جس قدر کم ہمتی کیجاتی ہے اور عام مذاق کی پابندی کے منافع نے مغلوب کرکے علمی زبان کو بند کر دیا ہے۔ اُس قدر کمزور تو یہ زبان ہرگز نہیں ہے بلکہ بعض خاص مضامین کے دیکھنے اور لکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ادیب

ہونا چاہئے۔ ہر ایک مشکل سے مشکل مسئلہ کو اُردو میں لکھ سکتا ہے اب رہی اصطلاحات تو اس کا علاج یہ ہے کہ جب تک اُردو میں اصطلاحات وضع ہوں اُس وقت تک جو مضامین ایسے لکھے جائیں اُن کے شروع ہونے سے پہلے ایک فرہنگ ان اصطلاحات کی جو اس مضمون میں آگئے ہیں قلمبند کر دیجائے۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کا داستانی مذاق علمی مذاق سے بدلجائے گا۔ لہٰذا بکثرت ایسی کتابیں جو مختلف علوم و فنون کی ہوں اور جن کا لٹریچر عمدہ ہو جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں شائع کیجائیں کیونکہ زبانِ اردو اس وقت ایک طالب علم کی حیثیت سے ہے اگر اُسے علامہ بنانا ہے تو اُردو کانفرنس کے فاضل اور خوشحال ممبر اس کی تعلیم کسی ایک علم یا مذاق پر موقوف و محدود نہ رکھینگے۔ بلکہ اگر اس کے ممبر مغربی مذاق رکھتے ہیں تو مشرقی مذاق کو نہ بھولیں اور اگر مشرقی مذاق کی طرف اپنا طبعی میلان ہے تو مغربی مذاق کو بھی نہ چھوڑیں۔ میرے خیال میں یوروپ کی بڑی زبانیں عربی و سنسکرت کی شاگردی سے پہلے علامہ نہ تھیں تو اُردو کو عربی و انگریزی دونوں میں خُذ ماصفا ودع ماکدر پر عمل کرنا چاہئے اور ایسے لوگوں سے کام لینا چاہئے جو حسب ذیل صفات رکھتے ہوں۔

(۱) اہل زبان ہوں (نہ کہ محض زباندان) (۲) اہل نظم (۳) ایسی نثر لکھنے والے جنکی عبارت جامع مانع ناقابل اصلاح اور با اثر ہو (۴) اپنے مافی الضمیر کو کما حقہ کسی خاص دلکش طرز میں ظاہر بلکہ آئینہ کر سکتے ہوں (۵) تمام علوم مشرقی و مغربی سے واقف ہوں (۶) ان سب باتوں کو جانتے ہوں جنکی الفاظ سے اُردو مرکب ہے (۷) ایسا ذہین اور قوی الفکر کہ مروجہ زبان میں سے قواعد پیدا کر کے مدوّن کر سکے (۸) اصولِ لغت سے واقف ہو (۹) محاورات و امثال کا محل استعمال جانتا ہو (۱۰) فصاحت کا حسن صحیح رکھتا ہو۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص ان سب صفات سے موصوف نہیں ملسکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے مگر چند آدمی مل سکتے ہیں۔ میری غرض اس کے شمار سے یہ ہے کہ اُردو کانفرنس کے تمام عملی کارکنوں سے اگر ان صفات میں سے ایک صفت بھی چھوٹ گئی تو اُتنا ہی حصہ ترقی ادب کا باقی رہ جائے گا +

ابوالعلا سعید احمد ناطق لکھنوی
سکرٹری مجلس الحکماء

تہذیب الاخلاق

سرسید مرحوم کے زمانے میں جو خدمت علمی اور اصلاحی رسالہ تہذیب الاخلاق نے کی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ انکے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی بارہا کوشش ہوئی مگر ناکام رہی۔ حال میں اخبار وکیل امرتسر نے زیر ایڈیٹری مولوی عبداللہ عمادی صاحب ایک رسالہ اس نام کا شائع کرنا شروع کیا ہے۔ جس کے مقاصد وہی ہیں جو تہذیب الاخلاق کے تھے۔ اس میں مذہب کے متعلق بعض محققانہ مضامین شائع ہو رہے ہیں اور اس کے فاضل ایڈیٹر اچھی معلومات اور وسیع نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ مفید ثابت ہوگا اور علم دوست مسلمانوں میں مقبول ہو جائیگا۔ اسکا رنگ الندوہ سے بھی ملتا جلتا ہے اور وہی تقطیع ہے۔ قیمت سالانہ عام خریداروں کے لئے تین روپیہ اور خریداران وکیل سے دو روپیہ ۸ آنہ رکھی گئی ہے۔

شکوہ

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی یہ نظم بھی مثل اُس قطعہ کے جو مخزن بابت مئی میں طبع ہوا ہے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی تھی۔ اور اسقدر مقبول ہوئی کہ اس کے خریدنے کے لئے لوگوں نے بڑھ بڑھ کر بولیاں دیں اور بالآخر انجمن کا مال قرار پائی۔ اور کئی صاحبوں نے اُسی وقت اسکی نقلیں اشاعت کے لئے لیں۔ یہ نظم گو انجمن کے جلسہ کی رپورٹ کے ہمراہ شائع ہونیوالی ہے اور پنجاب ریویو کی ایک تازہ اشاعت میں بھی چھپ گئی ہے تاہم کلام اقبال کی خوبی اور نظم کی چستی متقاضی ہیں کہ باوجود اور جگہ شائع ہوجانے کے اسے ہدیہ ناظرین مخزن کیا جائے۔ خصوصاً اس لئے کہ ناظرین مخزن کی ایک کثیر تعداد ایسی ہوگی جسے اور رسالوں تک دسترس نہیں:-

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

تھی تو موجود ازل سے ہی تری ذاتِ قدیم پھول تھا زیبِ چمن پر نہ پریشاں تھی شمیم
شرطِ انصاف ہے اے صاحبِ الطافِ عمیم بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم
ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی
ورنہ امت ترے محبوب کی دیوانی تھی

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا؟
قوتِ بازوئے مسلم نے کیا کام ترا

بس رہے تھے یہیں سلجوق بھی تورانی بھی اہلِ چیں چین میں ایران میں ساسانی بھی
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی اسی دنیا میں یہودی بھی تھے نصرانی بھی
پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے؟
بات جو بگڑی ہوئی تھی وہ بنائی کس نے؟

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں کبھی خشکی میں لڑے اور کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کیلئے اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کیلئے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کیلئے سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کیلئے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اڑ جاتے تھے پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے — تیغ کیا چیز ہے ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

تو ہی کہہ دے کہ اکھاڑا در خیبر کس نے؟ — شہر قیصر کا جو تھا اسکو کیا سر کس نے؟
توڑے مخلوق خداوندوں کے پیکر کس نے؟ — کاٹ کر رکھ دیئے کفار کے لشکر کس نے؟
کس نے ٹھنڈا کیا آتشکدۂ ایراں کو؟
کس نے پھر زندہ کیا تذکرۂ یزداں کو؟

کون سی قوم فقط تیری طلبگار ہوئی؟ — اور تیرے لئے زحمت کش پیکار ہوئی؟
کس کی شمشیر جہانگیر جہاندار ہوئی؟ — کس کی تکبیر سے دنیا تری بیدار ہوئی؟
کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے؟
منہ کے بل گر کے ہو اللہ احد کہتے تھے؟

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقت نماز — قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز — نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے — مے توحید کو لیکر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے — اور معلوم ہے تجھکو کبھی ناکام پھرے
دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے — نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے — تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہ گلا ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں! تو بھی تو دلدار نہیں!

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں ہشیار بھی ہیں
سیکڑوں ہیں کہ ترے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزل دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کفر ہے احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں؟

یہ شکایت نہیں ہیں انکے خزانے معمور
نہیں محفل میں جنہیں بات بھی کرنے کا شعور
قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدۂ حور
اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں!
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں؟

کیوں مسلمانوں میں ہے دولت دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جسکی نہ حد ہے نہ حساب
تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہرو دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب
طعن اغیار ہے رسوائی ہے ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنیکا عوض خواری ہے؟

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لئے ایک خیالی دنیا!
ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا!
ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے

کہیں ممکن ہو کہ ساقی نہ رہے جام رہے

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلا لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لیکر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر

درد لیلیٰ بھی وہی قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — امت احمد مرسل بھی وہی تو بھی وہی

پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی
اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

تجھ کو چھوڑا کہ رسول عربی کو چھوڑا؟ — بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا؟
عشق کو عشق کی آشفتہ سری کو چھوڑا؟ — رسم سلمان و اویس قرنی کو چھوڑا؟

آگ تکبیر کی سینوں میں دبی رکھتے ہیں
زندگی مثل بلال حبشی رکھتے ہیں!!

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی — جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفت قبلہ نما بھی نہ سہی — اور پابندی آئین وفا بھی نہ سہی

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہو
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہو

سر فاراں پہ کیا دین کو کامل تو نے — اک اشارے میں ہزاروں کے لئے دل تو نے
آتش اندوز کیا عشق کا حاصل تو نے — پھونک دی گرمی رخسار سے محفل تو نے

آج کیوں سینے ہمارے شرر آباد نہیں
ہم وہی سوختہ ساماں ہیں تجھے یاد نہیں؟

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے ہم نہ رہے دل نہ رہا گھر یہ اُجڑا ہے کہ تو رونقِ محفل نہ رہا
اے خوش آں روز کہ آئی و بصد ناز آئی
بے حجابانہ سوئے محفلِ ما باز آئی

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جو بیٹھے سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہو بیٹھے
پھر پتنگوں کو مذاقِ تپش اندوزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قومِ آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز لے اُڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز
نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کیلئے
طور مضطر ہے اسی آگ سے جلنے کیلئے

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے یعنی ہم دیر نشینوں کو مسلماں کر دے
جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

بوئے گل لیگئی بیرونِ چمن رازِ چمن کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اسکی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اسکی
لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزا جینے میں کچھ مزا ہے تو یہی خونِ جگر پینے میں
کتنے بےتاب ہیں جوہر مرے آئینے میں کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں
اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہوں وہ لالے ہی نہیں
چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اقبال

جوشِ گل

وہ موسم ہے کہ خوبانِ چمن بنتے سنورتے ہیں یہ عالم ہے کہ جیسے رنگ تصویروں میں بھرتے ہیں
ہے خوابیدہ جو سبزہ آئینہ خانہ میں شبنم کے نفس دزدیدہ بادِ صبح کے جھونکے گذرتے ہیں
پرِ طوطی پہ ہوتا ہے دُمِ طاؤس کا دھوکا ہوا سے اُڑ کے برگِ گل جو سبزہ پر بکھرتے ہیں
ملا ہے سبزۂ نوخیز کو کیا رنگِ زنگاری ہوا لگنے سے جسکی۔ زخم دل لالہ کے بھرتے ہیں
شگوفہ ریز ہو کر ڈالیاں مدہوش کرتی ہیں کہ میکش جانتے ہیں طاق سے شیشے اُترتے ہیں
نزاکت سے ادا سے جھوم کر کہتی ہے شاخِ گل یونہیں اِک جام پی کر رنگ مستوں کے نکھرتے ہیں

بشاشت کہ رہی ہی چہرۂ گل کی - دیکھو ۔۔۔ یونہیں محفل میں ہنس دیتے ہیں جو ہمارے ہیں
چمن کی بزم کے شاخیں اثر سے کرتی ہیں گلبازی ۔۔۔ گلوں کی آئینہ داری پہ طاؤس گرتے ہیں
گماں ہوتا ہی کی لشکر کشی باد بہاری نے ۔۔۔ زرہ پوش آب ہو جاتا ہی جب بادل گرتے ہیں
دمِ صبح بہاری ہی رخِ خور پر نقاب افگن ۔۔۔ کسی آئینہ پر تارِ نفس جیسے بکھرتے ہیں
وہیں جا کر تھمیگا کاروانِ لالہ و گل بھی ۔۔۔ نسیمِ صبح کے جھونکے جہاں جا کر ٹھہرتے ہیں
نہالانِ چمن کر لینگے قبضہ ساری عالم پر ۔۔۔ وہاں سے کچھ نہیں چلتی جہاں آ پاؤں دھرتے ہیں
زمیں پہ جال پھیلایا ہی گو سوسن لفِ سنبل نے ۔۔۔ عنادل اِن دنوں آتے ہوئے گلشن میں ڈرتے ہیں
جوابِ جشنِ جم ہی گرمیِ ہنگامۂ گلشن ۔۔۔ کرے کرشتی می تخت پر پری کے اترتے ہیں
عنادل مل چکے ہیں خاک میں - کیا خبر انکو ۔۔۔ کہ شاخیں جھومتی ہیں پھول تربت پر بکھرتے ہیں

علی حیدر طباطبائی

نوحہ سرور

یہ نوحہ منشی درگا سہائے صاحب سرور آنجہانی کے انتقال پر لکھا گیا

آنکھوں کو کیوں ہی بارشِ خونِ جگر پسند ۔۔۔ ہونٹوں کو کیوں ہیں نالۂ شورش اثر پسند
غم تجھ کو کیوں ہی اے دلِ شوریدہ سر پسند ۔۔۔ دنیا سے آج کس کو ہے عزمِ سفر پسند

جاتا ہے آج منزلِ ہستی سے آہ کون
نظروں میں کر چلا یہ زمانہ سیاہ کون

خاموش کیوں ہی بزمِ سخن آہ! کیا ہوا ۔۔۔ ہندوستاں ہی دارِ محن - آہ کیا ہوا!
پہنا یہ کس نے آج کفن آہ! کیا ہوا ۔۔۔ یہ نالہائے تاب شکن - آہ کیا ہوا!

کشتی تباہ کیوں ہی دلِ دردمند کی

دُنیا سے کس نے آہ یہ رحلت پسند کی

کیوں بیقرار اَے دِلِ خونیں جگر ہے تُو کیوں اشکبار اَے مژہ چشمِ تر ہے تو
اَے صبر! کیا ہُوا تجھے کیوں نوحہ گر ہے تو اَے داغ! کس کے غم میں چراغِ سحر ہے تو

یہ کون! ہائے محفلِ ہستی سے اُٹھ گیا
خیمہ یہ کس کا منزلِ ہستی سے اُٹھ گیا

اَے بیکسی یہ سانحہ جانگزا ہے کیا یہ ہائے ہائے نالۂ خونیں نوا ہے کیا
اَے درد! اُٹھ کے دیکھ یہ آہ و بکا ہے کیا لب پر یہ جوشِ نالۂ حسرت فزا ہے کیا

تسکینِ قلب ہے ۔ نہ شکیبِ جگر ہے تو
اے صبر! کس کے سوگ میں وحشت اثر ہے تو

تو او سرورِ مصرِ معانی کدھر گیا ہمراہ تیرے دفترِ علم و ہُنر گیا
دُنیا سے آہ! کیا ترا رختِ سفر گیا پہلو سے صبرِ دل تو شکیبِ جگر گیا

وہ مہرِ آسمانِ فصاحت کہاں ہے آج
وُہ آفتابِ اوجِ بلاغت کہاں ہے آج

خاموش کیوں ہے طوطیِ شکر فشاں چہک باغِ سخن کے بلبلِ رنگیں بیاں چہک
آ! ایک بار بزمِ احبّا میں ہاں چہک رُوح القدس سے خلد میں ہے ہمزباں چہک

مُدت ہُوئی کہ تیرے ترانے سُنے نہیں
خوابِ عدم کے آہ فسانے سُنے نہیں

او جانیوالے! پھر کے اِدھر دیکھ لے ذرا آنکھوں سے رنگِ خونِ جگر دیکھ لے ذرا
اپنی گلی میں خاک بسر دیکھ لے ذرا اِک بار تو اُٹھا کے نظر دیکھ لے ذرا

ہم سب سے آہ! خاک اُڑاتے ہیں راہ میں
اور سو رہا زمیں کی ہے تو خوابگاہ میں

نقشِ حیات تیرا زمانہ مٹا چکا   رنگِ نشاطِ بزمِ شبانہ مٹا چکا
رنگیں نوائیوں کا ترانہ مٹا چکا   جادو نگاریوں کا فسانہ مٹا چکا

باقی ہوا میں اب نہیں تیرا غبار بھی
اُڑتے نہیں ہیں آنکھ سے تیرے شرار بھی

پہلو میں اُٹھ کے درد نے چٹکیاں تو لیں   یہ اُلٹی اُلٹی سانس دلِ ناتواں نے لے
میں خود ستم زدہ ہوں میرا امتحاں لیے   یہ انتقام اَے ستمِ آسماں نے لے

میرے جگر پہ آہ ! نہ یہ غم کا داغ دے
سو داغ دے مگر نہ یہ ماتم کا داغ دے

داغوں پہ اے فلک ہیں دیے تو نے داغ داغ   نیرنگیوں نے تیرے کھلائے ہیں سبز باغ
نیرنگیوں سے تیری ہی ظالم کیے فراغ   تو نے جلا جلا کے بجھائے بہت چراغ

تیرے ستم غضب کے، جفائیں بلا کی ہیں
گردش میں تیری آہ ! ادائیں قضا کی ہیں

آزاد[1] کا ذکا[2] کا ابھی غم گیا نہ تھا   ہم سوگوار تھے کہ یہ ماتم گیا نہ تھا
سینے سے جوشِ نالۂ پیہم گیا نہ تھا   دل سے بخارِ آہ ! شررِ دم گیا نہ تھا

منجدھار میں پڑی ہوئی کشتی سکوں کی تھی
آنکھوں سے آہ ! نہر رواں موجِ خوں کی تھی

شیرازۂ خیال سرور اب کہاں تیرا   جاتا کدھر ہے توسنِ عمرِ رواں تیرا
جائیگا جیتے جی نہ غمِ جانستاں تیرا   برسوں رلائیگا الم خونچکاں تیرا

جب تیری یاد آئے گی احباب روئینگے
آنکھوں سے سیلِ بارشِ خونناب روئینگے

[1] مولوی محمد حسین صاحب۔ [2] مولوی ذکاءاللہ صاحب سے مراد ہے ۱۲

غمخانۂ آرزو کا یہ دار المحن ہے حیف — انجام کار دہر کا دو گز کفن ہے حیف
ہے ساز نالہ جس میں یہ وہ انجمن ہے حیف — قبضہ خزاں کا جس میں ہے یہ وہ چمن ہے حیف
وہ پھول ہے یہ جس میں شمیم وفا نہیں
وہ داغ ہے کہ کس کے جگر پر لگا نہیں

گر صبر نالہ کش دل آشفتہ سر نہ ہو — اے بیکسی ہے غم کی بھی حد نوحہ گر نہ ہو
اے صبر مجھ غریب سے وحشت اثر نہ ہو — اے موج گیر لجۂ خونِ جگر نہ ہو
عبرت سرا ہے دہر۔ یہ رونے سے فائدہ
اے دل آ تڑپ نہ۔ جان کے کھونے سے فائدہ

بالکمال شاد (از پٹیالہ)

چلمن

چلمن! بجا ہے یہ کہ تو رکھتی زباں نہیں — پردے میں تیرے شوخیِ حسن بیاں نہیں
اس پر بھی تو نے ہم سے کئے آہ! جو قرار — پورے وہ قول کے تھے کہ بھولی نہ نبھا
ٹھہرا نہ آج تک کوئی وعدہ ترا غلط — تو اور آہ! خوئے فریب و وفا غلط
دامن میں تیرے عیب ہر اک کا چھپا رہا — کس کس کا تیرے پردے میں پردہ ڈھکا رہا
گو خلق کی نگاہ میں رتبہ ترا نہ ہو — گو پردہ پوشیوں کا تری حق ادا نہ ہو
شکوہ نہیں کرے جو مذمت کوئی تری — پوچھے ہمارے دل سے حقیقت کوئی تری
تصویر آہ! تو ہے نشاط و ملال کی — تمثال ہے دو رنگیِ بزمِ خیال کی
یعنی تری سرشت میں شانِ کرم بھی ہے
اور اس پہ یہ ستم ہے کہ طرزِ ستم بھی ہے

تو رہنمائے شوق ہی پردے میں گم ہو گیا مشتاقِ دید پر ترا احسان یہ کم ہو گیا
پردے میں تیرے حسن کسی کا نظر پڑا بے پردہ کوئی شاہدِ رعنا نظر پڑا
ارماں نظر کے تو نے نکالے نہ آہ! کب رخنے نقابِ حسن میں ڈالے نہ آہ! کب
تیری ہی اوٹ میں کسی مہوش نے جھانک کر کی التفات کی کسی عاشق پہ اک نظر

درباں کو کچھ ہوئیں بھی اگر بدگمانیاں
پردے میں تیرے ہی سب پردہ رہیں نہاں

دامن میں چھپ کے تیرے ہی اے جرم پوش آہ رندِ سیاہ کار نے کیا کیا کیے گناہ
اس تیری پردہ پوشی سے پہنچا ضرر تجھے پردے کا تیرے راز کھلا خلق پر نہ کچھ
پردے میں آہ! تیرے ہی اے شوخ فتنہ گر! خنجر کو پھیر کر کسی بیکس کے حلق پر

سفاک آہ! کر کے کوئی وار چل دیا
پہلو میں آہ! چھوڑ کے تلوار چل دیا

چلمن! ہے سادہ لوح غرض تو بھی کس قدر ہے دشمن اور دوست پہ یکساں تری نظر
تجھ کو دماغ آہ! کہاں امتیاز کا پردہ اٹھا نہ رخ سے کبھی تیرے راز کا
گو سادگی کو دخل ہو تیری سرشت میں گو تجھ کو امتیاز نہیں خوب و زشت میں
شکوہ ترا نہیں کہ تو پھر بھی ہے مغتنم تیرے نگاہِ شوق پہ احسان نہیں ہیں کم
ہرچند بے وفا یہ حسینانِ دہر ہیں خلوت پسند پردہ نشینانِ دہر ہیں
پردے ہیں آہ! اگرچہ تری حاجبِ نظر دستِ درازِ شوق کا تجھ تک نہیں گزر

ہم پھر بھی مہوشوں کی جھلک دیکھ لیتے ہیں
پریوں کا حسن زیرِ فلک دیکھ لیتے ہیں

شاکر میرٹھی

تازہ غزلیں

(از سید علی حیدر زیدی صاحب)

غنی ہے دل مرا میں صاحبِ تمول ہوں
مدام رادہ روِ جادۂ توکل ہوں

کسی کی چشم کا مخمور ہوں مگر سب کو
گمان ہے کہ میں سرمستِ ساغرِ مُل ہوں

میں بے بلائے خدا کے بھی گھر نہ جاؤں گا
طلب کرو تو میں حاضر بلا تامل ہوں

کسی کو چاہا نہ عاشق مزاج ہو کر بھی
فدائے گل نہ ہوا جو کبھی وہ بلبل ہوں

خدائے پاک کا ہر شخص کو وسیلہ ہے
کبھی نہ چاہیے کہنا کہ بے توسل ہوں

جو بڑھتا جاتا ہے سن عمر گھٹتی جاتی ہے
ترقیوں میں بھی میں برسرِ تنزل ہوں

مثالِ شمعِ سحر ہوں بس اب کوئی دم میں
جو تم رہو گے یونہیں بے خبر تو میں گُل ہوں

ہوں ایک مستِ مئے الفتِ علی حیدر
میں جان و دل سے فدائے سوارِ دلدل ہوں

(از جناب نظم صاحب)

چلی صبا کہ چمن میں گذر نہیں نہ سہی
کھلے شگوفے کہ مٹھی میں زر نہیں نہ سہی

نمود و بودِ سرابِ جہاں کی فکر عبث
اگر ہے کچھ تو نہیں کیا اگر نہیں نہ سہی

کب اپنے حال کی مجھ کو خبر ہے اے ناصح
اگر وہ حال سے میرے خبر نہیں نہ سہی

نسیمِ صبح نہ آئے تو خوابِ مرگ تو آئے
سُن اے فلک شبِ غم کی سحر نہیں نہ سہی

تمہیں تو اپنے تغافل پہ ناز ہے بارے
مجھے تحملِ دردِ جگر نہیں نہ سہی

چٹک رہی ہیں جو کلیاں تو پھول ہنستے ہیں
غرض کہ کیجئے نالے اثر نہیں نہ سہی

لحاظِ خاطرِ زاہد ضرور ہے ساقی
اُدھر تو دے کوئی ساغر اِدھر نہیں نہ سہی

اجل ہے سر پر سوار اور سامنے رُخِ یار
قدم تو اب نہیں ہٹنے کا سر نہیں نہ سہی

شہید ہونے کو رکھا ہے پاؤں مقتل میں
ظفر نصیب ہیں تیغ و سپر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دلِ بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج در نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہلِ توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اُگل رہا ہے نظمؔ
جہان میں گر کوئی صاحبِ نظر نہیں نہ سہی

ہاف ٹون عکسی تصاویر

(شائقین جلد منگوائیں)

علمی اور ادبی دنیا کے چند مشاہیر کی تصویریں وقتاً فوقتاً رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر صاحبان علیحدہ علیحدہ اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان کی کچھ کچھ زائد کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ جو اب برائے فروخت پیش کی جاتی ہیں۔ قیمتیں حسب ذیل ہیں:-

۱- حضرت داغ دہلوی مرحوم قیمت ۲؍

۲- شمس العلما مولوی سید علی صاحب بلگرامی ۲؍

۳- پروفیسر ویمبری (مع نمونہ دستخط انگریزی و تحریر فارسی) ۲؍

۴- گروپ (میر مہدی مجروح مرحوم و منشی امیر اللہ تسلیم و احسان واسی) ۳؍

۵- منشی ونائک پرشاد صاحب طالب بنارسی ۲؍

۶- حضرت جلال لکھنوی (مرحوم) ۳؍

تصاویر مصر و روم

ہز ہائی نس عباس حلمی پاشا (خدیو مصر) ۴؍

والی بروصہ کے تین مقامات (جلال الدین چلپی شیخ میر حسین ... و شیخ عبد القادر) ۴؍

جامع سلطان احمد (استانبول) ۴؍

ان تینوں تصویروں کی فقط چند کاپیاں موجود ہیں۔

چشمہ سلطان قیصر ولیم (استانبول) ۱؍

قصر یلدیز (جس پر جلوس سلطانی کی بھی تصویر ہے) ۱؍

غلطہ کا پل (استانبول) ۱؍

خزینہ ہمایوں کا دروازہ ۱؍

کارخانہ ابریشم (بروصہ) ۱؍

درگاہ سلطان طریقت مولانا روم علیہ الرحمۃ ۲؍

متفرق

... لیتم کا تنی کا چرخہ (جھوک گئی) ۱؍

قیصر مصنوعات زنانہ (نمائش لندن) ۱؍

درخواستیں بنام مینیجر مخزن منٹگمری روڈ لاہور آنی چاہئیں

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقالۂ لطیف : مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ شائقین جلد منگا لیں۔ ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا قیمت مع محصولڈاک (۱؍)

رسوم دہلی : مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ قیمت مع محصولڈاک ۔ ۱۲؍

اقبال دلہن : مصنفہ مولوی بشیر الدین احمد خان صاحب قسم اول ۷ قسم دوم ۔ ۸؍

خواب ہستی : مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کی تصنیف ہے ناول کا دوسرا ایڈیشن (۱۲؍)

ابو مسلم خراسانی : رسالہ ہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف کو مولوی محمد حلیم صاحب انصاری ردولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش سے عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت ۱۲؍

مکتوبات آزاد : اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ باتصویر ۶؍

کلام نیرنگ : یہ غلام بھیک صاحب نیرنگ بی اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۸؍

انتخاب مخزن : مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۲

درجانستان : مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی بگڑی زبان میں دہلی کا سچا قصہ ۸؍

دربار نمبر : دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۶؍

مثنویات میر حسن : مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کر کے شامل کی گئی ہے ۲؍

سیر تبت : انگریزی کتاب فیہ ایران تبت کا محاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰؍

مرقع خوشخطی : فن خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں، کاتبوں اور شائقین خط کیواسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھ کر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب نے اس کے اہتمام میں نظر رکھا ہے۔ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اس وقت ملک میں موجود نہیں ۵؍

درخواستیں بنام مینیجر مخزن۔ لاہور آنی چاہئیں۔

آبِ حیاتِ خضر کا پتہ

مدت سے لوگ ڈھونڈتے تھے جس کو اب ملا ہے

عرب میں اکسیر البدن اور اطبا کی اصطلاح میں اکسیر اعظم کہتے ہیں

اطبائے سلف و خلف کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں روح الکل ایک غلاف کے اندر ملفوف ہوتی ہے۔ اگر کوئی ماہر علم ان اجزائے ارضی و غلاف کو دور کر کے روح کو حاصل کرلے تو وہ روح جس مرض میں دیا جاوے مرض کیسی ہی پرانا کہنہ لاعلاج ہو وہ روح کو طاقت دے کر مرض کو نکال دیتا ہے۔ ایسی اکسیر دوا میں ہر ایک کو معلوم نہیں ہوتیں بلکہ بعض خاص لوگوں کو جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتے ہیں تو ان پر ان بوٹیوں کا راز افشا کر دیتے ہیں جن میں روح اکثر زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم اور خضر علیہ السلام اور بڑے بڑے سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی چیزوں کے متلاشی رہے۔ حکیم میکائیل جیسے ... ایسے جواہر کو آبحیات کہتے ہیں اور ... کو تبدیل ... جسم میں کوئی ... نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ سرایت کرکے جسم سے مرض کو باہر نکال دیتا ہے +

اکسیر البدن دوائی کا خاصہ ہے کہ مرض کو ... جڑ سے ہی خارج کر دیتا ہے اور مریض کو خطرناک حالت پر پہنچانا ... کا بڑا فرض ہے ... کرکے اکسیر اعظم ... قسم کی مختلف لاعلاج بیماریوں ... مدت کا کام دیتی ہے ... عام لوگ اس ... یا روح الکل کو آبحیات کہتے ہیں ... عوارض میں ... مفید ... ہوتی ہے +

فوائد مصدقہ آبحیات خضری

تپ محرقہ۔ تپ صفراوی۔ تپ برسوت۔ تپ دق و سل کے لئے بے مثل دوا ہے۔ ہیضہ ... ہر سال بچن میں ... سرسام۔ دردسر۔ درد شکم۔ درد پہلو۔ نمونیا۔ ذات الجنب سرفہ طپش دل۔ سوزش وغیرہ میں سریع الاثر ہے۔ ناسور۔ بدھ کا زخم۔ کان کا درد۔ مسوڑوں سے خون آنا۔ پھوڑے پھنسیاں۔ بچھوں کا ڈنگ۔ بواسیر۔ بھگندر۔ تالو کا سوراخ۔ دانت کا درد۔ درد قولنج۔ درد کمر۔ قبض۔ درد نقرس۔ قے متلی۔ چھپاکی۔ زخموں میں کیڑے پڑنا۔ کثرت تشنگی۔ تشنج۔ بے خوابی۔ کھانسی خشک و تر۔ کرم۔ بخونہ ... پستان کا ورم۔ درد دل۔ آگ سے جلنا وغیرہ وغیرہ میں مفید ہے۔

قیمت

فی شیشی ایک روپیہ (عہ۱) محصولڈاک ۳/
۳ شیشی تین روپے (سے) محصولڈاک معاف
۶ " پانچ روپے (صہ) بغیر محصولڈاک

ہزاروں سرٹیفکیٹ میں سے بطور نمونہ چند سندات ملاحظہ فرمائیے

پتہ: مینیجر شفاخانہ حاجی الحرمین الشریفین حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما۔ لاہور

شائقین کتب

(ملاحظہ فرمائیں)

سنگلاخ کتابوں کا حل - مندرجہ ذیل کتابیں کوئی حل نہ کرسکا اور نہ کوئی انشاء اللہ حل کرسکتا ہے یعنی پتھروں کو پانی کر کے بہا دیا۔ دیکھنا شرط ہے -

حل قصائد خاقانی خلد کورس منشی فاضل ایم۔اے حصہ اول ۲؎ اور حصہ دوم زیر طبع ہے وہ قصہ اس لئے کہ ہم کو چوروں سے پناہ نہیں جو گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مرد میدان ہے تو دوسرا حصہ حل کرے۔ مشکل قصائد میں نے حل کر دئے آسان باقی ہیں

حل کلیات - اردو مرزا غالب دہلوی مرحوم - " " " " ۱۰؎

حل قصائد خاقانی کورس منشی عالم - " " " " ۹؎

حل نکات مولانا مرزا عبد القادر بیدل رحمۃ اللہ علیہ در تصوف .. ۱۲؎

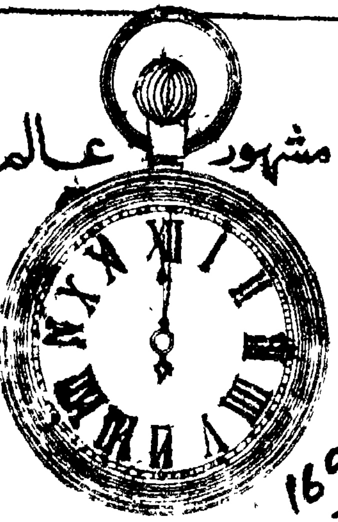
شوکت التجدید میری کلیات جو قصائد و غزلیات و رباعیات و سلام اور اردو اور بھاشا وغیرہ کی نظم سے مرصع ہے اور شاعری کی دنیا جسکی منتظر ہے پیشگی قیمت آرہی ہے زیر طبع ہے - پیشگی ۲؎ اور بعد طبع .. .. ۴؎ ۶؎

اعلان عام جو صاحب کامل شاعر بننا چاہیں میری جانب رجوع لائیں - جیسا کلام ہوگا اسی درجے کی اصلاح ہوگی - کلام بھیجکر آزمالیں -

جو صاحب کسی کتاب اردو - فارسی - عربی میں اصلاح لینا چاہیں فیس کے بارہ میں مراسلت کریں - اکثر کتابوں کا لٹریچر بلکہ املا تک صحیح نہیں ہوتا غلطیوں کو مجدد ہی خوب جانتا ہے -

مجدد و سنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھی

ع ۱۲ ار مشہور عالم ع ۱۲ ار



اصلی راسکوپ سسٹم واچ

یہی اصلی چال کی اصلی راسکوپ سسٹم جیبی گھڑی ہے جسکی پائداری کی نسبت ضرب المثل ہے کہ "دادا خریدے اور پوتا برتے" اور جو باحتیاط رکھنے سے مدت العمر تک گھڑی ساز کا منہہ نہیں دیکھتی - اسپر اسکی خوبصورتی اور ٹائم کی سچائی سونے پر سہاگہ ہے - جب سے یہ گھڑی ہندوستان میں آئی ہے کوئی بھی سوداگر آجتک پانچ روپیہ سے کم قیمت پر فروخت نہیں کرسکا - لیکن ہمنے پچاس ہزار گھڑیاں بذریعہ خاص آرڈر کے ولایت سے منگوائیں - اور کوڑیوں کے منافع پر فروخت کرنا شروع کردیں - یہی وجہ ہے کہ اسکی دہوم مچ گئی اور غیر ملکوں تک جانے لگی جہاں ایک گھڑی گئی اسکو دیکھکر صدہا لوگوں نے منگائیں اور اکثر اصحابنے زیادہ تعداد میں برائے فروخت منگا کر اچھا فائدہ اٹھایا - ہزارہا سارٹیفکیٹ ہمارے دفتر میں اس کے موجود ہیں اسکی نقل ولایت کے دیگر کارخانوں نے ہلکی گھڑیاں بہت بنائیں جنکو اکثر بھولے بھالے خریدار دو چار آنہ کی کفایت دیکر خریدار کر پچھتاتے ہیں - اسی لئے ہمنے یہ شرط کردی ہے کہ اگر ناپسند ہو یا کوئی نقص معلوم ہو تو اسی روز واپس کردو اور قیمت مع خرچہ کے لے لو - اس سے زیادہ کوئی صورت اطمینان کی نہیں ہوسکتی دو یا دو سے زیادہ خریدنے سے محصولڈاک معاف اور یکمشت چھ گھڑی لینے سے علاوہ معافی محصول ایک گھڑی زائد دینگے -

ملنے کا پتہ برج باسی لال ویش ناولٹی ایجنسی نمبر ۱۹۵ بلدیو بلڈنگس شہر جھانسی

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی

جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے - اطراف ہند میں اس کار اہم
سب کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کو
ہیں تو وہ انہی کی ذات سے ہیں اور انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں - جناب حاذق الملک صاحب فرصر
ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو
اس مہتم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں - ہندوستانی دواخانہ انکے احساس و
ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمر ہے گو اس کی ظاہری حیثیت ایک تجارتی جبہ
لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں - طب یونانی کی بقا کا سامان
شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے - اس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اس کے پور
میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا - اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات
انکے طرز ساخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے - بہت سی
کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطبا برتتے ہیں - بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف
و امرا کو میسر آتے تھے - بالکل اصل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور وہ اچھی قیمت
ہوتے ہیں -

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس
کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک جوہر بے بہا ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس جوہر کا گذر
اس لئے تمام ارباب وطن کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی اور ویدک ادویات سے جو اس دواخانہ
خاص اہتمام سے بنتی ہیں - فائدہ اٹھانے کا اور اس کے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقعہ ملسکا
خوبی انتظام اور حسن معاملہ کے بہت تھوڑے عرصہ میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے -

خط کا مکمل پتہ منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی - تار کا کافی پتہ میڈیسن